ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ

آسان تفسیر القرآن

تفسیرِ ربانی

تالیف و ترتیب

حضرت مولانا مفتی اصغر علی ربانی صاحب زید مجدہم

استاذ و مفتی دارالافتاء جامعہ دارالعلوم کراچی

جلد سوم

سورۃ المائدۃ و سورۃ الانعام

مکتبہ ربانیہ کراچی

Islamic Studies Publishers
Karachi-Pakistan

مکتبہ ربانیہ کراچی
ISLAMIC STUDIES PUBLISHERS

٣

آسان تفسیر القرآن

جملہ حقوق بحق مکتبۂ ربانیہ محفوظ ہیں۔

Islamic Studies Publishers
Karachi-Pakistan

باہتمام : عبیدالرحمٰن ربانی

جلد سوم : سُوْرَةُ الْمَائِدَة تا سُوْرَةُ الْأَنْعَام

طبع اوّل : ذی الحج ۱۴۳۹ھ بمطابق اگست 2018ء

ناشر : مکتبۂ ربانیہ کراچی

فون : 0314-6107967
0302-2426288
(92-21) 35031011

ای میل

rabbaniglobal@yahoo.com
ibnerabbani@gmail.com

عرض ناشر

الحمدللہ!! اگرچہ مکتبۂ ربانیہ نے

آسان تفسیر القرآن

کی تصحیح وطباعت میں ہر ممکن احتیاط سے کام لیا ہے، لیکن کبھی کبھی کتابت، طباعت اور جلد سازی میں غلطی ہو جاتی ہے، اگر کسی صاحب کو ایسی غلطی کا علم ہو تو براہ کرم مطلع فرما کر ممنون فرمائیں۔

(ادارہ)

ضروری انتباہ!!

اس کتاب کے جملہ حقوق کاپی رائٹ آفس میں رجسٹرڈ ہیں۔اس کتاب کی کتابت، تدوین وترتیب اور کسی بھی طریقے سے کاپی کرنا ''کاپی رائٹ ایکٹ 1962ء'' کے تحت قابل تعزیر جرم ہے اور اس کی خلاف ورزی پر بطور رجسٹرڈ کاپی رائٹ مالک (Owner) قانونی کارروائی کی جائے گی۔

(ادارہ)

ملنے کا پتہ

مکتبۂ ربانیہ کراچی
131/30 سیکٹر 36/A زیڈ ون کے ایریا کورنگی کراچی
نزد جامعہ دارالعلوم کراچی ۱۴

- ادارۃ المعارف، جامعہ دارالعلوم کراچی
- بیت القرآن، اردو بازار کراچی
- دارالاشاعت، اردو بازار کراچی
- مکتبہ معارف القرآن، جامعہ دارالعلوم کراچی
- ادارہ اسلامیات، اردو بازار کراچی
- مکتبہ فہیم دین (جامع مسجد بیت السلام ڈیفنس)

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَارَيْبَ فِيْهِ

آسان تفسیر القرآن

تفسیرِ ربّانی

تالیف وترتیب

حضرت مولانا مفتی اصغر علی ربانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ

اُستاذ و مُفتی دارالافتاء جامعہ دارالعلوم کراچی ۱۴

جلد سوم

سُورۃ المائدۃ و سُورۃ الانعام

مکتبہ ربانیہ کراچی

131/30 سیکٹر 36/A ڈبل روم کے ایریا کورنگی کراچی

نزد جامعہ دارالعلوم کراچی ۱۴

بسم الله الرحمن الرحيم

فہرست آسان تفسیر القرآن (جلد سوم)

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
	سورۃ المآئدۃ	
۱	ذمہ داری پوری کرو	۲۵
۲	’’سورۂ مائدہ‘‘ کا خلاصہ	۲۷
۳	زیادتی نہ کرو	۳۲
۴	معاشرتی اصول	۳۴
۵	حرام چیزوں کا ذکر	۳۶
۶	دین مکمل ہو گیا	۴۰
۷	حلال کی تفصیل	۴۵
۸	احکام و مسائل	۴۷
۹	حلال چیزیں	۴۸
۱۰	’’حلال‘‘ اور ’’طیّب‘‘ میں فرق	۵۰
۱۱	ایک عجیب واقعہ	۵۲
۱۲	ایک اہم سوال اور اس کا جواب	۵۳

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۱۳	وضو اور غسل	۵۴
۱۴	وضو اور ناپاکی والے غسل میں کلی کرنے اور ناک میں پانی ڈالنے کا حکم	۵۷
۱۵	تیمم کا بیان	۵۸
۱۶	اللہ تعالیٰ کا عہد	۶۱
۱۷	عدل وانصاف	۶۳
۱۸	اچھے اور بُرے لوگوں کا انجام	۶۸
۱۹	اللہ تعالیٰ کا احسان	۷۰
۲۰	بنی اسرائیل کا عہد	۷۳
۲۱	بنی اسرائیل کا عہد توڑنا	۷۷
۲۲	عیسائیوں کا حال	۸۲
۲۳	عیسائی فرقوں میں آپس کی دشمنی	۸۳
۲۴	عیسائیوں میں اصل میں تین فرقے ہیں	۸۴
۲۵	قرآن کریم کو مانو	۸۴
۲۶	عیسائیوں کا غلط عقیدہ	۸۸
۲۷	ایک اور غلط خیال	۹۰
۲۸	یہودیوں اور عیسائیوں کو نصیحت	۹۳

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۲۹	زمانۂ فترت کے احکام	۹۶
۳۰	یہودیوں پر اللہ تعالیٰ کی مہربانیاں	۹۷
۳۱	مہربانیوں کی تفصیل	۹۹
۳۲	جہاد سے انکار	۱۰۲
۳۳	ہمت والے جیتتے ہیں	۱۰۴
۳۴	بنی اسرائیل اور مسلمانوں کی فرمانبرداری کا موازنہ	۱۰۵
۳۵	سرکشی کی سزا	۱۰۶
۳۶	حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بددعا کی قبولیت	۱۰۹
۳۷	بے گناہ کا قتل	۱۱۱
۳۸	پرہیزگاروں کا رویہ	۱۱۵
۳۹	خواہش اندھا کردیتی ہے	۱۱۷
۴۰	قابیل کے کئے کا پھل	۱۲۰
۴۱	زمین میں فساد کی تشریح	۱۲۴
۴۲	دنیا میں فساد پھیلانے والوں کی سزا	۱۲۵
۴۳	ڈاکوؤں کی چار قسم کی سزاؤں کا بیان	۱۲۶
۴۴	شرعی سزاؤں کی تین قسمیں	۱۲۷

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۴۵	فسادیوں کی سزا	۱۳۰
۴۶	کامیابی کا راستہ	۱۳۲
۴۷	فدیہ کام نہ دے گا	۱۳۵
۴۸	چوری کی سزا	۱۳۷
۴۹	توبہ اور خود کی درستگی	۱۴۱
۵۰	اللہ تعالیٰ کی حکومت	۱۴۲
۵۱	کفر کے حامی	۱۴۳
۵۲	کفر کے ہتھکنڈے	۱۴۶
۵۳	گمراہوں کی سزا	۱۵۱
۵۴	عدل و انصاف	۱۵۳
۵۵	یہودیوں اور عیسائیوں کا برتاؤ	۱۵۴
۵۶	تورات	۱۵۶
۵۷	نصیحت	۱۶۰
۵۸	تورات کا حکم	۱۶۱
۵۹	انجیل	۱۶۳

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۶۰	انجیل پر عمل	۱۶۶
۶۱	قرآن مجید	۱۶۷
۶۲	آزمائش	۱۶۹
۶۳	شریعتوں کے مختلف ہونے کی حکمت	۱۷۲
۶۴	انصاف	۱۷۳
۶۵	دین سے دور بھاگنا	۱۷۵
۶۶	خودغرضوں سے بچو	۱۷۸
۶۷	شانِ نزول	۱۷۹
۶۸	کافروں کی طرف جھکاؤ	۱۸۲
۶۹	منافقوں کا انجام	۱۸۳
۷۰	اِسلام انسانی مذہب ہے	۱۸۵
۷۱	اللہ والے ہی غالب ہیں	۱۹۰
۷۲	دین مذاق کی چیز نہیں	۱۹۳
۷۳	نماز کا مذاق اڑانا	۱۹۴
۷۴	بروں کو اچھے نہیں بھاتے	۱۹۶

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۷۵	نفرت کے قابل باتیں	۱۹۷
۷۶	یہودیوں کی دھوکہ بازی	۱۹۹
۷۷	عالم برائی سے روکیں	۲۰۱
۷۸	یہودیوں کی گستاخی	۲۰۲
۷۹	فسادی مٹنے کے قابل ہیں	۲۰۴
۸۰	اہل کتاب چوک گئے	۲۰۵
۸۱	تفسیر: اللہ تعالٰی کے حکموں پر پورا عمل کس طرح ہوتا ہے؟	۲۰۶
۸۲	پیغمبر کا فرض	۲۰۷
۸۳	تفسیر: تبلیغ کی تاکید اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی	۲۰۸
۸۴	اہل کتاب کو پھر نصیحت	۲۱۰
۸۵	خوف وغم سے نجات	۲۱۲
۸۶	خواہشوں کے غلام	۲۱۳
۸۷	گناہوں کا بدلہ	۲۱۴
۸۸	عیسائیوں کا شرک	۲۱۵
۸۹	تین خداؤں والا عقیدہ کفر ہے	۲۱۷

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۹۰	حضرت مسیح علیہ السلام اور حضرت مریم کی حیثیت	۲۱۸
۹۱	ایک علمی نکتہ، حضرت مریم بتول پیغمبر تھیں یا ولی؟	۲۲۰
۹۲	دین میں زیادتی	۲۲۰
۹۳	بنی اسرائیل کے ٹیڑھ پن کا دوسرا پہلو	۲۲۱
۹۴	لعنت کا سبب	۲۲۲
۹۵	کافروں کی دوستی	۲۲۵
۹۶	یہودیوں وعیسائیوں کا موازنہ	۲۲۶
۹۷	نرم دلی کے سبب	۲۲۹
۹۸	نرم دل ہونے کی پہچان	۲۳۳
۹۹	ایمان کا بدلہ	۲۳۵
۱۰۰	یہودیوں اور عیسائیوں کا طریقہ کار	۲۳۷
۱۰۱	حلال کو حرام نہ ٹھہراؤ	۲۳۸
۱۰۲	حلال کو حرام قرار دینے کی صورتیں	۲۳۹
۱۰۳	قسموں کے حکم	۲۴۱
۱۰۴	قسم کی قسمیں	۲۴۲
۱۰۵	احکام ومسائل	۲۴۳

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۱۰۶	قسموں کے مزید احکام	۲۴۵
۱۰۷	شراب اور جوا	۲۴۷
۱۰۸	شراب و جوے وغیرہ کی خرابیاں	۲۵۰
۱۰۹	اللہ اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت	۲۵۳
۱۱۰	شراب کا حکم اترنے سے پہلے شراب پینے والوں کی مشروط معافی	۲۵۴
۱۱۱	اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائشیں	۲۵۶
۱۱۲	شکار کی ممانعت	۲۵۹
۱۱۳	جرمانے کی صورتیں	۲۶۱
۱۱۴	احکام و مسائل	۲۶۲
۱۱۵	احرام میں شکار	۲۶۴
۱۱۶	ایک علمی نکتہ	۲۶۵
۱۱۷	کعبہ کیا ہے؟	۲۶۶
۱۱۸	اللہ تعالیٰ کی صفتیں	۲۷۰
۱۱۹	حلال و حرام	۲۷۲
۱۲۰	آیت کا شان نزول	۲۷۳
۱۲۱	بے ضرورت سوالات	۲۷۴
۱۲۲	"بَحِيْرَةٌ" اور "سَآئِبَةٌ" وغیرہ کی حقیقت	۲۷۸

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۱۲۳	کافر باپ دادوں کی بے سوچے سمجھے پیروی	۲۸۱
۱۲۴	شانِ نزول	۲۸۲
۱۲۵	مشرک باپ دادوں کی پیروی اور علم و ہدایت والے اماموں کی پیروی میں فرق	۲۸۳
۱۲۶	کسی پر تنقید کرنے کا مؤثر طریقہ	۲۸۳
۱۲۷	تم اپنی فکر کرو	۲۸۴
۱۲۸	تفسیر: مخلوق کی اصلاح کی فکر کرنے والوں کو ایک تسلی	۲۸۴
۱۲۹	وصیّت پر گواہی	۲۸۶
۱۳۰	ایک علمی نکتہ	۲۸۷
۱۳۱	وصی کی جانچ پڑتال	۲۸۸
۱۳۲	وصی کی غلط بیانی	۲۹۰
۱۳۳	وارثوں کی قسمیں	۲۹۱
۱۳۴	پیغمبروں سے سوال	۲۹۳
۱۳۵	حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خصوصیتیں	۲۹۵
۱۳۶	حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزے	۲۹۹
۱۳۷	حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مزید معجزے	۳۰۳
۱۳۸	حواریوں کی درخواست	۳۰۵

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۱۳۹	حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعا	۳۰۸
۱۴۰	نافرمانی کی سزا	۳۰۹
۱۴۱	حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی گواہی	۳۱۰
۱۴۲	دل کا حال	۳۱۲
۱۴۳	پیغمبر کی گواہی	۳۱۴
۱۴۴	اللہ تعالیٰ سے رحم کی درخواست	۳۱۵
۱۴۵	اللہ تعالیٰ کا فیصلہ	۳۱۷
	سورۃ الأنعام	
۱	اللہ تعالیٰ سب کے خالق ہیں	۳۱۹
۲	انسان کی پیدائش	۳۲۰
۳	اللہ تعالیٰ کی صفتیں	۳۲۲
۴	حقیقت کا اظہار	۳۲۳
۵	پچھلوں سے عبرت	۳۲۵
۶	بدعملیوں کا نتیجہ	۳۲۶
۷	ضد کی انتہا	۳۲۷
۸	انوکھی فرمائشیں	۳۲۹

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۹	پیغمبروں کی بے ادبی	۳۳۰
۱۰	سیاحت کا مقصد	۳۳۱
۱۱	بنیادی قاعدہ	۳۳۲
۱۲	قیامت ضرور واقع ہوگی	۳۳۳
۱۳	اللہ تعالیٰ ہی سب کے مالک ہیں	۳۳۴
۱۴	اللہ تعالیٰ کی اطاعت	۳۳۷
۱۵	اللہ تعالیٰ ہر حال میں قادر ہیں	۳۳۸
۱۶	اللہ تعالیٰ سب سے زبردست ہیں	۳۳۹
۱۷	اللہ تعالیٰ ایک ہیں	۳۴۱
۱۸	سدھرنے اور سدھارنے کی ضرورت ہے	۳۴۲
۱۹	جانتے ہیں اور نہیں مانتے	۳۴۴
۲۰	بہت بڑی بے انصافی	۳۴۵
۲۱	مشرکوں کی جھوٹی قسم	۳۴۶
۲۲	بعض لوگوں کا طرزِ عمل	۳۴۷
۲۳	اسلام کے مخالف اپنا نقصان کر رہے ہیں	۳۴۹
۲۴	دوزخ کا ہولناک منظر	۳۵۱

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۲۵	اسلام کے تین بنیادی اصول ہیں:	۳۵۲
۲۶	دوبارہ پھر وہی کریں گے	۳۵۳
۲۷	سچ کا اقرار	۳۵۴
۲۸	کوتاہیوں پر پچھتاوا	۳۵۵
۲۹	اصل زندگی	۳۵۹
۳۰	لوگوں کی نافرمانی سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو دُکھ	۳۶۱
۳۱	پیغمبروں کے مددگار اللہ تعالیٰ ہیں	۳۶۳
۳۲	زبردستی مقصود نہیں	۳۶۶
۳۳	ماننے کیلئے عقل کافی ہے	۳۶۹
۳۴	کافر کھلی نشانی مانگتے ہیں	۳۷۱
۳۵	ہر مخلوق ایک اُمت ہے	۳۷۲
۳۶	عقل سے کام لینا	۳۷۷
۳۷	مصیبت میں اللہ تعالیٰ کی یاد	۳۷۸
۳۸	سخت دلی	۳۸۰
۳۹	ظلم کا انجام	۳۸۲
۴۰	توبہ میں دیر نہ کرے	۳۸۳
۴۱	خوشخبری اور ڈراوا	۳۸۶

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۴۲	پیغمبر کی حیثیت	۳۸۷
۴۳	پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غیب جاننے کی حقیقت	۳۹۰
۴۴	قرآن کریم سے فائدہ کون اٹھائیگا؟	۳۹۱
۴۵	خلوص والوں کو دور مت کیجئے	۳۹۲
۴۶	مرتبوں کا فرق آزمائش ہے	۳۹۶
۴۷	اس آیت سے چند باتیں معلوم ہوئیں	۳۹۸
۴۸	مسلمانوں کی دل جوئی کرو	۳۹۸
۴۹	پیغمبر کسی بھی انسان کے پیروکار نہیں	۴۰۲
۵۰	منکروں کا فیصلہ اللہ تعالیٰ پر ہے	۴۰۴
۵۱	سزا دینا صرف اللہ تعالیٰ کا کام ہے	۴۰۶
۵۲	اللہ تعالیٰ کو ذرّہ ذرّہ کا علم ہے	۴۰۷
۵۳	"غیب" کا معنیٰ	۴۰۹
۵۴	انسان کو اپنا بھی ہوش نہیں	۴۱۰
۵۵	انسانی زندگی کا مکمّل نقشہ	۴۱۲
۵۶	ہر مشکل میں اللہ تعالیٰ ہی مددگار رہیں	۴۱۶
۵۷	اللہ تعالیٰ ہر طرح کا عذاب بھیج سکتے ہیں	۴۱۸

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۵۸	ہر چیز کا ایک وقت مقرر ہے	۴۲۱
۵۹	قرآن کریم کیساتھ مذاق	۴۲۲
۶۰	احکام ومسائل	۴۲۴
۶۱	نیک لوگوں کی ذمہ داری	۴۲۵
۶۲	شریروں سے بچو	۴۲۶
۶۳	بدلہ قبول نہ کیا جائیگا	۴۲۹
۶۴	اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر دوسروں کو پکارنا	۴۳۱
۶۵	اللہ تعالیٰ کی صفتیں	۴۳۳
۶۶	حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مثال	۴۳۶
۶۷	(عقائد اور عملوں کی اصلاح کی دعوت) اپنے گھر اور اپنے خاندان سے شروع کرنی چاہئے	۴۳۸
۶۸	عقل کا کام	۴۳۸
۶۹	تفسیر: تبلیغ ودعوت میں حکمت وتدبیر سے کام لینا پیغمبروں کی سنت ہے	۴۳۹
۷۰	اسلام کے مبلغین کیلئے چند ہدایتیں	۴۴۱
۷۱	عقل کا فیصلہ	۴۴۲
۷۲	بے جا حجت کا جواب	۴۴۳
۷۳	مشرک خطرے میں ہیں	۴۴۴
۷۴	مطمئن کون ہیں؟	۴۴۶

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۷۵	پیغمبروں کی جماعت	۴۵۰
۷۶	اللہ تعالیٰ کی ہدایت	۴۵۳
۷۷	زبردست پیشنگوئی	۴۵۵
۷۸	تمام پیغمبر سیدھی راہ پر ہیں	۴۵۸
۷۹	اللہ تعالیٰ کی کتاب	۴۵۹
۸۰	اُن سے اللہ سمجھے	۴۶۱
۸۱	اللہ تعالیٰ کی کتاب	۴۶۳
۸۲	اللہ تعالیٰ کی بے ادبی	۴۶۵
۸۳	ظالموں کی سزا	۴۶۸
۸۴	مرتے وقت انسان تنہا ہوگا	۴۷۰
۸۵	قدرت کے کرشمے	۴۷۲
۸۶	قدرت کی واضح نشانیاں	۴۷۷
۸۷	سب پھل اور سبزیاں اللہ تعالیٰ نے پیدا کیں	۴۸۰
۸۸	اللہ تعالیٰ خیالات سے بڑھ کر ہیں	۴۸۴
۸۹	اللہ تعالیٰ کی کوئی اولاد نہیں	۴۸۷
۹۰	دنیا کی چیزوں کے ذریعے اللہ تعالیٰ کو پہچانو	۴۸۸
۹۱	انسان کو اس دنیا میں آنکھوں سے اللہ تعالیٰ کی زیارت ہوسکتی ہے یا نہیں؟	۴۹۰

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۹۲	کامیاب کون ہے؟	۴۹۲
۹۳	وحی پر چلنے کا حکم	۴۹۵
۹۴	زبردستی نہیں ہے	۴۹۷
۸۵	رواداری کی تعلیم	۵۹۷
۹۶	کسی گناہ کا سبب بننا بھی گناہ ہے	۵۰۱
۹۷	ہر ایک کو اپنا اپنا طریقہ پسند ہے	۵۰۲
۹۸	نہ ماننے کے سو بہانے	۵۰۳
۹۹	نشانیاں دیکھ کر بھی نہ مانیں گے	۵۰۵
۱۰۰	پہلی ضد انہیں اب بھی روکے گی	۵۰۷
۱۰۱	انوکھی نشانیوں کا مطالبہ	۵۰۹
۱۰۲	پیغمبروں کے دشمن	۵۱۰
۱۰۳	بُرے لوگوں کے کام	۵۱۴
۱۰۴	فیصلہ اللہ تعالیٰ ہی کر سکتے ہیں	۵۱۵
۱۰۵	قرآن مجید کے حکم اٹل ہیں	۵۱۷
۱۰۶	گمراہ کن	۵۱۹
۱۰۷	گمراہ اور ہدایت یافتہ	۵۲۰
۱۰۸	احکام و مسائل	۵۲۲

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۱۰۹	بے بنیاد اعتراض	۵۲۲
۱۱۰	احکام ومسائل	۵۲۵
۱۱۱	گناہ نہ کرو	۵۲۶
۱۱۲	اللہ کا نام لیکر ذبح کیے ہوئے جانوروں کے بارے میں شیطانوں کا وسوسہ	۵۲۸
۱۱۳	احکام ومسائل	۵۳۰
۱۱۴	روشنی اور اندھیرا برابر نہیں	۵۳۰
۱۱۵	مؤمن زندہ اور کافر مردہ	۵۳۱
۱۱۶	بڑے مجرم	۵۳۳
۱۱۷	پیغمبری اللہ تعالیٰ کی عطا ہے	۵۳۵
۱۱۸	ہدایت سے محروم	۵۳۷
۱۱۹	سیدھا راستہ	۵۴۰
۱۲۰	شیطان کا راستہ	۵۴۲
۱۲۱	بروں کا حشر	۵۴۴
۱۲۲	دنیا میں بھی عملوں واخلاق کا اجتماعی معاملوں میں اثر	۵۴۷
۱۲۳	پیغمبروں کا پیغام	۵۴۷
۱۲۴	کیا جنوں میں بھی پیغمبر ہوتے ہیں	۵۵۰
۱۲۵	اللہ تعالیٰ کے ہاں بے انصافی نہیں ہے	۵۵۱

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۱۲۶	اللہ تعالیٰ کو تمہارے ماننے نہ ماننے کی پرواہ نہیں	۵۵۲
۱۲۷	اللہ تعالیٰ نے کسی انسان کو بے نیاز نہیں بنایا	۵۵۳
۱۲۸	کھلا ہوا مقابلہ	۵۵۵
۱۲۹	کافروں کے کرتوت	۵۵٦
۱۳۰	قابلِ توجہ بات	۵۵۹
۱۳۱	ایک اور بڑی بیوقوفی	۵۵۹
۱۳۲	دین کی اور غلط شکلیں	۵٦۱
۱۳۳	احکام ومسائل	۵٦۳
۱۳۴	مشرکوں کی اور فضول باتیں	۵٦۳
۱۳۵	اللہ تعالیٰ کی مہربانیاں	۵٦۵
۱۳٦	احکام ومسائل	۵٦۹
۱۳۷	جانور بھی اللہ تعالیٰ ہی نے بنائے	۵٦۹
۱۳۸	جانوروں کی دو باقی قسمیں	۵۷۲
۱۳۸	حرام چیزیں	۵۷۳
۱۴۰	احکام ومسائل	۵۷۸
۱۴۱	یہودیوں پر حرام کی ہوئی چیزیں	۵۷۸
۱۴۲	مجرم بچ نہیں سکتے	۵۸۱

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۱۴۳	دھوکا	۵۸۲
۱۴۴	اٹکل پچّو باتیں	۵۸۴
۱۴۵	گواہ لاؤ	۵۸۶
۱۴۶	اللہ تعالیٰ کے واضح حکم	۵۸۸
۱۴۷	شرک کی تعریف اور اس کی قسمیں	۵۹۱
۱۴۸	وہ دس چیزیں جن کے حرام ہونے کا حکم ان آیتوں اور آگے کی آیتوں میں آرہا ہے یہ ہیں	۵۹۳
۱۴۹	احکام ومسائل	۵۹۳
۱۵۰	بے حیائی مت کرو	۵۹۴
۱۵۱	احکام ومسائل	۵۹۷
۱۵۲	عدل اور انصاف کرو	۵۹۸
۱۵۳	احکام ومسائل	۶۰۳
۱۵۴	اللہ تعالیٰ کا سیدھا راستہ	۶۰۳
۱۵۵	خلاصہ: جن دس چیزوں کا تفصیلی بیان ان آیتوں میں آیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ:	۶۰۶
۱۵۶	ان آیتوں کی اہم خصوصیات	۶۰۷
۱۵۷	یہ آیتیں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وصیت نامہ ہیں	۶۰۷
۱۵۸	ہدایت کا سلسلہ	۶۰۹
۱۵۹	قرآن مجید	۶۱۰

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۱۶۰	قرآن حکیم سے منہ موڑنا	۶۱۳
۱۶۱	ایمان لانے کیلئے اب کس بات کا انتظار ہے	۶۱۴
۱۶۲	فرقہ بندی	۶۱۷
۱۶۳	ایک ضروری وضاحت	۶۱۹
۱۶۴	نیکی کا ثواب	۶۲۲
۱۶۵	خالص توحید	۶۲۶
۱۶۶	اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی کچھ دینے لینے والا نہیں	۶۲۸
۱۶۷	انسان زمین پر اللہ تعالیٰ کا نائب ہے۔	۶۳۰

اٰیاتھا — ۱۲۰ سُوْرَةُ الْمَآئِدَةِ مَدَنِیَّةٌ رکوعاتھا — ۱۶

سورۃ المائدہ مدنی ہے، اس میں ایک سو بیس آیتیں اور سولہ رکوع ہیں۔

ذمہ داری پوری کرو

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ؕ اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ

اے وہ لوگو! جوایمان لائے پورا کرو عہدوں کو حلال کئے گئے لئے تمہارے جانور

الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَ اَنْتُمْ

چوپائے سوائے اسکے جو پڑھے جائیں اوپر تمہارے نہ حلال جانتے ہوئے شکار کو اور جب تم

حُرُمٌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ ① يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا

احرام میں ہو بیشک اللہ حکم کرتے ہیں جو چاہیں (۱) اے وہ لوگو! جوایمان لائے ہو نہ

تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ وَ لَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَ لَا الْهَدْيَ وَ لَا

حلال جانو نشانیاں اللہ کی اور نہ مہینہ کو محترم اور نہ حج کی قربانی کا جانور اور نہ

الْقَلَآئِدَ وَ لَآ آٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ

پٹے ڈالے ہوئے اور نہ قصد کرنے والے گھر کا حرمت والے جو ڈھونڈتے ہیں فضل سے

رَّبِّهِمْ وَ رِضْوَانًا ؕ

رب اپنے اور خوشنودی

المجلد الثالث المنزل الثانی ۲

بامحاورہ ترجمہ:۔اے ایمان والو! عہدوں کو پورا کرو، تمہارے لئے حلال کیے گئے چوپائے، سوا ان چوپایوں کے جو تم کو سنائے جائیں گے مگر شکار کو حلال نہ جانو احرام کی حالت میں اللہ جو چاہیں حکم کرتے ہیں۔(۱) اے ایمان والو! حلال نہ سمجھو اللہ کی نشانیوں کو اور نہ احترام والے مہینہ کو اور نہ اس جانور کو جو حج کی قربانی کا ہو اور نہ ان کو جن کے گلے میں پٹہ ڈال کر کعبہ کی طرف لے جائے جائیں، نہ ہی حرمت والے گھر یعنی بیت اللہ کے ارادے سے آنے والوں کو جو اپنے رب کا فضل اور اس کی خوشی ڈھونڈتے ہیں۔(مطلب یہ کہ قربانی کے جانوروں اور حاجیوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ نہ کرو)۔

لفظی تحقیق: اس سورۃ کا نام "مُنْجِیَۃٌ" بھی ہے کیونکہ انسانوں کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچانے والی سورۃ ہے، تاہم اس کا زیادہ مشہور نام "مَائِدَۃٌ" ہی ہے۔

اس سورۃ کا نام "مَائِدَۃٌ" اس وجہ سے ہے کہ اس کے پندرھویں رکوع میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعا کا ذکر ہے جس میں آپ نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی تھی "﴿اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اَنْزِلْ عَلَیْنَا مَائِدَۃً مِنَ السَّمَآءِ﴾[المائدة:۱۱۴]"، "اے اللہ! ہمارے لئے آسمان سے دسترخوان اتار دیجئے"، "مَائِدَۃٌ" اس دسترخوان کو کہتے ہیں جس پر کھانا چنا ہوا ہو۔

عُقُوْدٌ: عہد و پیمان۔ "عَقْدٌ" کی جمع ہے جس کے معنی ہیں گرہ لگانا، باندھنا، اپنے ذمہ کوئی کام لے لینے کو عقد کہتے ہیں، اس کے معنی عہد و پیمان کرنا اور پختہ وعدہ کرنا بھی ہیں۔ مُحِلِّی الصَّیْدِ: اس کے معنی ہیں شکار کو حلال سمجھنے والے، جائز کر لینے والے۔ حُرُمٌ: "حَرَامٌ" کی جمع ہے، حرام محترم چیز کو کہتے ہیں۔ شَعَآئِرَ: "شَعِیْرَۃٌ" کی جمع ہے، وہ چیزیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی بندگی کی نشانیاں مقرر کیا ہے۔ اَلْقَلَآئِدَ: "قَلَادَۃٌ" کی جمع ہے، ہار یا پٹہ یا اسی قسم کی کوئی چیز جو قربانی کے جانور کے گلے میں باندھ دیتے ہیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ یہ جانور قربانی کیلئے جا رہا ہے، یہاں مراد وہ جانور ہیں جن کے گلوں میں یہ چیزیں باندھ دی گئی ہوں۔ آمِّیْنَ: "آمٌّ" کی جمع ہے، اس کا معنی ہے کعبہ کا ارادہ کر کے چل دینے

والے۔ الْبَيْتَ الْحَرَامَ: حرمت والا گھر، یعنی: کعبہ۔

تفسیر

اس سورۃ کے شروع میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ جن باتوں کا پورا کرنا تم نے اپنے ذمہ لے لیا ہے انہیں پورا کرنا چاہئے، انسان جب کلمہ پڑھ لیتا ہے تو وہ اپنے ذمہ لیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر کی فرمانبرداری کروں گا، اس ذمہ داری کا نبھانا اس پر فرض ہے چنانچہ اس کے بعد جو چیزیں کرنے کی ہیں اور جن چیزوں سے رکنا ہے وہ بتا دی جائیں گی۔

"سورۂ مائدہ" کا خلاصہ

سورۃ کے شروع میں ہی ایمان والوں سے کہا گیا ہے کہ جو تم اپنے ذمہ لو اُسے پورا کرو، ایمان والا شخص وہ ہے جو زبان سے کلمہ طیبہ کہے اور دل میں ٹھان لے کہ اللہ تعالیٰ اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو مجھے حکم دیں گے اسے دل وجان سے بجالاؤں گا، اس کلمہ کے پڑھتے ہی اسے کچھ کام کرنے کے حکم دیئے جاتے ہیں۔

(۱)..... اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔

(۲)..... پانچ وقت مسلمانوں کے ساتھ مل کر نماز ادا کرو۔

(۳)..... جب رمضان کا مہینہ آئے تو روزے رکھو۔

(۴)..... اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کرو۔

(۵)..... عمر بھر میں ایک بار حج ضرور کرو اگر اس کی استطاعت ہو۔

کلمہ پڑھ لینا ان سب کاموں کے کرنے کا عہد ہے جس کو عقد بھی کہتے ہیں، آیت میں ارشاد ہے کہ:

اپنے عہد کو پورا کرو، اللہ تعالیٰ اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو کہیں کرو۔

پچھلی قوموں نے جن کی مثال یہودیوں اور عیسائیوں کی شکل میں عرب کے سامنے موجود تھی، سب سے بڑھ کرانہوں نے غلط یہی کیا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ جو عہد کیے تھے انہیں پورا نہ کیا، ان کی سب باتیں تفصیل کے ساتھ ''سورۂ بقرہ، سورۂ آل عمران اور سورۂ نساء'' میں بیان کی گئی ہیں، شاید ہی ایسی بہانہ بازیاں کسی اور قوموں نے کی ہوں گی جتنی ان دو قوموں نے کیں، زبان سے اقرار کرلیا کہ ہم اللہ تعالیٰ کے سارے حکم مانیں گے مگر بعد میں اپنی خواہشوں کے پیچھے لگ گئے اور اللہ تعالیٰ کے حکموں کو اپنی مرضی کے مطابق جیسا چاہا موڑ توڑ لیا، سب سے بڑا عہد جو انہوں نے توڑا وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرنے کا عہد تھا، یہاں پہلے ہی مسلمانوں سے کہہ دیا گیا ہے تم یہودیوں اور عیسائیوں کی طرح نہ کرنا بلکہ جو راستہ تمہارے لئے اللہ تعالیٰ اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر کیا ہے اس کی خوب خیال کے ساتھ پیروی کرنا۔

مسلمانوں کو حکم ہے کہ تم پر چوپائے جانوروں سے فائدہ اٹھانا حلال کیا گیا ہے، جی چاہے تو ان کو کھاؤ لیکن حج کے احرام کی حالت میں جنگلی جانوروں کا شکار نہ کرو، اسی طرح تم کو حکم دیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کو اپنی عبادت کا مقام یا علامت مقرر فرمادیا ہے ان کی بے احترامی کرنے کو اپنے لئے حلال نہ جانو، یہ مقام مسجدیں ہیں اور خانہ کعبہ کے اردگرد کی بہت سی جگہیں ہیں جہاں حج کے موقعہ پر جانا پڑتا ہے یا کوئی کام کرنا پڑتا ہے خاص کر چار حرمت والے مہینوں میں لڑائی اور گناہوں سے بچنے اور اچھے کام کرنے کی کوشش کریں، البتہ کوئی حملہ کرے تو اس سے ان مہینوں میں بھی لڑنا جائز ہے، یہ مہینے رجب، ذی قعدہ، ذی الحجہ اور محرم ہیں۔

قربانی کے جو جانور مکہ معظّمہ لے جائے جاتے ہیں اور کبھی کبھی ان کے گلے میں نشانی کے طور پر پٹہ یا کوئی ایسی چیز لٹکائی جاتی ہے ان جانوروں کا احترام بھی ضروری ہے کسی کو انہیں ستانا نہ چاہئے، اسی طرح جو لوگ حج کے ارادے سے خانہ کعبہ کی طرف روانہ ہو جائیں ان کی حفاظت اور ان کا احترام کرنا مسلمانوں پر فرض ہے کیونکہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کا فضل اور خوشنودی حاصل کرنے کیلئے جارہے ہیں۔

آگے ساری سورۃ میں یہودیوں اور عیسائیوں کا حال بتایا گیا ہے کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار

بندے بننے میں ناکام رہے، تم ان کی باتیں اختیار نہ کرنا ایسا نہ ہو کہ تم بھی نافرمانوں میں لکھے جاؤ۔

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ: سورۃ کی ابتداء عہد و پیمان کے پورا کرنے کے حکم سے ہوئی ہے، "سورۂ نساء" کی آخری آیت میں تھا کہ اے لوگو! اللہ تعالیٰ تمہارے لئے حکموں کو خوب کھول کھول کر بیان فرماتے ہیں تاکہ تم گمراہی سے بچ جاؤ، اب اس کے ساتھ ہی اس سورۃ میں فرمایا: اے لوگو! عہد و پیمان کو پورا کرو، دونوں آیتیں آپس میں اس طور پر جڑی ہوئی ہیں کہ پچھلی آیت میں جن چیزوں کے بارے میں فرمایا گیا تھا اللہ تعالیٰ واضح طور پر بیان فرماتے ہیں اس آیت سے ان کی تفصیل شروع ہو رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکموں کے پورا کرنے کے معاملہ میں اپنے عہد و پیمان کو لازماً پورا کرو اور یہ ایمان والوں سے خاص خطاب ہے کیونکہ وہ ہی سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کے حکموں کو پورا کرنے کے پابند ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور دوسرے مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ: عہد و پیمان میں ہر قسم کے عہد شامل ہیں، عہد و پیمان خواہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہو یا اس کے پیغمبر کے ساتھ، عبادت کا عہد ہو یا مخلوق کے ساتھ معاملات کا، اپنی جماعت کے ساتھ کوئی معاہدہ ہو یا کسی بیرونی جماعت کے ساتھ، عہد اپنی ملک کے لوگوں کے ساتھ ہو یا غیر ملکیوں کے ساتھ، ایمان کا تقاضہ یہ ہے کہ اسے ہر صورت میں پورا کیا جائے، "اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ" کا یہی مطلب ہے۔

اجتماعی زندگی میں ایک دوسرے کے ساتھ مختلف معاملوں میں اکثر عہد و پیمان ہوتے رہتے ہیں جن کا پورا کرنا نہایت ضروری ہے، عہد سے منہ پھیرنے والوں کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منافق قرار دیا ہے، یعنی: منافقوں کی ایک عادت یہ ہے کہ معاہدہ کر کے اس کو پورا نہیں کرتے بلکہ عہد توڑ ڈالتے ہیں، بہر حال عہد کے پورا کرنے میں دینی، دنیاوی، انفرادی، اجتماعی، ملکی، غیر ملکی ہر قسم کے عہد شامل ہیں جن کو پورا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

انسان کی ترقی کی سیڑھی اللہ تعالیٰ کے حکموں کی پابندی ہے اسی کے ذریعے انسان اعلیٰ مقام حاصل کرتا ہے، جنت کے مقام میں پہنچتا ہے شریعت کے خلاف کرنا گویا شیطان کی پیروی کرنا ہے جس کے متعلق

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ''شیطان کے پیچھے نہ چلو'' کیونکہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے، وہ تمہاری ہلاکت، ناکامی پر خوش ہوتا ہے، لہٰذا تم شیطان کی پیروی کرنے کے بجائے اللہ تعالیٰ کے حکموں کو پورا کرو۔

اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ: حلال وحرام کے حکموں کو اتار کر ان کی پابندی کا حکم دیا جارہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے چرنے والے جانور، چوپائے، مویشی حلال کیے ہیں، ''بَهِيْمَة'' ان چرنے والے جانوروں کو کہتے ہیں جو گھاس یا پتے وغیرہ کھاتے ہیں اور ''اَنْعَامِ'' وہ جانور ہوتے ہیں جو عام طور پر پالے جاتے ہیں، یہ چار قسم کے جانور ہیں اونٹ، گائے، بھیڑ اور بکری ان کو بعض شرطوں کے ساتھ ذبح کیا جائے تو ان کا گوشت کھانا حلال ہوجاتا ہے، جو چیز اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے حلال قرار دی ہے اسے کھاؤ پیؤ اور جو حرام کی ہے اس سے رک جاؤ یہی ''عہد کا پورا کرنا'' ہے۔

ان جانوروں کے علاوہ بعض دوسرے جانور بھی حلال جانوروں کی فہرست میں آتے ہیں، ان میں ہرن، گورخر اور شتر مرغ وغیرہ ہیں وہ بھی چوپائے ہیں اور گھاس چرتے ہیں، لہٰذا یہ بھی حلال جانور ہیں، بعض جانور مویشیوں کی طرح چوپائے ہیں مگر ان میں کسی نہ کسی طرح کی خرابی پائی جاتی ہے، جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کا گوشت انسانوں کیلئے حرام قرار دیدیا ہے، پالتو گدھا بھی انہی جانوروں میں سے ہے، گھاس چرتا ہے، چار پاؤں بھی رکھتا ہے مگر اس کا گوشت حرام ہے۔

اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ: اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے چوپائے حلال کیے ہیں سوائے ان چوپایوں کے جن کا ذکر آگے آیت نمبر ''۳'' میں اور اس سے آگے آئے گا، وہاں پر مختلف قسم کے حرام جانور اور حرام چیزوں کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، ان جانوروں کے علاوہ باقی مویشی تم پر حلال ہیں۔

غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ: جب حج یا عمرہ کا احرام باندھ لیا ہو تو پھر خشکی کا ہر قسم کا حلال شکار بھی حرام ہوجاتا ہے، یہ وقتی حرمت ہوتی ہے ہمیشہ کیلئے نہیں ہوتی، جونہی کوئی شخص احرام سے فارغ ہوجاتا ہے اور حرم کی حدود سے باہر آجاتا ہے اس سے شکار کی پابندی دور ہوجاتی ہے، احرام کی حالت میں نہ خود شکار

کرسکتا ہے اور نہ ہی شکار کا جانور ذبح کرسکتا ہے نہ ہی کسی کو شکار کے بارے میں اشارہ کرسکتا ہے کہ فلاں جگہ شکار چھپا ہوا ہے البتہ پانی کا شکار احرام کی حالت میں بھی کرسکتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ: اللہ تعالیٰ نے احرام کی حالت میں خشکی کے شکار کی ممانعت کردی ہے اور پانی کا شکار حلال قرار دیا ہے، یہ اس کا حکم ہے اور اسمیں کسی چوں و چرا کی گنجائش نہیں انسان کا کام صرف حکم کو پورا کرنا ہے، اس قسم کے حکموں میں ضرور کوئی مصلحت ہے جسے اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں، یہاں پر یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ مسلمان کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ ہر وقت حکموں کے وجہ کو تلاش کرنے میں لگا رہے بلکہ اسے اللہ تعالیٰ کے ہر حکم کے سامنے سر جھکا دینا چاہئے اگر چہ بہت سے علم والوں کو اللہ تعالیٰ نے وہ نعمت عطا فرمائی ہے کہ جس سے وہ کسی چیز کے حلال ہونے یا حرام ہونے کی وجہ کو بھی سمجھتے ہیں، تاہم یہ ہر شخص کیلئے ضروری بھی نہیں ہے، عام انسان کیلئے اللہ تعالیٰ کے ہر حکم کو پورا کرنا ضروری ہے اسی میں اس کی ترقی اور کامیابی کا راز پوشیدہ ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ: اس میں لفظ "شَعَآئِر" جس کا ترجمہ نشانیاں کیا گیا ہے "شَعِيْرَةٌ" کی جمع ہے جس کے معنی ہیں علامت، اسی لئے "شَعَآئِر" اور "شَعِيْرَةٌ" اس محسوس ہونے والی چیز کو کہا جاتا ہے جو کسی چیز کی علامت ہو، اسلام کے شعائر ان چیزوں کو کہا جائے گا جو عرفاً مسلمان ہونے کی علامت سمجھے جاتے ہیں اور محسوس ہوتے ہیں اور مشاہدے میں آتے ہیں، جیسے اذان، نماز، حج، ختنہ، اور سنت کے موافق داڑھی وغیرہ "شَعَآئِرَ اللّٰهِ" کی تفسیر اس آیت میں مختلف لفظوں سے بیان کی گئی ہے، بعض حضرات کے نزدیک "شَعَآئِرَ اللّٰه" سے مراد تمام حکم اور دین کے مقرر کردہ فرض و واجب اور ان کی حدود ہیں، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک، قرآن کریم، بیت اللہ، اور نماز ہیں، اسکے علاوہ اور چیزیں بھی "شَعَآئِرَ اللّٰهِ" ہیں جن کا تفصیلی ذکر تفسیر کی کتابوں میں موجود ہیں۔ جو شخص "شَعَآئِرَ اللّٰهِ" کی تعظیم کرے گا تو اس کا مطلب ہے کہ اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کا ڈر اور خوف موجود ہے، جو اللہ تعالیٰ سے نہیں ڈرتا اس سے "شَعَآئِرَ اللّٰهِ" کی تعظیم کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

وَ لَا الْهَدْيَ وَ لَا الْقَلَآئِدَ: عام قربانی کے جانوروں کو تو "اُضْحِيَة" کہا جاتا ہے مگر حج تمتع اور حج قران کرنے والے حاجی جو جانور حرم شریف کی طرف لے جاتے ہیں ان کو "هَدْيٌ" کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ بھی محترم ہیں ان کی بھی بے حرمتی نہ کرو، پھر یہ ہے کہ قربانی کے ایسے جانوروں کے گلے میں پٹہ یا ہار ڈال دیا جاتا تھا جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہوتا تھا کہ یہ حج کی قربانی کے جانور ہیں جو حرم شریف جا رہے ہیں لہٰذا راستے میں کوئی ان سے چھیڑ چھاڑ نہ کرے، جاہلیت کے زمانہ میں بھی عام طور پر ایسے جانوروں کا احترام کیا جاتا تھا۔

وَ لَآ آٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ: بیت اللہ شریف کی طرف ارادہ کر کے جانے والے لوگ بھی محترم ہیں، جو لوگ حج یا عمرہ کے ارادے سے سفر کر رہے ہیں ان سے کسی قسم کی چھیڑ چھاڑ یا لڑائی بھڑائی نہیں ہونی چاہیے، وہ اللہ تعالیٰ کے مہمان ہیں اور اس کے گھر کی طرف جا رہے ہیں ہو سکے تو ان کی خدمت کرو اگر ان کی خدمت نہیں کر سکتے تو کم از کم انہیں تکلیف نہ پہنچاؤ۔

اس قسم کے واقعوں کو روکنے کیلئے فرمایا کہ حج و عمرہ کے ارادہ سے حرم شریف جانے والے لوگوں کے ساتھ بھی کسی قسم کی چھڑ چھاڑ نہ کرو، ان کی بے حرمتی مت کرو بلکہ ان کا ادب و احترام کرو۔

زیادتی نہ کرو

وَ اِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا ؕ وَ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ

اور جب احرام کھول دو تم تو شکار کی اجازت ہے اور نہ آمادہ کرے تم کو دشمنی اس قوم کی کہ

صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا ۘ وَ تَعَاوَنُوْا عَلَى (وقف لازم)

روکا تم کو سے مسجد حرمت والی کہ تم زیادتی کرنے لگو اور ایک دوسرے کی مدد کرو پر

الْبِرِّ وَ التَّقْوٰى ۠ وَ لَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ ۠ وَ

نیکی اور برائیوں سے بچنے پر اور نہ مدد کرو ایک دوسرے کی پر گناہ اور زیادتی پر اور

اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝۲

ڈرتے رہو اللہ سے بیشک اللہ ہیں سخت عذاب والے (۲)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور جب احرام سے فارغ ہوجاؤ تو شکار کرسکتے ہو جس قوم نے تمہیں مسجد حرام سے روکا اس قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم بھی ان پر ظلم کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو بیشک اللہ کا عذاب سخت ہے۔(۲)

لفظی تحقیق: حَلَلْتُمْ: تم حلال ہوجاؤ۔ یعنی: احرام کھول دو اور احرام سے باہر آجاؤ۔ اِصْطَادُوْا: تم شکار کرو۔ یعنی: شکار تمہارے لئے جائز ہوجائے گا۔ اِعْتَدُوْا: "عُدْوَانْ" سے بنا ہے، جس کے معنی زیادتی کے ہیں۔ اِتَّقُوا: "تَقْوٰی" سے ہے، جس کے معنٰی ہیں: اللہ تعالٰی سے ڈرنا اور برائی سے بچنا، مطلب یہ ہے کہ برائی سے بچو۔

تفسیر

جب کوئی شخص حج یا عمرہ کی ادائیگی کیلئے احرام باندھ لیتا ہے تو اس پر بعض پابندیاں عائد ہوجاتی ہیں، مثلاً: مرد سلا ہوا کپڑا نہیں پہن سکتا، پورا جوتا اور جراب نہیں پہن سکتا، خوشبو استعمال نہیں کرسکتا، چہرہ نہیں ڈھانپ سکتا، بیوی سے ہمبستری نہیں کرسکتا، کسی سے لڑائی جھگڑا نہیں کرسکتا، خشکی کا شکار نہیں کرسکتا یہانتک کہ کسی جاندار کو تکلیف نہیں پہنچا سکتا، ان میں سے کچھ پابندیاں وقتی ہوتی ہیں جو احرام کھلنے کے ساتھ ختم ہوجاتی ہیں، پہلی آیت میں احرام کی حالت میں شکار پر پابندی کا ذکر تھا، یہاں اس کے متعلق فرمایا کہ: جب تم حلال ہوجاؤ، یعنی: احرام کھول دو تو تمہیں شکار کرنے کی اجازت ہے جو کہ احرام کی حالت میں منع تھا۔

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا: اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام مسلمانوں کو دوسروں کے ساتھ برتاؤ کرنے کا کتنا اچھا طریقہ سکھاتا ہے، آیت

کے پہلے حصہ میں تھا کہ حج کے مہینوں کا احترام کرو، جو لوگ حج کیلئے یا کعبہ کی زیارت کیلئے آئیں ان کو نہ روکو اور نہ ستاؤ، ان کے قربانی کے جانوروں کی حفاظت کرو، مکہ کے لوگ بھی ان باتوں کو مانتے تھے لیکن مسلمانوں سے دشمنی میں اتنے سخت تھے کہ جب وہ مدینہ منورہ سے عمرہ کیلئے مکہ معظّمہ آئے تو کافروں نے ان سب باتوں کا کوئی خیال نہیں کیا اور مسلمانوں کو مکہ معظمہ میں داخل ہونے سے روک دیا، ایسے موقع پر مسلمانوں کا جوش میں آ جانا معمولی بات تھی اس لئے پہلے ان باتوں کا ذکر کر دیا جنہیں حج یا عمرہ ادا کرنے کیلئے ضروری قرار دیا گیا ہے تا کہ مسلمان ان باتوں کا خیال رکھیں۔

مکہ مکرمہ کے فتح ہونے کے بعد مسلمانوں کو قوت حاصل ہوگئی تھی اس لئے ایسا حکم دیا گیا کہ اب جبکہ مسلمانوں کو قوت حاصل ہوگئی ہے تو ایسا نہیں ہونا چاہئے کہ پچھلے واقعہ کے غم وغصہ اور دلی دشمنی کا انتقام اس طرح لیا جائے کہ تم ان کو بیت اللہ اور مسجد حرام میں داخل ہونے اور حج وغیرہ ادا کرنے سے روکنے لگو کیونکہ ایسا کرنا ظلم ہوگا اور اسلام ظلم کا بدلہ ظلم سے لینے کا سبق نہیں سکھاتا، بلکہ ظلم کے بدلہ میں انصاف کرنا اور انصاف پر قائم رہنا اور معاف کرنا سکھاتا ہے، قرآن کریم کی تعلیم یہ ہے کہ عدل وانصاف میں دوست ودشمن سب برابر ہونے چاہئیں، تمہارا دشمن کیسا ہی سخت ہو اور اس نے تمہیں کیسی ہی تکلیف پہنچائی ہو اس کے معاملہ بھی انصاف کرنا تمہارا فرض ہے، یہ اسلام ہی کی خصوصیت ہے کہ وہ دشمنوں کے حقوق کی پامالی سے روکتا ہے، اور ان کے ظلم کا جواب ظلم سے نہیں بلکہ انصاف سے دینا سکھاتا ہے۔

معاشرتی اصول

شروع سے یہاں تک کی آیتوں میں مسلمانوں کو کئی فائدہ مند حکم دیے گئے ہیں جن میں بعض خاص موقعوں کیلئے ہیں اور بعض عام ہیں، عام حکموں میں سے دو حکم بہت زیادہ مسلمانوں کی توجہ کے قابل ہیں اگر ان پر عمل کرلیا جائے تو ہماری سوسائٹی کی تمام خرابیاں دور ہوسکتی ہیں اگر شروع کی طرح بعد میں بھی ان پر عمل جاری

رہتا تو سوسائٹی کی کوئی خرابی ہمارے اندر پیدا ہی نہیں ہوسکتی تھی، لیکن افسوس ہے کہ ہم نے اس سے غفلت برتی اور اس کا نتیجہ جو ہوا ہماری آنکھوں کے سامنے ہے، وہ دو حکم یہ ہیں:

(۱)......تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰى۔

(۲)......وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ۔

''تعاون اور عدم تعاون'' (مدد کرنے اور مدد نہ کرنے) کا جو مطلب قرآن کریم سے سمجھ آتا ہے وہ یہ ہے کہ'' تعاون'' کے معنٰی ہیں آپس میں ایک دوسرے کی مدد کرنا اور ''عدم تعاون'' کا مطلب ہے مدد نہ کرنا اور منہ موڑ لینا، اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ ''مدد'' کن چیزوں میں ہونی چاہئے؟ اور ان دو جملوں میں مکمل فیصلہ کردیا گیا ہے جس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں، یعنی نیکی اور تقویٰ (پرہیزگاری) پھیلانے کیلئے مدد کرو اور گناہ و ظلم روکنے کیلئے مدد نہ کرو، اگر اس کو دوسری طرح کہا جائے تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ اچھے آدمیوں کی ان کے اچھے کاموں میں مدد کرو اور برے آدمیوں کی برے کاموں میں مدد نہ کرو۔

مدد کرنے کی صورت یہ ہے کہ سب آدمی جمع ہوکر پکا ارادہ کرلیں کہ جو شخص لوگوں کے فائدے کا کام کرے گا اور گناہوں سے بچے گا اس کی ہم سب مل کر مدد کریں گے اور مدد نہ کرنے کی صورت یہ ہے کہ سب مل کر فیصلہ کریں کہ جو گناہ کرے گا اور کمزوروں کو دبائے گا اس کی ہم مدد نہیں کریں گے بلکہ ممکن ہوا تو اسے برائی سے روکیں گے، ایسا انتظام کرلینے سے ممکن نہیں کہ کوئی شخص گناہ کرسکے یا کمزوروں کو دبا کر اپنا مطلب نکال سکے۔

بِرّ: نیکی وتقویٰ پر مدد کرنے کیلئے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: جو شخص کسی کو نیکی کا راستہ بتادے تو اس کا ثواب ایسا ہی ہے جیسے اس نیکی کو اس نے خود کیا ہو، صحیح بخاری میں ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: جو شخص لوگوں کو ہدایت اور نیکی کی طرف دعوت دے تو جتنے آدمی اس کی دعوت پر نیک عمل کریں گے ان سب کے برابر اس کو بھی ثواب ملے گا بغیر اس کے کہ ان لوگوں کے ثواب میں کچھ کمی کی جائے اور جس شخص نے لوگوں کو کسی گمراہی یا گناہ کی طرف بلایا تو جتنے لوگ اس کے بلانے سے گناہ میں مبتلا ہوئے ان سب کے گناہوں کے برابر اس کو بھی

گناہ ہوگا بغیر اس کے کہ ان کے گناہوں میں کچھ کمی کی جائے، پیغمبر ﷺ نے فرمایا کہ: جو شخص کسی ظالم کے ساتھ اس کی مدد کیلئے چلا وہ اسلام سے نکل گیا، پیغمبر ﷺ نے فرمایا کہ: قیامت کے روز آواز دی جائے گی کہ ظالم لوگ اور ان کے مددگار کہاں ہیں یہاں تک کہ وہ لوگ جنہوں نے ظالموں کے دوات، قلم کو درست کیا ہوگا وہ سب بھی ایک لوہے کے تابوت میں جمع کر کے دوزخ میں پھینک دیئے جائیں گے۔

وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ: اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، اللہ تعالیٰ نے عہد کے پورا کرنے کا حکم دیا ہے تو اسے پورا کرو، اگر اس کے حکم کی خلاف ورزی کرو گے تو یاد رکھو! اللہ تعالیٰ سخت عذاب دینے والے ہیں، جب وہ مجرموں کو اپنی پکڑ میں لیں گے تو پھر ان کو نہیں چھوڑیں گے، اللہ تعالیٰ کی پکڑ بڑی سخت ہے، جو شخص اللہ تعالیٰ کے حکموں کی خلاف ورزی کرتا ہے، حلال و حرام سے بے نیاز ہے، شعائر اللہ کی بے حرمتی کرتا ہے، برائی میں تعاون کرنے والا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے نہیں بچ سکتا، اسی لئے فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ سے ڈر جاؤ۔

حرام چیزوں کا ذکر

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ

حرام کر دیا گیا پر تم مردہ جانور اور خون اور گوشت سور کا اور وہ جو کہ پکارا جائے

لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوْذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيْحَةُ

سوا کسی اور کے اللہ کا پر اس اور گلا گھونٹا ہوا اور چوٹ سے مرا ہوا اور اوپر سے گر کر مرا ہوا اور سینگ لگ کر مرا ہوا

وَمَآ اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ ۟ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ

اور جس کو کھایا درندے نے مگر جو ذبح کر لیا تم نے اور جو ذبح کیا گیا اوپر آستانوں کے

وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ ؕ ذٰلِكُمْ فِسْقٌ ؕ

اور یہ کہ بانٹو تم ساتھ جوئے کے تیروں کے یہ گناہ ہے

بامحاورہ ترجمہ: تم پر حرام کیا گیا ہے مردہ جانور اور خون اور خنزیر کا گوشت اور جس جانور پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا جائے اور جو مر گیا ہو گلا گھٹنے سے یا چوٹ سے یا اونچائی سے گر کر یا سینگ لگنے سے اور جس کو کھایا ہو درندے نے مگر جس کو تم نے ذبح کرلیا (وہ حرام نہیں) اور وہ جانور بھی حرام ہے جو کسی آستانے پر ذبح کیا گیا ہو، اور یہ کہ تقسیم کرو جوئے کے تیروں سے یہ گناہ کا کام ہے۔

تفسیر

حُرِّمَتْ: حرام کیا گیا، اس کا مصدر "تَحْرِیْم" ہے جو کہ "حَرَامٌ" سے بنا ہے، جس کے معنی ہیں وہ چیز جس سے بچنا چاہئے، نہ بچنا تعظیم اور عزت کے خیال سے بھی ہوتا ہے اور استعمال کرنے سے رُکنا بھی ہوتا ہے، یہاں یہی مراد ہے کہ جن چیزوں کا کھانا اس آیت میں حرام کیا گیا ہے ان کو نہ کھاؤ،

وہ چیزیں یہ ہیں:

(۱)..... **مَیْتَةٌ:** مردار جانور۔ وہ جانور جس کی جان ذبح کرنے سے نہیں بلکہ خود بخود نکل گئی ہو اس کا گوشت کھانا جائز نہیں، البتہ حدیث شریف میں ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دو چیزوں کو اس سے مستثنیٰ فرمایا ہے: ایک مچھلی دوسرے ٹڈی۔

(۲)..... بدن سے بہہ کر نکلنے والا خون، خواہ ذبح کرنے سے نکلا ہو یا کسی اور وجہ سے، یہ خون ناپاک ہے اور اس کا کھانا حرام ہے، "سورۂ انعام" میں اسے "دَمًا مَّسْفُوْحًا" کہا گیا ہے، یعنی: بہتا ہوا خون جسے جسم سے نکال دیا جائے، حلال جانوروں کو ذبح کرتے وقت یا ان کے جسم میں زخم لگانے سے جو خون نکلتا ہے وہ "دَمٌ مَّسْفُوْحٌ" (بہتا ہوا خون) ہے جو کہ حرام بھی ہے اور ناپاک بھی ہے، (حلال جانور اس لئے کہا گیا کیونکہ حرام جانور تو ویسے بھی شرعاً حرام ہے، شرعی طریقہ کے مطابق ذبح کرنے سے بھی حلال نہ ہوگا) جانور کو شرعی طریقہ سے

ذبح کر کے اس کا خون بہا دینا ضروری ہے تاکہ گوشت پاک اور حلال ہو جائے، البتہ ذبح کرنے کے بعد جو تھوڑا بہت خون گوشت کے ساتھ رہ جاتا ہے وہ حرام نہیں ہے اسے اگر بغیر صاف کیے پکا لیا جائے تو اس کا کھانا درست ہے تاہم صفائی و ستھرائی کے تقاضہ کے تحت اس خون کو بھی صاف کر لیا جائے تو بہتر ہے، بہرحال اللہ تعالیٰ نے بہتے ہوئے خون کو حرام قرار دیا ہے، مزید یہ کہ دو قسم کا خون حلال ہے ایک کلیجی دوسرے تلی۔

(۳)…. خنزیر کا گوشت ناپاک ہے اور اس کا کھانا حرام ہے، خنزیر کے گوشت کا ذکر اس کے عام استعمال کی بناء پر کیا گیا ہے وگرنہ اس کے جسم کا ہر حصہ حرام اور ناپاک ہے، ''سورۂ انعام'' میں سور کو ''رِجْسٌ'' (گندگی) کہا گیا ہے، یہ بالکل ناپاک ہے، لہٰذا اس کی ہڈیاں، بال، چربی اور تھوک وغیرہ ہر چیز حرام ہے۔

(۴)…. وہ جانور جس کو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کا نام لے کر ذبح کیا گیا ہو تو وہ جانور باوجود ذبح کے اور خون کے بہا دینے کے حرام ہے، ''اِهْلَالٌ'' کا معنی ہے آواز کو بلند کرنا مقصد یہ ہے کہ جس جانور کو غیر اللہ کے نام پر پکارا گیا ہو، نامزد کیا گیا ہو وہ حرام ہے، مثلاً: یوں کہا جائے کہ یہ جانور یا یہ چیز فلاں بت یا فلاں قبر یا فلاں بزرگ کی نیاز ہے تو وہ چیز حرام ہو جائے گی اور غیر اللہ کی نیاز دینے سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ وہ بزرگ ہم سے راضی ہو کر ہماری مرادیں پوری کریں گے یا کم از کم اللہ تعالیٰ کے ہاں ہماری سفارش ہی کر دیں گے، یہ شرکیہ عقیدے ہیں، لہٰذا غیر اللہ کے نام پر پکارے جانے والی چیز کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے ''وَ مَاۤ اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰهِ بِهٖ'' کا مطلب یہ ہے کہ جس جانور کو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کے نام پر پکارا جائے وہ حرام ہے اگرچہ ذبح کے وقت اللہ تعالیٰ کا نام ہی کیوں نہ لیا گیا ہو، جب وہ غیر اللہ کی طرف منسوب ہو گیا کہ، مثلاً: یہ فلاں پیر یا بزرگ کا بکرا ہے تو وہ ''بِسْمِ اللّٰهِ'' کہہ کر ذبح کرنے سے بھی حلال نہیں ہوگا۔

(۵)…. ''مُنْخَنِقَةٌ، مَوْقُوْذَةٌ، مُتَرَدِّیَةٌ، نَطِیْحَةٌ'' حرام ہیں، ان کے معنیٰ ترجمہ کے ساتھ اوپر دے دیئے گئے ہیں، یہ جانور وہ ہیں جو ذبح نہیں کئے گئے ہیں اور چوٹ وغیرہ لگ کر یا اوپر سے گر کر مرے ہیں، یہ سب ''مَیْتَةٌ'' ''مردار'' میں داخل ہیں لیکن چونکہ عرب میں ان کے کھانے کا عام رواج تھا اس لئے ان کو الگ

الگ نام لے کر بیان کیا گیا۔

(۶)…. درندے کا کھایا ہوا جانور حرام ہے، لیکن اگر اس میں کچھ جان تھی اور تم نے اسے ذبح کرلیا تو اس کو کھانا جائز ہے۔

(۷)…. جو جانور آستانوں پر ذبح کئے جائیں تو وہ اگرچہ اللہ تعالیٰ کا نام لے کر ذبح کئے جائیں، پھر بھی حرام ہے، آستانہ وہ جگہ ہے جہاں کوئی بت بنا کر کھڑا کردیا ہو اور اس کی تعظیم کی جاتی ہو، اس جگہ جانور ذبح کرنے کا عرب میں عام رواج تھا اور اس سے مطلب بت کا حق ادا کرنا ہوتا تھا لیکن چونکہ ذبح کا یہ ایک خاص طریقہ تھا اس لئے اس کا ذکر الگ سے کردیا گیا۔

(۸)…. سب سے آخر میں جوئے کی ایک خاص شکل سے جو عرب میں رائج تھی منع کیا گیا ہے، عرب کے لوگ مل کر جانور ذبح کرلیتے اور پھر اس کے گوشت کے حصے بنا کر رکھ دیتے اور ان حصوں کو تیروں کے ذریعے بانٹتے، ہر تیر پر ایک ہندسہ لکھا ہوتا، لیکن کچھ تیر خالی بھی ہوتے، ہر شخص جاتا اور تھیلے میں سے ایک تیر نکال لاتا اور اس تیر کے ہندسے کے مطابق اسے حصے مل جاتے اور جو خالی تیر لاتے وہ محروم رہتے بلکہ ان کو سارے جانور کی قیمت ادا کرنی پڑتی اور جو شخص اس طرح کا جوا نہیں کھیلتا تھا اسے برا اور کنجوس خیال کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے اسے خالص جوا قرار دے کر اسے حرام قرار دیا۔

ان قسموں کے حرام ہونے کو بیان کرنے کے بعد ایک استثناء ذکر کیا گیا "اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ" یعنی: اگر ان جانوروں میں سے تم نے کسی کو زندہ پالیا اور ذبح کرلیا تو وہ حلال ہوگیا، اس کا کھانا جائز ہے، یہ استثناء شروع کی چار قسموں سے متعلق نہیں ہوسکتا، کیونکہ مردار اور خون میں تو اس کا امکان ہی نہیں اور خنزیر اور غیر اللہ کیلئے ذبح کئے ہوئے جانور ہر حال میں حرام ہیں، ذبح کرنا نہ کرنا ان میں برابر ہے، اسی لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ، حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ وغیرہم کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ استثناء ابتدائی چار کے بعد "مُنْخَنِقَةُ، مَوْقُوْذَةُ، مُتَرَدِّيَةُ، نَطِيْحَةُ" سے متعلق ہے اس لئے مطلب اس کا یہ ہوگیا کہ ان

تمام صورتوں میں اگر جانور زندہ پایا گیا، زندگی کی علامتیں محسوس کی گئیں اور اسی حالت میں اس کو اللہ تعالیٰ کے نام پر ذبح کر دیا گیا تو وہ حلال ہے۔

دین مکمل ہوگیا

اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَ

آج مایوس ہو گئے وہ جو کافر ہوئے سے دین تمہارے پس نہ ڈرو ان سے اور

اخْشَوْنِ ؕ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ

ڈرو مجھ سے آج پورا کر چکا میں لئے تمہارے دین تمہارا کو اور پورا کر دیا میں نے پر تم

نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ؕ فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ

نعمتوں اپنی کو اور پسند کیا لئے تمہارے اسلام کو دین پس جو لاچار ہو جائے میں

مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ③

بھوک نہ جھکنے والا طرف گناہ کے پس تحقیق اللہ ہیں بخشنے والے مہربان (۳)

با محاورہ ترجمہ: آج کافر تمہارے دین سے ناامید ہو گئے سو ان سے مت ڈرو اور مجھ سے ڈرو آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارا دین پورا کر دیا اور میں نے تم پر اپنا احسان پورا کر دیا اور میں نے تمہارے لئے اسلام کو دین کے طور پر پسند کیا، پھر جو کوئی لاچار ہو جائے بھوک میں لیکن گناہ پر مائل نہ ہو تو اللہ بخشنے والے مہربان ہیں۔ (۳)

لفظی تحقیق: يَئِسَ: مایوس ہو گئے۔ "يَاْس" سے ہے، جس کے معنیٰ: ناامیدی اور مایوسی کے ہیں، مراد یہ ہے کہ اب انہیں امید نہیں رہی کہ مسلمان اپنا دین چھوڑ کر ان کے دین میں واپس آجائیں گے۔ لَا تَخْشَوْهُمْ: ان سے مت ڈرو۔ یہ "خَشْيَة" سے بنا ہے، جس کے معنیٰ ڈر، خوف، ہیبت کے ہیں، اسی سے

''وَاخْشَوْن'' بنا ہے، جس کے معنی ہیں: مجھ سے ڈرو۔ اُضْطُرَّ: مضطر ہو جائے۔ ''اِضْطِرَار'' سے ہے، جس کے معنی ہیں: بے بس ہو جانا، کسی چیز کے کرنے کی اٹل ضرورت آ پڑنے کو ''اِضْطِرَار'' کہتے ہیں۔ مَخْمَصَةٍ: فاقہ۔ مُتَجَانِفٍ: مائل ہونے والا، جھکنے والا۔ ''جَنَف'' سے ہے، جس کے معنیٰ مائل ہونے اور جھکنے کے ہیں۔

تفسیر

اس آیت میں ارشاد ہے کہ کافروں کو امید تھی کہ مسلمان یہ دیکھ کر کہ ان کو سخت کام کرنے پڑ رہے ہیں، بہت سی کھانے پینے کی چیزوں سے جن کی انہیں عادت تھی روک دیا گیا ہے اور عبادت اور جہاد کا حکم دیا گیا ہے، اسلام کو چھوڑ کر پھر اپنا پرانا دین اختیار کر لیں گے اور ہم جیسے ہو جائیں گے، آج ان کی یہ آس ٹوٹ گئی۔

مسلمان اس وقت بڑے اطمینان کی زندگی بسر کر رہے تھے، مکہ مکرمہ فتح ہو چکا تھا، سارا عرب اسلام قبول کر چکا تھا، دین کا ماننا بہت آسان ہو گیا تھا، ہر کام کے حکم مقرر ہو چکے تھے اس لئے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری حج کے موقعہ پر عرفات کے میدان میں صاف صاف اعلان کر دیا کہ آج کافر اس سے ناامید ہو گئے کہ وہ مسلمانوں کو پھر بہکا کر کافر بنا لیں گے، مسلمان اب ان کا خوف بالکل دل سے نکال دیں اور سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی سے نہ ڈریں، مسلمانوں کو ارشاد ہے کہ آج میں نے تمہارا دین مکمل کر دیا اور اپنی پوری پوری نعمت تمہارے اوپر اتاری اب تمہارا دین اسلام ہے اس میں تمہاری ہر مشکل کا حل اور ہر موقع کے مناسب ہدایت موجود ہے۔

اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ: جب ۸ھ میں مکہ مکرمہ بھی فتح ہو گیا جس سے قریش کی رہی سہی قوت بھی ختم ہو گئی اب صرف حنین والوں میں کچھ سکت باقی تھی، فتح مکہ کے بعد انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اب بھی موقع ہے کہ کسی طرح مسلمانوں کا راستہ روک دیا جائے ورنہ ہم ہمیشہ کیلئے ختم ہو جائیں گے، انہوں نے آخری کوشش کی اور درید بن الصمہ نے چوبیس ہزار کے قریب فوج جمع کی، دوسرے جنگی ساز و سامان بھی اکٹھا کیا اور مسلمانوں سے ٹکرا گئے مگر انہیں بھی شکست ہوئی اور پورے عرب میں مسلمانوں کو کسی طرف سے خطرہ باقی نہ رہا۔

اس پس منظر میں ۱۰ھ میں عرفہ کے دن آیت کا یہ حصہ اترا، جس میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو خوشخبری سنائی کہ اب کافر تمہارے دین سے مکمل طور پر مایوس ہو چکے ہیں، اب اسلام کے خلاف ان میں کوئی دم خم باقی نہیں رہا اور اسلام غالب آ چکا ہے، ایک موقع پر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: عرب کے خطہ میں شیطان اس بات سے مایوس ہو گیا ہے کہ نمازی اب اسکی پوجا کرنے لگیں، البتہ شیطان آپس کی لڑائی بھڑائی میں ضرور کامیاب ہوگا، مقصد یہ کہ اب زمین کے اس خطہ میں کفر اور شرک کا خاتمہ ہو چکا ہے البتہ مسلمانوں کا آپس میں لڑائی جھگڑا ہوتا رہے گا، بہر حال فرمایا کہ: اب کافر لوگ مکمل طور پر مایوس ہو گئے ہیں کہ وہ مسلمانوں کو دوبارہ کفر کی طرف لا سکیں گے۔

آیت کا یہ حصہ "وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا" تک ۱۰ھ بتاریخ ۹ ذی الحجہ کو جمعہ کے دن عرفات کے میدان میں اترا، اس دن پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم مسجد نمرہ میں ظہر کی نماز ادا کرنے کے فوراً بعد عصر کی نماز ادا کی، یعنی: عصر کی نماز کو بھی ظہر کے وقت میں ادا فرمایا، اس کے بعد جبلِ رحمت پر اونٹنی پر سوار ہو کر وقوفِ عرفہ فرما رہے تھے کہ آیت کا یہ دوسرا حصہ اترا، مختلف روایتوں کے مطابق اس دن ایک لاکھ چودہ ہزار، ایک لاکھ چوبیس ہزار، ایک لاکھ تیس ہزار، ایک لاکھ چالیس ہزار یا ڈیڑھ لاکھ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میدانِ عرفات میں موجود تھے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین دعائیں کر رہے تھے کہ آیت کا یہ حصہ اترا، اس کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اکیاسی (۸۱) دن تک اس دنیا میں رہے، جب یہ آیت اتری تو عام مسلمان اس کو سن کر خوش ہو رہے تھے مگر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ رو رہے تھے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے رونے کی وجہ دریافت فرمائی تو عرض کیا کہ اس آیت سے اس کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ اب آپ کا اس دنیا میں رہنا بہت کم ہے کیونکہ دین کے مکمل کرنے کے ساتھ ساتھ پیغمبروں کے بھیجنے کی ضرورت بھی پوری ہو چکی اس پر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی بات کی تصدیق فرمائی۔

اس دوران فرض یا حکم کے متعلق مزید کوئی آیت نہیں اتری، بلکہ اس لحاظ سے یہ آخری آیت شریف تھی

البتہ اس آیت کے بعد"سورۂ بقرہ" کی صرف یہ آیت نازل ہوئی "﴿وَ اتَّقُوْا یَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِیْهِ اِلَی اللّٰهِ ثُمَّ تُوَفّٰی كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَ هُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ﴾ [البقرة:۲۸۱]" اس میں مسلمانوں کو ان کی ذمہ داریوں کا احساس دلایا گیا ہے کہ قیامت کے دن سے ڈرو، اس دن ہر ایک کو پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور کسی کے ساتھ زیادتی نہیں ہوگی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خلافت کے زمانہ میں ایک یہودی نے آپ سے کہا کہ یہ آیت جس میں دین کے مکمل ہونے کی خبر دی گئی ہے اتنی بڑی آیت ہے کہ اگر یہ ہم پر اترتی ہم اس کے اترنے کے دن کو عید کا دن مناتے اور اس پر خوشی کا اظہار کرتے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تمہیں کیا پتہ ہے جس دن یہ آیت اتری، اس دن ہماری دو عیدیں تھیں ایک جمعہ تھا اور دوسرے عرفہ کا دن، یہ دونوں دن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کی قبولیت کے دن ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی بات میں اس بات کی طرف بھی اشارہ فرمادیا کہ اسلام میں دن منانے کی کوئی حیثیت نہیں، یہودی، عیسائی، ہندو وغیرہ اپنے اپنے دن مناتے ہیں مگر اسلام نے ایسا حکم نہیں دیا، دین کے مکمل ہونے کا دن بلاشبہ مسلمانوں کیلئے خوشی کا دن ہے، جمعہ تو ویسے ہی ہفتہ کے دنوں کا سردار ہے اور عرفہ کا دن بھی سال میں سب سے زیادہ قبولیت کا دن ہے، اس دن اللہ تعالیٰ کی رحمت بارش کی طرح برستی ہے، اور اسی دن شیطان سب سے زیادہ ذلیل ہوتا ہے مگر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم، آپ کے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین، تابعین کرام، تبع تابعین، اور سلف صالحین میں سے کسی نے کوئی دن نہیں منایا، بہرحال اپنی طرف سے کوئی دن منانا تو کوئی حیثیت نہیں رکھتا البتہ جو دن پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے منائے ہیں وہ دن منانا درست ہے، جیسے: "عید اور بقر عید" وغیرہ۔

فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَ اخْشَوْنِ: ایمان والوں کو ترغیب دی جارہی ہے کہ وہ اپنے دین پر قائم رہیں اور اس کے حکموں کو بلا خوف وخطر دوسروں تک پہنچائیں، ویسے بھی ہر دور میں مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ پورے

اطمینان کے ساتھ اپنے دین پر عمل کرتے رہے اور اس سلسلے میں غیروں کی کسی بات کو خاطر میں نہ لائے، بتوں کی پوجا کرنے والے لوگ آپ کو طعنے دیں گے، شک وشبہ کا اظہار کریں گے، طرح طرح کے اعتراضات اٹھائیں گے مگر آپ ان کی ذرا بھی پرواہ نہ کریں اور اپنے دین پر ڈٹے رہیں، ان کی تو ہمیشہ سے یہی خواہش رہی ہے کہ اسلام اور اسلام والے ہم سے ہمیشہ دبے رہیں، یہودیوں اور عیسائیوں کے متعلق تو واضح طور پر آچکا ہے کہ وہ تم پر ہرگز راضی نہ ہوں گے جب تک کہ آپ ان کی ملت (دین) کی پیروی نہ کریں، کافر بھی تمہیں پلٹا کر کفر کی طرف لے جانا چاہتے ہیں مگر تمہیں جرأت کے ساتھ اپنے دین پر عمل کرنا ہوگا۔

فضول رسموں کو صرف غیروں کی دیکھا دیکھی میں اختیار نہیں کرنا چاہئے، یہ نہیں سوچنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کے حکموں پر عمل کرنے سے وہ کیا کہیں گے، ان کا خوف دل سے نکال دینا چاہئے اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے ڈرنا چاہئے۔

وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ: اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمت پوری کردی، یعنی دین کے تمام حکم بیان فرمادیئے ہیں اب کسی بھی چیز کی کمی باقی نہیں رہی ہے، اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ نعمت سے مراد غلبہ بھی ہوسکتا ہے یعنی: اسلام اور مسلمانوں کو غلبہ بھی عطا فرمادیا ہے تاکہ یہ دین تمام جہان کے دینوں پر غالب آجائے۔

وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا: قرآن کریم میں ایک دوسرے مقام پر موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ دین صرف اسلام ہے اور یہی اس نے تمہارے لئے پسند فرمایا ہے۔

فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ: اسی آیت کے پہلے حصہ میں حلال وحرام کا حکم بیان ہوا تھا اور بعض حرام جانوروں کی تفصیل بتائی گئی تھی اب اسی سلسلہ کو جاری رکھتے ہوئے ارشاد ہے کہ جو کوئی فاقہ کی وجہ سے مجبور ہوجائے بشرطیکہ گناہ کی طرف مائل ہونے والا نہ ہو (یعنی: اس کا مقصد فاقہ کو دور کرنا اور موت سے بچنا ہو لذت لینا اور پیٹ بھرنا مقصد نہ ہو) اس کو اجازت ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی حرام کی ہوئی چیزوں میں سے ضرورت کے مطابق کھا پی سکتا ہے مطلب یہ کہ جان بچانے کیلئے اگر مردار، خنزیر یا شراب ہی

ملے ہے تو پھر اس کی کم از کم مقدار استعمال کر سکتا ہے، یعنی: اگر کم استعمال سے جان بچ سکتی ہے تو پھر پیٹ بھر کر کھانا جائز نہیں۔

فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ: اللہ تعالیٰ بخشنے والے اور مہربان ہیں، وہ چھوٹی موٹی غلطیوں کو معاف فرما دیں گے تاہم قانون اور ضابطہ کی وضاحت فرمادی کہ یہ یہ چیزیں حلال ہیں اور فلاں فلاں چیزیں حرام ہیں۔

حلال کی تفصیل

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ ؕ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۙ وَ

پوچھتے ہیں آپ سے　کیا ہے　جو　حلال کیا گیا　کیلئے ان　کہہ دیجئے　حلال کی گئیں　لئے تمہارے　پاکیزہ چیزیں　اور

مَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ

جو　سدھاؤ تم　سے　شکاری جانور　دوڑنے کیلئے شکار پر　سکھا کر ان کو　اس میں سے جو　سکھایا تم کو

اللّٰهُ ۫ فَكُلُوْا مِمَّآ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ ۪

اللہ نے　پس کھاؤ　اس سے جو　پکڑیں وہ　لئے تمہارے　اور　یاد کرو　نام　اللہ کا　پر اس

وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝۴

اور　ڈرتے رہو　اللہ سے　بیشک　اللہ ہیں　جلد لینے والے　حساب　(۴)

بامحاورہ ترجمہ: آپ سے پوچھتے ہیں کہ ان کیلئے کون کون سی چیزیں حلال ہیں، کہہ دیجئے تمہارے لئے سب پاک چیزیں حلال ہیں اور وہ (شکار) بھی حلال ہے جو تمہارے لئے ان شکاری جانوروں نے پکڑا ہو اور جس طریقہ سے اللہ نے تمہیں (شکار کرنا) سکھایا ہے (اسی طریقہ سے) تم نے ان کو سکھایا ہو تو جو شکار وہ تمہارے لئے پکڑ رکھیں اس کو کھالیا کرو (اور شکاری جانوروں کو چھوڑتے وقت) اللہ کا نام لیا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ (۴)

لفظی تحقیق: جَوَارِحِ: شکاری جانور۔ "جَارِحَةٌ" کی جمع ہے، وہ جانور جو جھپٹ کر شکار کو دبوچ لیتا ہے۔ مُكَلِّبِيْنَ: شکار پر دوڑنا۔ "تَكْلِيْبٌ" سے ہے، جس کے معنی ہیں: شکاری جانور کو شکار دکھا کر اس کے اوپر چھوڑ دینا۔ تُعَلِّمُوْنَ: تم سدھاتے ہو۔ "تَكْلِيْبٌ" سے ہے، جس سے یہاں مراد شکاری جانور کو شکار پکڑنے کیلئے سدھانا ہے۔

تفسیر

سورۃ کی ابتداء میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مویشیوں کو ہمارے لئے حلال قرار دیا ہے بشرطیکہ ان کو صحیح طریقہ سے ذبح کیا جائے مگر شکار کا مسئلہ بھی ابھی تک حل نہیں ہوا تھا جس کے متعلق صحابہ کرام میں کئی سوال پیدا ہوتے تھے، چنانچہ حضرت ابو ثعلبہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے شکار کے متعلق پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا، جس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتار کر شکار کی حلال صورت کا ذکر فرما دیا، یاد رہے! حاتم طائی بڑا مشہور و معروف سخی آدمی گزرا ہے اس کی موت تو عیسائیت پر آئی، تاہم اس کے بیٹے حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ اور بیٹی کو اللہ تعالیٰ نے ایمان کی دولت نصیب فرمائی، حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کی روایت میں آتا ہے کہ انہوں نے یہ مسئلہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خود دریافت فرمایا تھا۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ ۭ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ: "طَيِّبَات" (پاکیزہ چیز) میں دو قسم کی چیزیں آتی ہیں، پاکیزہ چیزوں کی پہلی قسم تو وہ ہے جو "مُحَرَّمَات" (حرام چیز) کے مقابلے میں آتی ہیں، یعنی: اللہ تعالیٰ کی کتاب، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت نے جن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے ان کے علاوہ باقی تمام چیزیں حلال ہیں اور "طَيِّبَات" میں آتی ہیں، "طَيِّبَات" کی دوسری قسم میں وہ چیزیں آتی ہیں جو انسانی فطرت اور مزاج میں بری نہ سمجھی جائیں، ظاہر ہے کہ جس چیز کو طبیعت پسند نہ کرے وہ کیسے استعمال کے قابل ہو سکتی ہے؟ "سورۂ اعراف" میں اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کی یہ صفت بھی بیان فرمائی ہے کہ: اللہ تعالیٰ کے وہ پیغمبر جس کا ذکر

پچھلی کتابوں "تورات وانجیل" میں موجود ہے، وہ نیکی کا حکم کرتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں، ان کیلئے پاکیزہ چیزیں حلال قرار دیتے ہیں اور بری چیزوں کو حرام قرار دیتے ہیں، مقصد یہ کہ جو چیزیں انسانی طبیعت کے مطابق صاف ستھری ہیں وہ حلال ہیں، اور جو چیزیں انسانی فطرت سے مطابقت نہیں رکھتیں وہ حرام ہیں کیونکہ وہ ضرور جسمانی یا روحانی طور پر انسان کیلئے نقصان دہ ہیں۔

بعض علاقوں کے لوگوں کی معیشت (گزارہ) کا انحصار شکار پر ہوتا ہے اس کے علاوہ ان کا کوئی دوسرا کاروبار نہیں ہوتا، مثلاً: ساحلی علاقوں کے لوگوں کی گزراوقات مچھلی کے شکار پر ہوتی ہے، نیز: صحراؤں یا جنگلوں میں رہنے والے لوگ جنگلی جانوروں یا پرندوں کا شکار کرتے ہیں، چنانچہ شکار کی وسیع کاروباری حیثیت کے پیش نظر اس کی قانون بنانا ضروری تھی جس کیلئے صحابہ کرام کے دریافت کرنے پر اللہ تعالیٰ نے ان حکموں کو اتارا۔

احکام ومسائل

شکاری جانوروں کے ذریعہ شکار کرنے کے کچھ طریقہ کار ہوتے ہیں، ان طریقوں میں سے کچھ طریقے شرعاً معتبر ہیں اور کچھ طریقے شرعاً معتبر نہیں، یعنی: اگر ان غیر معتبر طریقوں سے شکار کیا جائے تو شکار حلال نہیں سمجھا جائے گا۔

(۱)....جس جانور کے ذریعہ شکار کرنے کا ارادہ ہو اسے شکار کرنے کیلئے سدھایا گیا ہو، جس کی علامت یہ ہیکہ وہ خود شکار کو نہ کھائے بلکہ تمہارے لئے پکڑ رکھے۔

(۲)....تم اسے خود شکار دکھا کر اس کے پکڑنے کیلئے چھوڑو، خود سے ہی لپک کر نہ جائے۔

(۳)....کتے کا سدھانا یہ ہے کہ جب شکار پر چھوڑا جائے تو کتا اس میں سے خود نہ کھائے، اگر اس طرح تین بار کتے کو آزما لیا تو اب اس کتے کے ذریعہ شکار کرنا حلال ہوگا۔

(۴)....شکاری کتے کے شکار میں ایسی صورت بھی پیش آسکتی ہے کہ سدھائے ہوئے کتے کے ساتھ

کوئی غیر سدھایا ہوا کتا بھی شامل ہو جائے، اور وہ مطلوبہ شکار کو اکٹھا شکار کریں تو ایسی صورت میں کیا گیا شکار حلال نہیں ہوگا جبکہ یہ علم نہ ہو سکے کہ کون سے کتے نے درحقیقت شکار کو پکڑا ہے، ہو سکتا ہے کہ شکار غیر تربیت یافتہ کتے نے پکڑا ہو جس پر اللہ تعالیٰ کا نام بھی نہیں لیا گیا، لہٰذا ایسا مشکوک شکار حلال نہیں ہوگا۔

(۵)..... باز یا شکرہ وغیرہ کو شکار کیلئے بھیجا جائے تو اس میں یہ شرط نہیں ہے کہ وہ شکار کئے ہوئے جانور میں سے خود نہ کھائے بلکہ یہ شرط ہے کہ اگر اسے واپس بلایا جائے تو واپس آ جائے۔

(۶)..... شکار پر چھوڑنے کے وقت اللہ تعالیٰ کا نام لیا جائے، یعنی "بِسْمِ اللّٰهِ. اَللّٰهُ اَكْبَرْ" کہہ کر چھوڑا جائے۔

(۷)..... ان سب کے علاوہ ایک شرط یہ بھی ہے کہ جانور شکار کو زخمی کر دے کہ اس کا کچھ خون بہہ جائے اور اگر اس نے زخمی نہیں کیا تو پھر اس کو ذبح کرنا ضروری ہے اور اگر پکڑنے سے پہلے مر گیا اور ذبح نہ کر سکے تو وہ مردار ہے اور حرام ہے، اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ حرام کے چھوڑنے کا سبب اللہ تعالیٰ کا ڈر ہونا چاہئے، وہ بہت جلد حساب لینے والے ہیں۔

(۸)..... آیت کے آخر میں یہ ہدایت بھی کر دی گئی ہے کہ شکار کو اللہ تعالیٰ نے حلال تو فرما دیا ہے، مگر شکار کے پیچھے لگ کر نماز اور دوسرے شرعی حکموں سے غفلت برتنا جائز نہیں۔

حلال چیزیں

اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ؕ وَ طَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ

آج حلال کر دی گئیں لئے تمہارے پاکیزہ چیزیں اور کھانا ان لوگوں کا جن کو دی گئی کتاب

حِلٌّ لَّكُمْ ۪ وَ طَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ۫ وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ

حلال ہے لئے تمہارے اور کھانا تمہارا حلال ہے لئے انکے اور (حلال کر دی گئی تمہارے لئے) پاک دامن عورتیں سے

الْمُؤْمِنٰتِ وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ

مسلمانوں میں اور (حلال کردی گئی تمہارے لئے) پاک دامن عورتیں سے ان لوگوں میں جن کو دی گئی کتاب سے

قَبْلِكُمْ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ

پہلے تم جب کہ دو تم ان کو مہران کے پاکدامنی کرنے کو نہ کہ خواہش پورا کرنے کو

وَ لَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ ؕ وَ مَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ

اور نہ بنانے والے چھپی ہوئی دوستی اور جو انکار کرے سے ایمان پس تحقیق ضائع ہوا

عَمَلُهٗ ۫ وَ هُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۵﴾ ع ۵

عمل اس کا اور وہ میں آخرت میں سے ہے خسارہ پانے والوں (۵)

بامحاورہ ترجمہ:۔ آج تمہارے لئے سب پاکیزہ چیزیں حلال ہوئیں اور اہل کتاب کا کھانا تمہارے لئے حلال ہے، اور تمہارا کھانا ان کیلئے حلال ہے، اور پاک دامن مؤمن عورتیں پاک دامن اہل کتاب عورتیں بھی حلال ہیں جبکہ ان کا حق مہر دے دو، اور ان سے باقاعدہ نکاح کرو نہ کھلی بدکاری کرو اور نہ چھپی دوستی، اور جو شخص ایمان کا انکاری ہو اس کے عمل ضائع ہو گئے، اور وہ آخرت میں نقصان پانے والوں میں سے ہو گا۔ (۵)

لفظی تحقیق: الطَّيِّبٰتُ: پاکیزہ چیزیں۔ "طَيِّبَةٌ" کی جمع ہے، وہ چیز جو صاف ستھری مانی جاتی ہو اور طبیعت اس سے کراہت نہ کرے۔

تفسیر

ارشاد ہے کہ: اسلام نے تمہارے لئے پاکیزہ جانوروں کا اور ساری پاکیزہ چیزوں کا کھانا اور استعمال کرنا حلال کر دیا ہے، جانوروں کا گوشت اس وقت حلال ہو گا جب اس کو اللہ تعالیٰ کے نام پر ذبح کیا جائے، اور ذبح کرنے والا مسلمان ہو، یہودی اور عیسائی کا ذبح کیا ہوا جانور تمہارے لئے اور تمہارا ذبح کیا ہوا جانور ان کیلئے

حلال ہے، اس کے بعد ارشاد ہے کہ: مسلمان عفیفہ، یعنی: پاکدامن عورت سے شادی کرنا اچھا ہے اور ایسے ہی یہودی یا عیسائی عورت سے، جو پاکدامن نیک اور گناہ سے بچنے والی ہو شادی کرنی جائز ہے، شادی کی غرض یہ ہونی چاہئے کہ مرد اور عورت شادی کر کے ایک دوسرے کیلئے پاکدامنی کا ذریعہ بن جائیں، خواہش کے جوش میں آ کر اندھا دھند جنسی تعلقات قائم نہ کرنے چاہئیں، ایسا نہ ہو کہ بعد میں مل جل کر رہنا مشکل معلوم ہونے لگے، عورت سے خفیہ تعلق جن کی غرض بیہودہ خواہش پوری کرنے کے سوا کچھ نہیں ہوسکتی نہ ہونے چاہئیں، یہ سب جانوروں کی سی حرکتیں ہیں جو انسان کیلئے کسی طرح مناسب نہیں، نکاح میں پاکدامنی کا ذکر مصلحت کی بناء پر ہے ورنہ نکاح ہر ایک سے ہو جائے گا سوائے کافر اور مشرک کے، اصل کام ایمان کی حفاظت ہے ورنہ عمل بیکار ہے یہ بات تو طے ہے کہ آخرت میں بے ایمان گھاٹے میں رہیں گے۔

اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ: آیت کے اس حصہ میں "اَلْيَوْمَ" کا جو لفظ ہے اس سے مراد آیت کے اترنے کا دن اور اس کے بعد کا زمانہ ہے۔

"حلال" اور "طیّب" میں فرق

طَيِّبَات: یعنی پاکیزہ چیز میں دو قسم کی پاکیزہ چیزیں شامل ہیں ایک قسم تو ان چیزوں کی ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے حرام کردہ چیزوں میں مقابلے میں پاکیزہ چیزوں کو حلال فرمایا ہے، اور دوسری قسم کی "طَيِّبَات: خوشگوار" وہ چیزیں ہیں جن میں کسی قسم کی خباثت یا گندگی موجود نہ ہو، "سورۂ بقرۃ" میں حلال اور طیب دونوں الفاظ اکٹھے استعمال ہوئے ہیں "﴿كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا﴾ [البقرۃ:۱۶۸]" زمین میں سے حلال اور پاکیزہ چیزیں کھاؤ بظاہر تو ہر حلال چیز پاکیزہ ہی ہوگی، مگر اس میں بھی ایک درجے کا فرق ہے، بعض چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حلال قرار دیا ہے، مگر وہ اپنی اندرونی خباثت کی بناء پر ایک مسلمان کیلئے روا نہیں ہوتیں، مثلاً: ایک شخص نے اپنی بکری کو شرعی طریقے سے ذبح کیا ہے اب اس کیلئے تو یہ حلال ہے، مگر کوئی شخص وہی گوشت چوری کر کے

لے جائے اس کیلئے وہ پاکیزہ اور حلال چیز بھی حرام ہوجائے گی، کیونکہ اس میں غیر کا حق دبایا گیا ہے اور چوری کی وجہ سے اس میں اندرونی خباثت پیدا ہوگئی ہے، بالکل اسی طرح ناجائز طریقوں سے حاصل کی گئی ہر قسم کی چیز حرام ہوگی، اگرچہ اللہ تعالیٰ نے عمومی طور پر اس کے استعمال کو حلال قرار دے رکھا ہو، بعض اوقات سالن یا کوئی دوسری چیز باسی ہوجاتی ہے اس سے بدبو آنے لگتی ہے اگرچہ ایسی چیز تو حلال ہوتی ہے مگر اپنے اندر پیدا شدہ خرابی کی بناء پر مکروہ ہے، گویا حلال اور پاکیزہ میں یہ معمولی سا فرق ہے۔

وَ طَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ: تمام پاکیزہ چیزیں حلال ہیں، اور ان کے علاوہ اہل کتاب کا طعام (ذبیحہ) بھی حلال کیا گیا ہے، صحابہ کرام اور مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ: یہاں پر طعام سے مراد عام کھانا نہیں، کیونکہ عام کھانا تو ہر غیر مسلم کا بھی جائز ہے اس میں اہل کتاب کی خصوصیت بیان کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں، چنانچہ یہاں پر طعام سے مراد ذبح کیا ہوا جانور ہے، یعنی: اہل کتاب کا ذبح کیا ہوا جانور بھی مسلمان پر حلال ہے، بشرطیکہ ذبح کرتے وقت اس پر اللہ تعالیٰ کا نام لیا گیا ہو کیونکہ (ذبح کرتے وقت اللہ تعالیٰ کا نام لو) یہ حکم ایک بنیادی حکم ہے اور اگر اہل کتاب نے ذبح کے وقت حضرت مسیح علیہ السلام یا حضرت عزیر علیہ السلام یا کسی بھی غیر اللہ کا نام لیا ہے تو ایسا ذبح کیا ہوا جانور حرام ہوگا۔

اہل کتاب ہی سے متعلق ایک مزید شرط یہ ہے کہ ذبح کرنے والا شخص یا تو نسلی طور پر یہودی یا عیسائی ہو یا وہ کسی دوسرے مذہب ہندو، سکھ وغیرہ سے عیسائی یا یہودی ہوا ہو، البتہ اگر ذبح کرنے والا شخص اسلام کو چھوڑ کر یہودی یا عیسائی ہوا ہے تو وہ مرتد ہے اور مرتد کا ذبح کیا ہوا جانور حلال نہیں ہوسکتا۔

وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ: اہل کتاب کے ذبح کیے ہوئے جانور کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک اور خصوصیت بھی دی ہے کہ ان کی عورتوں سے مسلمان کا نکاح بھی حلال ہے، اہل کتاب میں یہودی اور عیسائی دونوں گروہ شامل ہیں، البتہ مشرکہ عورت سے مسلمان مرد کا نکاح جائز نہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول بھی ہے کہ ایک مسلمان یہودی یا عیسائی عورت سے نکاح کرسکتا ہے، البتہ کوئی مسلمان عورت یہودی

یا عیسائی مرد سے نکاح نہیں کرسکتی۔

ایک عجیب واقعہ

بعض اعتراض کرنے والے اعتراض کرتے ہیں کہ ایک وسیع تر مذہب ہونے کے باجود اسلام نے اہل کتاب سے نکاح کے مسئلہ میں یکطرفہ راستہ اختیار کیا ہے، اگر مؤمن آدمی اہل کتاب عورت سے نکاح کرسکتا ہے تو اہل کتاب آدمی مؤمنہ عورت سے نکاح کیوں نہیں کرسکتا؟ اس بارے میں جرمن یہودی لیوپولڈ کا واقعہ کافی ہے، اللہ تعالیٰ نے اسے ایمان کی دولت سے نوازا اور محمد اسد نام رکھا، بڑا پکا مسلمان تھا، بہت بڑا مصنف بھی تھا اس نے پہلی جنگ عظیم کے بعد کا خود اپنا واقعہ نقل کیا ہے کہ وہ فلسطین اور شام کے علاقہ میں ریل پر سفر کررہا تھا سفر کے دوران اس کا ایک بدو مسلمان ہم سفر کھانا خرید کر لایا اور اسے بھی کھانے کی دعوت دی، محمد اسد خود بیان کرتا ہے کہ میں نے کھانے میں شریک ہونے سے ہچکچاہٹ ظاہر کی مگر اس نے کہا کہ بھئی تم بھی میری طرح مسافر ہو کھانا کھانے میں کیا حرج ہے، الغرض! اس نے ایک روٹی مجھے دی اور ایک خود کھانے لگا، کہتا ہے کہ پہلے تو میں اس بدو مسلمان کی سادہ معاشرت اور بے تکلفی سے متاثر ہوا، پھر دوران گفتگو میں نے اس سے سوال کیا کہ جب ایک مسلمان یہودی یا عیسائی عورت سے شادی کرسکتا ہے تو یہودی یا عیسائی مرد کسی مسلمان عورت سے نکاح کیوں نہیں کرسکتا؟ وہ دیہاتی آدمی اسلام کا گہرا شعور رکھتا تھا کہنے لگا اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان اللہ تعالیٰ کے سب پیغمبروں حتیٰ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اسی طرح ایمان رکھتے ہیں جس طرح وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان رکھتے ہیں، وہ پچھلے پیغمبروں کی اسی طرح عزت واحترام کرتے ہیں جس طرح اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی، چنانچہ جب یہودی یا عیسائی عورت مسلمان کے گھر میں آئے گی تو وہاں اپنے پیغمبر کے عزت واحترام کو پائے گی اور اسے کسی قسم کی ذہنی اذیت نہیں ہوگی، برخلاف اس کے یہودی نہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مانتے ہیں اور نہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو، اسی طرح عیسائی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان نہیں رکھتے، لہٰذا جب مسلمان عورت یہودی یا عیسائی کے گھر میں جائے گی تو وہ ہر وقت ذہنی

اذیت میں مبتلا رہے گی، کیونکہ اس کے سامنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم کے بجائے توہین کی جائے گی چنانچہ مسلمان عورت کیلئے کتابی مرد کے نکاح میں جانا جائز قرار نہیں دیا گیا۔

یہ بات ذکر کے قابل ہے کہ موجودہ زمانے کے عیسائی برائے نام عیسائی ہیں، ان کی اکثریت نہ کسی مذہب کی قائل ہے نہ آسمانی کتاب کی اور نہ اللہ تعالیٰ کی، یہ دہریہ قسم کے لوگ ہیں، لہٰذا یہ صحیح معنوں میں اہل کتاب کی تعریف میں نہیں آتے اسی لئے نہ تو ان کا ذبح کیا ہوا جانور مسلمانوں کیلئے حلال ہے اور نہ ہی ان کی عورتوں سے نکاح جائز ہے، مسلمانوں کو اس معاملہ میں محتاط رہنا چاہئے، ہاں اگر یقین ہو جائے کہ کوئی شخص واقعی اہل کتاب ہے اس کا ''تورات یا انجیل'' پر ایمان ہے تو اس کی دونوں چیزیں مسلمانوں کیلئے جائز ہیں۔

ایک اہم سوال اور اسکا جواب

وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ: قرآن کریم کے اس ارشاد میں ایک حکم جو مسلمانوں کیلئے بیان فرمایا کہ: اہل کتاب کا طعام (ذبیحہ) جو کہ تمہارے لئے جائز ہے یہ تو ظاہر ہے، مگر اس کا دوسرا جزء، یعنی: مسلمانوں کا کھانا اہل کتاب کیلئے جائز ہے، اس کا کیا مقصد ہے کیونکہ اہل کتاب جو قرآنی ارشادات کے ماننے والے ہی نہیں ان کیلئے کیا حلال کیا حرام، اس کے بیان سے کیا فائدہ؟

''تفسیر بحرِ محیط'' وغیرہ میں اس کے متعلق فرمایا کہ دراصل یہ حکم بھی مسلمانوں ہی کو بتلانا منظور ہے کہ تمہارا ذبح کیا ہوا جانور ان کیلئے جائز ہے اس واسطے تم اپنے ذبح کیے ہوئے جانور میں سے کسی غیر مسلم اہل کتاب کو کھلا دو تو کوئی گناہ نہیں، یعنی: اپنی قربانی یا عام ذبح کئے ہوئے جانور میں سے کسی یہودی یا عیسائی شخص کو دے سکتے ہو اور اگر ہمارا ذبح کیا ہوا جانور ان کیلئے حرام ہوتا تو ہمارے لئے جائز نہ ہوتا کہ ہم ان کو اس میں سے کھلائیں اس لئے یہ حکم بظاہر اہل کتاب کا ہے مگر درحقیقت اس کے مخاطب مسلمان ہی ہیں۔

وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ ۡ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ: جو کوئی

ایمان کا انکار کردے گا، یعنی: ایمان کو چھوڑ کر مرتد ہو جائے گا تو اس کا عمل ضائع ہو گیا اس نے ایمان کی حالت میں نیکی کی تھی وہ بھی برباد ہو گئی، اور ایسا شخص آخرت میں سخت نقصان اٹھانے والا ہو گا، ایمان والے اپنا نیکیوں کا اعمال نامہ لے کر آئیں گے اور انہیں کامیابی حاصل ہو گی مگر مرتد کے پاس کچھ نہیں ہو گا وہ خالی ہاتھ اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہو گا، اس دن حقیقی نقصان میں مرتد شخص ہو گا جو بالکل خالی ہاتھ ہو گا۔

جب کوئی شخص اسلام کو چھوڑ کر مرتد ہو جاتا ہے تو پھر خواہ وہ یہودی کہلائے یا عیسائی اس کا نہ تو ذبح کیا ہوا جانور حلال ہو گا اور نہ ان کی عورتوں سے نکاح درست ہو گا، اگر چہ اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کے ذبح کئے ہوئے جانور اور ان کی عورتوں سے نکاح کو حلال قرار دیا ہے تاہم احتیاط کا تقاضہ یہی ہے کہ اگر کوئی صحیح اہل کتاب بھی ہو تو اس کے ساتھ ایسے تعلق قائم کرنا مناسب نہیں، حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے یہودی عورت سے نکاح فرمایا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو ڈانٹ دیا تھا، عرض کیا! کیا اللہ تعالیٰ نے یہودی اور عیسائی سے نکاح کی اجازت نہیں دی؟ فرمایا: بیشک دی ہے، مگر اس میں خطرہ ہے کہ کہیں مسلمان بدکار عورتوں کے جال میں گرفتار نہ ہو جائیں، تمہارے پاس ایسی عورت کی پاکدامنی کا کیا ثبوت ہے؟ ہو سکتا ہے کہ وہ بدکار ہو اور تمہارے اخلاق کو بھی تباہ کر کے رکھ دے، لہٰذا میں اسے پسند نہیں کرتا۔

الغرض! اللہ تعالیٰ نے اشارتاً یہ بھی بتادیا کہ ایمان بہت بڑی دولت ہے اسے ہمیشہ محفوظ رکھنے کی کوشش کرو، کیونکہ نجات کا دار و مدار ایمان پر ہی ہے، نیکیاں وہی کام آئیں گی جو ایمان کی حالت میں کی ہوں اور آخرت میں کامیابی بھی ایمان پر ہی ہو گی، لہٰذا ایمان کو برباد ہونے سے بچانا ضروری ہے۔

وضو اور غسل

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ

اے وہ جو ایمان لائے ہو! جب کھڑے ہو تم طرف نماز کی پس دھو لو چہرے اپنے کو

وَ اَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَ امْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ

اور ہاتھوں اپنے کو سمیت کہنیوں اور گیلا ہاتھ پھیرلو پر سروں اپنے اور پاؤں اپنے کو

اِلَى الْكَعْبَيْنِ ؕ وَ اِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا ؕ

سمیت ٹخنوں اور اگر ہوتم ناپاک پس اچھی طرح پاک ہو

بامحاورہ ترجمہ:۔ اے ایمان والو! جب تم نماز کیلئے اٹھوتو اپنے چہروں کو دھولو اور کہنیوں سمیت دونوں ہاتھوں کو دھولو اور اپنے سروں پر ہاتھ پھیرلو اور پاؤں ٹخنوں سمیت دھولو اور پھر اگر ناپاک سے ہوتو اچھی طرح پاک ہوجاؤ۔

لفظی تحقیق: وَامْسَحُوْا: اور گیلا ہاتھ پھیرلو۔ "مَسْحٌ" سے بنا ہے، جس کے معنی ہیں ہاتھ سے کسی چیز کو چھونا، کسی چیز پر ہاتھ پھیرنا۔ وَالْكَعْبَيْنِ: ٹخنے۔ "كَعْبٌ" کا تثنیہ ہے، "كَعْبٌ" کسی اوپر اٹھی ہوئی یا ابھری ہوئی چیز کو کہتے ہیں، یہاں پاؤں کے دونوں طرف کی ابھری ہوئی ہڈی مراد ہے جنہیں ہم ٹخنے کہتے ہیں۔ جُنُبٌ: ناپاک۔ "جَنَابَتٌ" سے ہے، جس کے معنٰی ہیں ایسی حالت جس سے غسل واجب ہوجاتا ہے۔

تفسیر

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ جب نماز کیلئے کھڑے ہونے لگوتو وضو کرو، جس کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے اپنے چہرے کو دھولو، پھر دونوں ہاتھوں کو کہنیوں تک دھولو، پھر سروں کا مسح کرلو، پھر دونوں پاؤں ٹخنوں تک دھولو۔

اس کے بعد ارشاد ہے کہ اگر غسل ضروری ہوتو اس وقت نماز کیلئے صرف وضو کافی نہیں بلکہ سارے بدن کو اچھی طرح پانی ڈال کر دھونا، یعنی: غسل کرنا ضروری ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ: طہارت کے معنٰی پاکی کے ہیں، حدیث شریف میں آتا ہے کہ: اللہ تعالٰی بغیر طہارت کے نماز کو قبول نہیں فرماتے، نماز کی ادائیگی کیلئے جسم، لباس اور جگہ وغیرہ

سب کی طہارت ضروری ہے، جسم کی طہارت وضو یا غسل سے حاصل کی جاتی ہے، اس آیت میں وضو اور غسل دونوں کا ذکر ہے۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ: نماز کیلئے وضو کی ضرورت اس وقت پیش آئے گی جب کہ نماز پڑھنے کا ارادہ کرنے والا شخص بے وضو ہو، اگر پہلے سے وضو کی حالت میں ہو تو نماز کیلئے دوبارہ وضو کی ضرورت نہیں ہے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں حدیثوں میں آتا ہے کہ جب آپ کسی کام میں مشغول ہوتے اور نماز کیلئے اذان ہو جاتی تو سب کام چھوڑ کر نماز کی طرف متوجہ ہو جاتے، آپ کو سب سے پہلے نماز کی فکر ہوتی، بہر حال فرمایا کہ جب تم نماز کیلئے کھڑے ہو تو پہلے طہارت حاصل کر لو۔

"ترمذی شریف" کی روایت میں آتا ہے کہ: پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قضائے حاجت سے تشریف لائے اور صحابہ کرام نے آپ کو کھانا پیش فرمایا تو آپ نے قبول فرمالیا، ایک صحابی نے عرض کیا، اے پیغمبر! آپ نے وضو نہیں فرمایا، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کیا میں نماز کا ارادہ کر رہا ہوں کہ وضو کروں، وضو تو نماز کو ادا کرنے کیلئے ضروری ہے نہ کہ کھانا کھانے کیلئے، کھانے سے پہلے اور بعد میں صرف ہاتھ دھولینا کافی ہے مکمل وضو کرنے کی ضرورت نہیں، ہاں! یہ الگ بات ہے کہ ہمیشہ باوضو رہنا اچھی صفت ہے، یہ مسلمان کی خصوصی صفت ہے کہ وہ ہمیشہ باوضو رہتا ہے، تاہم یہ ضروری نہیں، البتہ قرآن پاک کو ہاتھ لگانے سے پہلے وضو ضروری ہے، کیونکہ خود قرآن پاک میں موجود ہے کہ اسے صرف پاک لوگ ہی چھوتے ہیں، ایک دوسری حدیث میں یہ بھی آتا ہے کہ جس نے طہارت پر طہارت کی، یعنی: وضو کے ہوتے ہوئے پھر وضو کیا اس کے اعمال نامہ میں دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں، البتہ اس کیلئے شرط یہ ہے کہ پہلے وضو سے کوئی فرض یا نفل عبادت کر چکا ہو، اگر پہلے وضو سے ابھی تک کوئی عبادت نہیں کی تو پھر دوبارہ وضو کرنے سے کوئی ثواب حاصل نہیں ہوگا بہر حال یہ ایک ثواب کی بات ہے اور وضو پر وضو ایک اچھی صفت ہے۔

جب تم نماز کیلئے کھڑے ہو تو وضو کے چار فرض پورے کرو، ان فرضوں میں چہرہ دھونا، کہنیوں تک ہاتھ

دھونا، سر کا مسح کرنا اور ٹخنوں تک پاؤں دھونا شامل ہیں، باقی تشریح پیغمبر ﷺ کے قول اور عمل میں ملتی ہیں جن میں نیت کرنا، وضو کے شروع میں بسم اللہ پڑھنا، ہر عضو کو کم از کم ایک دفعہ دھونا وضو کے مکمل ہونے کیلئے ضروری ہے، پیغمبر ﷺ نے ہر عضو کو دو دو دفعہ بھی دھویا ہے اور تین تین مرتبہ بھی، تین مرتبہ دھونا اعلیٰ درجہ ہے؛ البتہ سر کا مسح تین بار نہیں کیا جائیگا بلکہ ایک ہی بار سر پر گیلا ہاتھ پھیر لینا کافی ہے، بہر حال ایک، دو، تین بار موقع کی مناسبت سے اعضاء کو دھویا جا سکتا ہے، بعض اوقات پانی کی کمی ہوتی ہے تو ایک یا دو بار دھو لینا بھی کافی ہوگا، اسی طرح جلدی ہے کسی سواری کے نکل جانے کا خطرہ ہے تو کم از کم ایک دفعہ پانی بہا لینا بھی مکمل وضو ہے اس میں کوئی نقص نہیں رہتا، البتہ شرط یہ ہے کہ کوئی جگہ خشک نہیں رہنی چاہئے ورنہ وضو مکمل نہیں ہوگا اور نہ اس کے بعد پڑھی گئی نماز صحیح ہوگی۔

گذری ہوئی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے حلال وحرام کے حکم بیان فرمادیئے، نکاح اور کھانے پینے میں حلال و حرام کو واضح کیا، یہ دراصل طہارت (پاکیزگی) ہی کا بیان ہے، انسان کیلئے اندرونی اور بیرونی طہارت ضروری ہے، عبادت سے بھی انسان کو اندرونی طہارت حاصل ہوتی ہے اور عبادت کرنے سے پہلے بیرونی طہارت کی ضرورت ہوتی ہے، کیونکہ اس کے بغیر نماز بھی ادا نہیں ہوسکتی اور نماز کے ذریعہ انسان اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرتا ہے۔

وضو چھوٹی طہارت ہے جس کا بیان ہو چکا ہے، اور غسل بڑی طہارت ہے، جس کا بیان آرہا ہے۔

وضو اور ناپاکی والے غسل میں کلی کرنے اور ناک میں پانی ڈالنے کا حکم

جس طرح وضو کے فرض ہیں اسی طرح غسل کے بھی فرض ہیں، جن کی ادائیگی کے بغیر نہ غسل مکمل ہوتا ہے اور نہ انسان پاک ہوتا ہے، وضو کے دوران کلی کرنا سنت ہے جب کہ کلی کرنا ناپاکی والے غسل میں فرض کا درجہ رکھتا ہے، اسی طرح ناک میں پانی ڈالنا وضو میں سنت ہے جبکہ ناپاکی کے غسل میں فرض ہے اس کے بغیر غسل مکمل نہیں ہوتا، پھر اس کے بعد پورے جسم پر پانی بہانا بھی غسل میں فرض ہے یہانتک کہ کوئی جگہ خشک نہ رہ جائے کیونکہ ہر بال کے نیچے ناپاکی ہوتی ہے، اسی لئے فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ اگر پورے جسم میں ایک بال کے

برابر بھی جگہ خشک رہ گئی تو غسل مکمل نہ ہوگا، اس خطرہ کے پیش نظر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ اسی لئے میں نے اپنے سر کے ساتھ دشمنی کی ہے، یعنی پورا سر منڈوا دیا ہے تاکہ ناپاکی کے غسل میں بال برابر جگہ بھی خشک نہ رہ جائے، چنانچہ حکم ہے کہ ناپاکی کے غسل کیلئے پورے بدن کو خوب اچھی طرح دھوؤ۔

تیمم کا بیان

وَ اِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ

اور اگر ہوتم بیمار یا پر سفر یا آئے کوئی میں سے تم سے

الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا

بیت الخلاء یا ہاتھ لگایا ہو (ہمبستری کی ہو) عورتوں سے پھر نہ پاؤ تم پانی پس ارادہ کرلو تم

صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَ اَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ ؕ مَا

مٹی کا پاک پس ملو تم چہرے اپنے کو اور ہاتھوں اپنے کو سے اس نہیں

يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّ لٰكِنْ يُّرِيْدُ

چاہتے اللہ کہ کرے پر تم کوئی تنگی اور لیکن چاہتے ہیں

لِيُطَهِّرَكُمْ وَ لِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۞

کہ پاک کریں تم کو اور یہ کہ پوری کریں نعمت اپنی کو پر تم تاکہ تم شکر کرو (۶)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی بیت الخلاء سے آیا ہے یا عورتوں کو ہاتھ لگایا ہو (یعنی ہمبستری کی ہو) پھر تم پانی نہ پاؤ تو قصد (طہارت کیلئے ارادہ) کرو پاک مٹی کا اور اپنے چہرے اور ہاتھ اس سے مل لو اللہ تم پر تنگی نہیں کرنا چاہتے، لیکن تم کو پاک کرنا چاہتے ہیں اور اپنا احسان تم پر پورا کرنا چاہتے ہیں تاکہ تم احسان مانو۔ (۶)

لفظی تحقیق: غَآئِطٌ: نیچی جگہ، نشیب۔ انسان رفع حاجت کیلئے اکثر گڑھوں اور نیچی جگہوں میں بیٹھتا ہے اس لئے "غَآئِطٌ" سے مراد حاجت پورا کرنے کی جگہ ہے۔ لٰمَسْتُمُ: جو "لَمْسٌ" سے بنا ہے، اس کے معنٰی ہیں چھونا، ہاتھ لگانا، یہاں مراد عورت سے ہمبستری کرنا ہے۔

تفسیر

پچھلی آیت میں تھا کہ جب نماز پڑھنے کیلئے اٹھو تو وضو کرلو لیکن اکثر بیمار آدمی کو پانی کا استعمال نقصان پہنچاتا ہے اور سفر میں بھی کبھی کبھی پانی نہیں ملتا، اور جتنا ہوتا ہے وہ پینے کیلئے رکھنا پڑتا ہے ایسی صورتوں میں اگر نماز کا وقت آجائے تو کیا کرنا چاہئے؟ اس آیت میں اس کا حکم بیان کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ اس وقت تیمم کرلیا کرو، تیمم کا طریقہ یہ ہے کہ پاکی حاصل کرنے کی نیت کرکے دونوں ہاتھ کی ہتھیلیاں پھیلا کر پاک مٹی پر رکھے پھر دونوں ہاتھ اٹھا کر چہرہ پر اچھی طرح پھیرے، دوبارہ پھر اسی طرح دونوں ہاتھ مٹی پر رکھے اور اٹھا کر بائیں ہاتھ کی ہتھیلی دائیں ہاتھ پر انگلیوں سے لے کر کہنیوں تک اور دائیں ہاتھ کی ہتھیلی بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے لے کر کہنی تک اچھی طرح پھیرے بس تیمم ہوگیا، اس کے بعد نماز پڑھ لے، آدمی کو کھانے پینے کی وجہ سے پیشاب پائخانے کی حاجت ہوتی ہے اور کبھی کبھی ہوا خارج ہوتی ہے، ان صورتوں میں نماز سے پہلے وضو کرنا پڑتا ہے، پھر یہ وضو جب ٹوٹتا ہے جب ان تینوں میں سے کوئی بات ہوجائے یا کہیں سے خون بہے یا لیٹے ہوئے نیند آجائے، ایک ناپاکی وہ ہوتی ہے جس سے پاک ہونے کیلئے وضو کافی نہیں ہوتا بلکہ غسل ضروری ہوتا ہے، اگر غسل فرض ہوجائے اور پانی کا استعمال ممکن نہ ہو تو تیمم کرنا کافی ہوگا، جس طرح وضو کیلئے تیمم کرتے ہیں اسی طرح غسل کیلئے تیمم کیا جائے گا گویا وضو اور غسل کے تیمم میں کوئی فرق نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے دین میں ہمارے لئے کوئی تنگی نہیں کی بلکہ ہر چیز کیلئے آسانیاں کردی ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو اور اس کے حکموں پر عمل کرو۔

وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ: اگر بیماری کے بڑھ جانے کا خطرہ ہو اور ڈاکٹر نے پانی استعمال

کرنے سے منع کر دیا ہو یا تم سفر پر ہو اور سفر کے دوران پانی نہ ملے تو، فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ اگر پانی مسافر کے عارضی قیام سے کم از کم ایک میل کے فاصلے پر ہو تو اس کیلئے تیمم کرنا جائز ہو جاتا ہے۔

فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ اس کی تشریح پیغمبر ﷺ نے خود اپنے ارشاد مبارک سے فرمائی، وہ یہ ہے کہ دونوں ہاتھ ایک مرتبہ مٹی پر مارو، اگر مٹی زیادہ لگ جائے تو ہاتھوں کو جھاڑ دو، تاکہ گرد و غبار کچھ کم ہو جائے، پھر دونوں ہاتھ اپنے چہرہ پر مل لو پھر دوسری مرتبہ دونوں ہاتھ مٹی پر مارو، اور دونوں ہاتھ دونوں کہنیوں سمیت مل لو، تمہارا تیمم مکمل ہو گیا۔

مٹی کے علاوہ زمین کی جنس سے کوئی بھی چیز ہو اس کے ساتھ تیمم کیا جاسکتا ہے، یہ یاد رہے کہ زمین کی جنس سے ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جو چیزیں جلانے سے نہ راکھ بنے، نہ پگھلے جیسے پتھر، نمک، گرد و غبار، سیمنٹ، ہڑتال، اینٹ، روڑا وغیرہ، ان چیزوں پر ہاتھ مار کر تیمم کیا جاسکتا ہے، البتہ لکڑی کی راکھ سے تیمم درست نہیں، کیونکہ یہ زمین کی جنس سے نہیں، پتھر پر اگر چہ گرد و غبار نہ ہو تب بھی اس سے تیمم کرنا جائز ہے کیونکہ یہ زمین کی جنس سے ہے اور جو چیز جلانے سے جل کر راکھ ہو جائے یا پگھلانے سے پگھل جائے وہ زمین کی جنس سے نہیں، جیسے لکڑی، لوہا وغیرہ ان چیزوں سے تیمم نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ لکڑی جل جاتی ہے اور لوہا پگھل جاتا ہے، اس لئے کسی دھات پر تیمم جائز نہیں، پیغمبر ﷺ کا ارشاد ہے کہ: مسلمان کیلئے مٹی پاکی حاصل کرنے کا ذریعہ ہے خواہ دس سال تک پانی نہ ملے، اس دوران کوئی شخص تیمم کر کے مسجد میں داخل ہو سکتا ہے، قرآن کریم پکڑ سکتا ہے، نماز ادا کر سکتا ہے غرضیکہ وہ تمام کام کر سکتا ہے جو وضو کرنے سے ادا ہوتے ہیں، بہر حال یہاں پر وضو، غسل اور تیمم تینوں کے مسئلے بیان کر دیے گئے ہیں۔

اس کے بعد فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ تم پر کوئی تنگی نہیں ڈالنا چاہتے، اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے بڑی آسانیاں پیدا کی ہیں، وہ تو تمہیں پاک کرنا چاہتے ہیں کیونکہ اس کا اپنا فرمان ہے کہ: وہ پاکیزہ لوگوں کو پسند کرتے ہیں، اسی لئے اس نے طہارت کے تمام طریقے تمہیں بتلا دیئے ہیں، اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ یہ بھی چاہتے ہیں کہ تم پر اپنی

نعمت پوری کردیں، یہ اللہ تعالیٰ کے احسان اور اس کی مہربانیاں ہیں کہ اس نے تمہارے لئے حلال اور حرام کے حکموں کو بیان فرمادیا، وضو، غسل اور تیمم کا طریقہ بتلادیا ہے، تمہارے لئے پاکیزہ چیزوں کو حلال اور جو چیزیں تمہارے جسم کی بناوٹ کے خلاف اور روح کی طہارت کے خلاف ہیں انہیں حرام قرار دیا ہے، اور خاص شرطوں کے تحت نکاح کی اجازت دی ہے، اس سے پہلے اللہ تعالیٰ اپنے احسانوں میں سے اسلام کی نعمت کا ذکر بھی کرچکے ہیں کہ اس کی طرف تمہاری رہنمائی فرمائی، اور پھر تم پر اپنا دین مکمل کیا۔

اللہ تعالیٰ کا عہد

وَ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ مِيْثَاقَهُ الَّذِیْ وَاثَقَكُمْ

اور یادکرو احسان اللہ کا اوپر اپنے اور عہد اس کا کہ اور پختہ لیا تم سے

بِهٖۤ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا ۫ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ

اس کو جب کہا تم نے سنا ہم نے اور مانا ہم نے اور ڈرو اللہ سے بیشک اللہ

عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝۷

خوب جانتے ہیں بات دلوں کی (۷)

بامحاورہ ترجمہ: ۔اور اپنے اوپر اللہ کا احسان یاد کرو، اور اس کے عہد کو یاد کرو جو تم نے کیا تھا جب تم نے کہا تھا کہ ہم نے سنا اور مانا، اور اللہ سے ڈرتے رہو اور اللہ تعالیٰ دلوں کی بات خوب جانتے ہیں۔ (۷)

لفظی تحقیق: وَاثَقَكُمْ: اقرار لیا تم سے۔ "مُوَاثَقَةٌ" سے ہے، جو "وُثُوْقٌ" سے بنا ہے، اس کے معنیٰ ہیں قول وقرار کرنا، پختہ وعدہ لے لینا۔ الصُّدُوْر: سینے۔ "صَدْرٌ" کی جمع ہے، جس کے معنیٰ: سینہ اور دل کے ہیں۔ ذَاتِ الصُّدُوْر: دلوں والی: یعنی دلوں والی بات۔

تفسیر

اپنے عہد کو پورا کرو، انسان کلمہ پڑھتے ہی اسلام میں داخل ہو جاتا ہے، گویا وہ اقرار کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا شریک کسی کو نہ ٹھہراؤں گا اور اس کے سوا کسی کی عبادت نہیں کروں گا، چوری نہیں کروں گا، بدکاری نہیں کروں گا، کسی پر جھوٹا بہتان نہ لگاؤں گا، اور جاہلیت کے لوگوں کی طرح اپنی اولاد کو قتل نہیں کروں گا، نیک کام کرنے میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کی پیروی کروں گا، عقیدہ درست رکھوں گا، عبادتیں مقررہ طریقے سے ادا کروں گا، نیک اخلاق اور اچھی عادتیں اختیار کروں گا وغیرہ، انہی باتوں کو کلمہ پڑھنے کے بعد آپ ہر ایک سے اکثر زبانی بھی کہلوا لیتے تھے اور انہی کو پورا کرنا ہر مسلمان پر خواہ مرد ہو یا عورت کلمہ پڑھتے ہی ضروری ہو جاتا ہے، اور یہی باتیں پچھلی قوموں پر بھی ایمان لاتے ہی ضروری ہو جاتی تھیں، اور اسی وجہ سے یہودیوں اور عیسائیوں وغیرہ کو بار بار کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں یاد کرو اور ایمان لانے کی وجہ سے جو قول وقرار تم نے کیے تھے ان کو پورا کرو۔

یہی بات مسلمانوں کو جب بھی موقعہ آتا ہے ٹھہر ٹھہر کر یاد دلائی جاتی ہے، یا تو انہی سے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں تم پر بہت ہیں انہیں یاد کرو، یا دوسرے لوگوں کا ذکر کیا جاتا ہے کہ انہوں نے ایمان لا کر اللہ تعالیٰ سے جو د کیے تھے وہ پورے نہیں کیے، تم اپنے عہد کو پورا کرو، اس آیت میں مسلمانوں سے یہی کہنا مقصود ہے کہ تم یہودیوں اور عیسائیوں کی طرح نہ ہو جانا بلکہ اسلام لا کر تم پر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں انہیں پورا کرنا، اس عہد کے پورا کرنے پر آخرت کے چھٹکارے کا دارومدار ہے، اللہ تعالیٰ سے ہر وقت ڈرتے رہو اور اچھی طرح سمجھ لو کہ وہ ان سب باتوں سے جو تمہارے دلوں میں چھپی ہوئی ہیں اچھی طرح واقف ہیں تم اللہ تعالیٰ سے کوئی بات چھپا نہیں سکتے اور وہ سب کے تمام کاموں کا بدلہ دیں گے۔

اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا: اس قسم کا ذکر اس امت کے بارے میں "سورۂ بقرۃ" کے آخری رکوع میں بھی موجود ہے، ایمان والوں نے یہی کہا کہ "ہم نے آپ کے حکم سن لئے اور ان کی فرمانبرداری کا عہد کرتے

ہیں، اے اللہ! ہمارے گناہ معاف فرمادیجئے کہ ہمیں آپ ہی کی طرف لوٹنا ہے''، پچھلی سورۃ میں گزر چکا ہے کہ آخری امت سے پہلے اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے بھی عہد لئے، مگرانہوں نے توڑ دیئے، "سورۂ نساء" میں ہے کہ ''ان کے عہد توڑنے کی وجہ سے وہ لعنت کے مستحق ٹھہرے''، اس سورۃ کے شروع میں بھی عہد کے پورا کرنے کا حکم ہے، "اے ایمان والو! اپنے عہدوں کو پورا کرو" عہد کا پورا کرنا بہت بڑی ذمہ داری کی بات ہے، جو شخص کلمہ توحید پڑھتا ہے، اللہ تعالیٰ کے حکموں کی اطاعت کا عہد کرتا ہے تو اسے چاہئے کہ اپنے عہد کو پورا کرے اسی لئے یہاں فرمایا کہ: اپنے اس عہد کو یاد کرو۔

عام طور پر اللہ تعالیٰ کا یہ طریقہ ہے کہ وہ حکموں کو بیان کرنے کے بعد یا تو اپنے علم کا حوالہ دیتے ہیں یا تقویٰ (پرہیز گاری) اختیار کرنے کا، چنانچہ یہاں تیمم کے حکموں کو بیان کرنے اور اپنے احسانات کے ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کا حکم ہے کہ کہیں اس کے عہد کی خلاف ورزی نہ کر بیٹھنا، یہ نہ سمجھنا کہ تم اپنے جیسوں کی طرح اللہ تعالیٰ کو دھوکا دے سکو گے بلکہ اللہ تعالیٰ تو تمہارے نیت اور ارادے سے واقف ہیں، لہٰذا عہد کو توڑ کر اس کی سزا سے بچ نہیں سکتے۔

عدل وانصاف

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ كُونُوا۟ قَوَّٰمِينَ لِلَّهِ شُهَدَآءَ بِٱلْقِسْطِ ۖ وَ

اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! ہو جاؤ تم کھڑے ہونے والے لئے اللہ کے گواہی دینے کو ساتھ انصاف کے اور

لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَـَٔانُ قَوْمٍ عَلَىٰٓ أَلَّا تَعْدِلُوا۟ ۚ ٱعْدِلُوا۟ هُوَ

نہ آمادہ کرے تم کو دشمنی کسی قوم کی پر اس کہ نہ انصاف کرو تم انصاف کرو یہی

أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ۖ وَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ خَبِيرٌۢ بِمَا تَعْمَلُونَ ۝٨

زیادہ قریب ہے کے تقویٰ اور ڈرو اللہ سے بیشک اللہ جاننے والے ہیں جو کچھ تم کرتے ہو (۸)

بامحاورہ ترجمہ: ۔ اے ایمان والو! اللہ کے واسطے کھڑے ہو جایا کرو انصاف کے ساتھ گواہی دینے

کیلئے، اور کسی قوم کی دشمنی کی وجہ سے انصاف کو ہرگز نہ چھوڑو، عدل کرو! یہی بات تقویٰ کے زیادہ نزدیک ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو، اللہ کو اس کی خوب خبر ہے جو تم کرتے ہو۔ (۸)

تفسیر

اس آیت میں کلمے کے ایک پہلو کو واضح کر کے بیان کیا گیا ہے، کلمہ کے اندر یہ اقرار بھی پوشیدہ ہے کہ میں اپنے سب کام اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق درست کروں گا اسی کو یہاں اور زیادہ کھول کر بیان کیا گیا ہے، ارشاد ہے کہ: ایمان تم سے دو باتیں پوری کرنے کا تقاضہ کرتا ہے ایک تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احسان اور نعمتیں یاد کر کے ہمیشہ اس کی فرمانبرداری کیلئے تیار رہو، اور جس طرح وہ حکم دیں اس طرح اس کی عبادت کرو، دوسرے یہ کہ جن کے ساتھ تم مل جل کر رہتے ہو ان کا حق پورا پورا ادا کرو۔

ایمان دو باتیں چاہتا ہے: (۱)…. كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ: اللہ تعالیٰ کا حق ادا کرنا۔ (۲)…. كُوْنُوْا شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ: اللہ تعالیٰ کے بندوں کے ساتھ ٹھیک برتاؤ کرنا۔

یہی سارے دین کا خلاصہ ہے، جو ان دو حکموں کے اندر آ گیا ہے؛ اسی طرح کی ایک آیت اس سے پہلی سورۃ: ''سورۃ النساء'' پارہ ''وَالْمُحْصَنٰتُ'' کے آخر میں گزری ہے، وہاں ان دو حکموں کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

(۱)…. كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ۔

(۲)…. كُوْنُوْا شُهَدَآءَ۔

وہاں پہلے بندوں کے ساتھ ٹھیک برتاؤ کرنے کا ذکر ہے اور اللہ تعالیٰ کے حق ادا کرنے کا بعد میں ذکر ہے، اور یہاں پہلے اللہ تعالیٰ کے حق ادا کرنے کا حکم ہے اور بعد میں بندوں کے ساتھ ٹھیک برتاؤ کرنے کا حکم ہے، مطلب یہ کہ دونوں حکموں پر برابر زور دیا گیا ہے اور دونوں کو ساتھ ساتھ پورا کرنا ہے، اللہ تعالیٰ کا حق اس طرح پورا ہوگا کہ اس کی عبادت کرو، اور بندوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ہر بات میں عدل و انصاف کا خیال رکھو۔

"عدل" کے معنیٰ یہ ہیں کہ ہر شخص کو اس کا پورا پورا حق دیا جائے، کوئی شخص ایسی بات میں حصہ نہ لے جس میں کسی کا حق مارا جائے، یہاں تک کہ دشمنوں کے ساتھ بھی انصاف کرے اور دشمنی کی وجہ سے اس کا جائز حق نہ دبائے، جب اخلاق اس قدر بلند ہوں تب کہیں جا کر پرہیزگاری حاصل ہوسکتی ہے،"تقویٰ" کے معنیٰ ہیں اللہ تعالیٰ کے ڈر سے برے کاموں سے بچنا۔

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ: "قَوّٰمِيْنَ" کا معنیٰ ہے قائم رہنے والے، صرف اللہ تعالیٰ کی خوشی اور رضا کیلئے انصاف کے ساتھ گواہی دینے والے بن جاؤ، اس کے علاوہ کوئی اور غرض نظروں میں نہ ہو، صرف اللہ تعالیٰ کے حکم کے پورا کرنے میں انصاف کے ساتھ سچی گواہی دو، اس گواہی میں صرف مقدموں سے متعلق گواہی ہی شامل نہیں، بلکہ اس میں وہ تمام کام آجاتے ہیں جن کا تعلق گواہی سے ہو، ایسے ہر معاملے میں طرفداری، اپنے رشتہ داروں کی بے جا طرف داری یا خودغرضی وغیرہ نقصان دہ ثابت ہوسکتی ہے کیونکہ گواہی کے متعلق صاف حکم موجود ہے کہ گواہی صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر قائم کرو، اگر سچی گواہی کو چھپاؤ گے تو گنہگار بنو گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس بات کا فیصلہ فرما دیا ہے کہ جو کوئی گواہی کو چھپائے گا وہ شخص گنہگار ہوگا، اور جھوٹی گواہی کے متعلق پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے کہ: جھوٹی گواہی کا جرم اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنے کے برابر ہے، اسی لئے جھوٹی گواہی کو"اکبر الکبائر" یعنی: بڑے گناہوں میں شمار کیا گیا ہے۔

اس آیت کریمہ میں جس گواہی کا ذکر ہے اس میں ہر قسم کی وہ گواہیاں داخل ہیں جن سے ہمیں روزمرہ واسطہ پڑتا ہے، اور جن میں اکثر لوگ غلطیاں کرتے ہیں، مثال کے طور پر کسی بیمار کے حق میں ڈاکٹری سرٹیفکیٹ کو گواہی کی حیثیت حاصل ہے، مگر عموماً ایسا سرٹیفکیٹ جھوٹا ہوتا ہے، کوئی ملازم اپنی ڈیوٹی ادا کرنے کا اہل ہے یا نہیں اس کی تصدیق ڈاکٹر ہی کرسکتا ہے اگر وہ روپے پیسے لے کر غلط سرٹیفکیٹ جاری کرتا ہے تو یہ چیز تقویٰ اور عدل وانصاف کے خلاف ہے اور ایک قسم کی جھوٹی گواہی ہے، اسی طرح طالب علموں کو جاری کی جانے والی کامیابی کی سند کو بھی گواہی کی حیثیت حاصل ہے، ادارہ کا ممتحن اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ فلاں طالبعلم فلاں ڈگری کا اہل ہے، اور اگر کسی حیلے بہانے سے غلط ڈگری جاری ہوتی ہے تو یہ متعلقہ ادارے کی طرف سے جھوٹی

گواہی ہی تصور ہوگی، اگر نااہل آدمی کو رشوت یا سفارش کی بناء پر بغیر اہلیت کے ڈپلوما، سرٹیفکیٹ یا ڈگری جاری ہوتی ہے تو اس کا نتیجہ کبھی اچھا نہیں نکلے گا، جھوٹی ڈگری حاصل کرنے والا آدمی دنیا میں گمراہی کے سوا کیا پھیلائے گا، اسی طرح دوکاندار کی طرف سے جاری کی جانے والی رسید بھی ایک قسم کی گواہی ہے اگر کم پیسے لے کر زیادہ کی رسید بنا کر دے گا تو یہ بھی جھوٹی گواہی ہوگی۔

ووٹ بھی ایک گواہی ہوتی ہے جو کسی اہل ہی کو دینا چاہئے، مگر غلط آدمی کے حق میں رائے دینا اس کے حق میں جھوٹی گواہی ہی کی طرح ہے، گواہی کا تقاضہ یہ ہے کہ ووٹ اہل آدمی کو دیا جائے۔

قرآن کریم نے اس مضمون پر کئی آیتوں میں مختلف عنوان سے زور دیا ہے، اور اس کی تاکید کی ہے کہ لوگ سچی گواہی دینے میں کوتاہی اور سستی نہ برتیں، ایک آیت میں نہایت وضاحت کے ساتھ یہ حکم دیا کہ گواہی کو نہ چھپاؤ اور جو شخص گواہی چھپائے گا اس کا دل گناہگار ہوگا، جس سے سچی گواہی دینا واجب اور اس کا چھپانا سخت گناہ ثابت ہوا۔

لیکن اس کے ساتھ ہی قرآن کریم نے اس پر بھی نظر رکھی ہے کہ لوگوں کو سچی گواہی دینے سے روکنے والی چیز دراصل یہ ہے کہ گواہ کو بار بار عدالتوں کی حاضری اور فضول قسم کی وکیلانہ جرح سے واسطے پڑتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جس شخص کا نام کسی گواہی میں آ گیا، گویا وہ ایک مصیبت میں پھنس گیا، اپنے کاروبار سے گیا اور مفت کی پریشانی میں مبتلا ہوا، اس لئے قرآن کریم نے جہاں سچی گواہی دینے کو لازم قرار دیا وہیں یہ بھی ارشاد فرما دیا ہے کہ معاملہ کی تحریر لکھنے والوں اور گواہوں کو نقصان نہ پہنچایا جائے۔

آج کی عدالتوں اور ان میں پیش ہونے والے مقدموں کی اگر صحیح تحقیق کی جائے تو معلوم ہوگا کہ واقعہ کے سچے گواہ بہت کم ملتے ہیں، سمجھدار آدمی جہاں کوئی ایسا واقعہ دیکھتا ہے وہاں سے بھاگتا ہے کہ کہیں گواہی میں نام نہ آ جائے، پولیس اِدھر اُدھر کے گواہوں سے خانہ پری کرتی ہے اور نتیجہ اس کا وہی ہوسکتا ہے جو دن رات دیکھنے میں آ رہا ہے کہ سو میں سے دس پانچ مقدمات میں بھی حق و انصاف پر فیصلہ نہیں ہوسکتا، اور عدالتیں بھی مجبور ہیں جیسی گواہیاں ان کے پاس پہنچتی ہیں وہ انہی کے ذریعہ کوئی نتیجہ نکال سکتی ہیں اور انہیں کی

بنیاد پر فیصلہ کر سکتی ہیں۔

اگر گواہوں کو کسی قسم کا کوئی نقصان نہ پہنچایا جائے تو اچھے بھلے نیک اور سچے لوگ قرآنی تعلیمات کے پیش نظر گواہی میں آنے سے نہ رکیں گے، مگر جو کچھ ہو رہا ہے وہ یہ ہے کہ معاملہ کی ابتدائی تحقیق جو پولیس کرتی ہے وہ ہی بار بار بلا کر گواہوں کو اتنا پریشان کرتی ہے کہ وہ آئندہ اپنی اولاد کو کہہ مرتا ہے کہ کبھی کسی معاملہ کے گواہ نہ بننا، پھر اگر معاملہ عدالت میں پہنچتا ہے تو وہاں تاریخوں پر تاریخیں لگتی ہیں ہر تاریخ پر گواہ کو اپنے نہ کیے ہوئے گناہ کی سزا بھگتنی پڑتی ہے، کارروائی کے اس لمبے چوڑے قانون نے ہماری عدالتوں اور محکموں کو گندہ کیا ہوا ہے، پرانے سادہ طریقے جو آج بھی حجاز اور دوسرے ملکوں میں رائج ہیں اس کی وجہ سے نہ مقدموں کی اتنی بھرمار ہو سکتی ہے اور نہ ان میں اتنا وقت لگ سکتا ہے اور نہ گواہ کو گواہی دینا مصیبت بن سکتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ گواہی کے ضابطے اور اس کی کارروائی کو اگر قرآنی تعلیمات کے مطابق بنایا جائے تو اس کی برکتیں آج بھی آنکھوں سے دیکھی جانے لگیں گی، اس آیت سے سمجھ آیا کہ ایک طرف تو واقعہ سے باخبر لوگوں پر سچی گواہی ادا کرنے کو لازم قرار دیا ہے تو دوسری طرف لوگوں کو ایسی ہدایتیں دے دی ہیں کہ گواہوں کو بلا وجہ پریشان نہ کیا جائے، کم سے کم وقت میں ان کا بیان لے کر فارغ کر دیا جائے

لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۗ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى: عدل وانصاف کی اہمیت کے پیش نظر فرمایا کہ کسی قوم کی دشمنی تمہیں ناانصافی پر آمادہ نہ کرنے پائے، بلکہ ہمیشہ انصاف کا دامن پکڑے رہو، عدل کے بغیر کوئی نظام درست نہیں ہو سکتا، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان مبارک ہے کہ: کوئی اپنا ہو یا بیگانہ، قریبی ہو یا اجنبی، رشتہ دار ہو یا پڑوسی ہر ایک کے ساتھ ایک جیسا برتاؤ کرو، کسی کے ساتھ رورعایت نہ کرو کہ یہ عدل کے خلاف ہے، برخلاف اس کے عدل کرو، عدل کرنا خدا ترسی سے قریب تر ہے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو کیونکہ اللہ تعالیٰ تمہارے ہر کاموں سے باخبر ہیں۔

اچھے اور بُرے لوگوں کا انجام

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ
وعدہ کیا اللہ نے ان سے جو ایمان لائے اور کام کئے نیک لئے ان کے بخشش کا

وَّ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ
اور اجر کا بڑے (۹) اور جنہوں نے کفر کیا اور جھٹلایا آیتوں ہماری کو یہی وہ لوگ

اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ۝
ساتھی دوزخ کے (۱۰)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اللہ نے ایمان والوں سے اور نیک عمل کرنے والوں سے وعدہ کیا کہ ان کیلئے بخشش اور بڑا ثواب ہے۔(۹) اور جن لوگوں نے کفر کیا اور ہماری آیتیں جھٹلائیں وہ دوزخ والے ہیں۔(۱۰)

لفظی تحقیق: اَصْحٰبُ: دوست، ساتھی: "صَاحِبٌ" کی جمع ہے، "صَاحِبٌ" کے معنٰی ہیں: ساتھ رہنے والا ساتھی، اس کے معنی صرف "والے" کے بھی ہوتے ہیں، جیسے: "صَاحِبُ الْمَالِ" مال والا "صَاحِبُ الْعِزَّةِ" عزت والا، ایسے ہی "صَاحِبُ الْجَحِيْمِ" دوزخ والا، اس کی جمع "اَصحَابُ الْجَحِيْمِ" ہوئی، یعنی: دوزخ والے۔

تفسیر

اس آیت میں اچھے لوگوں سے اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ ان کی خطائیں اپنی رحمت سے معاف کردیں گے اور صرف یہی نہیں بلکہ یہ وعدہ بھی ہے کہ ان کے نیک کاموں کے بدلے انہیں بڑے بڑے انعام دیئے جائیں گے اور وہ جنت میں بڑے آرام وچین سے خوش رہیں گے۔

اس لئے یہ ہرگز نہ سمجھنا چاہئے کہ نیک کاموں کا دنیا میں کوئی پھل نہیں، اللہ تعالیٰ نیک کام کرنے والوں کو دنیا میں بھی غلطیوں سے بچا کر سیدھے راستے پر چلائیں گے اور پھر آخرت میں بھی ان پر بڑے بڑے انعام ہوں گے اور وہ ہمیشہ خوش رہیں گے۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ: جن لوگوں نے ہمارا انکار کر دیا اور قرآن کریم کی آیتوں کو جھوٹا قرار دیا، اور ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی نصیحت نہ مانی وہ لوگ اچھی طرح سمجھ لیں کہ ان کی نادانیوں کا نتیجہ اچھا نہ ہوگا، دنیا میں تو ان کو شاید کچھ ڈھیل دے بھی دی جائے اس لئے کہ شاید وہ کبھی نہ کبھی عقل سے کام لے کر ایمان لے آئیں اور کفر چھوڑ دیں، لیکن اگر وہ کفر کی حالت میں مر گئے تو وہ بری طرح دوزخ کا ایندھن بنیں گے۔

اللہ تعالیٰ کے حکم کو پورا کرنے والے اور نافرمانی کرنے والے اپنا اپنا انجام بھی سن لیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں سے وعدہ کیا ہے جو ایمان لائے ہیں اور انہوں نے نیک کام کیئے ہیں، کامیابی کی بنیاد تو یہی دو چیزیں ہیں، یعنی: ایمان اور نیک عمل، اللہ تعالیٰ کو ایک ماننا، اسکی کتابوں، پیغمبروں اور آخرت کے دن پر ایمان لانا اور پھر نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور جہاد جیسے نیک عمل کو اختیار کرنا، ایسے لوگوں کے متعلق فرمایا کہ: یقیناً انہیں بخشش حاصل ہوگی، اللہ تعالیٰ چھوٹی موٹی کوتاہیاں معاف فرمادیں گے کچھ ایمان کی وجہ سے اور کچھ نیک کاموں کی وجہ سے، بہر حال ایسے لوگوں کیلئے بخشش کے علاوہ بہت بڑے اجر کی خوشخبری بھی ہے؛ برخلاف اس کے جن لوگوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا توحید کے بجائے شرک کو اختیار کیا، اخلاص کے بجائے دوغلا پن اختیار کیا اور عملوں میں خلوص کے بجائے ریاکاری کی اور اللہ تعالیٰ کی آیتوں کو جھٹلایا یا تو زبان سے یا پھر مانتے ہوئے بھی عمل نہ کر کے عمل سے جھٹلایا اور اس طرح منافقوں کا طریقہ اختیار کیا تو ایسے لوگ ہی دوزخ میں جانے والے لوگ ہیں، دنیا میں کتنی بھی عیش وعشرت کی زندگی گزار لیں ہر طرح کی آرام وراحت حاصل کرلیں مگر آخرت میں یہ دوزخ کا ایندھن بنیں گے، ان کا حشر ایسا ہی ہوگا جیسا کہ پچھلی سورۃ میں گزر چکا ہے کہ جو کوئی غیروں کا طریقہ اختیار کرے گا ہم اس کا رُخ ادھر ہی پھیر دیں گے جدھر وہ جانا چاہتا ہے، اور بالآخر وہ دوزخ میں پہنچ جائے گا جو بہت برا ٹھکانہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کا احسان

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ هَمَّ
اے | وہ لوگو جو | ایمان لائے ہو | یاد کرو | نعمت کو | اللہ کی | اوپر اپنے | جب | ارادہ کیا

قَوْمٌ اَنْ يَّبْسُطُوْۤا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ ۚ
کچھ لوگوں نے | کہ | بڑھائیں | طرف تمہاری | ہاتھ اپنے | پس روک دیا | ہاتھوں ان کے کو | سے تم

ع ۲ ۶ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۟﴿۱۱﴾
اور | ڈرو | اللہ سے | اور | اوپر | اللہ ہی کے چاہئے کہ بھروسہ کریں | مسلمان | (۱۱)

بامحاورہ ترجمہ: اے ایمان والو! اپنے اوپر اللہ کا احسان یاد رکھو جب لوگوں نے ارادہ کیا کہ تم پر ہاتھ اٹھائیں، اس نے ان کے ہاتھ تم سے روک دیئے، اور اللہ سے ڈرتے رہو اور ایمان والوں کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہئے۔ (۱۱)

لفظی تحقیق: هَمَّ: ارادہ کیا، قصد کیا۔ "هَمٌّ" سے بنا ہے، جس کے معنی ہیں ارادہ کرنا، قصد کرنا، چاہنا۔ يَّبْسُطُوْۤا: وہ پھیلائیں۔ "بَسْطٌ" سے ہے، جس کے معنی ہیں: پھیلانا، بڑھانا۔ اَيْدِيَ: ہاتھ۔ ہاتھ پھیلانے سے مراد یہ ہے کہ تم کو ستائیں، تم سے لڑیں، تم پر حملہ کریں۔ كَفَّ: روک دیا۔ "كَفٌّ" سے ہے، جس کے معنی ہیں: روک دینا، الگ ہٹا دینا، ہاتھ روک دینے سے مراد یہ ہے کہ ان کو تمہیں ستانے نہ دیا اور تم پر حملہ کرنے سے انہیں روک دیا۔

تفسیر

اس آیت میں ایسی بات بتائی گئی ہے جس سے دشمنوں کے ساتھ انصاف کرنا آسان ہو جائے گا، اس میں

یہ گر بتایا گیا ہے کہ جب دشمن زیر ہو گیا تو یہ سوچنا چاہئے کہ اگر اللہ تعالیٰ اُس کو کامیابی دیتے تو ہماری کیا گت بنتی؟ یہ اللہ تعالیٰ کا بڑا احسان ہے کہ ہمارے دشمن کو ہمارے اوپر قابو نہیں دیا اس کا شکر اس طرح ادا کرنا چاہئے کہ دشمن پر قابو پانے کے بعد اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق احسان کریں اور عدل وانصاف سے کام لیں، اگر تمہارے دل میں یہ وسوسہ گذرے کہ دشمن کو معاف کر دینے سے لوگ ہمارے اوپر شیر ہو جائیں گے اور اس معاف کر دینے کو ہماری کمزوری سمجھیں گے تو اس اندیشے کو دل سے نکال دو، کیونکہ جس خدا نے تم لوگوں کو ان لوگوں کے ہاتھوں سے پہلے بچایا وہی دوبارہ بھی بچائیں گے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو تاکید کی ہے کہ لوگوں سے مت ڈرو، بلکہ خدا سے ڈرو، اور یاد رکھو! کہ مسلمانوں کا اصلی ہتھیار یہی ہے کہ وہ ہر معاملہ میں صرف اللہ تعالیٰ ہی پر بھروسہ کرتے ہیں۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے خطاب کر کے اپنی عطا کردہ نعمتوں کا شکریہ ادا کرنے کا حکم دیا، ان نعمتوں میں حلال وحرام کی تعلیم، ایمان کی دولت، نیک عمل کی توفیق، عدل وانصاف کا حاصل ہونا ہیں، کوئی چھوٹا انعام ہے کوئی بڑا انعام ہے، ان سب پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہئے، چنانچہ ارشاد ہے کہ: اے مسلمانو! اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد کرو جو اس نے تم پر کیں، یہاں پر ایک خاص واقعہ کی طرف اشارہ ہے کہ دیکھو! اللہ تعالیٰ نے تم پر احسان کیا جب ایک قوم نے تم پر ہاتھ اٹھانا چاہا، "تفسیر مظہری" کے مطابق پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام قبیلہ غطفان کو گھیرے میں لئے ہوئے تھے اس دوران مسلمانوں نے ظہر کی نماز ادا کی، بعد میں کافروں کو بڑا افسوس ہوا کہ ان سے غلطی ہوگئی جب مسلمان نماز میں مصروف تھے تو ان پر ایکدم حملہ کر دینا چاہئے تھا، پھر سوچا کوئی بات نہیں ابھی عصر کی نماز آنے والی ہے اور یہ نماز مسلمانوں کو اپنی اولاد سے بھی زیادہ عزیز ہے، اسے وہ ضرور ادا کریں گے اور ہم اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان پر نماز کی حالت میں ہی ٹوٹ پڑیں گے، ادھر اللہ تعالیٰ نے خاص احسان فرمایا کہ وحی کے ذریعہ نماز خوف پڑھنے کی اجازت دیدی جس کی وجہ سے مسلمانوں نے نماز بھی ادا کرلی اور دشمن سے بچاؤ بھی کرتے رہے۔

نمازِ خوف کے طریقہ کے مطابق مجاہدین دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے ایک گروہ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی امامت میں آدھی نماز ادا کی اور اس دوران دوسرا گروہ محاذ پر کھڑا رہا، پھر پہلا گروہ محاذ پر چلا گیا اور دوسرے گروہ نے محاذ سے آکر آدھی نماز پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ادا کی، اس طرح ہر دو گروہوں نے آدھی آدھی نماز جماعت کے ساتھ اور باقی آدھی آدھی اکیلے اکیلے ادا کی اس طرح نماز بھی ادا ہو گئی اور دشمن کو حملہ کرنے کا موقع بھی نہ ملا، اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کی طرف اشارہ کر کے احسان جتلایا ہے کہ میری اس نعمت کو یاد کرو کہ جب ایک قوم نے تمہیں نیست و نابود کرنے کا ارادہ کیا پس ہم نے ان کے ہاتھ تمہاری طرف بڑھنے سے روک دیئے۔

مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ اللہ تعالیٰ پر ہی بھروسہ رکھیں، بیشک ہتھیار اور دوسرے ذریعے استعمال کرو، مگر نتیجے کیلئے بھروسہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ پر ہی رکھو، کیونکہ کسی چیز میں اثر پیدا کرنا اسی کے قبضہ میں ہے وہ جب چاہیں گے تمہارے لئے اچھے نتیجے پیدا فرمادیں گے اگر وہ نہیں چاہیں گے تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا، لہٰذا سارے سببوں کو استعمال کرنے کے بعد نتیجے کیلئے بھروسہ اللہ تعالیٰ پر ہی ہونا چاہئے، ہر چیز کو چلانے والے اللہ ہی ہیں، وہ جس ذریعہ سے کام لینا چاہیں گے از خود لے لیں گے، تم پورے خلوص کے ساتھ ہمت کے مطابق اپنا فرض ادا کرو اور اس کے بعد اسے اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دو کہ ایمان والوں کی یہی شان ہے۔

"سورۂ مائدۃ" کی ساتویں آیت میں یہ مضمون ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ایک عہد لینے اور ان کے ماننے اور قبول کر لینے کا ذکر فرمایا ہے، یہ عہد خدا اور پیغمبر کی اطاعت اور شرعی حکموں کی پیروی کا عہد ہے، جس کا عنوان "کلمہ طیبہ" "لَآ اِلٰهَ اِلاَّ اللهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللهِ" ہے اور ہر کلمہ پڑھنے والا مسلمان اس عہد کا پابند ہے، اس کے بعد کی آیت میں عہد کی بعض خاص خاص شرعی حکموں کا بیان ہے جس میں دوست دشمن سب کیلئے عدل و انصاف اور رواداری کی تعلیم دی گئی ہے، یہ عہد خود بھی اللہ تعالیٰ کا ایک بہت بڑا انعام ہے۔

بنی اسرائیل کا عہد

وَ لَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۚ وَ بَعَثْنَا مِنْهُمُ

اور بیشک لیا اللہ نے عہد بنی اسرائیل سے اور کھڑے کئے ہم نے میں سے ان

اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا ؕ وَ قَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مَعَكُمْ ؕ لَئِنْ اَقَمْتُمُ

بارہ (۱۲) سردار اور کہا اللہ نے بیشک میں ساتھ ہوں تمہارے ضرور اگر قائم کی تم نے

الصَّلٰوةَ وَ اٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَ اٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَ عَزَّرْتُمُوْهُمْ

نماز اور دیتے رہے تم زکوۃ اور ایمان لائے تم پر پیغمبروں میرے اور مدد کی تم نے ان کی

وَ اَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَ

اور قرض دیا تم نے اللہ کو قرض اچھا تو ضرور دور کروں گا سے تم برائیاں تمہاری اور

لَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ فَمَنْ كَفَرَ

ضرور داخل کروں گا تم کو ایسے باغوں میں کہ بہتی ہونگی ان سے نیچے ان کے نہریں پس جس نے کفر کیا

بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴿۱۲﴾

بعد اس کے میں سے تم پس تحقیق بھٹکا وہ سیدھے راستے سے (۱۲)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل سے عہد لے چکے ہیں اور ہم نے مقرر کئے ان میں سے بارہ سردار، اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں تمہارے ساتھ ہوں اگر تم نماز قائم رکھو گے اور زکوۃ دیتے رہو گے اور ایمان لاؤ گے میرے پیغمبروں پر اور ان کی مدد کرو گے اور قرض دو گے اللہ کو اچھی طرح کا قرض، تو میں البتہ دور کروں گا تم سے تمہارے گناہ اور داخل کروں گا تم کو باغوں میں کہ جن کے نیچے نہریں بہتی ہونگی، پھر جو کوئی اس کے بعد تم میں سے کافر ہوا تو وہ بیشک سیدھے راستے سے گمراہ ہوا۔ (۱۲)

لفظی تحقیق: بَعَثْنَا: مقرر کیے ہم نے۔ "بَعْثٌ" سے بنا ہے جس کے معنٰی ہیں اٹھانا، کھڑا کرنا، مقرر کرنا۔ عَزَّرْتُمُوْهُمْ: مدد کی تم نے ان کی۔ "عَزْرٌ" سے بنا ہے جس کے معنٰی ہیں قوت، مدد، تائید۔ اَقْرَضْتُمُ: "اِقْرَاضٌ" سے ہے، جس کے معنٰی ہیں قرض دینا، قرض کے معنٰی ہیں: کسی کو روپیہ دینا اس خیال سے کہ اس کا کام نکل جائے "قرض حسن" وہ قرض ہے جس میں دوسرے کو فائدہ پہنچانا منظور ہو اور اپنے فائدے کا لالچ نہ ہو، اس کو غلطی سے "قرض حسنة" لکھتے اور بولتے ہیں صحیح لفظ "قرض حسن" ہے، "قرض": کے معنی روپیہ دینا "حسن": کے معنی اچھا۔

تفسیر

اب پچھلی قوموں کا حال بتا کر نصیحت کی جاتی ہے کہ تم ایسا نہ کرنا جیسا انہوں نے کیا، ارشاد ہے کہ: اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے بنی اسرائیل، یعنی: یہودیوں سے عہد لیا اور ان میں بارہ سردار مقرر کر دیئے کہ ان کو عہد پورا کرنے کی تاکید کی، اور کہا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔

اللہ تعالیٰ کا ساتھ اس صورت میں نصیب ہوسکتا ہے جب ان چیزوں پر عمل ہو جس کو اللہ تعالیٰ نے یہاں بیان فرمایا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے۔

(۱)....اگر تم برابر نماز پڑھتے رہے۔

(۲)....زکوٰۃ دیتے رہے۔

(۳)....میرے پیغمبروں پر ایمان لاتے رہے اور ان کی مدد اور تائید کرتے رہے۔

(۴)....اللہ تعالیٰ کے دین کے پھیلانے کیلئے مال خرچ کرتے رہے جس کو یہ سمجھا جائے گا کہ تم اللہ تعالیٰ کو قرض دے رہے ہو اور دنیا کا فائدہ حاصل کرنا نہیں چاہتے۔

اس کے بعد ارشاد ہے کہ: جو یہ باتیں پوری نہ کرے گا وہ گمراہ ہوگا اور سیدھے راستے سے ہٹا ہوا ہوگا۔

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد لیا اور ان میں بارہ سردار مقرر کئے، چونکہ بنی اسرائیل کے بارہ خاندان تھے، لہٰذا ہر خاندان کیلئے ایک سردار مقرر کیا گیا، "**نقب**" سوراخ کو کہتے ہیں، اور "**تنقیب**" کا معنیٰ کریدنا، دیکھ بھال کرنا، حفاظت اور نگرانی کرنا ہوتا ہے اسی لئے "**نقیب**" سردار یا سرکردہ آدمی کیلئے بولا جاتا ہے کیونکہ وہ اپنے خاندان، قبیلے یا گروہ کا سربراہ محافظ یا نگران ہوتا ہے اور ان کے حالات کی کھود کرید کرتا رہتا ہے، طلباء کے مانیٹر کیلئے بھی "**نقیب**" کا لفظ بولا جاتا ہے کہ وہ جماعت کی دیکھ بھال یا نگرانی کرتا ہے، یہاں جس عہد کا ذکر کیا جارہا ہے یہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے سے لیا تھا جس کا خلاصہ آگے آرہا ہے۔

جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کیلئے بارہ سردار مقرر فرمائے تھے، اسی طرح پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی مدینہ کے انصار کے بارہ سردار مقرر فرمائے تھے، مدینہ کی ہجرت سے پہلے مدینہ کے دو بڑے خاندانوں "اوس" اور "خزرج" نے اسلام قبول کرلیا تھا، جب وہ لوگ اسلام قبول کرنے کیلئے مکہ مکرمہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آئے تو آپ نے ان کے معاملوں کی دیکھ بھال اور مکہ مکرمہ سے رابطہ قائم رکھنے کیلئے بارہ سردار مقرر فرمائے تھے، "خزرج" بہت بڑا خاندان تھا، لہٰذا اس میں سے نو اور قبیلہ "اوس" سے تین سردار مقرر فرمائے، یہ لوگ مدینہ میں اسلام کی تبلیغ کرتے تھے اور مسلمانوں کی طرف سے حکموں کے پورا کرنے کی نگرانی کرتے تھے، جب کسی معاملہ میں ہدایات کی ضرورت محسوس کرتے تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہدایات حاصل کرتے۔

بہرحال اللہ تعالیٰ نے بنی اسرئیل سے عہد لیا اور بارہ سردار مقرر فرمائے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: میں تمہارے ساتھ ہوں، یعنی: اگر تم نے عہد کی پابندی اختیار کی تو میری شفقت اور مہربانی تمہارے ساتھ ہوگی، تمہیں بلند درجے نصیب ہوں گے اور تم کامیاب ہوجاؤ گے، اللہ تعالیٰ کا فرمان بہت بڑی قدر و قیمت رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ میں تمہارے ساتھ ہوں تو پھر کس چیز کی کمی رہ جاتی ہے؟ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے کہا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں مگر یہ قوم اپنے عہد پر قائم نہ رہ سکی، جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے ہاں عذاب کی مستحق ٹھہری۔

اس قسم کی کئی مثالیں قرآن پاک میں ملتی ہیں، جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو مصر سے لے کر نکل کھڑے ہوئے تو آگے سمندر آ گیا اور پیچھے فرعون کی فوج آ رہی تھی، قوم سخت پریشان ہوگئی تو اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: گھبراؤ نہیں، بیشک میرا رب میرے ساتھ ہے، ہجرت کی ابتداء میں جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم غارِ ثور میں چلے گئے تو کافر بھی آپ کا پیچھا کرتے ہوئے غار تک پہنچ گئے اس موقع پر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پر گھبراہٹ کی کیفیت طاری ہوئی تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی فرمایا تھا کہ: گھبراؤ نہیں، بیشک اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہیں، ہم اسی کے حکم سے نکلے ہیں اور اس کی مدد ہمارے ساتھ ہے وہ خود ہماری حفاظت فرمائیں گے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام جیسے باعمل لوگوں کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے ساتھ ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے ساتھ ہونے کا وعدہ اس وقت تھا جب لوگ اس پر صاف دل سے ایمان رکھتے تھے اور صاف نیت سے اس کے حکموں پر عمل کرتے تھے، مگر آج وہ چیز کہاں ہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی مدد ساتھ ہوتی ہے؟ جب مخلوق اپنے عہد پر قائم نہیں رہی تو اللہ تعالیٰ کی مدد کیسے حاصل ہوگی؟ وہ ہمارے تمام کاموں کو جانتے ہیں، ہمارے عملوں کو دیکھ رہے ہیں اور ہماری نیت اور ارادے سے واقف ہیں، لہٰذا اللہ تعالیٰ کا ساتھ اس وقت حاصل ہوگا جب ہم صاف نیت کے ساتھ اس کے حکموں کو پورا کرنے کی ٹھان لیں۔

آگے اللہ تعالیٰ وہ باتیں بیان فرما رہے ہیں جن کو پورا کرنے سے اللہ تعالیٰ کا ساتھ نصیب ہو سکتا ہے، اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کے بعد نماز اور زکوٰۃ اہم ترین اسلام کے رکن ہیں، قرآن پاک میں ان دو چیزوں کی بار بار تاکید کی گئی ہے، مسلمانوں کے گروہ میں شامل ہونے کی یہ دو ظاہری نشانیاں ہیں، نماز بدنی عبادت ہے اور اس کا تعلق اللہ کے حقوق سے ہے، زکوٰۃ مالی عبادت ہے اور اس کا تعلق بندوں کے حقوق سے ہے، نماز میں پاکی اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کی کیفیت جیسی صفت پائی جاتی ہیں کیونکہ پاکی کے بغیر نماز ادا نہیں ہو سکتی اور اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی کے اظہار کا یہ بہترین ذریعہ ہے، زکوٰۃ کے عمل میں سخاوت کی صفت پائی جاتی ہے، زکوٰۃ دینے والا شخص غریبوں کی مدد اور تمام مسلمانوں سے ہمدردی رکھتا ہے۔

اس آیت کریمہ میں نماز اور زکوٰۃ کو پہلے بیان کیا ہے اور ایمان کا ذکر بعد میں کیا گیا ہے حالانکہ ایمان ہی ہر عمل کی بنیاد ہے اور اس کا ذکر پہلے ہونا چاہئے تھا مگر یہاں پر بات یہ سمجھائی جارہی ہے کہ نماز اور زکوٰۃ کا اس وقت تک کچھ فائدہ نہیں جب تک ایمان درست نہیں ہے یہ بھی بیان کا ایک طرز ہے کہ ایمان میں زرو پیدا کرنے کیلئے اس کو بعد میں ذکر کیا گیا ہے، مطلب یہ ہے کہ نیکی کی قدرو قیمت ایمان کے ساتھ ہے، جو شخص صحیح ایمان سے محروم ہے اس کی لمبی لمبی نمازیں، صدقہ وخیرات اور نیکی کے دوسرے کام بیکار ہیں، ایمان کے بغیر کامیابی حاصل نہیں ہوسکتی۔

ارشاد ہے کہ: میرے پیغمبروں پر صرف زبانی ایمان لانا کافی نہیں بلکہ ایمان کے ساتھ ساتھ اگر تم ان کی حمایت کروگے، پیغمبروں کی لائی ہوئی شریعت کو مضبوط کرنے کا سبب بنوگے تو اللہ تعالیٰ تمہارے گناہوں کو مٹادیں گے، اس آیت میں اللہ تعالیٰ کو قرض دینے کے بارے میں جو ذکر کیا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی رضا کیلئے غریبوں اور مسکینوں پر خرچ کرنا، ان کو صدقہ وخیرات دینا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم ان تمام باتوں پر عمل کروگے تو میں تمہارے گناہوں کو مٹادوں گا، تمہاری خطاؤں سے درگزر کروں گا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہیں باغوں میں داخل کروں گا، ایسے باغات میں تمہارا ٹھکانہ ہوگا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، مگر یہ بھی یاد رکھو! ان حکموں پر عمل کرنے کے عہد کے بعد جس شخص نے انکار کیا تو وہ سیدھے راستے سے بھٹک گیا۔

بنی اسرائیل کا عہد توڑنا

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَ جَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً ۚ

پس بوجہ توڑنے ان کے عہد اپنا لعنت کی ہم نے اور کردیا ہم نے دلوں ان کے کو سخت

يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ ۙ وَ نَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا

پھیرتے ہیں کلام کو سے ٹھکانوں اور بھول گئے بڑا حصہ سے اس کہ نصیحت کیے گئے تھے وہ

بِهٖ ۚ وَ لَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰی خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْهُمْ

ساتھ اسکے اور ہمیشہ مطلع ہوتے رہتے ہیں آپ اوپر دغا کے میں سے ان مگر تھوڑے میں سے ان

فَاعْفُ عَنْهُمْ وَ اصْفَحْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۱۳﴾

پس معاف کیجئے کو ان اور درگزر کیجئے بیشک اللہ پسند کرتے ہیں احسان کرنے والوں کو (۱۳)

بامحاورہ ترجمہ: سوان کے عہد توڑنے کی وجہ سے ہم نے ان پر لعنت کی، اور ہم نے ان کے دلوں کو سخت کر دیا کلام کو پھیرتے ہیں اس کے ٹھکانے سے اور اس نصیحت سے فائدہ اٹھانا بھول گئے جو ان کو کی گئی تھی، اور آپ ہمیشہ ان کے کسی نہ کسی دغا پر مطلع ہوتے رہتے ہیں سوائے ان میں سے تھوڑے سے لوگوں کے، سوان کو معاف کیجئے اور درگزر کیجئے، اللہ احسان کرنے والوں کو دوست رکھتے ہیں۔ (۱۳)

لفظی تحقیق: لَعَنَّا: لعنت کی ہم نے۔ لعنت کے معنی ہیں: دور کر دینا، مراد یہ ہے کہ ہم نے اپنی رحمت سے دور کر دیا۔ یُحَرِّفُوْنَ: پھیر دیتے ہیں۔: "تَحْرِیْفٌ" سے ہے، جو "حَرْفٌ" سے بنا ہے، "حَرْفٌ" کے معنی ہیں: کنارہ۔ "تَحْرِیْفٌ" کا مطلب ہے کسی چیز کو کنارہ پر لگا دینا، جگہ سے بے جگہ کر دینا۔ ذُكِّرُوْا: نصیحت کئے گئے۔ "تَذْكِیْرٌ" سے ہے، جو "ذِكْرٌ" سے بنا ہے، "ذِكْرٌ" کے معنی ہیں: یاد کرنا "تَذْكِیْرٌ" کا مطلب ہے یاد دلانا، فائدہ کی بات بتانا۔ اِصْفَحْ: درگذر کیجئے۔ "صَفْحٌ" سے بنا ہے، جس کا مطلب ہے اعراض کرنا، منہ پھیر لینا، خیال نہ کرنا، درگذر کرنا۔

تفسیر

ارشاد ہے کہ: یہودیوں نے عہد کر کے توڑ دیا اور جو کام اپنے ذمہ لیا تھا اسے چھوڑ دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ہماری رحمت سے محروم ہو گئے، اللہ تعالیٰ سے کیا ہوا عہد توڑنا سخت جرم ہے جو بھی یہ حرکت کرے گا اس کے وبال سے اس کا دل سخت ہو جائے گا اور اچھی بات اس پر اثر نہیں کرے گی، اور وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے محروم ہو جائے گا،

یہودیوں نے "تورات" کے الفاظ اور معنٰی بدل ڈالے اور اپنے فائدے کی باتوں کو بالکل بھلا دیا اور اپنی خواہشوں کی تابعداری میں ایسے بے خود ہوئے کہ بڑی بڑی کام کی باتوں کا ذرا بھی خیال نہ رہا، انہی میں سے ایک نصیحت یہ بھی تھی کہ آخری پیغمبر تمہارے پاس آئیں گے ان کا کہنا ماننا، اس کو انہوں نے بالکل ہی غائب کر دیا اور الفاظ کو ہیر پھیر کر کے کچھ اور ہی معنی بنالئے۔

اب ان کا یہ حال ہے کہ ان کی کوئی نہ کوئی شرارت ہر وقت آپ کے سامنے آتی رہتی ہے اور ان میں سے چند آدمیوں کے سوا جو ایمان لا چکے ہیں جیسے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی، باقی سارے کے سارے فریبی اور دغاباز ہیں، پھر بھی ان کی برائی کے بدلے احسان کیجئے اور ان سے کھلم کھلا جھگڑا نہ کیجئے، کیونکہ ہر وقت ملامت کرنے سے دشمن اور ضد میں آجاتا ہے، ان کے ساتھ اچھے برتاؤ کئے جائیے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کو احسان کرنے والے پسند ہیں۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آنے کی پیشن گوئیاں "تورات" میں بھی موجود تھیں، "تورات" میں تھا کہ وہ آخری پیغمبر فاران کی چوٹیوں سے آئے گا، دس ہزار پاک باز لوگوں کی جماعت کے ساتھ آئے گا، وہ دنیا کی قوموں سے محبت کرنے والا ہوگا، اور قومیں اس کے قدموں میں جمع کی جائیں گی، یہ تمام نشانیاں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں تھیں، مکہ مکرمہ کے فتح ہونے کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ دس ہزار صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین موجود تھے مگر یہودیوں نے "تورات" میں دس ہزار کے بجائے لاکھوں لکھ دیا، تاکہ یہ پیشن گوئی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ثابت نہ ہو سکے، اہل کتاب نے اللہ تعالیٰ کے کلام کے مطلبوں و معنوں کو غلط رنگ میں پیش کیا اور اس طرح وہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت سے مستقل طور پر محروم ہو گئے، انہیں "تورات" اور "انجیل" کے ذریعے نصیحت کی گئی تاکہ ان کے حالات درست ہو جائیں، مگر اس نصیحت سے فائدہ اٹھانا بھلا بیٹھے اور اللہ تعالیٰ کی کتاب سے کچھ فائدہ حاصل نہ کیا، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ: ان لوگوں کی پچھلی تبدیلیوں کے متعلق آپ کو بہت کچھ بتایا جا چکا ہے تاہم ان کی آئندہ تحریف کے متعلق فرمایا کہ: یہ لوگ جب بھی اللہ تعالیٰ کے کلام میں تبدیلی کریں گے،

آپ وقتاً فوقتاً ان کی اس خیانت، یعنی: تبدیلی کرنے پر بھی خبر پاتے رہیں گے، سارے اہل کتاب ایک جیسے نہیں ہیں انکی ایک تھوڑی سی تعداد اللہ تعالیٰ کی کتابوں میں تبدیلی نہیں کرتی، اللہ تعالیٰ نے پیغمبر ﷺ کو فرمایا کہ: اہل کتاب کی ان تمام تر خباثتوں کے باوجود آپ ان کو معاف فرمادیں اور درگزر فرمائیں، نیکی پر قائم رہیں کیونکہ بیشک اللہ تعالیٰ نیکی کرنے والوں کو پسند فرماتے ہیں۔

آیت میں یہ بتلایا گیا ہے کہ بنی اسرائیل نے اپنی بدبختی سے ان کھلی ہدایتوں پر کان نہ دھرے عہد کی مخالفت کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو طرح طرح کے عذابوں میں مبتلا فرمادیا، بنی اسرائیل پر ان کی بدعملی اور سرکشی کی سزا میں دو طرح کے عذاب آئے، ایک ظاہری اور محسوس جیسے ان پر خون اور مینڈکوں وغیرہ کی بارش یا پتھراؤ یا زمین کا تختہ الٹ دینا وغیرہ، جن کا ذکر قرآن کریم کی بہت سی آیتوں میں مختلف مقام پر آیا ہے، دوسری قسم عذاب کی پوشیدہ اور روحانی تھی کہ سرکشی کی سزا میں ان کے دل و دماغ الٹے ہو گئے، ان میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت نہ رہی، وہ اپنے گناہوں کے وبال میں مزید گناہوں میں مبتلا ہوتے چلے گئے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: ہم نے ان کے عہد کی خلاف ورزی کی سزا میں ان کو اپنی رحمت سے دور کر دیا اور ان کے دلوں کو سخت کر دیا کہ اب ان میں کسی چیز کی گنجائش نہ رہی، اسی رحمت سے دوری اور دلوں کی سختی کو قرآن کریم نے "سورۂ مطففین" میں "رَانَ" کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے، یعنی: قرآنی آیتوں اور کھلی ہوئی نشانیوں سے انکار کی وجہ یہ ہے کہ ان کے دلوں پر ان کے گناہوں کی وجہ سے زنگ بیٹھ گیا ہے، پیغمبر ﷺ نے ایک حدیث میں فرمایا کہ: انسان جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ لگ جاتا ہے جس کی برائی کو وہ ہر وقت ایسا محسوس کرتا ہے جیسے کسی صاف سفید کپڑے پر ایک سیاہ داغ لگ جائے وہ ہر وقت نظر کو تکلیف دیتا ہے، پھر اگر اس نے متنبہ ہو کر توبہ کرلی اور آئندہ گناہ سے باز آ گیا تو وہ نقطہ مٹا دیا جاتا ہے اور اگر اس نے پروا نہ کی بلکہ دوسرے گناہوں میں مبتلا ہوتا چلا گیا تو ہر گناہ پر ایک سیاہ نقطہ کا اضافہ ہوتا رہے گا، یہاں تک کہ اس کا پورا دل ان نقطوں سے بالکل سیاہ ہو جائے گا، اس وقت اس کے دل کی یہ حالت ہو جائے گی جیسے کوئی برتن اوندھا رکھا

ہو کہ اس میں کوئی چیز ڈالی جائے تو وہ فوراً باہر آجاتی ہے اس لئے کوئی خیر اور نیکی کی بات اس کے دل میں نہیں جمتی، زکے الٹ ہونے لگتا ہے کہ عیب کو ہنر، برائی کو نیکی، گناہ کو ثواب سمجھنے لگتا ہے اور اپنی سرکشی میں بڑھتا چلا جاتا ہے (اعاذنا اللہ)، یہ اس کے گناہوں کی نقد سزا ہے جو اس کو دنیا ہی میں مل جاتی ہے۔

بعض بزرگوں نے فرمایا ہے کہ: نیکی کا ایک نقد بدلہ یہ ہے کہ اس کے بعد اس کو دوسری نیکی کی توفیق ہوتی ہے، اسی طرح گناہ کی نقد سزا یہ ہے کہ ایک گناہ کے بعد اس کا دل دوسرے گناہوں کی طرف مائل ہونے لگتا ہے، ایک نیکی دوسری نیکی کو دعوت دیتی ہے اور ایک برائی دوسری برائی اور گناہ کو ساتھ لے آتی ہے۔

بنی اسرائیل کو عہد کے توڑنے کی نقد سزا یہ ملی کہ وہ خدا کی رحمت سے دور ہوگئے جو سب سے بڑا نجات کا ذریعہ تھا اور ان کے دل سخت ہوگئے جس کی نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے کلام کو اس کے ٹھکانے سے پھیر دیتے تھے، یعنی: خدا کے کلام میں تبدیلی کرتے تھے کبھی اس کے الفاظ میں اور کبھی معنیٰ میں اور کبھی تلاوت میں، تبدیلی کی یہ سب قسمیں قرآن کریم اور حدیث کی کتابوں میں بیان کی گئی ہیں، اس سزا کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو نصیحت ان کو کی گئی تھی اس سے فائدہ اٹھانا بھول گئے، اور پھر فرمایا کہ ان کی یہ سزا ان کے گلے کا ہار بن گئی۔

یہاں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا جارہا ہے کہ آپ ہمیشہ ان کے کسی فریب پر واقف ہوتے رہیں گے سوائے تھوڑے سے لوگوں کے جو پہلے اہل کتاب کے دین پر تھے، پھر سچے مسلمان ہوگئے، یہاں تک کہ بنی اسرائیل کی بدعملیوں اور بداخلاقیوں کا جو بیان گزرا، ظاہر میں اس کو سامنے رکھتے ہوئے چاہئے تو یہ تھا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ان سے انتہائی نفرت اور حقارت کا معاملہ فرمائیں، ان کو پاس نہ آنے دیں اس لئے آیت کے آخری جملہ میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت دی گئی ہے کہ آپ ان کو معاف کریں اور ان کی بدعملی سے درگزر فرمائیں ان سے نفرت صحیح نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو پسند فرماتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ ان کے ایسے حالات کے باوجود اپنے طبعی تقاضہ پر عمل نہ کریں، یعنی: نفرت نہ کریں، کیونکہ ان کی سخت دلی اور بے حسی کے بعد اگرچہ کسی وعظ و نصیحت کا ان کیلئے مؤثر ہونا دور کی بات ہے، لیکن رواداری اور اچھے اخلاق کا معاملہ ایسی چیز ہے کہ اس کے ذریعہ ان بے

حسوں میں بھی احساس پیدا ہوسکتا ہے اور ان میں احساس پیدا ہو یا نہ ہو بہر حال اپنے اخلاق و معاملے کو درست رکھنا تو ضروری ہے، اچھا برتاؤ کرنا اللہ تعالیٰ کو پسند ہے اس کے ذریعہ مسلمانوں کو تو اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہو ہی جائے گا۔

عیسائیوں کا حال

وَ مِنَ الَّذِیْنَ قَالُوْۤا اِنَّا نَصٰرٰۤی اَخَذْنَا مِیْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا حَظًّا

اور سے بے شک جو کہتے ہیں بیشک ہم ہیں نصاریٰ (عیسائی) لیا ہم نے عہد ان کا پھر بھول گئے وہ بڑا حصہ

مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۚ فَاَغْرَیْنَا بَیْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ اِلٰی

اسکا کہ جو نصیحت کیے گئے ساتھ اسکے پھر بھڑکا دی ہم نے درمیان ان کے دشمنی اور کینہ تک

یَوْمِ الْقِیٰمَةِ ؕ وَ سَوْفَ یُنَبِّئُهُمُ اللّٰهُ بِمَا كَانُوْا یَصْنَعُوْنَ ﴿۱۴﴾

دن قیامت کے اور عنقریب خبر دیں گے ان کو اللہ اس کی جو تھے وہ کرتے (۱۴)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور ان سے بھی ہم نے ان کا عہد لیا تھا جو اپنے آپ کو عیسائی کہتے ہیں پھر ان کو جو نصیحت کی گئی تھی اس سے فائدہ اٹھانا بھول ہی گئے، پھر ہم نے ان کے درمیان قیامت کے دن تک کیلئے دشمنی اور کینہ کو پیدا کر دیا، اور عنقریب اللہ ان کو جتا دیں گے جو کچھ وہ کرتے تھے۔ (۱۴)

لفظی تحقیق: اَغْرَیْنَا: بھڑکا دی ہم نے۔ "اِغْرَاءٌ" کا معنیٰ ہے: لگا دینا، پیدا کرنا۔ یُنَبِّئُ: اس کے معنیٰ ہیں: خبر دیتا ہے، مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو بتا دیں گے۔ یَصْنَعُوْنَ: کرتے ہیں۔ کوئی چیز بنانا، کوئی کام کرنا۔

تفسیر

اس آیت میں عیسائیوں کا ذکر ہے، ارشاد ہے کہ: ان لوگوں سے ہم نے عہد لیا کیونکہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام

کو مان چکے تھے اور یہ اس کا عہد ہے کہ ان کا کہنا مانیں گے لیکن آگے چل کر وہ بھی اپنے عہد کو توڑ بیٹھے اور یہودیوں کی طرح نافرمان بن گئے جو کچھ "انجیل" میں انہیں بتایا گیا تھا، ان میں سے اصلی باتیں بھول گئے اور ان کو بدل کر کچھ کا کچھ کر دیا، اور ان کے فائدوں سے محروم ہو گئے، سب سے بڑی بات اس میں یہ تھی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد آخری پیغمبر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لائیں گے ان کی مدد کرنا اور ان کی فرمانبرداری دل وجان سے کرنا، انہوں نے اس کا اپنی کتاب میں نام ونشان ہی نہ چھوڑا۔

کتاب کی اصل تعلیم کو بھلا دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ کوئی کچھ کہنے لگا کوئی کچھ، اور یہ آپس کا اختلاف اتنا بڑھا کہ آپس میں ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے، ایک طرف یہودیوں اور عیسائیوں کی آپس میں دشمنی ہو گئی اور دوسری طرف یہودی خود آپس میں ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے، ادھر عیسائیوں کے فرقے آپس میں لڑنے لگے، آپس کا ملاپ اللہ تعالیٰ کی کتاب پر عمل کرنے سے ہی پیدا ہوتا ہے، یہودیوں اور عیسائیوں کی کتابیں اصل شکل میں دنیا میں باقی نہ رہیں، اس لئے یہ دنیا کے ختم ہونے تک ہمیشہ ایک دوسرے سے آپس میں بھی لڑتے جھگڑتے ہی رہیں گے، کیونکہ اب کوئی چیز ان کے آپس کے جھگڑوں کو مٹانے والی باقی نہیں، اب ان کے سنبھلنے کا سوا اس کے کہ قرآن مجید کو مانیں کوئی اور طریقہ نہیں۔

عیسائی فرقوں میں آپس کی دشمنی

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے عیسائیوں کے عہد توڑنے کی یہ سزا بیان کی ہے کہ ان کے آپس میں اختلاف اور دشمنی ڈال دی گئی جو قیامت تک جاری رہے گی، اس پر آج کل کے عیسائیوں کے حالات سے یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ وہ تو سب آپس میں متحد نظر آتے ہیں؟

جواب یہ ہے کہ یہ حال ان لوگوں کا بیان کیا گیا ہے جو واقعی عیسائی ہیں اور عیسائی مذہب کے پابند ہیں اور ان کا اختلاف مشہور ہے۔

عیسائیوں میں اصل میں تین فرقے ہیں

ایک فسطوریہ: جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں۔ **دوسرا یعقوبیہ:** جو خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اور اللہ تعالیٰ کو ایک ہی مانتے ہیں۔ **تیسرا ملکائیہ:** جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تین خداؤں میں سے ایک مانتے ہیں، اور ظاہر ہے کہ اتنے بڑے عقائد کے اختلاف کیساتھ آپس کی دشمنی ضروری ہے۔

قرآن کریم کو مانو

يَاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا

اے کتاب والو! تحقیق آئے ہیں تمہارے پاس پیغمبر ہمارے ظاہر کرتے ہیں لئے تمہارے بہت کچھ میں سے اس

كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ۬ قَدْ جَآءَكُمْ

جو تھے تم چھپاتے سے کتاب اور درگزر کرتے ہیں سے بہت سی چیزوں بیشک آئی ہے پاس تمہارے

مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۵﴾ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ

طرف سے اللہ کی روشنی اور کتاب کھلی (۱۵) دکھاتے ہیں سے جس اللہ اسکو جو فرمانبرداری کرے

رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ

رضا اس کی کی راستے سلامتی کے اور نکالتے ہیں ان کو سے اندھیروں طرف روشنی کے

بِاِذْنِهٖ وَ يَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۶﴾

ساتھ حکم اپنے کے اور چلاتے ہیں ان کو طرف راہ کی سیدھی (۱۶)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اے کتاب والو! بیشک آئے ہیں تمہارے پاس ہمارے پیغمبر ظاہر کرتے ہیں تم پر بہت سی چیزیں جن کو تم کتاب میں سے چھپاتے تھے اور درگزر کرتے ہیں بہت سی چیزوں سے، بیشک تمہارے

پاس آئی ہے اللہ کی طرف سے روشنی اور ظاہر کرنے والی کتاب۔ (۱۵) جس سے اللہ اپنی رضا پر چلنے والوں کو نجات کے راستے دکھاتے ہیں اور اپنے حکم سے ان کو اندھیروں سے روشنی کی طرف نکالتے ہیں اور ان کو سیدھی راہ پر چلاتے ہیں۔ (۱٦)

لفظی تحقیق: یَعْفُوْا: درگزر کرنا۔ "عَفْوٌ" سے ہے جس کے معنیٰ مٹانے اور بند کر دینے کے ہیں۔ نُوْرٌ: روشنی: یہاں اس سے مراد پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں جو گمراہی کے اندھیروں کو دور کرنے والے ہیں۔ سُبُلَ: راستے۔ "سَبِيْلٌ" کی جمع ہے، جس کے معنیٰ: راہ اور راستے ہیں، "سُبُلَ السَّلٰمِ" امن و امان کے راستے جن میں کوئی دشواری یا مشکل پیش نہیں آتی۔ ظُلُمٰتُ: اندھیرے۔ "ظُلْمَةٌ" کی جمع ہے، یہاں اس سے گمراہیاں مراد ہیں۔

تفسیر

اس آیت میں ارشاد ہے کہ: اگر یہودی اور عیسائی اپنی زندگی کو سنوارنا اور امن و امان سے رہنا اور آخرت میں عذاب سے بچنا چاہتے ہیں تو ان کو چاہئے کہ ہمارا پیغام سنیں۔

وہ پیغام یہ ہے:

اے کتاب والو! تمہارے پاس یہ آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ کی کتاب، یعنی: قرآن مجید لے کر آئے ہیں جس میں بہت سی باتوں کو جنہیں تم بھلا چکے ہو اور جو کچھ بچی کچی ہیں ان کو چھپاتے پھرتے ہو، یہ ان کو صاف صاف ظاہر کرتے ہیں، اور ان لوگوں کیلئے جو اللہ تعالیٰ کی خوشی اور رضامندی حاصل کرنا چاہتے ہیں امن و امان اور سلامتی کے راستے بالکل کھل گئے ہیں، مسلمانوں کیلئے اس میں اور بھی سبق ہے کہ اس روشنی سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں۔

یہاں پر اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کو نصیحت فرمائی ہے کہ اگر تم عہد توڑنے کی لعنت اور اس کی سزا سے بچنا چاہتے ہو تو اس کا ایک ہی راستہ ہے کہ آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لے آؤ، چنانچہ ارشاد ہے کہ: اے اہل کتاب!

تمہارے پاس ہمارے پیغمبر آ گئے ہیں، یعنی: اللہ تعالیٰ کے آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھیجے جا چکے ہیں، اگر دنیا کی ذلت اور آخرت کی رسوائی سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہو تو ان کے دامن کو تھام لو، اس پیغمبر کی ایک خاص نشانی یہ ہے کہ وہ تمہارے سامنے بہت سی چیزیں ظاہر کرتے ہیں جسے تم کتاب میں سے چھپاتے تھے۔

یہودیوں کی طرف سے حق کے چھپانے کے سلسلے میں اسی سورۃ میں آگے آئے گا کہ وہ سنگساری کے حکم کو چھپاتے تھے، خود یہودیوں کے درمیان بدکاری کا ایک واقعہ پیش آ گیا وہ لوگ مسئلہ دریافت کرنے کیلئے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے مگر آپ نے انہی کے علماء سے دریافت کیا کہ تمہاری کتاب کے مطابق بدکاری کرنے والے کی سزا کیا ہے؟ انہوں نے "تورات" کے حکم کو چھپانے کی کوشش مگر اللہ تعالیٰ نے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کے ذریعہ اسے ظاہر فرما دیا کہ بدکاری کی سزا سنگساری ہے، آج بھی "بائبل" کے ترجمہ میں یہ موجود ہے کہ جو کوئی پڑوسی کی بیوی سے بدکاری کریگا وہ جان سے مارا جائے گا گویا "تورات" میں بھی بدکاری سزائے موت کا حقدار ہے۔

اسی طرح عیسائیوں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام مبارک اور آپ کی نشانیوں کو چھپانے کی کوشش کی، انہوں نے اپنی کتاب سے "فارقلیط" کا لفظ ہی نکال دیا، جس کا معنیٰ: احمد ہوتا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نشانیوں میں سے دس ہزار قدسیوں کے الفاظ میں بھی تحریف کر دی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تشریف لانے کے متعلق پیش گوئیوں کو مٹا دیا بلکہ اگر کوئی شخص ان سے پوچھتا کہ آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعض نشانیوں کو بتاؤ تو یہ بدبخت ایسی نشانیاں بتلاتے جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف پڑتیں، پچھلی سورۃ کی تفسیر میں یہ بات ظاہر ہو چکی ہے کہ جب مکہ کے مشرک ان یہودیوں سے پوچھتے کہ بتاؤ ہمارا دین سچا ہے یا مسلمانوں کا، تو یہ کہتے کہ تمہارا دین زیادہ بہتر ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: یہ لوگ کتابوں سے واقف ہیں، پیغمبروں کو جانتے ہیں مگر کس قدر خیانت دار، ضدی اور بددیانت ہیں کہ صرف اسلام سے دشمنی کی وجہ سے مشرکوں کی بت پرستی کو اچھا بتلاتے ہیں۔

"تورات" میں یہ آیت موجود تھی کہ اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کو چھ دنوں میں پیدا فرمایا مگر انہوں نے

اس کے آگے خود یہ بڑھا دیا کہ پھر ساتویں دن آرام کیا حالانکہ یہ کفر کا کلمہ ہے، آرام کی ضرورت تو اسے ہوتی ہے جو تھک جائے مگر اللہ تعالیٰ ان چیزوں سے پاک ہیں، انہوں نے اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھا، اس کی وضاحت اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں سورۃ "قٓ" میں فرمادی "ہم نے آسمان و زمین اور ان کے درمیان تمام چیزوں کو چھ دن میں پیدا کیا اور ہمیں کوئی تھکاوٹ نہیں ہوئی"، بہر حال یہ بھی ان کی طرف سے کتاب میں تحریف (کتاب میں ادل بدل کرنے) کی ایک مثال ہے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہت سی ایسی چیزوں کو بیان کر دیتے ہیں جن کو تم چھپاتے تھے۔

وَ يَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ: اللہ تعالیٰ بعض ضروری چیزوں کو ظاہر فرما دیتے ہیں کیونکہ ان کو ظاہر کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا مگر بعض غیر اہم چیزوں کو ظاہر نہیں فرماتے کیونکہ ان کو ظاہر کرنے میں ضرور کوئی نہ کوئی قباحت پائی جاتی ہے اور اس سے مزید الجھنیں پیدا ہو سکتی ہیں، یہ سب کچھ وحی کے ذریعے ہوتا ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے کہ یہ لوگ جس قدر خیانتیں کرتے ہیں آپ ان پر وقتاً فوقتاً واقف ہوتے رہیں گے۔

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ: اس آیت میں لفظ "نُوْرٌ" اور "كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ" خاص طور پر توجہ کے قابل ہیں، عام مفسرین کے نزدیک دونوں لفظوں سے ایک ہی چیز مراد ہے، یعنی: قرآن کریم "نُوْرٌ" بھی وہی ہے اور "كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ" بھی اسی کو کہا گیا ہے، "سورۃ نساء" کے آخر میں بھی "نُوْرٌ" کا لفظ انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے، اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے دلیل آچکی ہے اور ہم نے تمہاری طرف "نورِ مبین" بھی نازل فرمایا ہے گویا "نورِ مبین" سے مراد قرآن کریم ہی ہے، "سورۃ اعراف" میں بھی "نُوْرٌ" کا لفظ قرآن پاک کیلئے آیا ہے "اور انہوں نے اس نور کی پیروی کی جو اس کے ساتھ اتارا گیا اور یہی لوگ کامیابی حاصل کرنے والے ہیں" مطلب یہ کہ "نور" اور "کتاب" ایک ہی چیز ہے اور وہ ہے قرآن کریم اور یہ اس لحاظ سے "مبین" ہے کہ ہر چیز کو کھول کھول کر، یعنی: واضح طور پر بیان کرتا ہے۔

تاہم بعض مفسرین کرام ان دولفظوں کو دوالگ معنوں کیلئے مانتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ "نُوْرٌ" سے مراد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک ہے اور "کِتٰبٌ مُّبِیْنٌ" سے مراد قرآن کریم ہے، مگر زیادہ صحیح تفسیر پہلے بیان ہو چکی ہے اور اگر ان حضرات کے مطابق نور سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بھی لی جائے تو اس کا معنیٰ نورِ ہدایت ہوگا، یعنی: تمہارے پاس ہدایت کا نور اور واضح کتاب آ چکی ہے، قرآن کریم میں "نُوْرٌ" کے مختلف معنیٰ بیان ہوئے ہیں جیسا کہ پہلے عرض کیا ہے خود قرآن کریم کو بھی "نُوْرٌ" کہا گیا ہے، اسلام بھی "نُوْرٌ" ہے، "سورۂ زمر" میں ہے کہ "جس کا سینہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کیلئے کھول دیا وہ اپنے رب کی طرف سے عطا کئے گئے نور پر ہے" ایمان کے متعلق "سورۂ شوریٰ" میں موجود ہے کہ "آپ نہیں جانتے تھے کہ کتاب اور ایمان کیا چیز ہے مگر ہم نے اسے نور بنایا جس کے ذریعے ہم اپنے بندوں میں جسے چاہیں ہدایت دیتے ہیں" ویسے نور کا لفظ خود اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھی بولا گیا ہے، "سورۂ نور" میں موجود ہے کہ "اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کے نور ہیں" نور اللہ تعالیٰ کی صفت بھی ہے اور اس سے مراد ایسا نور ہے جو ظاہر ہے اور دوسری چیزوں کو ظاہر کرنے والا ہے، اللہ تعالیٰ کی اس صفت میں بھی کوئی اس کا شریک نہیں ہے بہر حال پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اس لحاظ سے نور ہیں کہ آپ کے ذریعے سے ہدایت، روشنی، ایمان، تقویٰ اور اطاعت ہوتی ہے، اس بات سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ اللہ تعالیٰ کے سارے نبی ہدایت کے نور ہیں، نبی کی پیروی آخرت میں چھٹکارے کا ذریعہ اور کفر کی توہین کا سبب ہوتا ہے۔

عیسائیوں کا غلط عقیدہ

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ؕ

البتہ کافر ہوئے وہ لوگ جنہوں نے کہا بیشک اللہ وہی ہے مسیح ہے جو بیٹا ہے مریم کا

قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْــًٔا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ

کہہ دیجئے پس کون مالک ہے سے اللہ کے آگے کسی چیز کا اگر ارادہ کریں کہ ہلاک کر دیں مسیح

ابْنَ مَرْيَمَ وَ اُمَّهٗ وَ مَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ؕ وَ لِلّٰهِ مُلْكُ

بن مریم کو اور ماں اسکی کو اور جو کوئی میں ہے زمین سب کو اور لئے اللہ کے سلطنت

السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا ؕ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ

آسمانوں کی اور زمین کی اور جو درمیان ان دونوں کے پیدا کرتے ہیں جو کچھ چاہیں اور اللہ

عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۷﴾

پر ہر چیز قادر ہیں (۱۷)

بامحاورہ ترجمہ:۔ بیشک کافر ہوئے وہ لوگ جنہوں نے کہا کہ اللہ تو وہی مریم کا بیٹا مسیح ہے، آپ کہہ دیجئے پھر کس کا بس چل سکتا ہے اللہ کے آگے اگر وہ چاہیں کہ ہلاک کرے مسیح بن مریم اور اس کی ماں کو، اور جتنے لوگ زمین میں ہیں سب کے سب کو، اور اللہ ہی کے واسطے آسمانوں اور زمین کی بادشاہت ہے اور جو کچھ ان دونوں میں ہے پیدا کرتے ہیں جو چاہیں اور اللہ ہر چیز پر قادر ہیں۔(۱۷)

لفظی تحقیق: كَفَرَ: کافر ہوئے: "كُفْرٌ" سے بنا ہے، کفر کے معنٰی ہیں: ٹھیک بات کو نہ ماننا جس بات کو بے غرض لوگوں کی عقل ٹھیک کہے اس سے انکار کردینا۔

تفسیر

اس آیت میں بعض عیسائیوں کا غلط عقیدہ بیان کیا گیا ہے اور اسے انسانی عقل کے خلاف کہا گیا ہے، عیسائیوں کا ایک فرقہ جسے "یعقوبیہ" کہتے ہیں یہی عقیدہ رکھتا ہے کہ اللہ تعالٰی دنیا کے اندر حضرت عیسٰی علیہ السلام کے روپ میں ظاہر ہوا ہے، عام عیسائی بھی ایسی باتیں کہتے ہیں جس کا صاف خلاصہ یہی نکلتا ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام ہی اللہ ہیں، مثلاً: وہ کہتے ہیں کہ عیسٰی اور اللہ ایک دوسرے سے جدا نہیں اور ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ اللہ ایک ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عیسٰی ہی اللہ ہیں، قرآن مجید صاف صاف الفاظ میں کہتا ہے کہ اللہ تعالٰی نہ کسی سے جڑے

ہوئے ہیں نہ کسی کے ساتھ رشتہ ناطہ رکھتے ہیں، وہ سب سے الگ اور سب سے بڑے ہیں اور سب اس کی مخلوق ہیں جس کو چاہیں پیدا کر دیتے ہیں اور جس کو چاہیں مار دیتے ہیں، سب کچھ اس مٹی میں ہے کوئی چیز اللہ تعالیٰ کے حکم اور اختیار سے باہر نہیں۔

ارشاد ہے کہ: جو لوگ ایسی باتیں بناتے ہیں جن سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مریم کے بیٹے عیسیٰ ہی اللہ تعالیٰ ہیں، یہ لوگ کافر ہیں، انہوں نے اللہ تعالیٰ کی عظمت اور شان کو ٹھیک طور پر نہیں سمجھا، ان سے کہہ دو کہ اللہ تعالیٰ نے زمین اور آسمان اور ان کی سب چیزوں کو پیدا فرمایا ہے اور انہی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ بھی داخل ہیں، اگر وہ زمین کی تمام چیزوں کو ہلاک اور برباد کرنے کا ارادہ کر لے تو کسی میں اکیلے یا اکٹھے ہو کر اتنی طاقت نہیں کہ ان میں سے کسی کو بچا لے، وہ جس کے پیدا کرنے کا ارادہ کر لیں وہ پیدا ہو کر رہے گا اور اسی طریقہ سے پیدا ہوگا جس طرح وہ چاہیں اور جس کو تباہ و برباد کرنا چاہیں وہ تباہ و برباد ہو کر رہے گا کوئی شخص اس کو بچا نہیں سکتا۔

ایک اور غلط خیال

وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ وَ النَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ ؕ قُلْ

اور کہا یہودیوں نے اور نصاریٰ (عیسائیوں) نے ہم ہیں بیٹے اللہ کے اور چہیتے اس کے کہہ دیں

فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ ؕ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ؕ

پھر کیوں عذاب دیتے ہیں تم کو بسبب گناہوں تمہارے کے بلکہ تم انسان ہو میں سے انہی جو پیدا کیا اس نے

يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ لِلّٰهِ مُلْكُ

بخش دیں جس کو چاہیں اور عذاب دیں جس کو چاہیں اور لئے اللہ کے بادشاہت

السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا ۫ وَ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ﴿۱۸﴾

آسمانوں کی اور زمین کی اور انکی جو درمیان میں ہے انکے اور طرف اسی کی لوٹنا ہے (۱۸)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور یہودی اور عیسائی کہتے ہیں ہم اللہ کے بیٹے ہیں اور اس کے پیارے ہیں، آپ کہہ دیجئے! اگر ایسا ہے پھر اللہ تعالیٰ کیوں عذاب دیتے ہیں تم کو تمہارے گناہوں پر، کوئی نہیں بلکہ تم بھی انسان ہو اس کی مخلوق میں سے، بخشیں گے جس کو چاہیں اور عذاب کریں جس کو چاہیں، اور اللہ تعالیٰ ہی کیلئے آسمانوں کی اور زمین کی بادشاہت ہے اور جو کچھ دونوں کے بیچ میں ہے اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ (۱۸)

لفظی تحقیق: اَحِبَّآؤُهٗ: اس کے پیارے۔ "حَبِيْبٌ" کی جمع ہے، جس کے معنیٰ ہیں دوست، عزیز، چہیتا۔

تفسیر

یہودی اور عیسائی اپنے آپ کو لوگوں سے بڑا سمجھتے تھے عرب کے سیدھے سادے لوگوں میں جب پہنچے تو وہ لوگ بھی عموماً ان کو بڑا ماننے لگے یہ عرب کو اپنی داستان بھی سنایا کرتے تھے، جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تشریف لائے اور ان کی غلطیاں انہیں بتائیں تو بہت تنگ ہوئے، آپ نے ان کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرایا اور کہا کہ اب میری بات مانے بغیر تم عزت حاصل نہیں کر سکتے، آخر ان کے عالموں نے کہا کہ یہ باتیں آپ اپنی عرب قوم کو سنایئے، ہمارا مرتبہ بہت اونچا ہے، یہاں تک کہہ دیا کی ہم اللہ تعالیٰ کے بیٹے اور اس کے محبوب اور پسندیدہ لوگ ہیں۔

"سورۂ بقرہ" میں اور "سورۂ آل عمران" میں ہے کہ یہودی کہتے تھے کہ ہم کو آگ کا عذاب نہیں ہوگا اور اگر ہوا بھی تو صرف چند دن کیلئے ہوگا، وہاں اس کا جواب یوں دیا گیا تھا کہ وہ عہد نامہ دکھاؤ جس کی رو سے تم عذاب سے بچو گے، "سورۂ آل عمران" میں کہا گیا تھا کہ ان باتوں نے جو انہوں نے اپنی طرف سے دین میں شامل کر لی ہیں انہیں دھوکے میں ڈال رکھا ہے، اس آیت میں ان کے اس غرور کا منہ توڑ جواب دیا گیا ہی کہ ہم اللہ تعالیٰ کے چہیتے اور قریبی ہیں۔

ارشاد ہے کہ: تمہارا یہ کہنا کہ ہم اللہ تعالیٰ کے محبوب ہیں اگر صحیح ہے تو پھر تمہیں اس دنیا میں گناہوں کا عذاب کیوں ملتا ہے، کبھی حکم ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کو قتل کرو اور کبھی طاعون میں مبتلا ہوتے ہو، ظاہر ہے کہ تم بھی

ویسے ہی انسان ہو، جیسے اور ہیں اور تم بھی اسی قاعدہ کے اندر شامل ہو کہ اللہ تعالیٰ نے جس کو چاہا عذاب دے دیا، کیونکہ ہر چیز کے وہ مالک ہیں، زمین یا آسمانوں میں کوئی چیز اس کے حکم کو ٹال نہیں سکتی اور سب کو لوٹ کر اسی کی طرف جانا ہے، اللہ تعالیٰ کے پیارے بندے تو وہ ہیں جو اچھے کام کرتے ہیں اور اس کے عذاب کے خوف سے بری باتوں اور گناہوں سے بچتے ہیں ان سے اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ آخرت میں ان کو کوئی پریشانی اور رنج وغم نہ ہوگا۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں آتا ہے کہ کسی موقع پر کچھ یہودی عالم پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے آپ نے ان کو اسلام کی دعوت دی، اور کہا کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور گمراہی کا راستہ چھوڑ دو اس کے بجائے ایمان کا سیدھا راستہ اختیار کرو، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ نے بھی یہودیوں سے کہا کہ تم جانتے ہو کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ کے سچے پیغمبر ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر، آپ کی صفتیں اور نشانیاں تمہاری کتابوں میں موجود ہیں مگر تم پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان کیوں نہیں لاتے؟ یہودی کہنے لگے کہ آپ ہمیں اپنے دین سے بدگمان کر رہے ہیں اور کسی فرضی عذاب سے ڈرا رہے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کے جواب کو اس آیت میں دہرایا ہے، ان کا مقصد یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ ہمارا حقیقی باپ تو نہیں مگر وہ ہم پر باپ کی طرح مہربان ہے، لہٰذا تم ہمیں کس چیز سے ڈرا رہے ہو؟ ہم خدا کے محبوب ہیں وہ ہمیں کوئی سزا نہیں دے گا، کہنے لگے ہم پیغمبروں کی اولاد میں سے ہیں، ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف نسبت رکھتے ہیں وہ ہمیں دوزخ میں نہیں جانے دیں گے، اور اگر بالفرض سزا ملی بھی تو چند دنوں کیلئے ملی گی، جتنے دنوں ان کے باپ دادوں نے بچھڑے کی پوجا کی تھی اور وہ صرف چالیس دن تھے وگرنہ ہم تو اللہ کے محبوب بندے ہیں، وہ ہمارے ساتھ بیٹوں جیسا مہربان ہے وہ ہمیں دوزخ میں کیسے داخل کرے گا؟ ان کی کتابوں میں یہ بھی موجود ہے کہ قیامت کے دن حضرت ابراہیم علیہ السلام دوزخ کے دروازے پر موجود ہوں گے اور کسی ختنہ والے اسرائیلی کو اس میں نہیں جانے دیں گے۔

عیسائی بھی اس معاملہ میں پیچھے نہیں رہے "سورۂ بقرہ" میں موجود ہے کہ انہوں نے بھی ایسا ہی دعویٰ کیا یعنی جنت کے ٹھیکیدار ہم ہیں، یہودیوں اور عیسائیوں کے علاوہ کوئی شخص جنت میں نہیں جا سکتا، جنت میں وہی

جائے گا جو ہمارے عقیدہ پر ہوگا، کہنے لگے کہ ہمیں کوئی عمل کرنے کی ضرورت نہیں کفارے کا عقیدہ رکھنے والوں نے تو صاف کہہ دیا کہ عیسیٰ علیہ السلام سولی پر چڑھ کر ہمارے گناہوں کا کفارہ بن چکے ہیں، لہٰذا ہمیں کسی نیک عمل کی ضرورت نہیں، ہم ہر صورت میں نجات پائے ہوئے ہیں۔

وہ لوگ اس بات کو بھول گئے کہ اللہ تعالیٰ ہر اس شخص کو عذاب دیں گے جو ظالم، مشرک، منافق اور فاسق ہوگا جو کوئی پیغمبروں اور ان کی شریعتوں کا انکار کرے گا وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچ نہیں سکے گا۔

آسمان و زمین اور ان کے درمیان ہر چیز پر قدرت اللہ تعالیٰ کو ہی حاصل ہے وہ جس کو چاہیں معاف کردیں یا عدل و انصاف کے ساتھ سزا دیدیں، اس کی مرضی اور ارادے میں کوئی آڑے نہیں آسکتا اور جب وہ پکڑلیں تو پھر کوئی چھڑا بھی نہیں سکتا، وہ دوسروں کو پناہ دیتے ہیں مگر اس کے مقابلے میں کوئی دوسرا کسی کو پناہ نہیں دے سکتی، زمین و آسمان کی ساری بادشاہی اسی کے پاس ہے اور ہر ایک انسان کو اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

یہودیوں اور عیسائیوں کو نصیحت

يَآَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ

اے کتاب والو! تحقیق آگئے تمہارے پاس پیغمبر ہمارے بیان کرتے ہیں لئے تمہارے پر سلسلہ ٹھہر جانے کے بعد

مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ

کے پیغمبروں کہ کہو تم نہیں آیا ہمارے پاس کوئی خوشخبری دینے والا اور نہ ڈرانے والا

فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّنَذِيْرٌ ۗ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿١٩﴾ ع ۸ ۳/۷

پس تحقیق آئے تمہارے پاس خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے اور اللہ پر ہر چیز کے قادر ہیں (۱۹)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اے کتاب والو! تمہارے پاس پیغمبروں کا سلسلہ رُک جانے کے بعد ہمارے پیغمبر

آئے جو کہ تم پر کھول کھول کر بیان کرتے ہیں کہ کبھی تم کہنے لگو کہ ہمارے پاس کوئی خوشخبری دینے والا یا ڈرانے والا آیا، سو تمہارے پاس خوشخبری اور ڈر سنانے والے آ چکے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہیں۔(۱۹)

لفظی تحقیق: فَتْرَةٌ: اس کے معنٰی ڈھیلے اور سست پڑ جانے کے ہیں۔ "فُتُوْرٌ" بھی اسی سے ہے جس کے معنٰی کمی اور نقصان کے ہیں، اگر کوئی چیز برابر ہوتی چلی آ رہی ہو اور پھر رک جائے تو اس رکنے کو "فَتْرَةٌ" کہتے ہیں اور اس زمانے کو جس میں اس کا ہونا بند رہا ہے اسے زمانۂ فترت یعنی وحی نہ آنے کا زمانہ کہتے ہیں، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش ۵۷۰ء میں ہوئی اور آپ کو پیغمبری ۶۱۰ء میں عطا کی گئی اس طرح آپ کے اور حضرت عیسٰی علیہ السلام کے درمیان پورے چھ سو سال کا وقفہ ہے، اس عرصہ کو "فَتْرَةٌ" کہتے ہیں، یہاں یہ کہا گیا ہے کہ اتنے زمانے تک پیغمبروں کے آنے کا سلسلہ بند رہنے کے بعد آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے ہیں ان کا کہنا مانو۔

تفسیر

اس آیت میں کہا گیا ہے کہ تمہارے پاس ہمارے پیغمبر اسی لئے آئے ہیں کہ نیک لوگوں کو خوشخبری سنائیں اور برائی کرنے والوں کو عذاب سے ڈرائیں، عربی میں خوشخبری دینے والے کو "بشیر" اور ڈرانے والے کو "نذیر" کہتے ہیں اس لئے پیغمبر کا لقب "بشیر اور نذیر" ہوتا ہے، یہ آیت بتلاتی ہے کہ اب کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہمارے پاس "بشیر و نذیر" نہیں آیا کیونکہ یہ آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لے آئے ہیں یہ بھی "بشیر و نذیر" ہیں ان کی بات مانے بغیر نہ دنیا سنور سکتی ہے اور نہ آخرت۔

آخر میں اہل کتاب کو خبردار کیا گیا ہے کہ اگر تم نہ مانو گے تو یاد رکھو کہ! اللہ تعالٰی قدرت والے ہیں، وہ تمہیں چھوڑ کر اپنے دین کے ماننے والے اور پیدا کر سکتے ہیں اور تمہیں تمہارے کرتوتوں کی وجہ سے اپنی رحمت سے محروم کر سکتے ہیں۔

عربوں میں پیغمبر کو آئے ہوئے ہزار سال سے بھی زیادہ عرصہ گزر چکا تھا کیونکہ اس سرزمین کے گذرے

ہوئے پیغمبر حضرت اسماعیل علیہ السلام ہی تھے، اس دوران دوسری قوموں میں پیغمبر آتے رہے مگر عرب ایک لمبے زمانہ تک محروم رہے، لہٰذا اتنے لمبے عرصے تک یہ پیغمبر کے چرچے سے ناواقف رہے اسی لئے عربوں میں لقب اُمّی مشہور ہوگیا۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بعد پندرہ یا سولہ سو سال تک عرب لوگ آپ ہی کے دین پر رہے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بھیجے جانے سے تقریباً چار سو سال پہلے اس خطے میں شرک کی ابتداء ہوئی، ایک شخص عمرو ابن قنمیۃ یا عمرو ابن لحی عرب سے باہر کسی دوسرے علاقہ میں گیا اور وہاں سے کچھ مورتیاں لے آیا پھر اس نے یہاں بھی مورتیاں بنانی شروع کیں اور اس طرح عرب میں شرک کی ابتداء ہوئی، قصی ابن کلاب کے زمانہ تک لوگ بالکل حضرت اسماعیل علیہ السلام کے دین پر تھے اس کے بعد شرک کی لعنت پیدا ہوئی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بھیجے جانے تک عرب بھی دوسرے علاقوں کی طرح شرک میں ڈوب چکا تھا، اس زمانہ تک ہزاروں میں کوئی ایک آدھ آدمی توحید کا تصور رکھتا تھا ورنہ اکثر لوگ شرک میں مبتلا ہو چکے تھے، اہل کتاب میں سے بھی اکّے دُکّے لوگ توحید پر قائم تھے تاہم مجموعی طور پر پوری دنیا شرک کی گمراہیوں میں ڈوب چکی تھی۔

اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق پیغمبر کے اس لمبے عرصہ نہ آنے کے بعد تمہارے پاس ہمارے پیغمبر آگئے ہیں جو تمہیں تمام حکم کھول کھول کر بیان کرتے ہیں، پہلے بھی گزر چکا ہے کہ مصلحت کے مطابق بعض حکموں کو تفصیل کے ساتھ بیان کر دیتے ہیں اور جسے بنی اسرائیل چھپاتے تھے انہیں ظاہر کرتے ہیں اور بعض کم اہمیت کے معاملات سے درگزر کرتے ہیں اس سے اللہ تعالیٰ کا مقصود یہ ہے کہ تم کل کو یہ نہ کہہ سکو کہ ہمارے پاس کوئی خوشخبری دینے والا یا ڈرانے والا نہیں آیا، اللہ تعالیٰ کے یہ آخری پیغمبر خدا کی رحمت کی خوشخبری سناتے ہیں اور تمہیں تمہارے برے انجام سے ڈراتے ہیں تاکہ لوگ قیامت کو کوئی عذر پیش نہ کرسکیں، اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کیلئے تمام سامان مہیا کر دیئے ہیں، اس نے انسانوں کو عقل وشعور دیا، تاکہ دیکھ کر سمجھ کر اچھے برے میں تمیز کرسکیں، پھر اس نے پیغمبر بھیجے، ان کے نائب آتے رہے، اپنی کتابیں بھیجیں، قدرت کی نشانیاں پھیلا دیں،

غرضیکہ ظاہری اور باطنی ہدایت کے تمام سامان مہیا کر دیئے تاکہ کسی کو جھوٹا عذر پیش کرنے کی گنجائش باقی نہ رہے اس کے باوجود اگر کوئی ہدایت کا راستہ اختیار نہیں کرتا تو پھر وہ گمراہی کا خود ذمہ دار ہے، جب سورج طلوع ہو کر اپنی روشنی چاروں طرف پھیلا چکا ہو اور اس کے بعد اگر کوئی شخص آنکھیں بند کر کے کہے کہ مجھے کچھ نظر نہیں آتا تو اس کا علاج نہیں، ایسے ہی جو شخص پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے کے بعد آنکھیں بند رکھے اور کہے کہ ہمارے پاس کوئی سمجھانے والا نہیں آیا اس کا انجام دوزخ کے گڑھے میں گرنے کے سوا کچھ نہیں، اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے کوئی عذر باقی نہیں رہنے دیا، اللہ تعالیٰ کو ہر چیز پر قدرت ہے اس کے بعد جب چاہیں گے مجرموں کو پکڑ لیں گے اور پھر ان کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔

زمانۂ فترت کے احکام

اس آیت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر بالفرض کوئی قوم ایسی ہو کہ ان کے پاس نہ کوئی پیغمبر آیا اور نہ ان کے کوئی نائب پہنچے اور نہ پچھلے پیغمبروں کی شریعت ان کے پاس محفوظ تھی تو یہ لوگ اگر شرک کے سوا کسی اور غلط کام اور گمراہی میں مبتلا ہو جائیں تو وہ معذور سمجھے جائیں گے، وہ عذاب کے مستحق نہیں ہوں گے، اسی لئے حضرات فقہاء کا اہل فترت کے معاملہ میں اختلاف ہے کہ وہ بخشے جائیں گے یا نہیں؟

اکثر حضرات کا رجحان یہ ہے کہ امید اسی کی ہے کہ وہ بخش دیئے جائیں گے جبکہ وہ اپنے اس مذہب کے پابند رہے ہوں جو غلط سلط ان کے پاس موجود تھا بشرطیکہ وہ توحید کے مخالف نہ ہوں اور شرک میں مبتلا نہ ہوں کیونکہ مسئلہ توحید کسی دلیل نقلی (کسی آیت یا حدیث) کا محتاج نہیں وہ ہر انسان ذرا سا غور کرے تو اپنی ہی عقل سے معلوم کر سکتا ہے۔

اس آیت میں اہل کتاب کو مخاطب کر کے یہ ارشاد فرمانا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ایک لمبے زمانے کے بعد آئے ہیں اس میں ایک اشارہ اس طرف بھی ہے کہ تم لوگوں کو چاہئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہونے کو بڑی نعمت سمجھیں

کیونکہ لمبی مدت سے یہ سلسلہ بند تھا اب تمہارے لئے پھر کھولا گیا ہے، دوسرا اشارہ اس طرف بھی ہے کہ آپ کا تشریف لانا ایسے زمانے اور ایسی جگہ ہوا ہے جہاں علم اور دین کی کوئی روشنی موجود نہ تھی، خدا کی مخلوق خدا سے بیگانہ ہو کر بت پرستی میں لگ گئی تھی ایسے زمانے میں ایسی قوم کی اصلاح کوئی آسان کام نہ تھا، ایسے جاہلیت کے زمانے میں ایسی بگڑی ہوئی قوم آپ کے حوالہ ہوئی، آپ کی تربیت کی وجہ سے اور پیغمبری کے نور سے تھوڑے ہی عرصہ میں یہ قوم ساری دنیا کیلئے علم، عمل، اخلاق، معاملات، معاشرت اور تمام زندگی کے ہر ہر گوشے میں استاد اور پیروی کے لائق بن گئی جس سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبری اور آپ کی پیغمبرانہ تعلیم کا تمام پچھلے پیغمبروں میں افضل اور اعلیٰ ہونا ثابت ہو گیا، جو ڈاکٹر کسی علاج سے مایوس مریض کا علاج کرے اور ایسی جگہ میں کرے جہاں طبی آلات اور دوائیں بھی نہ ہوں اور پھر وہ اس کے علاج میں اتنا کامیاب ہو کہ یہ موت کے کنارے پہنچا ہوا مریض نہ صرف یہ کہ تندرست ہو گیا بلکہ ایک ماہر ڈاکٹر بھی بن گیا تو اس ڈاکٹر کے کمال میں کسی کو کیا شبہ رہ سکتا ہے، اسی طرح لمبے زمانے کے بعد جبکہ ہر طرف کفر و گمراہی کی تاریکی ہی تاریکی چھائی ہوئی تھی آپ کی تعلیمات اور تربیت نے ایسا اجالا کر دیا کہ اس کی مثال کسی پچھلے دور میں نظر نہیں آتی تو سارے معجزات ایک طرف تنہا یہ معجزہ انسان کو آپ پر ایمان لانے کیلئے مجبور کر سکتا ہے۔

یہودیوں پر اللہ تعالیٰ کی مہربانیاں

وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ

اور جب　کہا　موسیٰ نے　سے قوم اپنی　اے قوم میری!　یاد کرو　احسان کو　اللہ کا　اوپر اپنے

اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَ جَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖۗ وَّ اٰتٰىكُمْ مَّا

جب　بنائے　میں تم　پیغمبر　اور　بنایا تم کو　بادشاہ　اور　دیا تم کو　جو

لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ۝۲۰ يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ

نہیں　دیا تھا　کسی کو　میں سے　جہان والوں　(۲۰)　اے قوم میری!　داخل ہو　زمین میں

الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَ لَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِكُمْ

پاک　جو　مقرر کر چکے ہیں　اللہ　لئے تمہارے　اور　نہ　واپس ہو　پر　پیٹھوں اپنی

فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿۲۱﴾

پس ہو جاؤ گے تم　نقصان اٹھانے والے (۲۱)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا اے قوم! یاد کرو اپنے اوپر اللہ کا احسان جب تم میں پیغمبر پیدا کئے اور تم کو بادشاہ بنا دیا اور تم کو وہ دیا جو کسی کو بھی جہان والوں میں سے نہیں دیا تھا۔(۲۰) اے قوم! اس پاک زمین میں داخل ہو جو اللہ نے تمہارے واسطے مقرر کر دی ہے اور نہ لوٹو اپنی پیٹھ کی طرف پھر نقصان میں جا پڑو گے۔(۲۱)

لفظی تحقیق: يٰقَوْمِ: اے میری قوم۔ مُّلُوْكًا: بادشاہ: "مَلِكٌ" کی جمع ہے۔ اَلْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ: سے مراد شام و فلسطین کا ملک ہے، جہاں بہت سے پیغمبر آئے، اس سرزمین کا چپہ چپہ مقدس علامتوں اور یادگاروں سے بھرا ہوا ہے۔ تَرْتَدُّوْا: مت پھرو تم۔: "اِرْتِدَادٌ" سے ہے جو "رَدٌّ" سے بنا ہے، "رَدٌّ" کے معنیٰ ہیں واپس کر دینا، "اِرْتِدَادٌ" کے معنیٰ ہیں واپس ہو جانا، پھر جانا۔ اَدْبَار: "دُبُرٌ" کی جمع ہے جس کے معنیٰ پیٹھ کے ہیں۔ خٰسِرِيْنَ: نقصان اٹھانے والے۔: "خَاسِرٌ" کی جمع ہے جو "خَسَارَةٌ" سے بنا ہے، "خَسَارَةٌ" نقصان، "خَاسِرٌ" گھاٹا اور نقصان اٹھانے والا۔

تفسیر

ان آیتوں میں رکوع کے آخر تک یہودیوں کو اللہ تعالیٰ اپنے انعام یاد دلائے ہیں جو ان پر کیے، اس سے یہ کہنا مقصود ہے کہ وہ ایسے مہربان اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ کریں اور پیغمبر ﷺ کی پیروی کریں تا کہ وہ دونوں جہان میں سرخرو ہوں ساتھ ہی مسلمانوں کو یہ سبق سکھانا ہے کہ وہ اپنے پیغمبر ﷺ کے ساتھ ہرگز ایسی گستاخیاں نہ

کریں جیسے یہودیوں نے اپنے پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کیں تا کہ وہ ان سزاؤں اور مصیبتوں سے بچے رہیں جو یہودیوں کو اپنی شرارتوں کی وجہ سے اٹھانی پڑیں۔

مہربانیوں کی تفصیل

تفسیر کی کتابوں میں لکھا ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وطن کے لوگوں نے ان کا کہنا نہ مانا اور بت پرستی نہ چھوڑی تو وہ اپنے وطن عراق کو چھوڑ کر ملک شام میں آ کر ٹھہرے تو اللہ تعالیٰ نے ان سے وعدہ کیا کہ میں آپ کی اولاد کو شام کا مالک بنادوں گا، حضرت یعقوب علیہ السلام ان کے پوتے تھے جن کا لقب اسرائیل تھا وہ اپنی اولاد کے ساتھ اپنے بیٹے حضرت یوسف علیہ السلام کے بلانے پر شام چھوڑ کر مصر چلے آئے اور پھر یہ لوگ وہیں بس گئے اور بنی اسرائیل کہلائے آگے چل کر مصر کے بادشاہ فرعون نے ان کو ستانا شروع کیا جس کا کچھ قصہ ''سورۂ بقرہ'' میں گذر چکا ہے اور کچھ آگے ''سورۂ اعراف'' اور ''سورۂ طٰہٰ'' میں آئے گا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اپنا پیغمبر بنا کر فرعون کے پاس بھیجا تا کہ وہ اسے سمجھائیں کہ بنی اسرائیل کو ستانا چھوڑ دے اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آئے لیکن وہ نہ مانا آخر حضرت موسیٰ علیہ السلام تمام بنی اسرائیل کو مصر سے نکال کر دریا پار دوسرے کنارے پر لے آئے، شام وہاں سے تھوڑی دور تھا اور وہاں اس وقت ایک اور قوم کی حکومت تھی جو ''عمالقہ'' کہلاتی تھی اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے جو وعدہ کیا تھا اس کے پورا ہونے کا وقت آیا، ملک شام تمہارا ہے لیکن تمہیں اس کیلئے ''عمالقہ'' سے جہاد کرنا پڑے گا، اس رکوع میں اسی واقعہ کا ذکر ہے۔

ان آیتوں میں ارشاد ہے کہ: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم بنی اسرائیل کو لڑائی کیلئے تیار کرنا چاہا اور ان سے کہا کہ تم پر اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمتیں رہی ہیں تمہارے دادا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وقت سے سارے پیغمبر انہی کی اولاد میں ہوئے ہیں، یعنی: حضرت اسماعیل علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام، حضرت یعقوب علیہ السلام وغیرہ، پھر تم کو

دنیا میں بادشاہت عطا کی، تم میں سے حضرت یوسف علیہ السلام مصر کے بادشاہ ہوئے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان بادشاہوں کا حال وحی سے معلوم تھا جو ان کے بعد بنی اسرائیل میں ہونے والے تھے، جیسے حضرت داؤد علیہ السلام، حضرت سلیمان علیہ السلام وغیرہ، ان سب کو وہ بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ کی خاص نعمت بتا رہے ہیں اس کے حاصل کرنے کیلئے انہیں اس وقت اپنے دشمنوں سے لڑ کر اللہ تعالیٰ کے حکم کو پورا کرنا چاہئے، تمہیں اللہ تعالیٰ نے دین اور دنیا دونوں میں مرتبے عطا کیے، چنانچہ پیغمبر بھی تم ہی میں سے ہوئے اور بڑے بڑے بادشاہ بھی تم ہی میں سے ہوئے، اس لئے تمہیں چاہئے کہ تم اس پاک سرزمین میں داخل ہو اور اپنے آپ کو بہت خوش قسمت سمجھو کہ تمہارے دادا حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جو وعدہ کیا گیا تھا کہ ملک شام تمہاری اولاد کو دیا جائے گا وہ تمہارے ہاتھوں پورا ہو۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس سے پہلے بنی اسرائیل کے بارہ سرداروں کو شام بھیجا تھا کہ وہاں کی صحیح خبر لائیں اور آ کر وہاں کے حالات بتائیں انہوں نے واپس آ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ شام بڑی خوبیوں کا ملک ہے لیکن جن لوگوں کا آج کل اس پر قبضہ ہے وہ بڑے زبردست قوت والے دیو جیسے آدمی ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سرداروں سے کہا کہ تم عوام کے سامنے ملک کی خوبیاں بیان کرنا لیکن یہ نہ کہنا کہ وہاں بڑی طاقت والے زبردست لوگ ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ بنی اسرائیل یہ سن کر ہمت ہار دیں، بارہ کے بارہ نے وعدہ کیا لیکن باہر نکل کر دو (۲) تو اس وعدہ پر قائم رہے اور دس (۱۰) نے کہہ دیا کہ شام کے لوگ انسان نہیں دیو ہیں ایسے طاقتور آدمی نہ دیکھے نہ سنے۔

وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ: مؤرخین فرماتے ہیں کہ اس آیت میں جن احسانوں کی طرف اشارہ ہے وہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے ۱۴۴۰ سال پہلے کیے تھے، پھر جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا زمانہ آیا تو انہوں نے اپنی قوم کو اللہ تعالیٰ کے وہ احسانوں کو یاد دلائے پھر حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام کے بعد چھ سو سال کا مزید عرصہ گزر گیا جب کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم بھیجے

گئے اور اللہ تعالیٰ نے ان آیتوں کے ذریعہ گذرے ہوئے واقعوں کا ذکر فرمایا ہے۔

مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل پر سب سے بڑا احسان یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک خدا کو ماننے اور جاننے والا بنایا، قوم کی حیثیت سے تو بنی اسرائیل خدا کے ایک ہونے کا یقین رکھتے تھے، البتہ باقی احسانات کا ذکر اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یوں بیان فرمایا ہے کہ تمہاری قوم میں اللہ تعالیٰ نے بہت زیادہ پیغمبر بھیجے، تفسیری روایتوں میں آتا ہے کہ مجموعی طور پر بنی اسرائیل میں چار ہزار پیغمبر بھیجے گئے جو کہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان ہے، پیغمبر ہی کے ذریعے انسان کا ایمان، عقیدہ اور عمل درست ہوتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے ایک ہونے کا یقین رکھتا ہے اسی لئے فرمایا کہ پہلا احسان تم پر یہ فرمایا کہ تم میں بہت زیادہ پیغمبر بھیجے۔

وَ جَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا: اور تم کو بادشاہ بنایا بڑی بڑی سلطنتیں عطا فرمائیں، چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی بڑی بڑی سلطنتیں تاریخ کا اہم حصہ ہیں، حضرت طالوت رحمۃ اللہ علیہ کی بادشاہت کا ذکر بھی ''سورۂ بقرہ'' میں آچکا ہے، یہ خدا کی مہربانی اور اس کا احسان تھا کہ عام طور پر بادشاہ تخت وتاج کے مالک کو کہا جاتا ہے مگر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل ہر خوشحال آدمی کو بادشاہ کہتے تھے، ''صحیح مسلم شریف'' میں بھی آتا ہے کہ کچھ لوگ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما کے پاس گئے اور کہنے لگے کہ کیا ہم محتاج اور مہاجر نہیں ہیں؟ آپ نے فرمایا: کیا تمہاری بیوی موجود ہے؟ عرض کیا موجود ہے، آپ نے پوچھا: تمہارے پاس مکان بھی ہے؟ کہا مکان بھی ہے، آپ نے فرمایا: پھر تم محتاج کیسے ہو؟ تم تو غنی ہو اس شخص نے پھر عرض کیا حضرت میرے پاس تو خادم بھی ہے اس پر آپ نے فرمایا: پھر تو بادشاہوں میں سے ہے، یعنی: خوشحال آدمی ہے کیونکہ تیرے پاس بیوی ہے، رہنے کیلئے مکان ہے اور خدمت کیلئے خادم بھی موجود ہے۔

بہر حال اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو یاد دلایا کہ تم میں پیغمبر پیدا کئے، تمہیں خوشحال بنایا، تم میں بڑی بڑی سلطنتوں والے بادشاہ بنائے، ان میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی بادشاہی انسانوں، جنوں، اور پرندوں پر بھی تھی، آپ کو ہوا پر بھی بادشاہت حاصل تھی، آپ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی کہ اے اللہ! ایسی سلطنت عطا کیجئے جو

میرے بعد کسی کو حاصل نہ ہو، چنانچہ اس دعا کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو بے مثال حکومت عطا فرمائی، اس کے علاوہ بنی اسرائیل میں بڑے بڑے فوجی، جرنیل، حکیم، فلاسفر، عقلمند اور علم والے لوگ پیدا ہوئے یہ سب بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ کے احسان تھے۔

یہ عظمت اور برتری بنی اسرائیل کو اپنے دور میں بحیثیت قوم کے حاصل ہوئی اللہ تعالیٰ نے ایسا اعزاز اور شرف عطا فرمایا کہ کوئی قوم بنی اسرائیل کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی پھر یہی عظمت اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے قریش اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کی اس کا ذکر قرآن کریم اور حدیثوں میں بہت زیادہ موجود ہے۔

جہاد سے انکار

قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ ۖ وَ اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا

انہوں نے کہا اے موسیٰ! بیشک میں اس ایک ایسی قوم ہے زبردست اور بیشک ہم ہرگز نہ داخل ہونگے اس میں

حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْهَا ۚ فَاِنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ ﴿۲۲﴾

یہاں تک کہ نکلیں وہ میں سے اس پس اگر نکل جائیں وہ میں سے اس پھر ہم ضرور داخل ہوں گے (۲۲)

قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمَا ادْخُلُوْا

کہا دو مردوں نے سے ان لوگوں جو ڈرتے تھے اللہ سے انعام کیا تھا اللہ نے پر ان دونوں گھس پڑو تم

عَلَيْهِمُ الْبَابَ ۚ

پر ان دروازے سے

بامحاورہ ترجمہ:۔ بولے اے موسیٰ! وہاں ایک زبردست قوم ہے اور ہم وہاں ہرگز نہ جائیں گے یہاں تک کہ وہ اس میں سے نکل جائیں، پھر اگر وہ اس میں سے نکل جائیں گے تو ہم ضرور داخل ہوں گے۔ (۲۲) اللہ سے ڈرنے والے دو مردوں نے کہا جن پر اللہ کی نوازش تھی ان پر حملہ کر کے دروازے میں گھس جاؤ۔

تفسیر

جب بنی اسرائیل کے بارہ سرداروں کو حضرت علیہ السلام نے شام کے حالات ٹھیک معلوم کرنے کیلئے وہاں بھیجا تھا واپس آ کر ان میں سے دس نے وہاں کے آدمیوں کو دیو جیسا بتا جس سے بنی اسرائیل کو ڈر گئے، اس لئے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا کہ شہر میں بہادروں کی طرح داخل ہو جاؤ اور اس کو فتح کر لو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ شہر تمہارے لئے پہلے سے مقرر کر دیا ہے اس پر قبضہ کر لو تو انہوں نے صاف جواب دے دیا۔

بنی اسرائیل نے کہا کہ اے موسیٰ! وہاں تو بڑے زبردست دیو کی طرح کے لوگ ہیں جب تک وہ وہاں سے نہ نکل جائیں ہم ہرگز وہاں نہ جائیں گے ہاں! اگر وہ وہاں سے نکل گئے تو ہم وہاں بڑے شوق سے جائیں گے، ان کا یہ جواب صاف بتا رہا تھا کہ جو آدمی شام اور وہاں کے لوگوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ آئے تھے انہوں نے ان لوگوں سے شہر کی تو خوب تعریف کر دی تھی لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کے منع کرنے کے باوجود وہاں کے آدمیوں کو دیو جیسا طاقتور کہا تھا جس سے بنی اسرائیل ڈر گئے تھے، اور ظاہر ہے کہ بارہ میں سے جب دس نے راز فاش کر دیا تو اس کا پھیل جانا قدرتی تھا، بنی اسرائیل میں جب ان واقعہ کی خبریں پھیلنے لگیں تو لگے رونے پیٹنے اور کہنے لگے کہ اس سے تو اچھا یہی تھا کہ فرعون کی قوم کی طرح ہم بھی دریا میں غرق ہو جاتے وہاں سے بچا لا کر ہمیں یہاں مروایا جا رہا ہے، انہیں حالات میں بنی اسرائیل نے یہ کہا کہ اے موسیٰ! اس شہر میں تو بڑی زبردست قوم آباد ہے جن کا مقابلہ ہم سے نہیں ہو سکتا اس لئے جب تک وہ لوگ وہاں موجود ہیں ہم وہاں جانے کا نام نہ لیں گے۔

ان سرداروں میں سے دو آدمی ایسے تھے جنہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ہدایت پر عمل کیا اور ان کے سامنے شہر کی تعریف کی اس وقت بنی اسرائیل کا جواب سن کر ان دو آدمیوں نے انہیں حوصلہ دلایا۔

آیت میں ان دو آدمیوں (کالب اور یوشع بن نون) کی تعریف کی گئی ہے اور ان کو صرف اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا کہا ہے اور کہا ہے کہ ان پر اللہ تعالیٰ نے اپنا انعام کیا کہ وہ اپنے قول و قرار پر قائم رہے جو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کیا تھا اس وقت ان دو آدمیوں نے کہا کہ لوگو! تم بے دھڑک شہر کے دروازے میں گھس

کر ان لوگوں سے جالڑو اور ذرا خوف نہ کرو۔

ہمت والے جیتتے ہیں

فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ
پھر جب داخل ہو جاؤ تم اس میں تو بیشک تم ہی غالب آؤ گے اور پر اللہ ہی بھروسہ کرو اگر ہو تم

مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۳﴾ قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا
ایمان والے (۲۳) انہوں نے کہا اے موسیٰ! ہم ہر گز نہ داخل ہوں گے کبھی جب تک وہ ہیں

فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ﴿۲۴﴾
میں اس کہ جاؤ تم اور رب تمہارا لڑو تم دونوں ہم تو یہیں بیٹھے ہیں (۲۴)

بامحاورہ ترجمہ:۔ پھر جب تم اس میں گھس جاؤ گے تو تم ہی غالب آؤ گے اور اللہ پر بھروسہ کرو اگر تم یقین رکھتے ہو۔(۲۳) بولے اے موسیٰ! ہم ہرگز نہ جائیں گے جب تک وہ اس میں رہیں گے، سو تم اور تمہارا رب جاؤ اور تم دونوں لڑو ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔(۲۴)

تفسیر

یہاں دو آدمیوں کی بات اس آیت میں پوری کی گئی ہے انہوں نے کہا کہ تم اس طرح بے دھڑک ان پر شہر میں گھس کر ٹوٹ پڑو گے تو آخر کار تم ہی غالب رہو گے، تم تو ایمان والے ہونے کا دعویٰ کرتے ہو تمہیں چاہئے کہ صرف اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرو کیونکہ ایمان والے اللہ تعالیٰ کے سوا نہ کسی سے ڈرتے ہیں اور نہ اس کے سوا کسی اور پر بھروسہ کرتے ہیں۔

اِن دو آدمیوں نے اُن دیو جیسے آدمیوں کو دیکھ کر کچھ بھی اثر نہ لیا ان کو اللہ تعالیٰ کی مدد پر بھروسہ تھا ان کا دل مضبوط تھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ جو اللہ تعالیٰ کی فرمانبرادی کرے گا اور اس کے حکم کے مطابق چلے گا اللہ تعالیٰ

ضرور اس کی مدد کریں گے، اس نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ''عمالقہ'' کے شہر میں گھس کر ان کو وہاں سے نکال دیں اب ہمارا کام یہ ہے کہ اس کے حکم کے مطابق بالکل نڈر ہو کر ان پر جا پڑیں، اللہ تعالیٰ ہمیں ان کے اوپر ضرور کامیابی دیں گے، ہمارا دھیان صرف اللہ تعالیٰ کی طرف ہونا چاہئے، اس کی قوت اور طاقت سب سے بڑھی ہوئی ہے، اس کے سامنے کسی کی نہیں چلتی، بڑے بڑے زور آوروں کا زور اس کے سامنے رکھا رہ جاتا ہے اور کمزور لوگ اس کی مدد سے زبردستوں پر غالب آ جاتے ہیں۔

ان کی قوم نے ان کی بات نہیں سنی اور جواب میں کہا کہ اے موسیٰ! ہم تو اس شہر میں اس وقت تک ہرگز داخل نہیں ہوں گے جب تک وہ زبردست لوگ وہاں ہیں بس تو اور تیرا رب دنوں جاؤ اور دونوں لڑو ہم تو یہاں سے نہ ٹلیں گے، اس جواب سے اس بات کا اندازہ کرنا آسان ہے کہ بنی اسرائیل کس قدر ڈھیٹ، گستاخ اور بے ادب ہو گئے تھے۔

بنی اسرائیل اور مسلمانوں کی فرمانبرداری کا موازنہ

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ کرام کی جانثاری کے واقعات ہر زبان پر ہیں منجملہ ان کی بدر کی جنگ کی تیاری کا واقعہ ہے جب قریش کی طرف سے جنگی تیاری کی خبر پہنچی تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام کو جمع فرمایا اور جنگ کی تیاری کیلئے ان کی رائے طلب کی، چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور انہوں نے دشمن سے ٹکرا جانے کا مشورہ دیا اس پر آپ خاموش رہے پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر اپنی جان نثاری کا یقین دلایا مگر آپ پھر بھی خاموش رہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سمجھ گئے کہ آپ مدینہ کے انصاریوں کی طرف سے یقین دہانی چاہتے ہیں، چنانچہ مدینہ کے انصاریوں میں سے حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہما نے عرض کیا کہ اے پیغمبر! اگر آپ چاہتے ہیں کہ ہم کچھ کہیں تو ہم آپ کو قسم اٹھا کر یقین دلاتے ہیں کہ اگر آپ حکم دیں گے تو اپنے گھوڑوں کو برک الغماد تک لے جائیں گے اور انہیں سمندر میں دوڑانے سے بھی گریز نہیں کریں گے، ہم آپ کے اشارے پر ہر طرح کی قربانی کیلئے تیار ہیں، عرض کیا اے پیغمبر! آپ ہمیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کے جیسا نہ پائیں گے جنہوں نے

اپنے پیغمبر سے یوں کہا تھا کہ ''تو اور تیرا رب دونوں جا کر لڑو'' اس کے بعد مہاجرین میں سے حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور عرض کیا اے پیغمبر! آپ یقین جانیں کہ ہم آپ کے دائیں، بائیں، آگے اور پیچھے غرضیکہ ہر طرف سے دشمن کا مقابلہ کریں گے، ہم جان کی بازی لگا دیں گے، آپ ہمیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم جیسا نہیں پائیں گے، انصار و مہاجرین کے اس جوش و جذبہ سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم بہت خوش ہوئے، آپ کا چہرہ مبارک چمکنے لگا اور آپ نے اللہ تعالیٰ کا نام لے کر روانگی کا حکم دے دیا، بہرحال حضرت موسیٰ علیہ السلام اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی قوموں کے نظریوں کا یہ ایک موازنہ ہے۔

سرکشی کی سزا

قَالَ رَبِّ اِنِّيْ لَآ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِيْ وَ اَخِيْ فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَ

بولے اے رب! میں تو نہیں قبضہ رکھتا مگر پر آپ اپنے اور پر بھائی اپنے پس جدائی کر دیجئے درمیان ہمارے اور

بَيْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۵﴾ قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ

درمیان قوم نافرمان کے (۲۵) فرمایا پس تحقیق وہ زمین حرام کی گئی پر ان چالیس

ع ۴/۸ سَنَةً ۚ يَتِيْهُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۭ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۶﴾

سال بھٹکتے پھریں گے بیچ زمین کے پس نہ افسوس کیجئے اوپر لوگوں نافرمان (۲۶)

بامحاورہ ترجمہ:۔ بولے اے میرے رب! مجھے اپنے اور بھائی کے سوا کسی پر اختیار نہیں، سو آپ ہم میں اور اس نافرمان قوم میں جدائی کر دیجئے۔ (۲۵) فرمایا: تحقیق وہ زمین ان پر چالیس برس تک کیلئے حرام کر دی گئی وہ ملک میں سر مارتے پھریں گے سو آپ نافرمان لوگوں پر افسوس نہ کیجئے۔ (۲۶)

لفظی تحقیق: اُفْرُقْ: جدائی کر دیجئے۔ ''فَرْقٌ'' سے بنا ہے، جس کے معنیٰ جدائی اور علیحدگی کے ہیں یعنی ہم کو ان سے علیحدہ کر دیجئے، ہم ان میں شامل نہیں ہونا چاہتے۔ اَلْفٰسِقِيْنَ: نافرمانی کرنے والے۔

"فِسْقٌ" سے بنا ہے، جس کے معنٰی ہیں اللہ تعالیٰ کے قانون کی حد سے باہر نکل جانا، "فَاسِق" وہ ہے جو حکم نہ مانے اور قانون کو خاطر میں نہ لائے جیسے غنڈہ یا بدمعاش۔ یَتِیْهُوْنَ: بھٹکتے پھریں گے۔ "تِیْهٌ" سے ہے، جس کے معنٰی ہیں سر مارنا، بھٹکنا، سرگردان پھرنا، مراد یہ ہے کہ وہ حیران پریشان پھریں گے۔ لَا تَأْسَ: مت افسوس کیجئے۔ "تَأْسَ" کے معنٰی افسوس، رنج اور کڑھنے کے ہیں، مراد یہ ہے کہ ان پر افسوس نہ کیجئے۔

تفسیر

ان کی قوم کے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اس جواب کا جو اثر ہوا اس کا خلاصہ اس آیت میں بیان کیا گیا ہے، آپ نے کہا کہ اے میرے پروردگار! میرے بس میں تو کچھ بھی نہیں ہے میں اور میرا بھائی آپ کا حکم پورا کرنے کیلئے حاضر ہیں باقی لوگوں نے نافرمانی پر کمر باندھ لی ہے ہمیں ان میں شامل نہ کیجئے اور ہمارے اور ان کے درمیان جدائی کر دیجئے کیونکہ وہ لوگ نافرمان ہیں اور فاسق ہو چکے ہیں۔

اس واقعہ کے تین سال بعد حضرت ہارون علیہ السلام اللہ تعالیٰ کو پیارے ہو گئے اور پھر مزید ایک سال بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی ان سے جا ملے اور اس طرح اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں اور قوم کے درمیان جدائی پیدا ہو گئی، جدائی کا یہ مطلب نہیں کہ دونوں پیغمبر قوم کو چھوڑ کر کسی دوسرے علاقہ میں چلے جاتے، یہ بات ان کے شایان شان نہ تھی، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی اور دونوں پیغمبروں کی وفات سے جدائی آ گئی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس دعا سے ظاہر ہے کہ بنی اسرائیل کے گستاخانہ جواب کا ان کو بہت رنج ہوا، ان کی یہ دعا قبول ہوئی، ارشاد ہے کہ اب ان کو اس سرزمین میں داخل ہونا آسانی سے میسر نہ ہوگا اگر یہ کہنا مان لیتے اور وہاں چلے جاتے تو وہاں کی نعمتوں سے فائدہ اٹھاتے لیکن اب ان کو چالیس برس تک جنگلوں میں سر مارتے اور بھٹکتے پھرنا پڑے گا، چالیس سال میں ان کے یہ ڈھیٹ اور سرکش لوگ مر کھپ جائیں گے اور ان کی اولاد وہاں جا کر آباد ہوگی، حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا گیا ہے کہ ان نافرمان لوگوں پر آپ ذرا افسوس نہ کیجئے یہ اپنے کیے کی سزا

بھٹکتیں گے، آپ اپنا کام کیے جائیے۔

بنی اسرائیل کی بے ادبی، گستاخی اور حکم نہ ماننے کی بناء پر اللہ تعالیٰ نے شام وفلسطین کو بنی اسرائیل پر چالیس سال کیلئے حرام قرار دے دیا، اگر وہ لوگ جہاد کیلئے تیار ہو جاتے تو اللہ تعالیٰ اسی وقت انہیں وہ نعمت عطا فرمادیتے مگر ان کی بزدلی کی وجہ سے انہیں یہ سزا ملی کہ وہ اس پاک سرزمین سے چالیس سال تک کیلئے محروم کردیئے گئے، حدیث شریف میں آتا ہے کہ بندہ اپنے گناہ کی وجہ سے رزق سے محروم ہوجاتا ہے، یعنی: جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اسے ملنے والی نعمت بھی روک لی جاتی ہے۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس چالیس سالہ دور میں تمام بوڑھے بنی اسرائیلی ختم ہو گئے اور ان میں سے کوئی بھی اس مقدس زمین میں نہ پہنچ سکا اس دوران نئی نسل پیدا ہوئی انہوں نے اپنے اندر تنظیم پیدا کی، پھر حضرت یوشع علیہ السلام کی رہنمائی میں انہوں نے جہاد کیا تو اس مقدس زمین کو فتح کرنے میں کامیاب ہوئے وگرنہ چالیس سال تک ان کی حالت یہ رہی، وہ سزا کے طور پر اسی صحرائے سینا (میدان تیہ) میں سرگردان پھرتے رہے ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کریں مگر اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنی مہربانی جاری رکھی جب ان کے خیمے پھٹ گئے تو ان پر بادلوں کے ذریعہ سایہ کردیا اور جب بھوک سے مرنے لگے تو ''من وسلویٰ'' جیسی لذیذ اور میٹھی خوراک انہیں پہنچائی۔

غلامی بہت بری چیز ہے اس کی وجہ سے لوگوں میں بری صفت پیدا ہوتی ہیں کمینگی اور بخل جیسی بری عادتیں پیدا ہوتی ہیں، اپنوں سے دشمنی اور غیروں سے وفاداری کے جذبات پیدا ہوتے ہیں، بنی اسرائیل بھی لمبے عرصہ تک غلامی میں رہنے کی وجہ سے اچھی عادتوں سے محروم ہو چکے تھے، لہٰذا انہوں نے اللہ تعالیٰ کا حکم ماننے سے انکار کردیا پھر جب نئی نسل آئی غلامی کے اثرات ختم ہوئے تو ان میں ملی جوش وجذبہ لوٹ آیا پھر انہوں نے جہاد کرکے وہ مقدس سرزمین حاصل کرلی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بددعا کی قبولیت

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے خلاف جو بددعا فرمائی اس کا حاصل حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیر کے مطابق یہ تھا کہ یہ لوگ جس سزا کے حقدار ہیں ان کو وہ سزا دی جائے اور ہم دونوں (حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت ہارون علیہ السلام) جس صورت حال کے مستحق ہیں ہم کو وہ عطا فرمائیے، اللہ تعالیٰ نے اس دعا کو اس طرح قبول فرمایا کہ ارشاد ہوا کہ ملکِ شام کی زمین ان پر چالیس سال کیلئے حرام قرار دیدی گئی ہے اب اگر وہ وہاں جانا بھی چاہیں تو نہ جاسکیں گے اور پھر یہ نہیں کہ ملک شام نہ جاسکیں گے بلکہ وہ اگر اپنے وطن مصر کی طرف لوٹنا چاہیں گے تو وہاں بھی نہ جاسکیں گے بلکہ اس میدان میں ان کو نظر بند کردیا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ کی سزاؤں کیلئے نہ پولیس اور نہ ان کی ہتھکڑیاں شرط ہیں اور نہ جیل خانے کی مضبوط دیواریں اور لوہے کے دروازے بلکہ جب وہ کسی کو نظر بند کرنا چاہیں تو کھلے میدان میں بھی قید کرسکتے ہیں، سبب ظاہر ہے کہ ساری کائنات اسی کی مخلوق ہے اور اسی کے حکم کی پابند ہے جب کائنات کو کسی کی قید کا حکم ہوجاتا ہے تو ساری ہوا اور فضا اور زمین اور مکان اس کیلئے جیل بن جاتے ہیں۔

چنانچہ یہ مختصر سا میدان جو مصر اور بیت المقدس کے درمیان ہے جس کی پیمائش حضرت مقاتل رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر کے مطابق تیس فرسخ لمبائی اور نو فرسخ چوڑائی ہے، ایک فرسخ اگر تین میل کا قرار دیا جائے تو نوے میل کے طول اور ستائیس میل کے عرض کا کل رقبہ ہوجاتا ہے اور بعض روایتوں کے مطابق صرف تیس میل ضرب اٹھارہ میل کا رقبہ ہے، اللہ تعالیٰ نے اس پوری قوم کو جس کی تعداد حضرت مقاتل رحمۃ اللہ علیہ کے بیان کے مطابق چھ لاکھ تھی، اس مختصر سے کھلے میدانی رقبہ کے اندر اس طرح قید کردیا کہ چالیس سال مسلسل اس کوشش میں رہے کہ کسی طرح اس میدان سے نکل کر مصر واپس چلے جائیں یا آگے بڑھ کر بیت المقدس پہنچ جائیں مگر ہوتا یہ تھا کہ سارے دن کے سفر کے بعد جب شام ہوتی تو یہ معلوم ہوتا کہ پھر پھرا کر وہ اسی مقام پر پہنچ گئے ہیں جہاں سے صبح چلے تھے۔

تفسیر کی کتابوں میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کو جو سزا دیتے ہیں وہ ان کے برے عملوں کی مناسبت سے ہوتی ہے اس نافرمان قوم نے چونکہ یہ کلمہ بولا تھا کہ ہم تو یہیں بیٹھے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کو اس سزا میں چالیس سال تک کیلئے وہیں قید کر دیا، تاریخی روایتیں اس میں مختلف ہیں کہ اس چالیس سال کے عرصہ میں بنی اسرائیل کی موجودہ نسل جس نے نافرمانی کی تھی سبھی فنا ہو گئے اور ان کی اگلی نسل باقی رہ گئی جو اس چالیس سالہ قید سے نجات پانے کے بعد بیت المقدس میں داخل ہوئی یا ان میں سے بھی کچھ لوگ باقی تھے بہرحال قرآن کریم نے ایک تو یہ وعدہ کیا تھا کہ ملکِ شام بنی اسرائیل کے حصہ میں لکھ دیا ہے وہ وعدہ پورا ہونا تھا کہ بنی اسرائیل کی قوم اس ملک پر قابض وحکمران ہو مگر بنی اسرائیل کے موجودہ افراد نے نافرمانی کر کے خدا کے انعام سے منہ موڑا تو ان کو یہ سزا مل گئی۔

اس وادئ تیہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام بھی اپنی قوم کے ساتھ تھے مگر یہ وادی لوگوں کیلئے تو قید اور سزا تھی مگر ان دونوں حضرات کیلئے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا خزانہ تھی، یہی وجہ تھی کہ چالیس سالہ دور جو بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ کے غصہ کی وجہ سے اس کی سزا کے اترنے کا گزرا اس میں بھی اللہ تعالیٰ نے ان کو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کی برکت سے طرح طرح کی نعمتیں عطا فرمائیں، کھلے میدان کی دھوپ سے عاجز آئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے اللہ تعالیٰ نے ان پر بادلوں کی چھتری لگا دی جس طرف یہ لوگ چلتے تھے بادل ان کے ساتھ ساتھ چلتے تھے، پانی کی کمی کی شکایت پیش آئی تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایک ایسا پتھر عطا فرما دیا کہ وہ ہر جگہ ان کے ساتھ ساتھ رہتا تھا اور جب پانی کی ضرورت ہوتی تھی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی لاٹھی اس پر مارتے تھے تو بارہ قبیلوں کیلئے بارہ چشمے جاری ہو جاتے تھے، بھوک کی تکلیف پیش آئی تو آسمانی غذا ''من وسلویٰ'' ان پر اتار دی گئی، رات کو اندھیرے کی شکایت ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے روشنی کا ایک مینار ان کیلئے کھڑا کر دیا جس کی روشنی میں یہ سب کام کاج کرتے تھے۔

غرض اس میدانِ تیہ میں صرف سزا یافتہ لوگ ہی نہ تھے بلکہ اللہ تعالیٰ کے دو محبوب پیغمبر اور ان کے ساتھ

دو مقبول بزرگ یوشع بن نون اور کالب بن یوحنا بھی تھے ان کے طفیل میں اس قید و سزا کے زمانے میں بھی یہ انعامات ان پر ہوتے رہے اور اللہ تعالیٰ رحیم ہیں ممکن ہے کہ بنی اسرائیل کے ان افراد نے بھی ان حالات کا مشاہدہ کرنے کے بعد اپنے جرم سے توبہ کر لی ہو اس کے بدلہ میں یہ انعامات ان کو مل رہے ہوں۔

صحیح روایتوں کے مطابق اسی چالیس سالہ دور میں پہلے حضرت ہارون علیہ السلام کی وفات ہوگئی اور اس کے ایک سال یا چھ ماہ بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات ہوگئی ان کے بعد حضرت یوشع بن نون کو اللہ تعالیٰ نے پیغمبر بنا کر بنی اسرائیل کی ہدایت کیلئے مقرر فرمایا، اور چالیس سالہ قید ختم ہونے کے بعد بنی اسرائیل کی باقی بچی کچی قوم حضرت یوشع بن نون کی قیادت میں بیت المقدس کے جہاد کیلئے روانہ ہوئی، اللہ تعالیٰ کے وعدہ کے مطابق ملک شام ان کے ہاتھوں فتح ہوا اور اس ملک کی ناقابل یقین دولت ان کے ہاتھ آئی۔

آیت کے آخر جو یہ ارشاد فرمایا کہ ''آپ اس قوم پر ترس نہ کھائیں'' یہ اس بناء پر کہ پیغمبر علیہم السلام اپنی طبیعت اور فطرت سے ایسے ہوتے ہیں کہ اپنی امت کی تکلیف اور پریشانی کو برداشت نہیں کر سکتے اگر ان کو سزا ملے تو یہ بھی اس سے غم زدہ ہوتے ہیں اس لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ تسلی دی گئی کہ آپ ان کی سزا سے غمگین نہ ہوں۔

بے گناہ کا قتل

وَ اتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَیْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ ۘ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا

اور پڑھئے اوپر ان کے خبر دو بیٹوں کی آدم کے ساتھ سچائی کے جب پیش کی دونوں نے نیاز

فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَ لَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ ؕ قَالَ

پس قبول کی گئی سے ایک کی ان دونوں میں اور نہ قبول کی گئی سے دوسرے کہا

لَاَقْتُلَنَّكَ ؕ قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۲۷﴾

البتہ ضرور میں قتل کر دونگا تجھ کو اس نے کہا بے شک قبول کرتے ہیں اللہ سے پرہیزگاروں (۲۷)

وقف لازم

النصف

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور ان کو سنایئے آدم کے دو بیٹوں کا صحیح حال جب دونوں نے کچھ نیاز پیش کی اور ایک کی قبول ہوئی اور دوسرے کی قبول نہ ہوئی (جس کی قبول نہ ہوئی اس نے دوسرے کو) کہا میں تجھ کو مار ڈالوں گا وہ بولا اللہ صرف پرہیز گاروں سے قبول کرتے ہیں۔ (۲۷)

لفظی تحقیق: **اُتْلُ:** پڑھ کر سنایئے۔ تلاوت کے معنیٰ ہیں: پڑھنا، کسی کو پڑھ کر سنانا، یہاں مراد ہے خبر دینا، اطلاع دینا۔ **قَرَّبَا:** پیش کی دونوں نے۔ ''تَقَرُّبْ'' کے معنیٰ ہیں نزدیک کرنا، آگے پیش کرنا۔ **قُرْبَانٌ:** تحفہ، پیش کش۔ جو کسی کی مہربانی حاصل کرنے کیلئے اسے پیش کی جائے، اسے نیاز بھی کہتے ہیں۔ **اَلْمُتَّقِيْنَ** پرہیز گار۔ متقی کی جمع ہے، متقی اسے کہتے ہیں جو برائیوں سے بچتا ہو، متقی ''تقویٰ'' سے بنا ہے، اور تقویٰ کے معنیٰ ہیں اللہ تعالیٰ کے ڈر سے بری باتوں سے بچنا۔

تفسیر

اس آیت میں ناحق قتل کی برائی اور اس کی تباہ کاری کا بیان کر کے قوم کو میانہ روی پر لانا مقصود ہے کہ جس طرح حق کی حمایت اور باطل کو مٹانے میں قتل وقتال سے جی چرانا غلطی ہے اسی طرح ناحق قتل وقتال کرنا بھی دین و دنیا کی تباہی ہے۔

پچھلی سورتوں میں خاص کر ''سورۂ بقرہ'' میں بنی اسرائیل کے بہت سے برے کام بیان کیے گئے ہیں، وہ اپنے پیغمبروں کو قتل کر دیتے تھے، وہ لڑ بھڑ کر اپنے آدمیوں کو وطن سے باہر دھکیل دیتے تھے، طرح طرح کے دنگے مچاتے تھے، لڑائی، قتل، دنگا، فساد ان کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا لیکن جب ان کو ٹھیک طرح دشمنوں کے خلاف جہاد کرنے کو کہا گیا تو انہوں نے ٹکا سا جواب دے دیا جیسا کہ پچھلے رکوع میں بیان کیا گیا، اس رکوع میں ان کو حضرت آدم کے دو بیٹوں ہابیل اور قابیل کا قصہ سنا کر سمجھایا جاتا ہے کہ بے گناہ کو اپنی غرض کیلئے قتل کرنا اور فساد پھیلانا بری بات ہے جیسے جہاد سے انکار کرنا بھی بری بات ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور اس کا مقابلہ ہے اور اس کی سزا بہت سخت ہے۔

ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں کا ذکر فرمایا ہے جن میں سے ایک نے دوسرے کو قتل کر دیا تھا، یہ بھی قاتل کی طرف سے عہد توڑنے کی وجہ سے ہی ہوا تھا۔

وَ اتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ: حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما، حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ، حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ وغیرہم فرماتے ہیں کہ اس آیت کریمہ میں دو بیٹوں میں سے حضرت آدم علیہ السلام کے سگے بیٹے مراد ہیں، ان دو بیٹوں، یعنی: ہابیل اور قابیل کا ذکر ''تورات'' میں بھی موجود ہے تاہم وہاں پر قابیل نام کے بجائے قائن کہا گیا ہے۔

دو بیٹوں کا واقعہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بھیجے جانے سے ہزاروں سال پہلے پیش آیا اور اس کا ٹھیک طور پر علم وحی کے بغیر نہیں ہوسکتا تھا، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے ہی اپنے پیغمبر کو فرمایا کہ: آپ بنی اسرائیل اور دوسرے لوگوں کو اس واقعہ کی ٹھیک ٹھیک تفصیل سنا دیں تاکہ ان کو علم ہوسکے کہ عہد توڑنے کے کس قدر برے نتیجے نکلتے ہیں۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ سب کے جد امجد حضرت آدم علیہ السلام کے ہاں ہر حمل سے دو جڑواں بچے پیدا ہوتے تھے جن میں ایک لڑکا ہوتا اور دوسری لڑکی، چنانچہ جب حضرت آدم علیہ السلام اپنی زندگی کے ایک ہزار سال مکمل کر کے اس دنیا سے رخصت ہوئے تو آپ ایک ہزار سے زیادہ اولاد، یعنی: لڑکے لڑکیاں پیچھے چھوڑ گئے تھے، اللہ تعالیٰ کو ایسا ہی منظور تھا، انسانی نسل کی ابتداء تھی اور اسے پوری دنیا میں پھیلانا مقصود تھا، لہٰذا حضرت آدم علیہ السلام کے ہاں بہت زیادہ بچے پیدا ہوئے، جب بچے جوان ہوتے اور ان کے نکاح کا مسئلہ پیدا ہوتا تو آپ کی شریعت کے مطابق ایک حمل کے لڑکے کا دوسرے حمل کی لڑکی سے آپس میں نکاح کرا دیا جاتا اور اس طرح انسانی نسل بڑھنے اور پھیلنے لگی۔

بھائی بہن کا آپس میں نکاح نہیں ہوسکتا تو اللہ تعالیٰ نے اس وقت کی ضرورت کے لحاظ سے حضرت آدم علیہ السلام کی شریعت میں یہ خصوصی حکم جاری فرما دیا تھا کہ ایک حمل سے جو لڑکا اور لڑکی پیدا ہو وہ تو آپس میں حقیقی بہن بھائی

سمجھے جائیں اور ان کے درمیان نکاح حرام قرار پائے، لیکن دوسرے حمل سے پیدا ہونے والے لڑکے کیلئے پہلے حمل سے پیدا ہونے والی لڑکی حقیقی بہن کے حکم میں نہیں ہوگی بلکہ ان کے درمیان نکاح جائز ہوگا۔

حضرت آدم علیہ السلام کے دو بیٹے ہابیل اور قابیل دو مختلف حمل سے تھے مگر اتفاق کی بات کہ ہابیل کے ساتھ پیدا ہونے والی لڑکی اچھی شکل وصورت کی نہ تھی جب کہ قابیل کی جڑواں بہن خوبصورت تھی اب اس وقت کی شریعت کے مطابق قابیل کا نکاح ہابیل کے ساتھ پیدا ہونے والی لڑکی کے ساتھ ہونا چاہئے تھا مگر وہ اسے پسند نہیں کرتا تھا اور اس کے بجائے اپنے ساتھ پیدا ہونے والی خوبصورت لڑکی سے نکاح کا خواہشمند تھا، حضرت آدم علیہ السلام نے انہیں سمجھایا کہ ایسا کرنا درست نہیں ہے کیونکہ یہ خدا تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی ہوگی، مگر قابیل اپنی ضد پر اڑا رہا ادھر ہابیل بھی اسی لڑکی کے ساتھ نکاح کرنا چاہتا تھا کیونکہ شریعت کے مطابق اس کے نکاح میں وہی آنی چاہئے تھی، حضرت آدم علیہ السلام نے ہابیل اور قابیل کے درمیان اختلاف کو ختم کرنے کیلئے یہ صورت تجویز فرمائی کہ تم دونوں اپنی اپنی قربانی اللہ تعالیٰ کیلئے پیش کرو جس کی قربانی قبول ہو جائے گی یہ لڑکی اس کو دی جائے گی کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام کو یقین تھا کہ قربانی اسی کی قبول ہوگی جو خدا ترس ہے، یعنی: ہابیل کی چنانچہ دونوں بھائی اس تجویز پر رضامند ہو گئے۔

چنانچہ ہابیل نے اپنے جانوروں میں سے ایک اچھا اور عمدہ جانور چُنا، دوسرے بھائی نے اپنے غلے کی پیداوار میں سے ردی غلّہ قربانی کیلئے پیش کیا جیسا کہ ''سورۂ آل عمران'' میں بیان ہو چکا ہے، قربانی کی قبولیت کی نشانی یہ تھی کہ اس چیز کو ایک خاص مقام پر رکھ دیا جاتا تھا آسمان سے آگ اترتی تھی اور قبولیت کی صورت میں قربانی کی چیز کو جلا کر راکھ کر دیتی تھی اسی طریقے کے مطابق دونوں بھائیوں نے اپنی اپنی قربانی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کی، اس آیت کریمہ میں اسی چیز کو بیان کیا گیا ہے، جب دونوں نے قربانی پیش کی تو ان میں سے ایک یعنی ہابیل کی قربانی کو اللہ تعالیٰ نے قبول فرمالیا اور دوسرے یعنی قابیل کی قربانی قبول نہ کی گئی۔

قربانی کے قبول نہ ہونے کی وجہ سے قابیل حسد کی آگ میں جل گیا اور اس نے غصہ میں آ کر دوسرے

بھائی ہابیل سے کہا کہ میں تجھے مار ڈالوں گا کیونکہ تو میری خواہش کے راستے میں رکاوٹ ہے، تیرا کام تمام کر کے ہی میں اپنے لئے راستہ صاف کرسکتا ہوں، اس کے جواب میں ہابیل نے کہا کہ بھائی! طیش میں نہ آ، قربانی کا قبول ہونا یا نہ ہونا اس اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے جس کے حضور قربانی پیش کی جاتی ہے اور اس کا قانون یہ ہے کہ وہ پرہیزگاروں کی قربانی کو قبول فرماتے ہیں، اگر تیری قربانی قبول نہیں ہوئی تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے مجھے پرہیزگاری کی صفت سے نوازا ہے اور میری قربانی قبول فرمائی ہے، اگر تجھ میں یہ صفت ہوتی تو اللہ تعالیٰ تمہاری بھی قربانی قبول فرما لیتے، حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ بڑے اونچے درجہ کے صحابی ہیں آپ حکیم الامت کہلاتے تھے ان کا قول ہے کہ اللہ کی قسم! اگر مجھے یقین ہو کہ میری یہ دو رکعت نماز قبول ہوگئی ہے تو یہ میرے لئے دنیا کی سب چیزوں سے زیادہ بہتر ہے کیونکہ اس آیت کریمہ کی رو سے میں سمجھوں گا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے پرہیزگاروں کی صف میں شامل فرمالیا ہے۔

پرہیزگاروں کا رویّہ

لَئِنْۢ بَسَطْتَّ اِلَیَّ یَدَكَ لِتَقْتُلَنِیْ مَاۤ اَنَا بِبَاسِطٍ یَّدِیَ
البتہ اگر　پھیلادے　تو میری طرف　ہاتھ اپنا　تاکہ قتل کرے تو مجھ کو　نہیں ہوں　میں　پھیلانے والا　ہاتھ اپنا

اِلَیْكَ لِاَقْتُلَكَ ۚ اِنِّیْۤ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۲۸﴾ اِنِّیْۤ اُرِیْدُ
طرف تیری　تاکہ قتل کروں تجھ کو　بیشک　میں ڈرتا ہوں　اللہ سے　پالنے والے　سارے جہانوں کے (۲۸)　بیشک　میں چاہتا ہوں

اَنْ تَبُوْٓءَاْ بِاِثْمِیْ وَ اِثْمِكَ فَتَكُوْنَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ۚ وَ
یہ کہ　حاصل کرے تو　گناہ میرا　اور　گناہ اپنا　پھر تو ہوجائے　میں سے　والوں　آگ کے　اور

ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِیْنَ ﴿۲۹﴾
یہی ہے　بدلہ　ظالموں کا　(۲۹)

بامحاورہ ترجمہ: اگر تو مجھ پر مارنے کو ہاتھ چلائے گا تو میں تجھ پر مارنے کو ہاتھ نہ چلاؤں گا، میں اللہ سے ڈرتا ہوں جو سب جہان کا پروردگار ہے۔(۲۸) میں چاہتا ہوں کہ تو میرا گناہ اور اپنا گناہ دونوں حاصل کرے تو دوزخ والوں میں سے ہو جائے اور ظالموں کی یہی سزا ہے۔(۲۹)

لفظی تحقیق: بَسَطْتَّ: تو پھیلائے۔ ''بَسَط'' کے معنٰی پھیلانے اور دراز کرنے، آگے بڑھانے کے ہیں۔ تَبُوْٓءَاْ: تو حاصل کرے۔ ''بُوْءٌ'' سے ہے، اس کے معنٰی لوٹنے اور پھرنے کے ہیں، یہ لفظ ''سورۂ بقرہ'' میں آیا ہے، مراد یہ ہے کہ جب تو اپنا کام کرکے فارغ ہو تو تجھ پر دو گناہوں کا بوجھ ہو ایک تو اپنے برے کام کا اور دوسرے میرے قتل کا۔

تفسیر

ہابیل نے اس کے بعد کہا کہ اگر تو نے میرے مارنے کیلئے ہاتھ اٹھایا مجھے جان سے مارنے کی ٹھان لی تو، تو جان! میں تو کبھی تجھے جان سے مارنے کے ارادہ سے تیرے اوپر ہاتھ نہ اٹھاؤں گا، کیونکہ میرے دل میں اللہ تعالٰی کا خوف بیٹھا ہوا ہے اور میں جانتا ہوں کہ سارے جہانوں کا نگہبان اور رکھوالا وہی ہے اور اسی کی مدد سے سب کام چلتے ہیں، میں اس کو ناراض کرتے ہوئے ڈرتا ہوں، میں نے ارادہ کرلیا ہے کہ اپنے بچاؤ کیلئے ایک انگلی بھی نہ ہلاؤں گا اور کوئی بات ایسی نہ کروں گا جس سے تجھے جوش آجائے اور تو مجھے جوش میں قتل کردے، ایسا کرنے سے کچھ حصہ گناہ کا میری طرف بھی آجائے گا، میں چاہتا ہوں کہ صبر کروں اور اس طرح میرے حصہ کا گناہ بھی تیرے ہی سر پڑے اور تو اپنا اور میرا دونوں کا گناہ سمیٹے جس کا نتیجہ یہ ہو کہ تو دوزخ کے اندر جانے والوں میں سے ہو جائے کیونکہ ظلم کرنے والوں کی یہی سزا ہے۔

ہابیل نے یہ سب اس لئے کہا کہ شاید قابیل یہ سب سن کر گناہ سے رک جائے ''میں تیرا ذرا سا بھی مقابلہ نہ کروں گا، سارا گناہ تیرے ہی سر پر ہوگا اور تو ظالموں میں داخل ہو جائے گا'' لیکن قابیل اپنی خواہشوں میں اندھا ہو رہا تھا اس نے ایک نہ سنی۔

خواہش اندھا کر دیتی ہے

فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ قَتْلَ اَخِيْهِ فَقَتَلَهٗ فَاَصْبَحَ مِنَ

پس آراستہ کیا لئے اسکے جی اسکے نے مار ڈالنا بھائی اپنے کو سو اس نے قتل کر دیا اسکو پھر ہو گیا میں سے

الْخٰسِرِيْنَ ﴿۳۰﴾ فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا يَّبْحَثُ فِي الْاَرْضِ لِيُرِيَهٗ

خسارہ پانے والوں (۳۰) پس بھیجا اللہ نے ایک کوا جو کرید تا تھا میں زمین تا کہ دکھائے اس کو

كَيْفَ يُوَارِيْ سَوْءَةَ اَخِيْهِ ؕ قَالَ يٰوَيْلَتٰۤى اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ

کیسے چھپائے وہ لاش بھائی اپنے کی بولا ہائے افسوس کیا میں بے بس ہوا اس سے کہ ہو جاؤں

مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ فَاُوَارِيَ سَوْءَةَ اَخِيْ ۚ فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِيْنَ ﴿۳۱﴾

مانند اس کوے کے پھر چھپا دوں لاش بھائی اپنے کی پس ہو گیا وہ میں سے پچھتانے والوں (۳۱)

بامحاورہ ترجمہ:۔ پھر اس کو اس کے نفس نے راضی کیا اپنے بھائی کے قتل پر، پھر اس کو مار ڈالا سو نقصان اٹھانے والوں میں ہو گیا۔ (۳۰) پھر اللہ نے ایک کوّا بھیجا جو زمین کو کرید تا تھا تا کہ اس کو دکھلائے کہ کس طرح چھپائے بھائی کی لاش، بولا اے افسوس! مجھ سے اتنا نہ ہو سکا کہ اس کوّے کے برابر ہو جاؤں کہ چھپاؤں اپنے بھائی کی لاش کو پھر پچھتانے لگا۔ (۳۱)

لفظی تحقیق: طَوَّعَتْ: "تَطْوِيْعٌ" سے ہے، اس کے معنٰی ہیں: کسی کو کوئی برا کام اچھی شکل میں دکھانا تا کہ وہ اس کے کرنے پر تیار ہو جائے۔ يَبْحَثُ: کھودتا تھا۔ "بَحْثٌ" سے ہے، جس کے معنٰی ہیں کریدنا، کھودنا، یعنی: کوا اس کے سامنے اپنی چونچ اور پنجوں سے زمین کھودنے لگا۔ يٰوَيْلَتٰۤى: عربی میں افسوس ظاہر کرنے کے وقت یہ لفظ بولا جاتا ہے، جیسے ہم بے اختیار ہائے افسوس کہہ دیتے ہیں۔ عَجَزْتُ: بے بس ہوا میں۔ "عِجزٌ" سے بنا ہے، جس کے معنٰی ہیں عاجز ہو جانا، کسی کام کو نہ کر سکنا۔ سَوْءَةَ: بری چیز۔ جو آنکھوں کو اچھی نہ

معلوم ہو، یہاں لاش مراد ہے۔

تفسیر

قابیل جو خواہش، حسد اور غصہ میں باؤلا ہو رہا تھا اس کے دل نے اسے یہی سمجھایا کہ بھائی کو قتل کر ڈالے، جو شخص اپنی غرض کی وجہ سے اندھا ہو گیا ہو اسے اس کے سوا کچھ نہیں سوجھتا کہ چاہے کچھ بھی ہو اپنے فائدے کیلئے دوسرے کو دکھ پہنچاتا ہے، چنانچہ اس نے اپنے بھائی ہابیل کو قتل کر دیا لیکن اس کا نتیجہ اس کیلئے نقصان کے سوا کچھ نہ ہوا، دنیا کا نقصان تو یہ ہوا کہ بھائی جیسا ساتھی اور مددگار کھو بیٹھا۔

دنیاوی اور فوری نقصان کے علاوہ آخرت کا شدید ترین اور ہمیشہ ہمیشہ کا نقصان بھی پیش آنے والا ہے، بھائی کا قتل انتہائی ظلم اور قطع رحمی کی بدترین مثال ہے، دنیا میں خونریزی کی ابتداء اسی قتل سے ہوئی اس سے پہلے کوئی خون نہیں بہا تھا، اس سب سے قتل کا اثر نہ صرف والدین اور بھائی پر ہوا بلکہ پورے ماحول پر ہوا، مفسرین فرماتے ہیں کہ قاتل کا بدن سیاہ ہو گیا، اس دنیا میں پھل کڑوے ہو گئے، درختوں کے ساتھ کانٹے لگ گئے اور اسی طرح کئی دوسری ناگوار تبدیلیاں پیش آئیں، یہ سب تفسیری روایتوں میں آتا ہے۔

آخرت کے نقصانات میں سے ایک بڑا نقصان یہ ہے کہ اس ناحق قتل کا وبال قاتل پر ہمیشہ کیلئے قائم ہو گیا اب قیامت تک جتنے بھی ناحق قتل ہوتے رہیں گے ان کا گناہ اس قاتل کے علاوہ سب سے پہلے قاتل قابیل کے اعمال نامہ میں بھی درج ہوتا رہے گا کیونکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے اس لئے کہ قابیل نے دنیا میں پہلا قتل کر کے اس جرم کو رائج کیا، اب ہر ایسے کام کی برائی اس کو بھی ملتی رہے گی، غرضیکہ اس لحاظ سے بھی قابیل کیلئے یہ بہت بڑا نقصان ہے کہ دنیا کے ہر قتل میں سے اس کو گناہ کا حصہ ملتا رہے گا۔

چونکہ اس سے پہلے کسی انسان کی موت واقع نہیں ہوئی تھی اس لئے قابیل کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ بھائی کی مردہ لاش کو کیسے ٹھکانے لگائے، بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ وہ لاش کو کندھے پر اٹھائے پھرتا رہا اور

جب وہ گلنے سڑنے لگی تو دماغ چکرانا شروع ہوگیا اس سے اسے مزید پریشانی لاحق ہوگئی، اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے اس کی رہنمائی فرمائی، اللہ تعالیٰ نے کوّے کو بھیجا جو زمین کرید تا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ کام کوّے سے لیا۔

کوّے کے ذریعے رہنمائی کے متعلق مفسرین نے کئی واقعے لکھے ہیں، مثلاً: یہ کہ دو کوّے آپس میں لڑ پڑے، پھر ایک نے دوسرے کے پر وغیرہ نوچ ڈالے حتیٰ کہ اسے مار ڈالا اس کے بعد زمین کو کرید کر گڑھا بنایا اور مردہ کوّے کو اس میں دفن کر دیا، بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ کسی مردہ جانور کے دفن کرنے کا واقعہ پیش نہیں آیا تھا بلکہ کوئی بھی ایسی چیز جسے فوری استعمال کرنا نہ ہو اسے آئندہ استعمال کیلئے زمین میں دبا دیا جاتا ہے تو ایسا ہی کوئی واقعہ قابیل کے سامنے پیش آیا تھا۔

اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوّے کا انتخاب بڑا معنیٰ خیز ہے کوّے کی فطرت میں یہ چیز پائی جاتی ہے کہ وہ اپنے ہم جنس کی لاش پر بڑا شور مچاتے ہیں اور سب کوّے اکٹھے ہو جاتے ہیں، پھر جب تک وہ لاش کسی ٹھکانے نہ لگ جائے کوؤں کی بے چینی اور شور وغل جاری رہتا ہے، چنانچہ ہابیل کی لاش کو دفن کرنے کیلئے بھی اللہ تعالیٰ نے کوّے سے کام لیا، اس نے اپنی چونچ اور پنجوں سے زمین کو کریدا اور مردہ کوّے یا کسی دوسری چیز کو اس گڑھے میں دفن کر دیا، مقصد یہ تھا کہ قابیل کو دکھایا جائے کہ وہ اپنے بھائی کی لاش کو کیسے دفن کرے، بہرحال اس پہلی میت کے دفن کا طریقہ اللہ تعالیٰ نے ایک کوّے کے ذریعے سمجھا دیا۔

میت کا دفن کرنا ایک فطری عمل ہے اس سے انسانی جسم کی حفاظت بھی ہو جاتی ہے اور اس کی ذلت و خواری بھی نہیں ہوتی، اس کے علاوہ میت کو ٹھکانے لگانے کے سارے طریقے غیر فطری ہیں، اللہ تعالیٰ نے زمین کی یہ بھی ایک خاصیت بیان فرمائی ہے کہ یہ زمین زندوں کو بھی اپنے اوپر تھامتی ہے اور مردوں کو بھی اپنے اندر سمیٹ لیتی ہے۔

بہرحال جب قابیل نے دیکھا کہ ایک کوّے نے زمین کرید کر مردہ کو دفن کیا ہے تو اپنے آپ پر افسوس کرنے لگا کہ ہائے افسوس! کیا میں اتنا عاجز آ گیا ہوں کہ میں اس کوّے جیسا بن جاؤں، مطلب یہ تھا کہ افسوس میں ایک کوّے جتنی عقل بھی نہیں رکھتا، ایک پرندے نے تو لاش کو دفن کر دیا مگر مجھ سے اتنا بھی نہ ہو سکا، یہ قابیل کی طرف سے

افسوس کے اظہار کے الفاظ تھے، اپنی کم عقلی اور کمزوری کو ظاہر کرنے کے بعد اس نے کوّے سے سبق سیکھا۔

قابیل نے اللہ تعالیٰ کے حکم کو توڑا، بھائی کو قتل کیا، پھر لاش کو ٹھکانے لگانے سے بھی عاجز رہا ان سب باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ پچھتانے والوں میں سے ہو گیا، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ توبہ شرمندگی ہی کا نام ہے جب کوئی شخص غلط کام کر بیٹھتا ہے پھر اسے شرمندگی ہوتی ہے اور وہ اس کام سے باز آ جاتا ہے، وہ آئندہ کیلئے بھی عزم کرتا ہے کہ ایسے کام کو دوبارہ نہیں کرے گا تو یہی توبہ ہے، مگر قابیل کا معاملہ مختلف ہے وہ اپنی عقل پر شرمندہ ہو رہا تھا کہ اسے ایک کوّے جیسی عقل بھی حاصل نہیں، مگر وہ اپنے قتل والے عمل پر شرمندہ نہیں ہوا اور نہ اس نے توبہ کی، لہٰذا وقتی طور پر تو اس کی پریشانی دور ہو گئی مگر جان بوجھ کر قتل کرنے کے جرم میں ہمیشہ کیلئے عذاب کا مستحق بن گیا۔

قابیل کے کئے کا پھل

مِنۡ اَجۡلِ ذٰلِكَ ۛ كَتَبۡنَا عَلٰى بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ اَنَّهٗ مَنۡ قَتَلَ

بوجہ — اس کے — لکھا ہم نے — پر — بنی — اسرائیل — کہ جو — کوئی — قتل کرے

نَفۡسًۢا بِغَيۡرِ نَفۡسٍ اَوۡ فَسَادٍ فِى الۡاَرۡضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ

ایک شخص کو — بلاعوض — دوسرے شخص کے — یا — بغیر کسی فساد کے پھیلانے کے — میں — زمین — پس گویا — قتل کیا اس نے

النَّاسَ جَمِيۡعًا ؕ وَمَنۡ اَحۡيَاهَا فَكَاَنَّمَاۤ اَحۡيَا النَّاسَ جَمِيۡعًا ؕ وَ

لوگوں — سب کو — اور — جو — زندہ رکھے اس کو — پس گویا — زندہ رکھا اس نے — لوگوں — سب کو — اور

لَقَدۡ جَآءَتۡهُمۡ رُسُلُنَا بِالۡبَيِّنٰتِ ثُمَّ اِنَّ كَثِيۡرًا مِّنۡهُمۡ بَعۡدَ

البتہ — آ چکے ان کے پاس — پیغمبر ہمارے — ساتھ صاف باتوں کے — پھر — بیشک — بہت — میں سے ان — بعد

ذٰلِكَ فِي الْاَرْضِ لَمُسْرِفُوْنَ ﴿۳۲﴾

اس کے میں زمین حد سے بڑھنے والے ہیں (۳۲)

بامحاورہ ترجمہ: ۔اسی وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل پر لکھا کہ جو کوئی ایک جان کو مارے بغیر کسی جان کے بدلے یا بغیر کسی فساد پھیلانے کے زمین میں گویا اس نے سب لوگوں کو قتل کر ڈالا اور جس نے ایک جان کو زندہ رکھا تو گویا سب لوگوں کو زندہ رکھا اور ان کے پاس ہمارے پیغمبر کھلے ہوئے حکم لا چکے ہیں، پھر بہت لوگ ان میں سے اس پر بھی زمین میں حد سے بڑھ جاتے ہیں۔ (۳۲)

لفظی تحقیق: اَجْلْ: باعث، سبب۔ نَفْسْ: جان۔ فَسَاد: بگاڑ۔ کسی بنی بنائی چیز کے خراب کرنے کی کوشش کرنا۔ اَلْبَيِّنٰتْ: روشن چیزیں۔ "بَيِّنَةٌ" کی جمع ہے، کھلی ہوئی دلیل، بات، یہاں مراد حکم یعنی شریعت کی باتیں ہیں یا پیغمبر کی نشانیاں ہیں۔ مُسْرِفُوْنَ: زیادتی کرنے والے۔ "اِسْرَافْ" سے ہے، جس کے معنیٰ ہیں زیادتی کرنا، حد سے نکل جانا، ستانا۔

تفسیر

ہابیل قابیل کا قصہ بیان کرنے کے بعد ارشاد ہے کہ قابیل نے قتل کر کے سارے آدمیوں کیلئے قتل کا دروازہ کھول دیا، اس وجہ سے بنی اسرائیل کو حکم دیا گیا کہ بلا وجہ اور عدالت کے فیصلے کے بغیر کسی بے گناہ کو مار ڈالنا سارے آدمیوں کے مار ڈالنے کے برابر ہے، کیونکہ ایک کے دیکھا دیکھی ایک دوسرے کے مار ڈالنے پر تل جائیں گے اور جس نے ایک شخص کو زندہ رہنے دیا اور غصہ کے باوجود نہ مارا تو، گویا اس نے سارے آدمیوں کے زندہ رہنے کا بندوبست کر دیا، آدمی اکثر وہی کام کرتا ہے جو دوسرے کو کرتے دیکھتا ہے اس لئے جو نیک کام کرے گا اس کے دیکھا دیکھی دوسرے بھی نیک کام کریں گے، اور جو برا کام کرے گا اس کو دیکھ کر دوسرے بھی برا کام کرنے لگیں گے۔

مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ: دراصل ''اجل'' کا معنیٰ ہوتا ہے برائی کو کھینچ کر لانا، چونکہ حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹے نے ناحق قتل کر کے ظلم کا ثبوت دیا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے قتل کے روک تھام کیلئے بنی اسرائیل پر یہ حکم اتارا ہے جیسا کہ گذری ہوئی آیتوں میں بیان ہو چکا ہے، ناحق قتل بہت بڑا جرم ہے یہ انسان کیلئے تباہ کن ہے اسی کی وجہ سے انسان جہنمی بنتا ہے، ناحق قتل کے وبال کے متعلق پچھلی سورۃ میں بھی گزر چکا ہے کہ جو کسی مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کرے گا اس کیلئے دوزخ واجب ہوگئی اس کے علاوہ ایسے شخص پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے لعنت کے الفاظ آئے ہیں اور اس پر اس کا غضب اور ناراضگی اترتی ہے، غرضیکہ قاتل کی دنیا اور آخرت دونوں خراب ہو جاتے ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس بڑے جرم کے ختم کرنے کیلئے یہاں پر حکم بیان فرمایا ہے۔

''سورۂ بقرہ'' میں قصاص کا حکم بیان ہو چکا ہے، اے عقلمندو! تمہارے لئے قصاص کے حکم میں زندگی ہے اگر اس حکم کو ٹھیک طور پر جاری کرو گے تو تمہاری زندگیاں محفوظ ہو جائیں گی اور قتل کی وارداتیں رُک جائیں گی ورنہ قتل ہوتے رہیں گے اور تمہاری جانیں ہمیشہ غیر محفوظ رہیں گی۔

جس طرح ایک آدمی کا قتل سب آدمیوں کا قتل ہے اسی طرح جس نے ایک آدمی کو زندہ رہنے دیا اس نے گویا سب آدمیوں کو زندہ رہنے دیا، مطلب یہ ہے کہ جس شخص نے فساد کے خلاف کسی ایک انسانی جان کی حفاظت کی اس نے گویا تمام انسانی نسل کی حفاظت کا فرض انجام دیا، اللہ تعالیٰ کے ہاں انسانی جان کی قدر و قیمت بہت زیادہ ہے اور اس نے ایک جان کی حفاظت کو پوری انسانی نسل کی حفاظت کے برابر قرار دیا ہے، ''ابن ماجہ شریف'' میں ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: اللہ تعالیٰ کے نزدیک کسی ایک مسلمان آدمی کا قتل پوری دنیا کی تباہی سے بھی بڑا ہے، ''بیہقی شریف'' کی روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ اگر زمین و آسمان کی ساری مخلوق مل کر کسی قتل میں شریک ہو تو اللہ تعالیٰ سب کو دوزخ میں ڈال دیں گے، ایک انسانی جان کا اتنا بڑا احترام اور اتنی قدر و قیمت ہے، حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما کی روایت میں آتا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت اللہ شریف کو مخاطب کر کے فرمایا: اے اللہ کے گھر! تو کتنا پاک ہے اور تیرا احترام کتنا بڑا ہے مگر میں کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے

ہاں ایک مسلمان کے جان کا احترام تجھ سے بھی زیادہ ہے، بہر حال احترام اور جان کی حفاظت کا یہ حکم بنی اسرائیل کو خطاب کر کے سمجھایا کیونکہ اس معاملہ میں وہ حد سے تجاوز کر چکے تھے۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں کو بھی فرمایا تھا کہ ایک وقت ایسا آئے گا جب تم بھی یہودیوں اور عیسائیوں کے نقش قدم پر چل نکلو گے، جو جو بری باتیں ان میں پائی جاتی ہیں وہ تم میں بھی لوٹ آئیں گی اگر وہ ناحق قتل کے عادی بن چکے تھے تو تم بھی ان سے پیچھے نہیں رہو گے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں میں سب سے پہلا ناحق قتل حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا ہوا، مسلمانوں کے درمیان تلوار چلنے کی ابتداء ہوئی جو اب تک جاری ہے۔

وَ لَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَيِّنٰتِ: یہاں "بَيِّنٰتِ" سے مراد صرف معجزات نہیں بلکہ حکم اور دلیلیں بھی مراد ہیں گویا ہمارے پیغمبر واضح تعلیم اور اصول لے کر آتے رہے انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد بھیجے ہوئے حکم ان پر واضح کر دیئے، پھر اس کے بعد ان میں اکثر لوگ اللہ تعالیٰ کی زمین میں حد سے بڑھنے والے ہیں، پچھلے پیغمبروں نے بھی وضاحت کے ساتھ حلال و حرام اور جائز و ناجائز کے حکم بیان فرمائے، اور پھر سب سے آخر میں آنے والے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی واضح فرما دیا کہ جنت کے قریب اور دوزخ سے دور کرنے والی تمام چیزیں تمہیں بتادی گئی ہیں تا کہ کل کو کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ ہمیں علم نہیں ہوا، اب ان کے پاس کوئی بہانہ باقی نہیں رہا، یہ لوگ اپنی غفلت، جہالت اور نادانی پر پکڑے جائیں گے، ناحق قتل اور دوسرے عیبوں سے بچنے کی تدبیریں بتادی گئی ہیں، گناہ اور ان کے درجے واضح کر دیئے گئے ہیں، گناہوں سے بچنے کی تدبیریں واضح کر دیں ہیں، سوسائٹی میں امن وامان کے قیام کے اصول سمجھا دیئے ہیں اور معاشرے کے افراد کی عزت واحترام کا طریقہ بتادیا ہے، لہٰذا اب یہ ان کا کام ہے کہ پوری دنیا سے فتنہ وفساد کا خاتمہ کر کے معاشرے کو پرامن بنادیں۔

''اسراف'' کا معنیٰ ہے اعتدال کی حد سے آگے بڑھنا، معاملہ کھانے پینے کا ہو یا لباس کا مسئلہ، مسئلہ سیاسی ہو یا معاشی کسی بھی موقع پر حد سے آگے نہیں بڑھنا چاہئے، اگر دس روپے کا کھانا کفایت کر سکتا ہے تو سو روپے خرچ کرنا لازماً ''اسراف'' ہوگا، شریعت کی حدوں کو توڑ کر حرام چیزوں کی طرف رغبت کرنا ''اسراف'' ہی تو ہے۔

زمین میں فساد کی تشریح

چوری اور ڈاکہ میں یہ فرق ہے کہ چوری کی صورت میں تو خفیہ طریقہ سے کسی کا مال حاصل کیا جاتا ہے مگر ڈاکے میں اعلانیہ طور پر طاقت کے زور سے مال حاصل کیا جاتا ہے اور اگر ضرورت پڑے تو قتل کرنے سے بھی نہیں چوکتے، ڈاکو جب ڈاکہ کے ارادہ سے نکلتے ہیں تو وہ مطلوبہ کام کیلئے افرادی قوت جمع کرتے ہیں، اسلحہ مہیا کرتے ہیں، اپنی جان کی حفاظت کا بندوبست کرتے ہیں اور پھر اس ظلم وزیادتی کا آغاز کرتے ہیں چونکہ ڈاکو پوری تیاری کے ساتھ اپنے کام کا آغاز کرتے ہیں اس لئے وہ حملہ آور ہو کر مال واسباب چھین لیتے ہیں اور بعض اوقات عورتوں کو بھی اغواء کر لیتے ہیں چونکہ مخالف فریق اس اچانک آنے والی آفت کیلئے پہلے سے تیار نہیں ہوتا اس لئے بعض وقت ڈاکوؤں سے چھیڑ چھاڑ کرتا ہے تو وہ اس کی جان کو ضائع کرنے سے بھی نہیں چوکتے، لہٰذا عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ اس قسم کے حالات میں لوگ خود ہی سب کچھ ڈاکوؤں کو پیش کر دیتے ہیں اور اگر کوئی حیل و حجت کرتا ہے تو اسے مال کے ساتھ جان سے بھی ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔

قرآن کریم میں حدود کا ذکر بہت مختصر ہے، البتہ تعزیرات کا وسیع بیان موجود ہے، حدود میں چوری، شراب پینا، قذف (تہمت لگانا)، بدکاری، مرتد ہوجانا، بغاوت اور ڈاکہ شامل ہیں جرموں کی نوعیت کے اعتبار سے اسلام نے تین قسم کی سزائیں مقرر کی ہیں، حدود وہ مقرر کی ہوئی سزائیں ہیں جس میں کمی زیادتی نہیں کی جاسکتی، دوسری قسم قصاص ہے، یہ سزا ناحق قتل کے جرم میں دی جاتی ہے سزاؤں کی تیسری قسم تعزیرات ہیں جن کا باب بہت وسیع ہے، اسلامی نظام میں تعزیرات کو بہت اہمیت حاصل ہے البتہ مختلف جرموں کی سزا تجویز کرنا مسلمان حاکم کی مرضی پر ہے وہ جرم کی نوعیت کے اعتبار سے جو سزا مناسب سمجھے عائد کر دے تاہم اصولی بات یہ ہے کہ ظلم کسی صورت میں بھی قابل برداشت نہیں ہے۔

دنیا میں فساد پھیلانے والوں کی سزا

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ يَسْعَوْنَ

اسکے سوا کچھ نہیں کہ سزا ان کی جولڑائی کرتے ہیں اللہ سے اور پیغمبر اسکے سے اور دوڑتے پھرتے ہیں

فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ

میں زمین فساد کرتے ہوئے کہ قتل کئے جائیں یا سولی دیئے جائیں یا کاٹ ڈالے جائیں ہاتھ انکے

وَ اَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ؕ

اور پاؤں ان کے سے خلاف یا دور کئے جائیں سے ملک

بامحاورہ ترجمہ:۔ یہی سزا ہے ان کی جولڑائی کرتے ہیں اللہ سے اور اس کے پیغمبر سے اور بھاگ دوڑ کرتے ہیں ملک میں فساد کرنے کیلئے کہ ان کو قتل کیا جائے یا سولی چڑھائے جائیں یا کاٹے جائیں ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف جانب سے یا دور کردیئے جائیں اس ملک سے۔

لفظی تحقیق: جَزٰٓؤُا: بدلا۔ عربی زبان میں بھلائی اور برائی دونوں کے بدلوں کو جزاء کہتے ہیں، اردو میں بھلائی کے بدلے کو جزاء اور برائی کے بدلے کو سزا کہتے ہیں۔ يُحَارِبُوْنَ: لڑائی کرتے ہیں۔ "مُحَارَبَةٌ" سے ہے، کسی سے لڑائی کرنا، یہ "حَرْبٌ" سے بنا ہے، جس کے معنٰی لڑائی کے ہیں، یہاں اس سے مراد بغاوت کرنا، یعنی: اللہ تعالٰی اور اس کے پیغمبر پر ایمان رکھنے والوں سے لڑتا ہے۔ يَسْعَوْنَ: دوڑتے ہیں۔: "سَعْیٌ" سے بنا ہے، جس کے معنٰی ہیں چلنا، پھرنا، دوڑنا، کوشش کرنا، یہاں اس سے مراد ہے فساد کرتے پھرتے ہیں۔ "مِّنْ خِلَافٍ" اس سے مراد یہ ہے کہ دایاں ہاتھ اور بایاں پاؤں، یا بایاں ہاتھ اور دایاں پاؤں۔ "يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ": ملک سے نکال دیے جائیں، یعنی: ملک بدر کردیئے جائیں، اس کی صورت یہ ہے کہ کہیں دور لے جاکر انہیں قید کردیں جسے آج کل نظر بند کرنا کہتے ہیں۔

تفسیر

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے قانون کے توڑنے والوں کی سزا بیان کی گئی ہے کہ یہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کے مقرر کیے ہوئے قانون کی پروانہیں کرتے حقیقت میں اللہ تعالیٰ اور پیغمبر سے لڑائی کرتے ہیں۔

ڈاکوؤں کی چار قسم کی سزاؤں کا بیان

(۱)....اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا: جنھوں نے ڈاکے کے وقت کسی کو قتل کر دیا لیکن مال نہ لے سکے اس کی سزا یہ ہے کہ وہ قتل کر دیئے جائیں۔

(۲)....اَوْ يُصَلَّبُوْٓا: یا قتل کر کے مال بھی لے لیا ہو ان لوگوں کی سزا یہ ہے کہ سولی پر لٹکا دیا جائے۔

(۳)....اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ: یا انہوں نے قتل تو نہیں کیا مگر مال چھین لیا تو ان کی سزا یہ ہے کہ دایاں ہاتھ اور بایاں پاؤں کاٹ دیا جائے۔

(۴)....اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ: لوگوں کو گھیر تو لیا مگر قتل کرنے اور مال لینے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہو گئے ایسے لوگوں کی سزا یہ ہے کہ انہیں جیل میں قید کر دیا جائے گا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابو بردہ اسلمی سے معاہدہ کا صلح فرمایا تھا مگر اس نے عہد کو توڑا اور کچھ لوگ مسلمان ہونے کے لئے مدینہ طیبہ آ رہے تھے ان پر ڈاکہ ڈالا، اس واقعہ میں حضرت جبرائیل امین یہ سزا کا حکم لے کر اترے کہ جس شخص نے کسی کو قتل بھی کیا اور مال بھی لوٹا اس کو سولی چڑھایا جائے اور جس نے صرف قتل کیا مال نہیں لوٹا اس کو قتل کیا جائے اور جس نے کوئی قتل نہیں کیا صرف مال لوٹا ہے اس کے ہاتھ پاؤں مخالف جانبوں سے کاٹ دیئے جائیں اور جو ان میں سے مسلمان ہو جائے اس کا جرم معاف کر دیا جائے اور جس نے قتل و غارت گری کچھ نہیں کیا صرف لوگوں کو ڈرایا جس سے امن میں خلل ہو گیا اس کو جلاوطن کیا جائے۔

ملک بدر کرنے کا مفہوم ایک فقہاء کی جماعت کے نزدیک یہ ہے کہ ان کو دارالاسلام سے نکال دیا جائے

اور بعض حضرات کے نزدیک یہ ہے کہ جس مقام پر ڈاکہ ڈالا ہے وہاں سے نکال دیا جائے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس قسم کے معاملے میں یہ فیصلہ فرمایا کہ اگر مجرم کو یہاں سے نکال کر دوسرے شہروں میں آزاد چھوڑ دیا جائے تو وہاں کے لوگوں کو ستائے گا اس لئے ایسے مجرم کو قید خانہ میں بند کر دیا جائے یہی اس کا زمین سے نکالنا ہے کہ زمین میں کہیں چل پھر نہ سکے، امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی اختیار فرمایا ہے۔

رہا یہ سوال کہ اس طرح کے مسلح حملوں میں آجکل عام طور پر صرف مال کی لوٹ کھسوٹ یا قتل وخون ریزی ہی پر اکتفاء نہیں ہوتا بلکہ اکثر عورتوں کی عزت لوٹنے اور اغواء وغیرہ کے واقعے بھی پیش آتے ہیں اور قرآن مجید کا جملہ "وَ يَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا" اس قسم کے تمام جرموں کو شامل بھی ہے تو وہ کس سزا کے مستحق ہوں گے اس میں ظاہر یہی ہے کہ امام وامیر کو اختیار ہوگا کہ ان چاروں سزاؤں میں سے جو ان کے حال کے مناسب دیکھے وہ جاری کرے اور بدکاری کا شرعی ثبوت پہنچے تو بدکاری کی حد جاری کرے، اسی طرح اگر صورت یہ ہو کہ نہ کسی کو قتل کیا نہ مال لوٹا مگر کچھ لوگوں کو زخمی کر دیا تو زخموں کے قصاص کا قانون نافذ کیا جائے گا۔

شرعی سزاؤں کی تین قسمیں

ڈاکہ اور چوری کی شرعی سزائیں جن کا ذکر اس آیت میں ہے ان کی تفسیر بیان کرنے سے پہلے مناسب ہے کہ ان سزاؤں سے متعلق شرعی لفظوں کی کچھ وضاحت کر دی جائے جن سے ناواقفیت کی وجہ سے بہت سے پڑھے لکھے لوگوں کو بھی شبہات پیش آتے ہیں، دنیا کے عام قانون میں جرموں کی تمام سزاؤں کو مطلقاً تعزیرات کا نام دیا جاتا ہے خواہ وہ کسی جرم سے متعلق ہو تعزیرات ہند، تعزیرات پاکستان وغیرہ کے ناموں سے جو کتابیں شائع ہو رہی ہیں وہ ہر قسم کے جرموں اور ہر طرح کی سزاؤں پر مشتمل ہیں لیکن شریعت میں معاملہ ایسا نہیں بلکہ جرموں کی سزاؤں کی تین قسمیں قرار دی گئی ہیں:

(۱).... حدود۔ (۲).... قصاص۔ (۳).... تعزیرات۔

ان تینوں قسموں کی تعریف اور مفہوم سمجھنے سے پہلے ایک یہ بات جان لینا ضروری ہے کہ جن جرموں سے کسی دوسرے انسان کو تکلیف یا نقصان پہنچتا ہے اس میں مخلوق پر بھی ظلم ہوتا ہے اور خالق کی بھی نافرمانی ہوتی ہے اس لئے ہر ایسے جرم میں اللہ تعالیٰ کا حق اور بندے کا حق دونوں شامل ہوتے ہیں اور انسان دونوں کی حق تلفی کا مجرم بنتا ہے، لیکن بعض جرموں میں بندے کے حق کی حیثیت کو زیادہ اہمیت حاصل ہے اور بعض میں اللہ تعالیٰ کے حق کی حیثیت زیادہ نمایاں ہے، اور حکموں میں دار و مدار اسی غالب حیثیت پر رکھا گیا ہے، دوسری بات یہ جاننا ضروری ہے کہ شریعت نے خاص خاص جرموں کے علاوہ باقی جرموں کی سزاؤں کیلئے کوئی پیمانہ متعین نہیں کیا، بلکہ قاضی کے اختیار میں دے دیا ہے کہ ہر زمانہ اور ہر جگہ اور ہر ماحول کے لحاظ سے جیسی اور جتنی سزا جرم کے روکنے کیلئے ضروری سمجھے وہ جاری کرے، یہ بھی جائز ہے کہ ہر جگہ اور ہر زمانے کی اسلامی حکومت شرعی قاعدوں کا لحاظ رکھتے ہوئے قاضیوں کے اختیارات پر کوئی پابندی لگا دے اور جرموں کی سزاؤں کا کوئی خاص پیمانہ دے کر اس کا پابند کر دے جیسا کہ پچھلی صدیوں میں ایسا ہوتا رہا ہے اور اس وقت تمام ممالک میں تقریباً یہی صورت رائج ہے۔

اب سمجھئے کہ جن جرموں کی کوئی سزا قرآن کریم وسنت نے متعین نہیں کی بلکہ حاکموں کی مرضی پر رکھا ہے ان سزاؤں کو شرعی اصطلاح میں ''تعزیرات'' کہا جاتا ہے اور جن جرموں کی سزائیں قرآن وسنت نے متعین کر دی ہیں وہ دو قسم پر ہیں: ایک وہ جن میں اللہ تعالیٰ کے حق کو غالب قرار دیا گیا ہے ان کی سزا کو ''حد'' کہا جاتا ہے جس کی جمع ''حدود'' ہے، دوسرے وہ جس میں بندے کے حق کو شریعت کی رو سے غالب مانا گیا ہے اس کی سزا کو ''قصاص'' کہا جاتا ہے، قرآن کریم نے حدود و قصاص کا بیان پوری تفصیل وتشریح کے ساتھ خود کر دیا ہے باقی تعزیری جرموں کی تفصیل کو حاکموں کی مرضی پر چھوڑ دیا ہے۔

تعزیری سزائیں حالات کے ماتحت ہلکی سے ہلکی بھی کی جاسکتی ہیں سخت سے سخت بھی، اور معاف بھی کی جاسکتی ہیں، ان میں حاکموں کے اختیارات وسیع ہیں، اور حدود میں کسی حکومت یا کسی حاکم و قاضی کو معمولی تبدیلی یا کمی زیادتی کی اجازت نہیں ہے اور نہ زمانہ یا جگہ کے بدلنے کا ان پر کوئی اثر پڑتا ہے، نہ کسی حاکم کو اس کے

معاف کرنے کا حق ہے، شریعت میں حدود صرف پانچ ہیں: ڈاکہ، چوری، بدکاری، بدکاری کی تہمت کی سزائیں، ان سزاؤں کا ذکر قرآن کریم میں موجود ہیں، پانچویں شراب پینے کی حد ہے، جو کہ اجماع صحابہ کرام سے ثابت ہوئی ہے اس طرح کل پانچ جرموں کی سزائیں معین ہوگئیں جن کو "حدود" کہا جاتا ہے، یہ سزائیں جس طرح کوئی حاکم کم یا معاف نہیں کرسکتا اسی طرح توبہ کرلینے سے بھی دنیاوی سزا کے حق میں معافی نہیں ہوتی، ہاں! آخرت کا گناہ مخلصانہ توبہ سے معاف ہوکر وہاں کا کھاتہ بے باق ہوجاتا ہے، تمام تعزیری جرموں میں حق کے موافق سفارشات سنی جاسکتی ہیں، حدود میں سفارش کرنا بھی جائز نہیں اوران کا سننا بھی جائز نہیں، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی سخت ممانعت فرمائی ہے، حدود کی سزائیں عام طور پر سخت ہیں اوران کے نافذ کرنے کا قانون بھی سخت ہے کہ ان میں کسی کو کسی کمی زیادتی کی کسی حال میں اجازت نہیں نہ کوئی ان کو معاف کرسکتا ہے، جہاں قانون کی یہ سختی رکھی گئی ہے وہیں معاملہ کو اعتدال میں لانے کیلئے جرم کے مکمل ہونے اور جرم کے ثبوت کو مکمل کرنے کیلئے شرطیں بھی نہایت کڑی رکھیں گئی ہیں ان شرطوں میں سے کوئی ایک شرط بھی نہ پائی جائے تو حد ختم یعنی سزا نہیں دی جاتی ہے بلکہ معمولی سا شبہ بھی ثبوت میں پایا جائے تو حد معاف ہوجاتی ہے بلکہ تعزیری سزا دی جاتی ہے، اسلام کا تسلیم شدہ قانون اس میں یہ ہے کہ حدود کو معمولی شبہ سے معاف کردیا جاتا ہے۔

یہاں یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ جن صورتوں میں شرعی حد کسی شبہ یا کسی شرط کی کمی کی وجہ سے معاف ہوجائے تو یہ ضروری نہیں کہ مجرم کو کھلی چھٹی مل جائے جس سے اس کو جرم پر اور جرأت پیدا ہو بلکہ حاکم اس کے حال کے مناسب اس کو تعزیری سزا دے گا اور شریعت کی تعزیری سزائیں بھی عموماً بدنی اور جسمانی سزائیں ہیں جن میں عبرت انگیز ہونے کی وجہ سے جرم کے خاتمے کا مکمل انتظام ہے، فرض کیجئے کہ بدکاری کے ثبوت پر صرف تین گواہ ملے اور گواہ اعتبار کے قابل ہیں جن پر جھوٹ کا شبہ نہیں ہوسکتا مگر شریعت کے مطابق چوتھا گواہ نہ ہونے کی وجہ سے اس پر شرعی حد جاری نہیں ہوگی لیکن اس کے یہ معنیٰ نہیں کہ اس کو کھلی چھٹی دیدی جائے بلکہ حاکم اس کو مناسب سخت تعزیری سزا دے گا یا چوری کے ثبوت کیلئے جو شرطیں مقرر ہیں ان میں کوئی کمی یا شبہ پیدا ہونے کی وجہ سے

اس پر شرعی حد ہاتھ کاٹنے کی جاری نہیں ہوسکتی تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بالکل آزاد ہو گیا بلکہ اس کو دوسری سخت تعزیری سزائیں اس کے حال کے مناسب دی جائیں گی۔

قصاص کی سزا بھی حدود کی طرح قرآن کریم میں متعین ہے کہ جان کے بدلہ میں جان لی جائے زخموں کے بدلہ میں مساوی زخم کی سزا دی جائے، لیکن فرق یہ ہے کہ حدود کو بحیثیت اللہ تعالیٰ کے حق کے نافذ کیا گیا ہے اگر حق والا انسان معاف بھی کرنا چاہے تو معاف نہ ہوگا اور حد معاف نہ کی جائے گی، مثلاً: جس کا مال چوری کیا ہے وہ معاف بھی کردے تو چوری کی شرعی سزا معاف نہ ہوگی بخلاف قصاص کے کہ اس میں بندہ کے حق کی حیثیت کو قرآن وسنت نے غالب قرار دیا ہے یہی وجہ ہے کہ قاتل پر قتل کا جرم ثابت ہو جانے کے بعد اس کو مقتول کے ولی کے حوالہ کر دیا جاتا ہے وہ چاہے تو قصاص لے لے اور اس کو قتل کرادے اور چاہے تو معاف کردے۔

اسی طرح زخموں کے قصاص کا بھی یہی حال ہے، یہ بات آپ پہلے معلوم کر چکے ہیں کہ حدود یا قصاص کے معاف ہو جانے سے یہ لازم نہیں آتا کہ مجرم کو کھلی چھٹی مل جائے بلکہ حاکم تعزیری سزا جتنی اور جیسی مناسب سمجھے دے سکتا ہے، اس لئے یہ شبہ نہ ہونا چاہئے کہ اگر خون کے مجرم کو مقتول کے وارثوں کے معاف کرنے پر چھوڑ دیا جائے تو قاتلوں کی جرأت بڑھ جائے گی اور قتل کی واردات عام ہو جائیں گی کیونکہ اس شخص کی جان لینا تو مقتول کے وارثوں کا حق تھا وہ اس نے معاف کر دیا لیکن دوسرے لوگوں کی جانوں کی حفاظت حکومت کا حق ہے وہ اس حق کے تحفظ کیلئے اس کو عمر قید کی یا دوسری قسم کی سزائیں دے کر اس خطرہ کی روک تھام کر سکتی ہے۔

فسادیوں کی سزا

ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ

یہ | لئے ان | رسوائی ہے | میں | دنیا | اور | لئے ان | میں | آخرت | عذاب ہے

عَظِيْمٌ ﴿۳۳﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهِمْ

بڑا | (۳۳) | مگر | جنہوں نے | توبہ کرلی | اس سے | پہلے | کہ | قابو پاؤ تم | پر ان

ع ۵ ۸ ۹

فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۳۴﴾

پس جان لو　کہ　اللہ　بخشنے والے　مہربان ہیں (۳۴)

بامحاورہ ترجمہ:۔ یہ ان کیلئے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں ان کیلئے بڑا عذاب ہے۔ (۳۳) مگر جنہوں نے اس سے پہلے توبہ کر لی کہ تم ان پر قابو پاؤ تو جان لو اللہ بخشنے والے مہربان ہیں۔ (۳۴)

لفظی تحقیق: خِزْیٌ: رسوائی، ذلت، شرمندگی۔

تفسیر

اس آیت میں ارشاد ہے کہ یہ سزا تو اس دنیا میں مقرر ہے تا کہ وہ دنیا میں ذلیل وخوار ہوں، اس کے بعد آخرت میں ان کو سخت عذاب دیا جائے گا، یہ دونوں جگہ کی سزا اس لئے دی جائے گی کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کو توڑا۔

باغیوں کی یہ سزائیں اس حالت میں معاف ہوسکتی ہیں کہ اس سے پہلے حکومت کے سپاہی انہیں گرفتار کریں وہ اپنے کئے پر پچھتاوا کر کے اس سے توبہ کرلیں اور آئندہ فرمانبردار بن کر رہنے کا اقرار کرلیں، اور اگر ان کی توبہ سچی ہے تو آخرت میں بھی ان کو عذاب نہیں دیا جائے گا، اس کے علاوہ دوسری حدود توبہ سے بھی دنیا کے حق میں معاف نہیں ہوتیں، خواہ یہ توبہ گرفتاری سے پہلے ہو یا بعد میں، اللہ تعالیٰ بخشنے والے مہربان ہیں، وہ "غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ" ہے، حدیث شریف میں آیا ہے کہ گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہی ہے جیسے اس نے گناہ ہی نہیں کیا۔

چوری یا ڈاکے کی وجہ سے اگر کسی کو مالی یا جانی نقصان پہنچا ہے تو اس کا تاوان مجرم کو پھر بھی دینا ہوگا یعنی جس کا مال لیا ہے اگر مال موجود ہو تو اس کو واپس کرنا ہوگا، قتل کیا ہے تو اس کا قصاص دینا ہوگا، یہ حقوق العباد یعنی بندوں کے حقوق کہلاتے ہیں، یہ توبہ سے معاف نہیں ہوسکتے، ہاں! اگر خود حق والا معاف کردے تو معاف ہوجائیں گے، یادرہے! معافی کا قانون صرف چوری کے جرم میں ہے باقی حد کے قابل جرموں بدکاری، پاک

دامن عورت پر تہمت، شراب پینا، مرتد ہو جانے وغیرہ میں جرم ثابت ہونے پر حد لازماً جاری ہوگی، جس کی ساری تفصیلات پیچھے گزر چکی ہیں۔

کامیابی کا راستہ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ ابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ وَ

اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو ڈرو اللہ سے اور تلاش کرو طرف اس کی ذریعہ اور

جَاهِدُوْا فِيْ سَبِيْلِهٖ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۝۳۵

کوشش کرو میں راستے اس کی اس سے توقع ہے کہ تم خوشحال ہو جاؤ (۳۵)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو اور ڈھونڈو اس تک وسیلہ، اور کوشش کرو اس کی راہ میں تاکہ تمہارا بھلا ہو۔ (۳۵)

لفظی تحقیق: اِتَّقُوا: ڈرو۔ یہ لفظ ''اِتِّقَاءْ'' سے ہے جو ''وِقَايَةٌ'' سے بنا ہے، اس کے معنی ہیں بچاؤ، حفاظت، ''اِتِّقَاءْ'' کے معنی ہیں بچنا، دور ہٹ جانا۔ اِتَّقُوا اللّٰهَ: اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔ یعنی ایسے کام نہ کرو جنہیں وہ ناپسند کرتے ہیں، اس کے غضب سے بچو۔

تفسیر

اس آیت میں مسلمانوں سے ارشاد ہے کہ یہ ایسے کام ہیں جن سے تمہیں نفرت ہونی چاہیے، تم تو اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے ہو، ہرگز کوئی ایسا کام نہ کرو جس سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوں اور تمہیں پکڑیں، تمہیں تو ہمیشہ ایسے کام کرنے چاہئیں جن سے تمہیں اللہ تعالیٰ کی نزدیکی نصیب ہو، دنیا والے یہاں کے بادشاہوں اور حاکموں کی نزدیکی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ایسے کام کرتے ہیں جن سے وہ خوش ہوں اور ان کے مقرب بن جائیں، وہ اسی کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ کوئی ایسا کام ہو جائے جس سے حاکم خوش ہو جائے، بس پھر تو وارے نیارے ہیں،

اے ایمان والو! تم کو چاہئے کہ ہر وقت تم اس دھن میں لگے رہو کہ کسی طرح اللہ تعالیٰ خوش ہو جائیں اور تم اس سے نزدیک ہوتے چلے جاؤ، جو کوئی اس دھن میں لگے گا اور ہر وقت اس کا خیال رکھے گا کہ کوئی کام ایسا نہ ہو جس سے اللہ تعالیٰ ناراض ہو جائیں وہ شخص کامیاب ہے اور امید ہے کہ وہ تمام مصیبتوں سے چھٹ جائے گا اور خوش رہے گا اس راستہ کے سوا اور کوئی راستہ نہیں جس میں کامیابی اور خوشحالی کی اُمید کی جا سکے۔

اس آیت سے پہلی آیت میں ڈاکہ اور بغاوت کی شرعی سزا اور اس کے حکموں کی تفصیل کا ذکر تھا اور آگے تین آیتوں کے بعد چوری کی شرعی سزا کا بیان آنے والا ہے، اس کے درمیان تین آیتوں میں پرہیزگاری، فرمانبرادری، عبادت، جہاد کی ترغیب، کفر، اسلام دشمنی اور گناہ کی تباہ کاری کا بیان ہے، قرآن کریم کے اس خاص طرز میں غور کریں تو معلوم ہوگا کہ قرآن کریم کا عام طرز یہ ہے کہ وہ صرف حاکمانہ طور پر تعزیر و سزا کا قانون بیان کر کے نہیں چھوڑ دیتا بلکہ خیر خواہانہ انداز میں ذہنوں کو جرموں سے باز رہنے کیلئے تیار بھی کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اور آخرت کے خوف اور جنت کی ہمیشہ کی نعمتوں اور راحتوں کو سامنے رکھ کر دلوں کو جرم سے نفرت دلاتا ہے یہی وجہ ہے کہ اکثر جرم و سزا کے قانون کے پیچھے "اِتَّقُوا اللّٰهَ" وغیرہ کہہ کر خدا ترسی کا حکم دیا جاتا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ: اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کی علامت یہ ہے کہ انسان شرک اور کفر سے بچ جائے، اسکے بعد دوسرے نمبر پر گناہ ہیں انہیں چھوڑ دے، کافر مشرک اور منافق متقی نہیں ہو سکتا، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ متقی وہ لوگ ہیں جو کفر، شرک، نفاق اور گناہ سے بچتے ہیں اور نیکی اور عدل و انصاف پر عمل کرتے ہیں۔

اللہ کے خوف سے مراد ایسا ڈر نہیں ہے جیسا کہ سانپ یا بچھو سے آتا ہے بلکہ اس خوف سے مراد یہ ہے کہ انسان کہیں اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کی خوشنودی سے دور نہ جا پڑے، انسان کے دل میں یہ خوف ہمیشہ موجود رہنا چاہئے کہ کوئی کام اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف نہ ہو جائے۔

وَابْتَغُوْۤا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ: لفظ "وسیلہ" بہت سے معنوں میں استعمال ہوتا ہے، "وسیلہ" کا معنیٰ قرب ہوتا ہے، اس کو مرتبہ اور حاجت کیلئے بھی بولا جاتا ہے تاہم مفسر قرآن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت

حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے مفسرین فرماتے ہیں کہ یہاں پر ''وسیلہ'' تلاش کرنے کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کرکے اس کو راضی کرکے اس کا قرب حاصل کرو۔

بہر حال اللہ تعالیٰ کی طرف ''وسیلہ'' تلاش کرنے کا مطلب یہ بھی ہے کہ اس کی طرف متوجہ ہو اپنی حاجتیں اسی سے طلب کرو، کلام کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے قریب ہونے کے جتنے بھی ذریعے ہیں وہ سب ''وسیلہ'' کہلا سکتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی ناخوشی اور دوری سے ڈر کر اس کا قرب حاصل کرنے کی کوشش کرو اور یہ جبھی ہو سکتا ہے جب درمیان کے تمام راستے طے ہو جائیں جن پر چل کر اس تک پہنچ سکتے ہیں۔

جیسا کہ عرض کیا ''وسیلہ'' کا معنیٰ اگرچہ قرب، اطاعت، حاجت و مرتبہ ہے مگر اللہ تعالیٰ کے قرب کے ذریعوں میں ہر ایسی چیز داخل ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کی خوشی مدنظر ہو چنانچہ اللہ تعالیٰ کے قرب کے ذریعوں میں پیغمبروں، اولیاء اللہ اور نیک لوگوں کی محبت بھی شامل ہے۔

وَجَاهِدُوْا فِیْ سَبِیْلِهٖ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ: جہاد میں ہر قسم کا جہاد یعنی مالی، جانی، قلمی اور زبانی جہاد شامل ہے جس طرح کفر کو مٹانے اور ظلم کو جڑ سے ختم کرنے کیلئے جانی اور مالی جہاد کیا جاتا ہے اس طرح قلمی جہاد بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے، جن لوگوں نے قرآن پاک کے ترجمے کیے ہیں، بڑی بڑی تفسیریں لکھی ہیں، حدیث کی کتابیں لکھی ہیں انہوں نے اپنے قلم سے جہاد کیا ہے، قرآن پاک میں جگہ جگہ موجود ہے مال و جان کے ذریعے جہاد کرو، دین کو قائم رکھنے اور مضبوط کرنے کیلئے جو شخص مال خرچ کرتا ہے بلاشبہ وہ جہاد میں حصہ لیتا ہے، اسلام کے نظام کی سربلندی کیلئے روپیہ خرچ کرنا جہاد ہی ہے، اس کے برخلاف کھیل تماشے پر خرچ کرنا، فضول عمارت بنانا، عیاشی اور فحاشی پر خرچ کرنا شیطان کے راستے پر خرچ کرنا ہے، اگر مسجد یا مدرسے کی تعمیر پر خرچ کیا جائے گا، دینی کتابوں کی اشاعت میں تعاون کیا جائے گا تو یہی مال آخرت میں نجات کا سامان بن جائے گا۔

''ابو داؤد شریف'' کی روایت میں موجود ہے کہ کافروں اور مشرکوں کے ساتھ مال، جان اور زبان کے ساتھ جہاد کرو، کفر و شرک اور برائی کی تردید میں تبلیغ کرنا زبان سے جہاد ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ اور پیغمبر کا پیغام غیر مسلموں تک پہنچانا بھی زبان کے ذریعے سے جہاد ہے۔

پچھلی آیتوں میں زمین میں فساد مچانے کا حرام و ناجائز ہونا اور اس کی دونوں جہان کی سزاؤں کا بیان آیا تھا، جہاد بھی ظاہر کے اعتبار سے زمین میں فساد کی صورت معلوم ہوتی ہے اس لئے ممکن تھا کہ کوئی ناواقف جہاد اور فساد میں فرق نہ سمجھے اس لئے زمین میں فساد کی ممانعت کے بعد جہاد کا حکم اہمیت کے ساتھ ذکر کر کے "فِيْ سَبِيْلِهٖ" سے دونوں میں فرق کی طرف اشارہ فرمادیا، کیونکہ ڈاکہ، بغاوت وغیرہ میں جو قتل وخون ریزی ہوتی ہے اور مال لوٹا جاتا ہے وہ صرف اپنی ذاتی غرضوں اور خواہشوں اور برے مقصدوں کیلئے ہوتا ہے اور جہاد میں اگر اس کی نوبت آئے بھی تو صرف اللہ تعالیٰ کا کلمہ بلند کرنے اور ظلم کو مٹانے کیلئے ہے جن میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

صحیح رائے رکھنے والے لوگوں کی ایسی جماعت ہونی چاہئے جو داخلی اور خارجی معاملوں کیلئے مناسب منصوبہ بندی کر سکیں، ملک کے اندر امن وامان کا قائم کرنا اور لوگوں کے مال وجان کی حفاظت داخلی مسئلہ ہے اور کافروں کے ساتھ جہاد خارجی معاملہ ہے ان دونوں کاموں کیلئے ایک اچھی سوسائٹی کی ضرورت ہے جو اچھے لوگوں کی وجہ سے وجود میں آسکتی ہے۔

فدیہ کام نہ دے گا

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّ

بیشک جنہوں نے کفر کیا اگر یہ ہوجائے کہ لئے ان جو ہے میں زمین سب کا سب اور

مِثْلَهٗ مَعَهٗ لِيَفْتَدُوْا بِهٖ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَا تُقُبِّلَ

جیسا اس ساتھ اسکے تاکہ دیکر چھوڑیں ساتھ اس کے سے عذاب دن قیامت کے تو نہیں قبول کیا جائیگا

مِنْهُمْ ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۳۶﴾ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنَ

سے ان اور لئے ان کے عذاب درد دینے والا (۳۶) وہ چاہیں گے کہ نکل جائیں سے

النَّارِ وَ مَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنْهَا ۫ وَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿۳۷﴾
آگ حالانکہ نہیں وہ نکلنے والے اُس سے اور لئے ان کے عذاب ہے ہمیشہ رہنے والا(۳۷)

بامحاورہ ترجمہ:۔ جو لوگ کافر ہیں اگر ان کے پاس ہو جو کچھ زمین میں ہے اور اس کیساتھ اتنا ہی اور ہوتا کہ اپنے عذاب کے بدلے میں دے دیں تو قیامت کے دن ان سے قبول نہ ہوگا اور ان کے واسطے دردناک عذاب ہے۔(۳۶) وہ چاہیں گے کہ آگ سے نکل جائیں حالانکہ وہ اس سے نکل نہیں سکتے اور ان کیلئے ہمیشہ کا عذاب ہے۔(۳۷)

لفظی تحقیق: **يَفْتَدُوْا:** اس کے بدلے میں دیں۔ "اِفْتِدَاء" سے ہے، یہ لفظ "فِدْيَةٌ" سے بنا ہے، "فِدْيَةٌ" کہتے ہیں اس چیز کو جو جان چھڑانے کو دی جائے، چنانچہ "اِفْتِدَاء" کے معنٰی ہیں فدیہ دینا، یعنی: جان بچانے کیلئے اپنی پسند کی کوئی چیز دے دینا۔

تفسیر

کافروں کے قبضے میں اگر زمین کی ساری چیزیں اور خزانے بھی آجائیں اور اس کے برابر اتنا ہی اور اس کے ساتھ مل جائے اور وہ لوگ یہ سب کا سب فدیہ کے طور پر دیں کہ کسی طرح قیامت کے دن عذاب سے بچ جائیں، اول تو قیامت کے دن یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی شخص زمین بھر مال و دولت کا مالک ہو، تاہم اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: فرض کرو ایسا ہو جائے اور وہ شخص یہ سب کچھ بلکہ اس سے دوگنا بھی فدیہ ادا کر کے عذاب سے بچنا چاہے تو بھی وہ عذاب سے نہ بچ سکے گا اور اس کو ایسا عذاب دیا جائے گا جو اس کو بڑا دکھ پہنچائے گا اور وہ درد کے مارے چلائے گا، وہ چاہے گا کہ کسی طرح اس دوزخ کی آگ سے جس میں وہ داخل کیا جائے گا نکل جائے لیکن اس کو اس سے نکلنا نصیب نہ ہوگا اور وہ دکھ درد اور عذاب ہمیشہ کیلئے اس کو بھگتنا ہوگا وہ کبھی اس کا پیچھا نہ چھوڑے گا۔

مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں رشوت نہیں چلتی اگر اس کے غضب سے بچنا ہے تو ایمان لاؤ اور اس سے

ڈرو اور اس کو راضی کرنے کی کوشش کرو، ورنہ اس سے بھاگ کر جانے کی کوئی جگہ نہیں ہے، دنیا میں رشوتیں دے کر کام نکال لیتے ہو اللہ تعالیٰ کے ہاں فرمانبرداری کے سوا کوئی چیز کام نہ آئے گی۔

ان آیتوں میں کفر اور شرک اور گناہ کا وبال ایسے انداز میں بتلایا گیا ہے کہ اس پر ذرا بھی غور کیا جائے تو وہ انسان کی زندگی میں ایک زبردست تبدیلی پیدا کر دے اور کفر و شرک اور گناہ سب کو چھوڑنے پر مجبور کر دے۔

چوری کی سزا

وَ السَّارِقُ وَ السَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَیْدِیَھُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا

اور چوری کرنے والا مرد اور چوری کرنے والی عورت پس کاٹ دو تم ہاتھ دونوں ان کے بدلہ ہے عوض اسکے جو انہوں نے کیا

نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴿۳۸﴾

بطورِ سزا طرف اللہ کی اور اللہ ہیں زبردست حکمت والے (۳۸)

بامحاورہ ترجمہ: ۔اور چوری کرنے والا مرد اور چوری کرنے والی عورت ان کے ہاتھ کاٹ ڈالو ان کے کرتوتوں کے بدلے میں یہ اللہ کی طرف سے سزا ہے اور اللہ غالب، حکمت والے ہیں۔ (۳۸)

لفظی تحقیق: اَلسَّارِقُ وَ السَّارِقَةُ: چور مرد اور چور عورت۔ یہ دونوں لفظ "سَرَقَةٌ" سے بنے ہیں جس کے معنٰی چوری کے ہیں۔

تفسیر

اس رکوع کے شروع میں مسلمانوں کو نصیحت کی گئی کہ اللہ تعالیٰ سے صلح کرو اور لڑائی کرنے والوں کی طرح کام مت کرو اور اطاعت اور فرمانبرداری کے ذریعے اس کی نزدیکی حاصل کرو۔

اس کے بعد پھر مجرموں کی سزاؤں کے سلسلے میں چوروں کی سزا بیان کی جاتی ہے، یہ ڈاکوؤں سے تو کم ہیں کیونکہ کسی کو مارتے یا ڈراتے دھمکاتے نہیں صرف مالک سے آنکھ بچا کر چپکے سے اس کا مال اٹھا لے جاتے ہیں لیکن ان سے بھی لوگوں کو کچھ کم دکھ نہیں پہنچتا اور بعض وقت تو جان نکل جانے کو ہو جاتی ہے۔

آیت میں ارشاد ہے کہ چور مرد ہو یا عورت ہاتھ کاٹ دو اور یہ ان کے کرتوت کی سزا ہے اور سزا اللہ تعالیٰ کا حکم نہ ماننے کی ہے، اللہ تعالیٰ زبردست ہیں سب پر غالب ہیں اور ساتھ ہی حکمت والے ہیں اس کے حکم کو کوئی ٹال نہیں سکتا اور وہ جو حکم دیتے ہیں اس میں مخلوق ہی کا فائدہ ہوتا ہے۔

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا: اس آیت میں صرف ہاتھ کے کاٹنے کا حکم ہے مگر اس بات کی وضاحت نہیں کی گئی کہ چور کا ایک ہاتھ کاٹا جائے گا یا دونوں تاہم تمام علماء اس بات پر متفق ہیں کہ چوری کا جرم ثابت ہونے پر صرف ایک ہاتھ کاٹا جائے گا، البتہ دس درہم سے کم مالیت کی چوری پر ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا، دس درہم دو تولہ ساڑھے سات ماشہ چاندی کے برابر ہوتا ہے، بعض دوسری چیزوں کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے، مثلاً: یہ کہ چوری محفوظ جگہ سے کی گئی ہو، محفوظ جگہ سے مراد یہ ہے کہ جس مکان سے چوری ہوئی ہوں اس میں تالا پڑا ہو یا جس صندوق سے چیز نکالی گئی ہے اس میں تالا لگا ہوا ہو یا مال کی حفاظت کیلئے پہریدار مقرر ہے مگر اس کے باوجود چوری ہوگئی تو ایسے چور کو شریعت کے حکم کے مطابق ''حد'' لگے گی یعنی ہاتھ کاٹا جائے گا اور اگر ایسا مال چوری کیا گیا ہے جس کی حفاظت کا کوئی بندوبست نہیں کیا گیا تھا تو اس چور پر حد جاری نہیں ہوگی، مثلاً: غلہ کی ڈھیری میدان یا کھیت میں رکھی ہوئی ہو اور کوئی پہریدار مقرر نہیں ہو یا جانور جنگل میں چھوڑ دیا اور کوئی نگران اس کے ساتھ نہیں اب اگر کوئی چور ایسے غلہ یا جانور کو لے گیا تو چور کو ہاتھ کاٹے جانے کی سزا نہیں دی جائے گی۔

مشترک مال میں سے اگر حصہ دار کوئی چوری کرلے تو اس پر بھی حد نہیں لگے گی، بعض معمولی چیزوں پر بھی حد جاری نہیں کی جاتی، مثلاً: جلد خراب ہو جانے والی چیزیں جیسے سبزی، ترکاری، پکا ہوا گوشت، ہنڈیا یا انڈے یا روٹی وغیرہ کی چوری پر ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا، ''ترمذی شریف'' کی روایت میں آتا ہے کہ باغ سے

پھل توڑنے یا کھجور کے درخت کے تنے سے گودا نکالنے پر بھی حد نہیں لگتی اس کے علاوہ بعض رعائتیں بھی حاصل ہیں، مثلاً: قحط سالی کے زمانہ میں اگر کوئی شخص فاقہ سے مجبور ہو کر کھانے پینے کی چیز چراتا ہے تو اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا البتہ جو کچھ اس نے کھایا پیا ہے اس کا تاوان ادا کرنا پڑے گا، ہاتھ کاٹنا چونکہ سخت سزا ہے اس لئے شریعت نے اس معاملہ میں بعض رعائتیں بھی دی ہیں، ایک عام قانون یہ ہے کہ اگر کسی معاملہ میں شک پڑ جائے تو بھی حد نہیں لگائی جاتی ہے، حد جاری کرنے کیلئے قطعی ثبوت ہونا لازمی ہے، البتہ اگر حاکم مناسب سمجھے تو اس پر تعزیر لگا سکتا ہے، اگر کسی پر ہاتھ کاٹنے کی سزا جاری ہوگئی تو چوری کیا ہوا مال اگر موجود ہے تو واپس کیا جائے گا اور اگر ضائع ہو گیا تو ملزم پر اس کا تاوان نہیں ڈالا جائے گا البتہ اگر حد جاری نہیں ہو سکی تو پھر اس کا بدل واپس کرنا لازمی ہو گا۔

اسلام میں ہاتھ کاٹنے کی سزا مطلقاً ہر چوری پر عائد نہیں کہ جس کو عام بول چال میں چوری کہا جاتا ہے بلکہ ایسی چوری جس پر چور کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے اس کی ایک مخصوص تعریف ہے جس کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے کہ کسی کا مال محفوظ جگہ سے تالا وغیرہ توڑ کر ناجائز طور پر خفیہ طریقہ سے نکال لیا جائے، اس تعریف کی رو سے بہت سی صورتیں جن کو عرفاً چوری کہا جاتا ہے چوری کی تعریف سے نکل جاتی ہیں، مثلاً: محفوظ مکان کی شرط سے معلوم ہوا کہ عام مقامات مثلاً: مسجد، عیدگاہ، پارک، اسٹیشن، انتظار گاہ، ریل، جہاز وغیرہ میں عام جگہوں پر رکھے ہوئے مال کی کوئی چوری کرے یا درختوں پر لگے ہوئے پھل چرالے یا کسی کے درخت سے شہد کی چوری کرے تو اس پر چوری کی حد جاری نہیں ہوگی بلکہ عام ملکوں کے قانون کی طرح تعزیری سزا دی جائے گی اسی طرح وہ آدمی جس کو آپ نے اپنے گھر میں داخل ہونے کی اجازت دے رکھی ہے خواہ وہ آپ کا نوکر ہو یا مزدور ہو یا مستری یا کوئی رشتہ دار ہو یا کوئی شخص کسی کے ہاں مہمان ٹھہرا ہو وہ اگر آپ کے مکان سے کوئی چیز لے جائے تو وہ اگرچہ عام بول چال میں چوری میں داخل اور تعزیری سزا کا مستحق ہے مگر ہاتھ کاٹنے کی شرعی سزا اس پر جاری نہ ہوگی کیونکہ وہ آپ کے گھر میں آپ کی اجازت سے داخل ہوا اس کے حق میں حفاظت مکمل نہیں، اسی طرح اگر کسی نے کسی کی جیب

کاٹ لی یا ہاتھ میں سے زیور یا نقد چھین لیا یا دھوکہ دے کر کچھ مال وغیرہ لے لیا یا امانت لے کر مکر گیا یہ سب چیزیں حرام و ناجائز اور عام بول چال میں چوری میں ضرور داخل ہیں مگر شرعاً چوری کی تعریف میں داخل نہیں، ان سب کی سزا تعزیری ہے جو حاکم کی مرضی پر ہے اس لئے اس پر ہاتھ نہ کاٹا جائے گا۔

اسی طرح کفن کی چوری کرنے والے کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا کیونکہ اول تو وہ محفوظ جگہ نہیں دوسرے کفن میت کی ملکیت نہیں، ہاں! اس کا یہ عمل سخت حرام ہے اس پر تعزیری سزا حاکم کی مرضی پر لگے گی۔

ہاتھ کاٹنے کے معاملے میں زیادہ صحیح قول یہ ہے کہ ہاتھ کلائی (گٹوں) سے کاٹا جائے گا، پہلی دفعہ چوری ثابت ہونے پر دائیاں ہاتھ کاٹا جائے گا اور دوسری مرتبہ چوری کے ثابت ہونے پر بائیاں پاؤں کاٹا جائے گا، امام اعظم امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ تیسری دفعہ چوری ثابت ہونے پر ہاتھ یا پاؤں نہیں کاٹا جائے گا بلکہ ملزم کو قید میں ڈال دیا جائے گا اس وقت تک جب تک یقین ہو جائے کہ وہ اس برے کام سے توبہ کر چکا ہے، البتہ حاکم کی مرضی پر ہے کہ اگر وہ مناسب سمجھے تو دوسرا ہاتھ یا پاؤں کاٹنے کا حکم بھی دے سکتا ہے، یہ تعزیراً ہوگا اور تعزیر میں تو سزائے موت بھی دی جا سکتی ہے، یہ حالات کے مطابق فیصلہ ہوتا ہے تاکہ سوسائٹی ایسے برے شخص سے محفوظ ہو جائے۔

ہاتھ کاٹنے کا حکم دینے کے بعد فرمایا کہ یہ بدلہ ہے ان کے کرتوت کا، انہوں (چور مرد یا عورت) نے چوری جیسا برا کام کیا جو کہ کبیرہ گناہوں میں شمار ہوتا ہے، لہٰذا ان کیلئے ہاتھ کاٹنے کی سزا ہی مناسب ہے، ان کے جرم کا تقاضا ہے کہ انہیں یہ سخت سزا دی جائے، یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عبرتناک سزا ہے، اللہ تعالیٰ کی جانب سے تنبیہ کی گئی ہے کہ کوئی شخص یہ کبیرہ گناہ نہ کرے۔

بعض ملحد قسم کے لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ ایک انگلی کاٹنے کی دیت پانچ اونٹ ہیں اور یہ مجرم کو ادا کرنی پڑتی ہے اس کے برخلاف صرف دس درہم کی چوری پر پورا ہاتھ کاٹ دیا جاتا ہے، یہ شرعی حکموں میں بہت بڑا فرق ہے، علماء اور مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اصل بات یہ ہے کہ انسانی ہاتھ جب امانت دار تھا تو بڑا قیمتی تھا جب کسی نے اس کی ایک انگلی بھی کاٹ دی تو اسے پانچ اونٹ دیت میں دینے پڑے مگر یہی ہاتھ جب

خیانتدار ہوگیا اس نے چوری کر کے امانت میں خیانت کی تو یہی ہاتھ ذلیل وخوار ہوگیا اب اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں رہی لہٰذا چوری کے جرم میں اس کا ہاتھ کاٹا جانا ہی چاہئے۔

اللہ تعالیٰ غالب اور حکمت والے ہیں، اس کا کوئی حکم حکمت سے خالی نہیں اگرچہ اس نے سزائیں سخت مقرر کی ہیں مگر انسانوں کا فائدہ اسی میں ہے اور امن وامان کا قائم کرنا اور انسانی جانوں کی حفاظت ایسے ہی قانون سے ممکن ہے۔

توبہ اور خود کی درستگی

فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَ اَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ ؕ

پس جس نے توبہ کی سے بعد ظلم اپنے کے اور اپنا عمل ٹھیک کرلیا پس تحقیق اللہ توجہ کریں گے اسکی طرف

اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۹﴾

بیشک اللہ بخشنے والے مہربان ہیں (۳۹)

بامحاورہ ترجمہ:۔ پھر جس نے اپنے ظلم کے بعد توبہ کی اور اپنے عمل کی اصلاح کی تو اللہ اس کی توبہ قبول کرتے ہیں بیشک اللہ بخشنے والے مہربان ہیں۔ (۳۹)

تفسیر

پچھلی آیت میں چور کی سزا بیان ہوئی تھی کہ اس کا ہاتھ کاٹ دو یہی اس کے کیے کی سزا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ناراضگی کا اظہار ہے اس کے بعد کہا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ سب سے زبردست اور سب پر غالب ہیں، اور اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں کہ ایسے موقع پر مسلمان حاکم کے ذریعے اپنی قوت اور غلبہ کا سب پر اظہار کریں اور چور کو ایسی سزا دیں کہ اس کو دیکھ کر لوگ لرز جائیں اور چوری کے پاس نہ پھٹکیں۔

اللہ تعالیٰ کی حکومت

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ يُعَذِّبُ

کیانہیں جانتے آپ کہ بےشک اللہ لئےاسی کے ہے بادشاہت آسمانوں کی اور زمین کی عذاب دیں

مَنْ يَّشَآءُ وَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۴۰﴾

جسے چاہیں اور بخشش کریں واسطےجسکے چاہیں اور اللہ اوپر ہر چیز کےقدرت والےہیں (۴۰)

بامحاورہ ترجمہ: کیا آپ نہیں جانتے کہ اللہ ہی کیلئے آسمانوں اور زمین کی بادشاہت ہے جس کو چاہیں عذاب دیں اور جسے چاہیں بخش دیں اور اللہ ہر چیز پر قادر ہیں۔ (۴۰)

تفسیر

اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ عقل مند آدمی تو فوراً سمجھ لیں گے کہ اللہ تعالیٰ سب سے زبردست قوت والے ہونے کے ساتھ حکیم بھی ہیں، یعنی: وہ جرم کی حقیقت سے واقف ہیں اور اس سے جو نقصان آدمیوں کو پہنچتا ہے اور جو فساد دنیا میں پھیلتا ہے اس کی مقدار اور حد کو وہی اچھی طرح پہچانتے ہیں اور پھر اس کے مناسب سزا مقرر فرماتے ہیں جو اس گناہ کی حد اور مقدار کے بالکل مطابق ہوتی ہے لیکن ناسمجھ لوگ اور محض قریب کی چیزوں کے دیکھنے والے جن کی نگاہ کسی کام کے آخری انجام اور دور تک کے نتیجوں کو نہیں دیکھ سکتی ان اشاروں کو نہیں سمجھ سکتے، ان کیلئے اس آیت میں خوب کھول کر ایسی بات بیان کر دی ہے۔

ارشاد ہے کہ انسان لاکھ نادان سہی وہ کیا اتنا بھی نہیں جان سکتا کہ آسمانوں میں اور زمین میں بڑی، چھوٹی، اونچی، نیچی، حاضر، غائب، انسانی یا حیوانی جو چیز بھی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے اور وہ صرف مالک ہی نہیں بلکہ اس پر قبضہ بھی رکھتے ہیں اور سارے ملک کا جیسے چاہیں انتظام کرتے ہیں اور جو چاہیں حکم کرتے ہیں جس کو چاہیں

عذاب دیں اور جس کو چاہیں بخش دیں، اس کی قدرت سے کوئی چیز باہر نہیں ہے، وہ ہر چیز کو جانتے ہیں اس کے مناسب اس کے ساتھ معاملہ کرتے ہیں۔

جو شخص اس آیت کو اچھی طرح سمجھ لے اسے اللہ تعالیٰ کے کسی حکم پر کبھی کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا، اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کے حکم کے ٹھیک اور مناسب ہونے میں شبہ نہیں ہوسکتا، تعجب ہے کہ ہم انسان کے بارے میں تو اس قاعدہ کو مانتے ہیں کہ جو جس چیز کا مالک ہو اسے اختیار ہے کہ اس بارے میں جو چاہے کرے مگر اللہ تعالیٰ کے بارے میں اس چیز کو بھول جاتے ہیں۔

کفر کے حامی

يَاَيُّهَا الرَّسُوْلُ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ
اے پیغمبر! نہ غمگین کریں آپ کو وہ لوگ جو دوڑ کر گرتے ہیں میں کفر

مِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ وَ لَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ ۚ
سے لوگوں جنہوں نے کہا ایمان لائے ہم ساتھ منہ ہوں اپنے کے اور نہیں ایمان لائے دل ان کے

وَ مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا ۚ سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ
اور میں سے ان لوگوں جو یہودی ہوئے کان لگا کر سنتے ہیں لئے جھوٹ کے کان لگا کر سنتے ہیں لئے ایسی قوم کے

اٰخَرِيْنَ ۙ لَمْ يَاْتُوْكَ ؕ
جو دوسری ہے نہیں آئے وہ آپ تک

بامحاورہ ترجمہ:۔ اے پیغمبر! غم نہ کیجئے ان کا جو دوڑ کر گرتے ہیں کفر میں وہ لوگ جو اپنے منہ سے کہتے ہیں ہم مسلمان ہیں حالانکہ ان کے دل مؤمن نہیں اور وہ جو یہودی ہیں جھوٹ بولنے کیلئے جاسوسی کرتے ہیں وہ دوسری جماعت کے جاسوس ہیں جو آپ تک نہیں آئے۔

رکوعنن المتقین ۱۲

لفظی تحقیق: یُسَارِعُوْنَ: "مُسَارَعَةٌ" سے ہے، جس کے معنیٰ ہیں کسی چیز کی طرف دوڑنا، یہ "سَرْعَتْ" سے بنا ہے، جس کے معنیٰ ہیں: جلدی، مراد یہ ہے کہ تیزی سے دوڑتے ہیں۔ سَمّٰعُوْنَ: بہت زیادہ سننے والے: "سَمَّاعٌ" کی جمع ہے جو "سَمْعٌ" سے ہے، جس کے معنیٰ کان بھی ہیں اور سننا بھی "سَمَّاعٌ" اس کو کہتے ہیں جو خوب کان لگا کر غور سے سنے۔

تفسیر

جو لوگ قرآن پاک کو دھیان سے پڑھتے ہیں اور اس کے مفہوم پر غور کرتے ہیں ان سے یہ بات پوشیدہ نہیں رہ سکتی کہ اسلام انسان کو مل جل کر رہنا سکھاتا ہے، وہ اس بات کی ہدایت کرتا ہے کہ اس بات کا خیال رکھیں کہ کسی کو کسی سے نقصان نہ پہنچے اور سب مل جل کر آپس میں ایک دوسرے کی مدد کریں کہ آپس کے میل ملاپ میں فرق نہ آنے پائے اور جو کوئی امن و امان، آپس کے میل جول کے توڑنے کا کام کرے اس کو سب مل کر دبالیں تاکہ اس کی شرارت کی وجہ سے بے چینی اور فساد نہ پھیلنے پائے، جب انسان اس طرح کا انتظام کرنے کے قابل ہوجائیں تو سمجھنا چاہئے کہ ان کے اندر ٹھیک معنیٰ میں معاشرہ قائم ہوگیا، معاشرہ کی ٹھیک صورت یہی ہے کہ نیک لوگوں سے برے لوگ دبے رہیں، معاشرہ کیلئے دوسرے الفاظ سوسائٹی اور سماج ہیں، سوسائٹی یا سماج درست نہیں ہوسکتی جب تک شرارت کرنے والوں کے دل میں اس کا اتنا خوف نہ بیٹھ جائے کہ ڈر کے مارے کوئی جرم نہ کرسکیں، یہاں اس بات کو کئی طریقے سے سمجھایا گیا ہے، سب سے بڑا قانون اس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ نیک لوگوں کی مدد کرو اور برے لوگوں کی مدد ذرا سی بھی نہ کرو۔

اسلامی سماج کی بنیاد سچے دل سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تابعداری پر ہے، قرآن کریم نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو سماج کے قائم کرنے کیلئے طریقے بتائے ہیں اور ان لوگوں کی تباہی کا حال سنایا ہے جو اس طریقے پر نہیں چلے۔

یہاں ان منافقوں کا ذکر ہے جن کی اکثریت مدینہ کے یہودیوں میں سے تھی کافروں کے ساتھ ان کا میل جول پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر ناگوار گزرتا تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے آپ کو تسلی دی کہ منافقوں کی گھٹیا حرکتوں سے

آپ رنجیدہ نہ ہوں بلکہ حق والوں کے مطابق اپنا فرض اچھے طریقے سے انجام دیتے رہیں اس کے باوجود اگر کوئی شخص برائی کی طرف رخ کرتا ہے تو اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیں وہ خود ان سے نمٹ لیں گے، بہر حال آیت کے اس حصہ میں اللہ تعالیٰ نے ایک طرف یہودیوں اور منافقوں کی خرابی بیان فرمائی ہے تو دوسری طرف اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حوصلہ افزائی بھی کی ہے، دراصل منافقوں نے دورخی پالیسی اختیار کر رکھی تھی جب مسلمانوں کی مجلسوں میں آتے تو ان کی طرف داری کرتے اور جب یہودیوں اور کافروں کے پاس جاتے تو ان سے وفاداری اور مسلمانوں سے غداری کا اظہار کرتے، وہ کسی ایک طرف نہیں تھے، نہ سچے مسلمان نہ پکے کافر، مگر وہ کافروں کے قریب تر تھے اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ان کی برائی بیان فرمائی ہے۔

منافقوں کے ذکر کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ان یہودیوں کی نشاندہی بھی کی ہے جو مسلمانوں کے خلاف سازشوں میں مصروف تھے اور اسلام کو نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے اور یہودیوں میں سے بھی کچھ لوگ ایسے ہیں جو بہت زیادہ سننے والے ہیں جھوٹ کو، مطلب یہ کہ اسلام کے خلاف جھوٹی باتوں میں بہت دلچسپی لیتے ہیں، دوسری قوم کیلئے بہت زیادہ سننے والے ہیں، اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کی یہ خصلت بیان فرمائی ہے کہ جو کوئی اسلام کی مخالفت میں جھوٹی موٹی بات کرتا تھا اسے بڑے غور سے سنتے تھے اور پھر ان کے ساتھ اسلام کے خلاف ہونے والے پروپیگنڈے میں شریک ہو جاتے تھے "سَمّٰعُوْنَ" کا دوسرا معنیٰ جاسوسی کرنا ہے، اگر اس معنیٰ کو مدنظر رکھا جائے تو اس کی تفسیر یوں ہوگی کہ یہ لوگ غیروں کیلئے اسلام کے خلاف جاسوسی کرتے تھے، یہودیوں کا ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مجلسوں میں حاضر ہو کر آپ کی باتیں سنتا تھا اور جھوٹ ملا کر غیروں تک پہنچاتا تھا، اس طریقے سے یہ لوگ اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ میں مددگار بنتے تھے بہر حال ایسے یہودیوں کا مسلمانوں کی مجلسوں میں آنا دین میں رغبت کی وجہ سے نہیں ہوتا تھا بلکہ اس قوم کیلئے جاسوسی کرنا ہوتا تھا جو آپ کے پاس نہیں آتے، یعنی: آپ کے پاس آنے والے لوگ آپ کی باتیں ان تک پہنچاتے ہیں جو آپ کے پاس نہیں پہنچتے تھے۔

کفر کے ہتھکنڈے

يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ ۚ يَقُوْلُوْنَ اِنْ اُوْتِيْتُمْ

بدل دیتے ہیں باتوں کو سے بعد ٹھکانوں ان کے سے کہتے ہیں اگر دیئے جاؤ تم

هٰذَا فَخُذُوْهُ وَ اِنْ لَّمْ تُؤْتَوْهُ فَاحْذَرُوْا ۭ

یہ حکم تو لے لینا اس کو اور اگر نہ دیئے جاؤ تم تو بچنا اس سے

بامحاورہ ترجمہ:۔ بات کو اس کا ٹھکانہ چھوڑ کر بدل ڈالتے ہیں کہتے ہیں اگر تم کو یہ حکم ملے تو قبول کر لینا اور اگر یہ حکم نہ ملے تو بچتے رہنا۔

لفظی تحقیق: يُحَرِّفُوْنَ: ''تَحْرِيْف'' سے ہے، جس کے معنٰی ہیں ہٹا دینا اور بدل دینا۔

تفسیر

کافر، منافق اور کچے ایمان والے لوگ اس کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا جو حکم بھی اپنی مرضی کے خلاف نظر آئے اس کو بدل کر اپنے مقصد کے مطابق کر لیں مگر ایمان اس کی اجازت نہیں دیتا، یہودیوں کے پاس حضرت موسیٰ علیہ السلام ''تورات'' لے کر آئے مگر لوگوں نے اپنی خواہشیں پوری کرنے کیلئے لفظوں کے کچھ کے کچھ معنٰی کر ڈالے، مثلاً: ''تورات'' میں شادی شدہ مرد اور عورت کے بدکاری کی سزا سنگساری تھی، یہودیوں نے اس حکم کو غائب ہی کر دیا جو یہودی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے جاتے تھے ان سے کہتے تھے کہ تم اس پیغمبر سے بدکاری کی سزا پوچھنا اگر وہ کہہ دیں کہ بدکاری کی سزا سنگساری نہیں ہے تو پھر ہم لوگوں کو بہکا سکیں گے کہ سنگساری کے انکار میں وہ بھی ہمارے ساتھ ہیں اور اگر وہ سنگساری کی سزا کو برقرار رکھیں تو پھر ان کی بات نہ سننا، گویا دین کو اپنی خواہشوں کے مطابق کرنا ہے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: سنگساری ''تورات'' میں موجود ہے اور اس پر

ان کے بڑے عالم کی گواہی دلوادی۔

ادھر حضرت جبرائیل علیہ السلام بھی خدا کی طرف سے آپ کے پاس آئے اور کہا کہ سنگساری کو قائم رکھو کیونکہ بدکاری کو سختی کے ساتھ روکنا مقصود ہے اس سے سماج میں بڑی بڑی خرابیاں پھیلتی ہیں۔

یہ وہ چالیں تھیں جن سے یہودی اور دوسرے لوگ دین کی پابندیوں کو توڑنا چاہتے تھے اور جرم کرنے اور ظلم وزیادتی کی آزادی چاہتے تھے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس آیت میں کہا گیا ہے کہ ان کفر کے طرفداروں کے کاموں کی وجہ سے غمگین اور رنجیدہ نہ ہوں، فسادی لوگ آخر میں دب جائیں گے۔

اس آیت کے اترنے کا سبب دو واقعے ہیں جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں مدینہ کے اردگرد رہنے والے یہودی قبیلوں میں پیش آئے ایک واقعہ قتل وقصاص کا تھا اور دوسرا واقعہ بدکاری اور اس کی سزا کا تھا۔

یہ بات تو کسی تاریخ کے جاننے والے پر پوشیدہ نہیں کہ اسلام سے پہلے ہر جگہ، ہر خطہ اور ہر طبقہ میں ظلم کی حکومت تھی، طاقت ور کمزور کو غلام بنائے رکھتا تھا، طاقت والے کیلئے قانون اور تھا اور کمزور کیلئے قانون دوسرا تھا جیسے آج بھی اپنے آپ کو مہذب اور ترقی یافتہ کہنے والے بہت سے ملکوں میں کالے اور گورے کا قانون الگ الگ ہے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہی آ کر اس فرق کو مٹایا، مخلوق کے حقوق کی برابری کا اعلان کیا اور انسان کو انسانیت اور آدمیت کا سبق دیا، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مدنیہ طیبہ تشریف لانے سے پہلے مدینہ کے اردگرد یہودیوں کے دو قبیلے بنوقریظہ اور بنونضیر آباد تھے ان میں سے بنونضیر قوت وشوکت اور دولت وعزت میں بنوقریظہ سے زیادہ تھے، یہ لوگ آئے دن بنوقریظہ پر ظلم کرتے رہتے تھے اور وہ چاروناچار اس کو سہتے تھے یہاں تک کہ بنونضیر نے بنوقریظہ کو اس ذلت آمیز معاہدہ پر مجبور کیا کہ اگر بنونضیر کا کوئی آدمی بنوقریظہ کے کسی شخص کو قتل کردے تو اس کا قصاص یعنی جان کے بدلے جان لینے کا ان کو حق نہ ہوگا بلکہ صرف ستّر وسق کھجوریں اس کے خون بہا کے طور پر ادا کی جائیں گی، (وسق عربی زبان کا لفظ ''ا'' ہے جو ہمارے وزن کے اعتبار سے تقریباً پانچ من دس سیر کا ہوتا ہے) اور اگر معاملہ برعکس ہو کہ بنوقریظہ کا کوئی آدمی بنونضیر کے کسی شخص کو قتل کردے تو قانون یہ ہوگا کہ اس کے قاتل کو قتل بھی کیا جائے

گا اوران سے خون بہا بھی لیا جائے گا اور وہ بھی بنونضیرؔ کے خون بہا سے دوگنا، یعنی: ایک سو چالیس وسق کھجوریں اور صرف یہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی کہ ان کا مقتول اگر عورت ہوگی تو اس کے بدلہ میں بنوقریظہؔ کے ایک مرد کو قتل کیا جائے گا اور اگر مقتول مرد ہے تو اس کے معاوضہ میں بنوقریظہؔ کے دو مردوں کو قتل کیا جائے گا اور بنونضیرؔ کے غلام کو قتل کیا ہے تو اس کے بدلہ میں بنوقریظہؔ کے آزاد کو قتل کیا جائے گا اور اگر بنونضیرؔ کے آدمی کا کسی نے ایک ہاتھ کاٹا ہے تو بنوقریظہؔ کے آدمی کے دو ہاتھ کاٹے جائیں گے، ایک کان کاٹا ہے تو ان کے دو کان کاٹے جائیں گے، یہ قانون تھا جو اسلام سے پہلے ان دونوں قبیلوں کے درمیان رائج تھا اور بنوقریظہؔ اپنی کمزوری کی بناء پر اس کے ماننے پر مجبور تھے۔

جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے اور مدینہ ایک دار الاسلام بن گیا یہ دونوں قبیلے ابھی اسلام میں داخل نہیں ہوئے تھے نہ کسی معاہدہ کی رو سے اسلامی حکموں کے پابند تھے مگر اسلامی قانون کے انصاف اور برابری اور عام سہولتوں کو دور سے دیکھ رہے تھے، اس عرصہ میں یہ واقعہ پیش آیا کہ بنوقریظہؔ کے ایک آدمی نے بنونضیرؔ کے کسی آدمی کو مار ڈالا تو بنونضیرؔ نے معاہدہ کے مطابق بنوقریظہؔ سے دوگنی دیت یعنی خون بہا کا مطالبہ کیا، بنو قریظہؔ اگرچہ اسلام میں داخل نہیں ہوئے تھے اور نہ ہی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس وقت ان کا کوئی معاہدہ تھا لیکن یہ لوگ یہودی تھے ان میں بہت سے لکھے پڑھے لوگ بھی تھے جو ''تورات'' کی پیشینگوئیوں کے مطابق جانتے تھے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی آخری پیغمبر ہیں جن کے آنے کی خوشخبری ''تورات'' نے دی ہے مگر مذہبی جانب داری یا دنیاوی لالچ کی وجہ سے ایمان نہ لائے تھے اور یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مذہب انسانی برابری اور انصاف کرتا ہے اس لئے بنونضیرؔ کے ظلم سے بچنے کیلئے ان کو ایک سہارا ملا اور انہوں نے دوگنی دیت دینے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ہم اور تم ایک ہی خاندان سے ہیں ایک ہی وطن کے باشندے ہیں اور ہم دونوں کا مذہب بھی ایک یعنی یہودیت ہے یہ غیر منصفانہ معاملہ جو آج تک تمہاری زبردستی اور ہماری کمزوری کے سبب ہوتا رہا اب ہم اس کو گوارا نہ کریں گے۔

اس جواب پر بنونضیرؔ میں اشتعال پیدا ہوا اور قریب تھا کہ جنگ چھڑ جائے مگر پھر کچھ بڑے بوڑھوں کے مشورہ سے یہ طے پایا کہ اس معاملہ کا فیصلہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کروایا جائے، بنوقریظہ کی تو یہ عین مراد تھی کیونکہ وہ جانتے تھے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بنونضیرؔ کے ظلم کو برقرار نہ رکھیں گے، بنونضیرؔ بھی آپس کی گفتگو اور صلح کی بناء پر اس کیلئے مجبور تو ہو گئے مگر اس میں یہ سازش کی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس مقدمہ لے جانے سے پہلے کچھ ایسے لوگوں کو آگے بھیجا جو اصل میں تو انہی کے ہم مذہب یہودی تھے مگر منافقانہ طور پر اسلام کا اظہار کر کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آتے جاتے تھے اور مطلب ان کا یہ تھا کہ یہ لوگ کسی طرح مقدمہ اور اس کے فیصلے سے پہلے اس معاملہ میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عندیہ معلوم کر لیں اور یہی تاکید ان لوگوں کو کر دی کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمارے مطالبہ کے مطابق فیصلہ فرما دیا تو اس کو قبول کر لینا اور اس کے خلاف کوئی حکم آیا تو ماننے کا وعدہ نہ کرنا۔

اس آیت کے اترنے کا سبب یہ واقعہ ہے اور مسند احمد و ابوداؤد میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کا خلاصہ نقل کیا گیا ہے۔

اسی طرح کا ایک دوسرا واقعہ بدکاری کا ہے جس کی تفصیل ہے کہ خیبر کے یہودیوں میں یہ واقعہ پیش آیا اور ''تورات'' کی مقرر کردہ سزا کے موافق ان دونوں کو سنگسار کرنا لازم تھا مگر یہ دونوں کسی بڑے خاندان کے فرد تھے، یہودیوں نے اپنی پرانی عادت کے مطابق یہ چاہا کہ ان کیلئے سزا میں نرمی کی جائے اور ان کو یہ معلوم تھا کہ اسلام میں بڑی سہولتیں دی گئی ہیں اس بناء پر اپنے نزدیک یہ سمجھا کہ اسلام میں اس سزا میں بھی سہولت ہوگی، خیبر کے لوگوں نے اپنی برادری بنی قریظہؔ کے لوگوں کے پاس پیغام بھیجا کہ اس معاملہ کا فیصلہ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کرا دیں اور دونوں مجرموں کو بھی ساتھ بھیج دیا مرضی ان کی بھی یہ تھی کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کوئی ہلکی سزا جاری کر دیں تو مان لیا جائے ورنہ انکار کر دیا جائے، بنوقریظہؔ کو پہلے تو ہچکچاہٹ ہوئی کہ معلوم نہیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیسا فیصلہ کریں اور وہاں جانے کے بعد ہمیں ماننا پڑے مگر کچھ دیر گفتگو کے بعد یہی فیصلہ رہا کہ ان کے چند سردار پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں ان مجرموں کو لے جائیں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی سے اس کا فیصلہ کرائیں۔

چنانچہ کعب بن اشرف وغیرہ کا ایک وفد ان کو ساتھ لے پیغمبر ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور سوال کیا کہ شادی شدہ مرد و عورت اگر بدکاری میں مبتلا ہوں تو ان کی کیا سزا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ: کیا تم میرا فیصلہ مانو گے؟ انہوں نے اقرار کیا، اس وقت حضرت جبرائیل علیہ السلام اللہ تعالیٰ کا یہ حکم لے کر آئے کہ ان کی سزا سنگسار کر کے مار دینا ہے، ان لوگوں نے جب یہ فیصلہ سنا تو بوکھلا گئے اور ماننے سے انکار کر دیا، حضرت جبرائیل علیہ السلام نے پیغمبر ﷺ کو مشورہ دیا کہ آپ ان لوگوں سے یہ کہیں کہ میرے اس فیصلہ کو ماننے یا نہ ماننے کیلئے ابن صوریا کو حَکَم (سرپنچ) بنادو اور ابن صوریا کے حالات و صفات پیغمبر ﷺ کو بتلا دیئے، آپ ﷺ نے آنے والے وفد سے کہا کہ کیا تم اس نوجوان کو پہچانتے ہو جو سفید رنگ مگر ایک آنکھ سے معذور ہے، فدک میں رہتا ہے جس کو ابن صوریا کہا جاتا ہے سب نے اقرار کیا، آپ ﷺ نے دریافت کیا کہ آپ لوگ اس کو کیسا سمجھتے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ یہودیوں کے عالموں میں اتنا اونچا درجہ رکھتا ہے کہ اس سے بڑا کوئی عالم نہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: اس کو بلاؤ، چنانچہ وہ آ گیا، آپ ﷺ نے اس کو قسم دے کر پوچھا کہ اس صورت میں ''توراتؔ'' کا حکم کیا ہے؟ یہ بولا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کی قسم آپ (ﷺ) نے مجھ کو دی ہے اگر آپ قسم نہ دیتے اور مجھے یہ خطرہ نہ ہوتا کہ غلط بات کہنے کی صورت میں '' توراتؔ'' مجھے جلا ڈالے گی تو میں یہ حقیقت ظاہر نہ کرتا، حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے حکم کی طرح ''تورات'' میں بھی یہی حکم ہے ان دونوں کو سنگسار کر کے قتل کرایا جائے۔

پیغمبر ﷺ نے فرمایا کہ: پھر تم پر کیا آفت آئی کہ تم ''توراتؔ'' کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہو، ابن صوریا نے بتلایا کی اصل بات یہ ہے کہ بدکاری کی شرعی سزا تو ہمارے مذہب میں یہ ہی ہے مگر ہمارا ایک شہزادہ اس جرم میں مبتلا ہو گیا ہم نے اس کی رعایت کر کے چھوڑ دیا سنگسار نہیں کیا، پھر یہی جرم ایک معمولی آدمی سے ہوا اور ذمہ داروں نے اس کو سنگسار کرنا چاہا تو مجرم کے جتھہ کے لوگوں نے احتجاج کیا کہ اگر شرعی سزا اس کو دینی ہے تو اس سے پہلے شہزادے کو دو ورنہ ہم اس پر یہ سزا جاری نہ ہونے دیں گے یہ بات بڑھی تو سب نے مل کر صلح کر لی کہ سب کیلئے ایک ہی ہلکی سزا تجویز کر دی جائے اور ''تورات'' کا حکم چھوڑ دیا جائے چنانچہ ہم نے کچھ مار پیٹ اور منہ

کالا کر کے جلوس نکالنے کی سزا تجویز کر دی اور اب یہی سب میں رواج ہو گیا۔

گمراہوں کی سزا

وَ مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ فِتْنَتَهٗ فَلَنْ تَمْلِكَ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ
اور وہ کہ چاہیں اللہ گمراہی اسکی پس ہرگز نہ بس میں پائینگے آپ لئے اس کے سامنے اللہ کے کوئی چیز
اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَمْ يُرِدِ اللّٰهُ اَنْ يُّطَهِّرَ قُلُوْبَهُمْ ؕ لَهُمْ فِى
یہ لوگ وہ ہیں نہیں چاہا اللہ نے کہ پاک کریں دل ان کے لئے ان کے میں
الدُّنْيَا خِزْىٌ ۖۚ وَّ لَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۴۱﴾
دنیا رسوائی ہے اور لئے ان کے میں آخرت عذاب ہے بڑا (۴۱)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور جس کو اللہ نے گمراہ کرنا چاہا سو آپ اس کیلئے کچھ نہیں کر سکتے، اللہ کے ہاں یہ وہی لوگ ہیں جن کیلئے اللہ نے نہ چاہا کہ ان کے دل پاک کریں ان کیلئے دنیا میں ذلّت ہے اور ان کیلئے آخرت میں بڑا عذاب ہے۔ (۴۱)

لفظی تحقیق: لَنْ تَمْلِكَ: ہرگز اپنے بس میں نہ پائیں گے: یہ لفظ "مِلْكٌ" سے ہے، جس کے معنٰی ہیں مالک ہونا، مراد یہ ہے کہ آپ کے بس میں نہیں۔

تفسیر

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا گیا ہے کہ نیک مشورہ دینے پر چڑنے اور برائیوں میں اور بھی زیادہ اصرار کرنے والوں کو دیکھ کر آپ نہ کڑھیں اور نہ غمگین ہوں آپ کا کام یہ ہے کہ نیکوں کو نیک بننے کا طریقہ دکھا دیں اور بروں کو ان کے حال پر چھوڑ دیں وہ اگر آپ کی بات نہ مانیں تو آپ رنج نہ کریں، دنیا میں ہر قسم کے آدمی رہیں گے

یہاں کی زندگی کی درستی اس میں ہے کہ نیک لوگوں کا غلبہ رہے۔

دنیا میں نیکی اور بدی دونوں موجود ہوں تب ہی نیک اور بد راستوں کے چننے کا موقع پیش آتا ہے اور دنیا میں بسنے والے انسانوں کا امتحان ہوتا ہے اور اسی امتحان میں کامیابی پر انعام ملتا ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ نے دنیا میں بدعملوں کو بھی مہلت دی ہے، اول تو وہ دوسروں کی آزمائش بنے ہوئے ہیں دوسرے انہیں بھی خود کو صحیح کرنے کا موقع میسر ہے چنانچہ یہ وہی لوگ ہیں، یہ آپ کی طاقت میں نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فیصلہ کے خلاف ان سب کو سیدھے راستے پر لے آئیں۔

ان کے بارے میں یہ سمجھ لیجئے کہ ان کی لگاتار بدکرداریوں کی وجہ سے ان کے دل ٹھیک ہونے کے قابل نہیں رہے اب یہ لاعلاج ہیں اور یہ برے لوگوں میں داخل ہیں جن کا رہنا بھی دنیا کی بناوٹ کے مطابق دنیا میں ضروری ہے ان کی وجہ سے مخلوق کو صحیح راستے پر لانے کا کام نہیں رک سکتا اور اگر رکا تو دنیا فنا ہو جائے گی۔

ان کے بارے میں یہ فیصلہ ہے کہ ان کے کرتوتوں کی وجہ سے ان کو دنیا میں ذلت اور رسوائی نصیب ہوگی، یہ ظاہراً اگر پنپتے ہوئے بھی نظر آئیں تو یہ صرف ظاہری کچھ دن کی بہار ہے اور عارضی حالت ہے، دنیا میں یہ اخلاقی لحاظ سے گرے ہوئے رہیں گے اور یہی ذلت کے معنیٰ ہیں، آخرت میں ان کیلئے دکھ، درد اور بے چینی کے سوا کچھ نہیں ہے اس سے بڑھ کر اور عذاب کیا ہوگا؟ ان کے دل ناپاک ہیں اور یہاں اس ناپاکی کا اثر احساس کمتری ہے اور وہاں سخت عذاب ہوگا۔

یہ وہی لوگ ہیں جن کے دلوں کو پاک کرنے کا ارادہ اللہ تعالیٰ نہیں رکھتے، یہ لوگ کفر اور نفاق میں اتنے آگے بڑھ گئے ہیں کہ ان کی واپسی کی کوئی امید باقی نہیں رہی اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ اسی شخص کے دل کو پاک کرتے ہیں جسے خود طلب ہو، جو شخص اپنی غلطی کا احساس کرکے اپنی اصلاح کا خواہشمند ہو اللہ تعالیٰ اس کی رہنمائی فرماتے ہیں اور اس کے دل کو کفر، شرک اور منافقت سے پاک صاف کر دیتے ہیں برخلاف اس کے جو لوگ دین سے دشمنی رکھتے ہیں اور حق کے مخالف ہوتے ہیں ان کے دلوں پر مہریں لگ چکی ہیں اپنی بدکرداری کی

وجہ سے ان کے دل زنگ آلود ہو چکے ہیں، لہٰذا اب وہ حق کی طرف نہیں آ سکتے، ہاں! اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ اب بھی موجود ہے جو ہماری طرف آنا چاہتے ہیں ہم ضرور ان کی سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کرتے ہیں، جو لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف آ جاتے ہیں پھر اللہ تعالیٰ ان کے دلوں کو پاک کر دیتے ہیں۔

عدل وانصاف

سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ ؕ فَاِنْ جَآءُوْكَ فَاحْكُمْ

کان لگا کر سننے والے لئے جھوٹ بولنے کے بڑے کھانے والے لئے حرام کے پس اگر آئیں وہ پاس آپ کے پس فیصلہ کیجئے

بَيْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ ۚ وَ اِنْ تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَنْ

درمیان انکے یا منہ پھیر لیجئے سے ان اور اگر آپ منہ پھیر لیں سے ان پس ہرگز نہ

يَّضُرُّوْكَ شَيْـًٔا ؕ وَ اِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ؕ اِنَّ

بگاڑیں گے آپ کا کچھ اور اگر آپ فیصلہ کریں تو فیصلہ کیجئے درمیان انکے ساتھ انصاف کے بیشک

اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ﴿۴۲﴾

اللہ دوست رکھتے ہیں انصاف کرنے والوں کو (۴۲)

بامحاورہ ترجمہ: جھوٹ بولنے کیلئے جاسوسی کرنے والے اور بڑے حرام کھانے والے سو اگر آپ کے پاس آئیں تو ان میں فیصلہ کر دیجئے یا ان سے منہ پھیر لیجئے اور اگر آپ ان سے منہ پھیر لیں گے تو وہ آپ کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے اور اگر آپ فیصلہ کریں تو ان میں انصاف سے فیصلہ کیجئے، بیشک اللہ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتے ہیں۔ (۴۲)

لفظی تحقیق: لَنْ يَّضُرُّوْكَ: آپ کا ہرگز کچھ نہ بگاڑیں گے: "ضَرَرٌ" سے بنا ہے، جس کے معنیٰ نقصان اور نقصان پہنچانا ہیں، یعنی: آپ کو کچھ نقصان نہ پہنچا سکیں گے۔

تفسیر

اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو تمہارے اندرونی راز معلوم کرنے کیلئے منڈلاتے رہتے ہیں ان کی عادت ہی یہ ہوگئی ہے کہ کسی طرح تمہارے اندر عیب کی باتیں نکالیں اور چونکہ عیب کی باتیں ملتی نہیں اس لئے وہ خوبی کو عیب کر کے دکھانا چاہتے ہیں جو بغیر جھوٹ بولے نہیں ہوسکتا اس لئے ان کا تمہاری باتیں غور سے سننا اسی لئے ہے کہ جھوٹ بولیں، یہ پرلے درجے کے جھوٹے ہیں اس کے علاوہ ان کو حرام کی چاٹ لگی ہوئی ہے یہ دوسرے کو دبا کر اس کا حق چھینتے ہیں، کمزوروں کی کمزوری سے اور غریبوں کی غریبی سے ضرورتمندوں کی ضرورت سے فائدہ اٹھاتے ہیں، مثلاً: سود لینا، رشوت طلب کرنا، بیکار میں پکڑنا، غرض جس میں اپنا نفع ہو اس کو کرنے سے نہیں کتراتے، اے پیغمبر! اگر یہ لوگ آپ کے پاس اپنے مقدمے لے کر آئیں تو آپ کو اختیار ہے کہ آپ ان کا مقدمہ سن کر اس کا فیصلہ کریں یا ان کو ٹال دیں، یہ بگڑیں تو بگڑنے دیں، یہ آپ کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے لیکن جب آپ فیصلہ کریں تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کیجئے، اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند فرماتے ہیں، یہ آپ کے فیصلے سے راضی ہوں یا ناراض آپ انصاف کو اپنے ہاتھ سے نہ جانے دیں؛ یہاں سے معلوم ہوا کہ جو بھی مسلمانوں سے اپنا فیصلہ کرائے مسلمانوں کو عدل وانصاف کے ساتھ اس کا فیصلہ کرنا چاہئے۔

یہودیوں اور عیسائیوں کا برتاؤ

وَ كَيْفَ يُحَكِّمُوْنَكَ وَ عِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ

اور کس طرح حاکم بنائیں گے وہ آپ کو اور پاس ان کے تورات ہے میں جس حکم ہے اللہ کا

ع ۹ ۱۰ ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ؕ وَ مَاۤ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۳﴾

پھر پیٹھ پھیرتے ہیں سے بعد اس کے اور نہیں وہ لوگ ماننے والے (۴۳)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور وہ آپ کو کس طرح حَکَم (سرپنچ) بنائیں گے حالانکہ ان کے پاس ''تورات'' ہے جس میں اللہ کا حکم موجود ہے، پھر اس کے بعد پھر جاتے ہیں اور وہ لوگ ہرگز ماننے والے نہیں۔ (۴۳)

لفظی تحقیق: يُحَكِّمُوْنَكَ: ''تَحْكِيْمٌ'' سے ہے، جو ''حُكْمٌ'' سے بنا، اور اسی سے ''حَاكِم، محکوم'' وغیرہ بہت سے لفظ بنے ہیں، ''تَحْكِيْمٌ'' کے معنٰی ہیں: حکم بنانا، یعنی: کسی کے سامنے فیصلہ کرنے کیلئے اپنا مقدمہ پیش کرنا، پنچ بنانا۔ يَتَوَلَّوْنَ: تَوَلِّی سے ہے، جس کے معنٰی ہیں: منہ پھیر لینا، مراد یہ ہے کہ اس کے ماننے سے انکار کرتے ہیں۔ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ: اس کے بعد۔ مراد یہ ہے کہ ''تورات'' ان کے پاس موجود ہے، پھر بھی اس کے ہوتے ہوئے ایسا کرتے ہیں۔

تفسیر

ارشاد ہے کہ یہودی کوئی سچ مچ فیصلہ کرانے کی غرض سے آپ کے پاس نہیں آتے بلکہ اس میں بھی ان کا اپنا مطلب ہوتا ہے، مثلاً: یہ کہ ''تورات'' میں کسی جرم کی سخت سزا مقرر ہے اس سے بچنے کیلئے وہ مجرموں کا مقدمہ آپ کے پاس اس لئے بھیجتے ہیں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ پیغمبر امّی ہے (یعنی مقررہ طریقہ کے مطابق پڑھا لکھا نہیں) اس لئے ''تورات'' کا حال اسے معلوم نہیں ہوگا، ویسے رحم دل ہے تو ہلکی سزا کا فیصلہ کرے گا اس طرح دنیا سے وہ اپنا دعوٰی منوالیں گے کہ ''تورات'' میں سخت سزا ہے ہی نہیں اس لئے سزا اس پیغمبر کے فیصلہ کے مطابق ہلکی ملنی چاہئے۔

واقعہ یہ پیش آیا تھا کہ یہودیوں کے معزز طبقے میں ایک شخص نے ایک عورت سے بدکاری کیا اور دونوں شادی شدہ تھے، ''تورات'' میں ان کے جرم کی سزا سنگساری تھی، یعنی: دونوں کو سامنے کھڑا کر کے پتھر مارتے مارتے مار ڈالو، چونکہ اونچے درجے کے لوگ تھے ان کو اس سزا سے بچانا منظور تھا اس لئے ''تورات'' کا سنگساری کا حکم چھپا کر جوتے مارنے، منہ کا وغیرہ کی ہلکی سزا دے دلا کر معاملہ ختم کرنا چاہتے تھے چنانچہ چند آدمی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس غرض سے بھیجے کہ انہیں سنگساری کا حال تو معلوم نہیں ہلکی سزا کا فیصلہ سنادیں گے اور ان

سے کہہ دیا کہ ہلکی سزا دیں تو ان کا فیصلہ ماننا ورنہ نہیں۔

آیت میں ارشاد ہے کہ تعجب ہے ان لوگوں پر کہ یہ لوگ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اپنے مقدمہ کا فیصلہ کرنے کیلئے آپ کو منصف بناتے ہیں حالانکہ ''تورات'' میں اس جرم کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا حکم صاف صاف موجود ہے، اس حکم پر عمل نہ کرنے کیا معنٰی؟

بات یہ ہے کہ یہ لوگ ایمان سے محروم ہیں، نہ ان کا ایمان ''تورات'' پر ہے اور نہ ''قرآن کریم'' پر، یونہی دین کو نرا کھیل بنا رکھا ہے، آگے رکوع میں ''تورات اور انجیل'' کی شان کا ذکر ہے اس کے بعد قرآن کریم کی صفات بیان کر کے فرمایا ہے کہ سب کتابیں برحق ہیں اور ایک دوسرے کی مددگار ہیں۔

تورات

إِنَّآ أَنزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيهَا هُدًى وَّنُورٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّونَ
بیشک ہم نے اتاری تورات کو میں اس ہدایت ہے اور روشنی حکم کرتے تھے سے اس پیغمبر

الَّذِينَ أَسْلَمُوا لِلَّذِينَ هَادُوا وَالرَّبّٰنِيُّونَ وَالْأَحْبَارُ بِمَا
ان لوگوں کو جنہوں نے فرمانبرداری کی ان لوگوں میں جو یہود اور اللہ والے اور عقل مند اس لئے کہ

اسْتُحْفِظُوا مِن كِتٰبِ اللّٰهِ وَكَانُوا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ ۚ
نگہبان کئے گئے تھے سے کتاب اللہ کی اور تھے وہ پر اس دیکھ بھال کرنے والے

بامحاورہ ترجمہ:۔ ہم نے ''تورات'' اتاری کہ اس میں ہدایت اور روشنی ہے، پیغمبر اس کے ذریعہ یہودیوں کے لئے فیصلے کرتے تھے جو اللہ کے حکموں کو ماننے والے تھے اور حکم کرتے تھے اس کے مطابق درویش اور عالم اس لئے کہ وہ اللہ کی کتاب پر نگہبان ٹھہرائے گئے تھے اور اس کی خبرگیری پر مقرر تھے۔

لفظی تحقیق: الرَّبّٰنِيُّونَ: رب والے۔ ''رَبَّانِيْ'' کی جمع ہے، جو ''رَبٌّ'' سے بنا ہے، اس میں ''ی''

نسبت کی ہے، جس کے معنٰی ہیں "والا" "رَبَّانِیُّ" رب والا، یعنی: اللہ والا۔ اَلْاَحْبَارُ: پڑھے لکھے۔: "حِبْرٌ" کی جمع ہے، "حِبْرٌ" علم اور عقل والے کو کہتے ہیں۔ اسْتُحْفِظُوْا: نگہبان ٹھہرائے گئے۔ "اِسْتِحْفَاظٌ" سے ہے، جو "حِفْظٌ" (حفاظت) سے بنا ہے، "حِفْظٌ" کے معنٰی ہیں نگہبانی، "اِسْتِحْفَاظٌ" کے معنٰی ہیں نگہبان مقرر کرنا۔

تفسیر

اس آیت میں "تورات" کی تعریف ہے کہ یہ کتاب جس کے حکموں کو اب یہودی ٹالتے پھر رہے ہیں وہ عظیم الشان کتاب ہے کہ جس میں انسان کی اس وقت کی تمام ضرورتوں کیلئے ہدایتیں موجود تھیں اور اس میں ایک ایسا ہدایت کا نور تھا کہ جس کی مدد سے بہت سے اللہ تعالیٰ کے حکم کے آگے سر جھکانے والے پیغمبر اور اپنے رب سے لو لگانے والے اور جاننے والے عقل مند عالم مدتوں فیصلے کرتے رہے اور انسانوں کیلئے کام کرنے کا صحیح طریقہ مقرر کرتے رہے اور ہونا بھی یہی چاہئے تھا، کیونکہ اس کتاب کا انہی کو محافظ بنایا گیا تھا اور وہ اس کو ہمیشہ اپنی آنکھوں کے سامنے رکھتے تھے اور انہی کی دیکھ بھال کی وجہ سے وہ دنیا میں قائم تھی کیونکہ "تورات، انجیل" میں کوئی ایسا وعدہ نہ تھا جیسا کہ "قرآن مجید" میں ہے کہ اللہ تعالیٰ خود اس کی حفاظت کرنے والے ہیں اس لئے جب تک اس کی حفاظت کرنے والے پیغمبر یا ولی موجود رہے یہ دنیا میں صحیح طور پر موجود رہیں جس وقت یہ لوگ دنیا سے رخصت ہوئے "تورات اور انجیل" بھی اپنی اصلی شکلوں میں باقی نہ رہیں۔

بہرحال "تورات" میں اپنے وقت کیلئے ہر چیز کے پورے پورے حکم موجود تھے اور اب تک بھی وہ حکم جن کو قرآن مجید نے منسوخ نہیں کیا ہے موجود ہیں۔

جو لوگ یہودی ہونے کے دعویدار تھے ان کا فرض تھا کہ ان حکموں کے مطابق چلتے اور ان میں اپنی طرف سے ردوبدل نہ کرتے۔

"تورات" حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اتاری گئی اور اس کا ذکر "سورۂ اعراف" میں ہے کہ ہم نے موسیٰ کو تختیوں پر لکھی لکھائی کتاب عطا کی جس میں ہر قسم کی نصیحت اور حکم موجود ہیں، اللہ تعالیٰ کی اتاری ہوئی یہ کتاب زمانے کے

ہاتھوں محفوظ نہ رہ سکی اور قرآن کریم کے اترنے کے زمانے تک اس میں بہت سی تبدیلیاں ہوچکی تھیں، یہودی خود ''تورات'' کے حکموں کو اپنے صحیح مقام سے بدل دیتے تھے یہ بڑے بددیانت لوگ تھے تاہم ''تورات'' میں آج بھی بعض صحیح باتیں موجود ہیں جو پیغمبروں کی تعلیم کے مطابق ہیں، البتہ صحیح اور غلط کا فرق علم والے لوگ ہی کرسکتے ہیں یہ ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے، یہ کوئی عالم ہی بتا سکتا ہے کہ موجودہ ''تورات'' کی کون سی آیت قرآن کریم وسنت کے مطابق ہے اور کون سی اس کے خلاف ہے، اس وقت تورات میں بعض ایسی فحش باتیں ہیں جو اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں کی طرف منسوب کی گئی ہیں مگر اللہ تعالیٰ کا کوئی پیغمبر بھی ایسی بات نہیں کرسکتا بلکہ ان کا دہرانا بھی بے ادبی ہے ایسی چیزیں اللہ تعالیٰ کی کتاب میں ردوبدل کا زندہ ثبوت ہیں۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل جب فرعون کی غلامی سے آزاد ہوگئے تو انہوں نے خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے قانون مقرر کرنے کا مطالبہ کیا، کہنے لگے کہ ہم صدیوں سے فرعون کی غلامی میں جکڑے ہوئے تھے اور ہم اس کا قانون ماننے پر مجبور تھے اب جبکہ ہم آزاد ہوچکے ہیں ہمارا اپنا کوئی قانون ہونا چاہئے جس کی روشنی میں ہم اپنی زندگی گذار سکیں، جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کی اس خواہش کا اظہار اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے موسیٰ! آپ طور پہاڑ پر ایک مہینے کا اعتکاف کریں جس کے بعد ہم آپ کو کتاب دیں گے چنانچہ آپ طور پہاڑ پر تشریف لے گئے، اعتکاف کی مدت ایک ماہ سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کے حکم سے چالیس دن ہوگئی تاہم اس کے مکمل ہونے پر اللہ تعالیٰ نے تختیوں پر لکھی لکھائی ''تورات'' حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عطا فرمائی مگر جب قانون کی یہ کتاب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو پیش کی تو وہ حیلے بہانے کرنے لگے، کہنے لگے اے موسیٰ! اس کتاب کے حکم بڑے سخت ہیں، لہٰذا ہم نے حکم سن تو لئے مگر ان پر عمل نہیں کرسکتے، لہٰذا ہم ان کا انکار کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ جو کچھ ہم نے دیا ہے اس کو مضبوطی سے پکڑو اور اس کو خوب یاد کرو اور اس پر عمل کرو، مگر اس قوم نے حیلے بہانوں سے ''تورات'' کے حکم ماننے سے نہ صرف انکار کردیا بلکہ اس میں طرح طرح کی تبدیلیاں کرنے لگے جو آج تک جاری ہے اور اس کتاب کا اکثر حصہ تبدیلیوں کا شکار ہوچکا ہے۔

''تورات'' کا لفظی معنیٰ قانون ہے، یہ عبرانی یا سریانی زبان کا لفظ ہے، اسی طرح ''انجیل'' کے معنیٰ بشارت، یعنی: خوشخبری کے ہیں، کیونکہ اس میں آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق خوشخبری دی گئی ہے، تیسری کتاب ''زبور'' ہے جس کا معنیٰ صحیفہ ہے اس کتاب میں اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا اور اخلاقی باتیں زیادہ ہیں، اور قانون وحکم کم تعداد میں ہیں، اللہ تعالیٰ کی چوتھی اور آخری کتاب قرآن کریم ہے جس کا معنیٰ پڑھی جانے والی کتاب ہے۔

يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا: اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ''تورات'' کی روشنی میں فیصلے کرتے تھے اور وہ سارے پیغمبر علیہم السلام اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار تھے، بنی اسرائیل میں اللہ تعالیٰ نے ہزاروں پیغمبر بھیجے جن کو حکم دیا جاتا رہا کہ اس ''تورات'' کے حکموں کو عام کرو، ''اَسْلَمُوْا'' کے لفظ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سارے پیغمبر اسلام والے لوگ تھے نہ کہ یہودیت یا نصرانیت والے، تمام پیغمبروں کا دین تو اصل میں ایک ہی رہا ہے اور وہ سارے اللہ تعالیٰ فرمانبرداری ہی کی دعوت دیتے رہے، سب بنیادی طور پر ایک ہی دین پر تھے۔

''تورات'' چونکہ بنی اسرائیل کیلئے اتاری گئی تھی، اس لئے اللہ تعالیٰ کے پیغمبر یہ قانون اس قوم پر نافذ کرتے رہے اور پھر یہ بھی ہے کہ پیغمبر علیہم السلام کے علاوہ اللہ والے، یعنی: درویش لوگ بھی اسی ''تورات'' کے مطابق فیصلے کرتے رہے، اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں ہزاروں درویش گزرے ہیں جو اسی کتاب کے مطابق فیصلے کرتے رہے اور عالم لوگ، یعنی: ''تورات'' کو جاننے والے اور سمجھنے والے لوگ بھی ''تورات'' کے حکموں پر عمل کراتے رہے، قرآن کریم اور تاریخ سے یہ بات ثابت ہے کہ اہل کتاب کے عالموں اور بزرگوں میں یقیناً ''تورات'' کے جاننے اور ماننے والے موجود تھے، جنہوں نے ''تورات'' کو سینوں سے لگا رکھا تھا مگر بعد میں ایسے لوگ پیدا ہوگئے جن کے متعلق قرآن پاک نے بتایا کہ بہت سے عالم اور درویش ایسے ہیں جو لوگوں کا مال ناحق طریقے سے کھاتے ہیں اور دوسروں کو اللہ تعالیٰ کے راستے سے روکتے ہیں، ان لوگوں نے ''تورات'' پر عمل کرنا چھوڑ دیا اور اس کے بجائے غیر اللہ کی نیازیں کھانا شروع کردیں، اور تعویز گنڈوں اور جادو کے ذریعے لوگوں کا مال ہڑپ کرنا شروع کردیا۔

نصیحت

فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ وَ لَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا ؕ

پس مت ڈرو لوگوں سے اور ڈرو مجھ سے اور نہ خریدو بدلے آیتوں میری کے سامان تھوڑا

وَ مَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ ﴿۴۴﴾

اور جو نہ حکم کرے ساتھ اسکے جو اتارا اللہ نے پس وہ لوگ ہی کافر ہیں (۴۴)

بامحاورہ ترجمہ: سو! تم لوگوں سے نہ ڈرنا اور مجھ ہی سے ڈرتے رہنا، اور میری آیتوں کے بدلے تھوڑی سی قیمت بھی نہ لینا اور جو کوئی حکم نہ کرے اس کے مطابق جو اللہ نے اتاری سو وہی لوگ کافر ہیں۔ (۴۴)

لفظی تحقیق: تَخْشَوْا: مت ڈرو۔ "خَشْیَۃٌ" سے ہے، جس کے معنٰی ڈر کے ہیں، اور "اِخْشَوْا" اس کے بعد کا لفظ بھی اسی سے بنا ہے، جس کے معنٰی ہیں: ڈرو۔ لَا تَشْتَرُوْا: مت خریدو۔ "اِشْتِرَاء" سے ہے جو "شِرَاءٌ" سے بنا ہے، یہ دو لفظ "شِتِراء بَیْعٌ اور شِرَاءٌ" ایک دوسرے کے معنٰی میں استعمال ہوتے ہیں جن کے واسطے ہم خرید و فروخت کے لفظ استعمال کرتے ہیں۔ ثَمَنٌ: مول۔ عام طور پر اس نقدی کو کہتے ہیں جو کسی چیز کے بدلے میں اس کو حاصل کرنے کیلئے دی جاتی ہے۔

تفسیر

اس آیت میں خریدنا روپیہ کیلئے استعمال ہوا ہے کیونکہ یہاں اصلی غرض روپیہ کا حاصل کرنا ہے اس کے لینے کیلئے اپنی کوئی چیز دی گئی ہے۔

اس آیت میں مسلمانوں کو تنبیہ کی جاتی ہے کہ تمہیں یہودیوں کی ان باتوں کو اختیار نہ کرنا چاہئے، وہ لوگوں کے ڈر سے دین کی باتیں بدل ڈالتے ہیں تم صرف اللہ تعالیٰ سے ڈرنا اور دین کے معاملہ میں کسی کی رو رعایت نہ کرنا اور نہ مال کا لالچ کرنا کہ رشوت لے کر غلط فیصلے کردو۔

یاد رکھو! جو اللہ تعالیٰ کی اتاری ہوئی باتوں کے مطابق جن کی دو قسمیں ہیں قرآن و حدیث سے فیصلے نہیں کراتے وہ کافروں میں داخل ہیں کیونکہ وہ صحیح بات کو جان بوجھ کر نہیں مانتے۔

دنیا کا مال بالآخر ختم ہونے والا ہے پھر اپنے کیے پر سخت شرمندگی ہوگی، امام محمد رحمۃ اللہ علیہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت نقل کرتے ہیں کہ جس نے خدا کے اتارے ہوئے حکموں پر دل سے یقین نہ کیا تو وہ کھلا کافر ہے اور اگر اللہ تعالیٰ کے حکموں پر اعتقاد تو ہے مگر اس پر عمل نہیں تو اس کا حکم اگلی آیتوں میں آرہا ہے، ایسے لوگوں کو ظالم اور فاسق کہا گیا ہے، یہودیوں کا حال یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب پر سے ان کا اعتقاد ہی اٹھ چکا تھا وہ اللہ تعالیٰ کے حکموں کو اپنی خواہشوں کے مطابق چلانے لگے تھے، قرآن کریم کے بارے میں بھی یہی حکم ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کے حکم پر مکمل عقیدہ نہ رکھے اور انہیں غیر ضروری سمجھے وہ کافر ہے۔

تورات کا حکم

وَ كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ۙ وَ الْعَيْنَ

اور لکھا ہم نے پر ان میں کتاب اس یہ کہ جان بدلے جان کے اور آنکھ

بِالْعَيْنِ وَ الْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَ الْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَ السِّنَّ بِالسِّنِّ ۙ

بدلے آنکھ کے اور ناک بدلے ناک کے اور کان بدلے کان کے اور دانت بدلے دانت کے

وَ الْجُرُوْحَ قِصَاصٌ ؕ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ ؕ وَ

اور زخموں میں برابری پس جو معاف کردے اس کو پس وہ کفارہ ہے لئے اسکے اور

مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۵﴾

جو نہ حکم کرے ساتھ اسکے جو اتارا اللہ نے پس یہ لوگ وہی ہیں جو ظالم ہیں (۴۵)

بامحاورہ ترجمہ: ۔اور ہم نے اس کتاب میں ان پر لکھ دیا کہ جان کے بدلے جان اور آنکھ کے بدلے آنکھ اور ناک کے بدلے ناک اور کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت اور سب زخموں کا بدلہ اسی جیسا

زخم لگانے سے ہے، پھر جس نے معاف کردیا تو وہ گناہ سے پاک ہوگیا اور جو حکم نہ کرے اس کے مطابق جو کہ اللہ نے اتارا، پس یہی لوگ ظالم ہیں۔ (۴۵)

لفظی تحقیق: تَصَدَّقَ: معاف کردے۔ "تَصَدُّقٌ" سے ہے، جو "صَدَقَةٌ" سے بنا ہے، "صَدَقَةٌ" کے معنٰی ہیں: خیرات، کسی کو اللہ تعالیٰ کے واسطے کچھ دینا، یہاں اس سے مراد یہ ہے کہ ستایا ہوا اپنے ستانے والے کا قصور معاف کردے، یہ اس کی مہربانی ہے ورنہ قانوناً وہ بدلے کا مطالبہ کرسکتا ہے، یہ معافی دینا خیرات کا کام ہے اور اس کے بدلے اس کے گناہ معاف کردیئے جائیں گے۔

تفسیر

اس آیت میں یہودیوں کی ایک اور بے جاباتوں کا ذکر ہے، ارشاد ہے کہ ہم نے ان کیلئے قانون مقرر کیا تھا کہ قتل کرنے والے کسی کے عضو کو کاٹنے والے یا کسی کو زخم کرنے والے پر قصاص کا حکم جاری کرو، یعنی: جو اس نے نقصان پہنچایا ہے اس کے بدلے اتنا ہی نقصان اسے پہنچاؤ، لیکن اس کو بھی انہوں نے نہ مانا، بڑے لوگوں کی رعایت کی اور رشوتیں لے لے کر مجرم کو سزا سے بچادیا، چاہئے تو یہ تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے قانون کو جاری کرتے اور مجرم کو سزا دیتے، البتہ جو کوئی مجرم کو معاف کردے اور اس سے بدلہ نہ لے تو اس کے گناہ معاف کردیئے جائیں گے۔

فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ: معافی کی صورت یہ ہے کہ زخمی نہ تو قصاص میں زخم لگانے والے کو زخم لگائے اور نہ اس سے دیت وصول کرے تو یہ بہت بڑا کام ہے، معافی کا قانون یہ ہے کہ قتل کی صورت میں مقتول کا ولی معاف کرسکتا ہے، اگر مقتول کے کئی وارث ہوں تو سب کی رائے لی جائے گی، البتہ اگر ان میں سے ایک وارث بھی قاتل کو معاف کرتا ہے تو اس سے قصاص ٹل جائے گا البتہ دیت دینا پڑے گی اور اگر مکمل معافی ہوجاتی ہے تو یہ مقتول کے گناہوں کا کفارہ بن جائے گا، زخم لگنے کی صورت میں معافی کا اختیار خود زخمی کو حاصل ہوتا ہے وہ چاہے تو بدلہ یا خون بہا، یعنی: مالی جرمانہ لے لے، اور اگر وہ بالکل معاف ہی کردیتا ہے تو یہ بہت بڑی

بات ہے اور اس کیلئے آخرت میں نجات کا ذریعہ ہے، لیکن جو جان بوجھ کر اپنی غرض کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے حکم کو جاری نہیں کرتے وہ لوگ یقیناً ظالم ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کیلئے ''تورات'' میں قصاص کا حکم بھی لکھ دیا تھا کہ جان کے بدلے جان آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان، دانت کے بدلے دانت اور خاص زخموں کے بدلے زخم لگایا جائے گا۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بنو قریظہ اور بنو نضیر کی اس چوری کا پردہ چاک کر دیا کہ خود ''تورات'' میں بھی قصاص اور دیت کی برابری کے حکم موجود ہیں، یہ لوگ جان بوجھ کر ان سے منہ پھیرتے ہیں اور صرف حیلے بہانے تلاش کرنے کیلئے اپنا مقدمہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس لاتے ہیں۔

وَ الْجُرُوْحَ قِصَاصٌ: جس قسم کا زخم کسی کو لگایا گیا ہے اسی قسم کا زخم بدلے میں لگایا جائے گا، غرضیکہ قصاص کا قانون ایسا قانون ہے جو زمین میں فساد مچانے والے کو مجبور کرتا ہے کہ وہ کسی کو نقصان پہنچانے سے پہلے اس کے نتیجوں پر اچھی طرح غور کرے، یہاں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ جسم کے مختلف حصوں اور زخموں کا قصاص اسی صورت میں جائز ہے جب کہ وہ لگائے گئے زخم کے عین مطابق ہو اور اس میں کمی زیادتی نہ ہو۔

انجیل

وَ قَفَّيْنَا عَلٰۤى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ

اور پیچھے بھیجا ہم نے اوپر قدموں انکے کے عیسٰی بیٹے مریم کو سچ بتانے والے اسکو جو درمیان تھی

يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ ۪ وَ اٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّ نُوْرٌ ۙ

دو ہاتھوں اسکے کے سے تورات اور دی ہم نے انجیل میں جس ہدایت اور روشنی تھی

وَّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَ هُدًى وَّ
اور سچ بتاتی تھی اسکو جو درمیان دو ہاتھوں اسکے کے سے تورات اور راہ دکھانے والی اور

مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۶﴾ؕ
نصیحت تھی واسطے پرہیز گاروں کے (۴۶)

بامحاورہ ترجمہ:۔ پھر ہم نے ان پیغمبروں کے بعد (انہی کے نقش قدم پر) عیسیٰ بن مریم کو بھیجا جو اپنے سے پہلے کی کتاب، یعنی: تورات کی تصدیق کرتے تھے اور انہیں انجیل عنایت کی جس میں ہدایت اور نور تھا اور وہ تورات کی جو اس سے پہلی کتاب ہے تصدیق کرتی تھی اور خدا ترس لوگوں کیلئے وہ سراسر ہدایت اور نصیحت تھی۔ (۴۶)

لفظی تحقیق: قَفَّيْنَا: پیچھے بھیجا ہم نے۔ ''تَقْفِيَةٌ'' سے ہے، جو ''قَفَا'' سے بنا ہے ''قفا'' گدی یعنی سر کے پچھلے حصے کو کہتے ہیں، ''تَقْفِيَةٌ'' کے معنٰی ہیں آگے جانے والے کے پیچھے کسی اور کو بھیجنا۔ مَا بَيْنَ يَدَيْهِ: جو اس کے دو ہاتھوں کے درمیان تھا، یعنی: اس کے سامنے تھا۔

تفسیر

اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق اس آیت کی تفسیر یہ ہے کہ ہم نے ''تورات'' اتاری اور اس میں ہر معاملہ کے بارے میں حکم دیئے ان حکموں کے مطابق پیغمبر اور عالم جھگڑوں کے فیصلے کرتے تھے، جب وہ نہ رہے تو بنی اسرائیل نے ان حکموں کو پیٹھ پیچھے پھینک دیا اور کافر ہو گئے۔

اس آیت میں ہے کہ انہی پیغمبروں، درویشوں اور عالموں کے نقش قدم پر چلنے والے حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان کے بعد آئے اور انہوں نے ''تورات'' کی تصدیق کی، اور ان کو جو ''انجیل'' ملی اس میں بھی ''تورات'' کی تصدیق موجود تھی صرف کچھ سخت قانون نرم کر دیئے گئے تھے اور بعض چیزیں جو ''تورات'' میں حرام تھیں وہ اس

میں حلال کردی گئی تھیں، ’’ تورات‘‘ کی طرح ’’انجیل‘‘ بھی ایسی کتاب تھی جس میں ہدایت اور روشنی تھی، اس میں ایسے قاعدے اور ضابطے تھے جن پر عمل کرنے سے انسان کی درستگی ہوتی ہے اور ’’تورات‘‘ کی طرح ’’انجیل‘‘ کی روشنی سے بھی شک وشبہات دور ہوتے تھے اور انسان کا ذہن بالکل صاف ہوجاتا تھا۔

عیسائیوں کا حال بھی یہودیوں سے ملتا جلتا ہے ان میں تعصب، دشمنی، زیادتی اور سنگدلی اگرچہ یہودیوں سے کچھ کم تھی مگر خدا کی کتاب سے منہ موڑنے اور آیتوں کا مطلب توڑ موڑ کرنے میں عیسائی بھی یہودیوں سے کم نہیں، اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو پیغمبروں کے نقش قدم پر بھیجا، آپ بنی اسرائیل کے سب سے آخری پیغمبر ہیں آپ کے بعد چھ سو سال تک دنیا میں کوئی پیغمبر نہیں آیا اور پیغمبری کے سلسلہ کے آخر میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھیجا گیا، آپ کے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان کوئی پیغمبر نہیں آیا، اسی لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ میں (حضرت) عیسیٰ (علیہ السلام) سے زیادہ قریب ہوں، آپ کی کتاب کا نام ’’انجیل‘‘ ہے جس کا معنیٰ بشارت، یعنی: خوشخبری ہے، کیونکہ اس میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خوشخبری دی گئی ہے جیسا کہ ’’سورۂ صف‘‘ میں موجود ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے کہا کہ میں تمہاری طرف پیغمبر بنا کر بھیجا گیا ہوں، میں تمہارے پاس موجود کتاب ’’تورات‘‘ کی تصدیق کرنے والا ہوں، میں اپنے بعد آنے والے پیغمبر کی خوشخبری دینے والا ہوں جس کا نام ’’ احمد‘‘ ہوگا، چنانچہ پچھلی صدی تک مختلف اناجیل میں فارقلیط کا لفظ موجود تھا جس کا عربی ترجمہ ’’احمد‘‘ ہے، مگر یہ لفظ ردوبدل کی نذر ہو چکا ہے۔

جس طرح ہر آسمانی کتاب اپنے سے پہلے آنے والی کتاب کی تصدیق کرتی رہی اسی طرح ہر پیغمبر اپنے سے پہلے پیغمبروں کی تصدیق کرتے رہے ہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی یہ فرمایا کہ: میرے آنے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ بعض ایسی چیزوں کو حلال قرار دوں جو پہلے بنی اسرائیل پر حرام تھیں، یہ حلال یا حرام ہونا اللہ تعالیٰ کی جانب سے تھا اس نے اپنی حکمت کے مطابق جب چاہا کسی چیز کو حرام کر دیا اور جب چاہا حلال قرار دے دیا۔

’’انجیل‘‘ کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام ’’تورات‘‘ کی تصدیق کرنے والے

تھے اسی طرح ''انجیل'' بھی ''تورات'' کی تصدیق کرنے والی تھی، یہ کتاب خدا ترسوں کیلئے ہدایت اور نصیحت تھی ظاہر ہے کہ یہ ہدایت اور نصیحت انہی کو فائدہ پہنچا سکتی تھی جو اس پر عمل کرتے ہیں۔

انجیل پر عمل

وَ لْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ ؕ وَ مَنْ لَّمْ

اور چاہئے کہ حکم کریں رکھنے والے انجیل کے ساتھ اسکے جو اتارا اللہ نے میں اس اور جو نہ

يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۴۷﴾

حکم کرے ساتھ اسکے جو اتارا اللہ نے پس وہ لوگ وہی فاسق ہیں (۴۷)

بامحاورہ ترجمہ:۔ (''انجیل'' دے کر حکم دیا گیا تھا کہ) اور چاہئے کہ انجیل والے حکم کریں اس کے مطابق جو اللہ نے اس میں اتارا اور جو اس کے مطابق حکم نہ کرے جو اللہ نے اتارا تو وہی لوگ فاسق ہیں۔(۴۷)

تفسیر

اس آیت میں ہے کہ عیسائیوں کو حکم دیا گیا تھا کہ تم کو ''انجیل'' پر پورا پورا عمل کرنا چاہئے تھا مگر انہوں نے ایسا غلط طریقہ اختیار کیا کہ ان کے عالموں نے ''انجیل'' کی اس بات کی جس میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمانبرداری کا حکم دیا گیا تھا یا تو اس کو چھپایا یا اس کا مطلب کچھ اور ہی بیان کرنے لگے اگرچہ ان کو یقین ہو گیا تھا کہ مقدس ''فارقلیط'' یہی محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے سچے پیغمبر ہیں پھر بھی حیلے بہانے کر کے ٹال گئے۔

آیت میں ارشاد ہے کہ ایسے لوگ جو جان بوجھ کر حکم ماننے میں حیلے بہانے کرتے ہیں وہ نافرمان ہیں۔

آگے کی آیت میں آخری کتاب یعنی قرآن مجید کا ذکر ہے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو اور ان کے ذریعے ان کی امت کو بتایا گیا ہے کہ ان لوگوں کے ساتھ کیسا برتاؤ کریں۔

قرآن کریم کے اترنے کے زمانے میں عیسائیوں سے کہا جا رہا ہے کہ اگر وہ "انجیل" پر ٹھیک ٹھیک ایمان لے آئیں اور اس پر عمل کریں تو پھر انہیں قرآن کریم اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ماننا اور ان پر ایمان لانا پڑے گا اور وہ اسلام میں داخل ہو جائیں گے، یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی کتاب کو دل سے نہیں مانتے تو پورے پورے نافرمان ہیں اور اگر ماننے کے باوجود عمل اس کے خلاف ہے تو پھر نافرمان ہیں۔

قرآن مجید

وَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ

اور اتاری ہم نے طرف آپکی کتاب ساتھ سچائی کے تصدیق کرنے والی واسطے اسکے جو درمیان اسکے دو ہاتھوں کے ہے

مِنَ الْكِتٰبِ وَ مُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ

سے کتاب اور نگہبان اوپر اسکے پس حکم کیجئے درمیان انکے ساتھ اسکے جو اتارا اللہ نے

وَ لَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ ؕ

اور مت پیروی کیجئے خواہشوں ان کی ہٹ کر اس سے جو آیا پاس آپ کے سے سچائی

با محاورہ ترجمہ:۔ اور ہم نے آپ پر سچی کتاب اتاری جو کہ پچھلی کتابوں کی تصدیق کرنے والی اور ان کے مضمونوں پر مشتمل ہے پس آپ ان میں حکم کیجئے اس کے مطابق جو اللہ نے اتاری اور سیدھا راستہ چھوڑ کر ان کی خوشی پر مت چلئے جو آپ کے پاس آیا۔

تفسیر

جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ تشریف لائے اور مسلمانوں کو قوت حاصل ہو گئی تو یہودیوں کو بڑی مشکل آ پڑی، اس سے پہلے وہ اپنے سے کمزوروں کو دبا کر رکھتے تھے اور جیسے جی میں آتا تھا جھگڑوں کے فیصلے کرتے تھے ایک

دفعہ یہودیوں کے قبیلہ بنو نضیر کے معزز لوگ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے، یہ بڑا زبردست قبیلہ تھا ان کا جھگڑا یہودیوں کے ایک اور قبیلہ بنو قریظہ سے تھا جو ان سے کمزور تھا، بنو نضیر نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا کہ اگر آپ بنو قریظہ کے ساتھ ہمارے جھگڑے کا ہماری مرضی کے مطابق فیصلہ کرادیں تو ہم مسلمان ہوجائیں گے اور ہمارے زبردست اثر سے اور بھی بہت سے لوگ مسلمان ہوجائیں گے جس کا تفصیلی بیان شروع میں گزر چکا ہے۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: میں تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کروں گا مجھے ایسے مسلمان نہیں چاہئیں جو اپنی دنیاوی غرض سے مسلمان ہوں، اس موقعہ پر یہ آیتیں اتریں جن میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طرز عمل کی تائید کی گئی اور آسمانی کتابوں کا آپس میں رشتہ اچھی طرح سمجھا دیا گیا۔

''تورات'' اور ''انجیل'' کے بعد اتارنے کے بعد اے پیغمبر! ہم نے آپ کی طرف قرآن مجید اتارا جو آخری کتاب ہے اور وہ سب پچھلی آسمانی کتابوں کو سچا بتاتی ہے اور اس میں سب باتیں جو ان کے بعد انسان کے کام آنے والی ہیں جمع کردی گئی ہیں، اس کتاب میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تاکید ہے کہ یہودی اور عیسائی ہوں یا کوئی اور جو اپنے مقدمے آپ کے پاس لائیں ان کا فیصلہ بالکل سچے اور درست قاعدوں اور قانون کے مطابق کریں جو آپ کے پاس قرآن کریم کے ذریعے آچکے ہیں اور کسی کی خواہش کی پیروی نہ کریں، بات وہ ٹھیک نہیں جس کو جی چاہتا ہو بلکہ بات وہ ٹھیک ہے جس کو قرآن کریم ٹھیک کہتا ہو، واقعی جو اس کتاب میں غور کرتا ہے وہ انسان کیلئے ساری فائدہ مند باتوں کو اس میں جمع پاتا ہے۔

وَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ: آیت کے اس ٹکڑے میں کتاب سے مراد قرآن کریم ہے کیونکہ یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خطاب ہورہا ہے، اور آپ پر اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب قرآن کریم اتاری گئی، اس کتاب کے اترنے کے ساتھ ہی پچھلی تمام کتابوں کا زمانہ ختم ہوا اور قرآن کریم کا دور شروع ہوگیا اب تمام لوگوں کا فرض ہے کہ وہ اس کتاب پر ایمان لائیں اس کے حکموں کی پیروی کریں اور اپنے تمام فیصلے اسی کے مطابق کریں۔

اس کتاب کی حیثیت یہ ہے کہ یہ تصدیق کرنے والی ہے ان کتابوں کی جو اس سے پہلے اتر چکی ہیں، یہ

ایک اصولی بات ہے کہ ہر بعد میں آنے والی کتاب پہلے آنے والی کتاب کی تصدیق کرتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہر پیغمبر اپنے سے پہلے ہونے والے پیغمبروں کی تصدیق فرماتے ہیں چنانچہ صحیفے حضرت داؤد علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام وغیرہم پر اترے اور جو کتابیں ''زبور''، ''تورات'' اور ''انجیل'' اتریں قرآن مجید ان سب کی تصدیق کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان تمام صحیفوں اور کتابوں کو حق کے ساتھ اتارا ہے۔

اس آخری کتاب کی دوسری صفت یہ ہے کہ یہ تمام گذرے ہوئی کتابوں کی نگران، محافظ، امین اور نگہبان ہے، قرآن کریم اس لحاظ سے بھی ''مُهَيْمِنْ'' ہے کہ یہ تمام آسمانی کتابوں کی اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہونے کی تصدیق کرتا ہے اس کے علاوہ جو مضامین تمام پہلی کتابوں میں اترے، اللہ تعالیٰ نے نہ صرف ان کا خلاصہ قرآن کریم میں بیان فرمادیا ہے بلکہ ان کے علاوہ بھی ہزاروں مضامین اس میں موجود ہیں، اس لحاظ سے یہ پہلی کتابوں کی محافظ ہے، قرآن کریم بہت زیادہ موٹی کتاب تو نہیں ہے مگر یہ ایسی مکمل کتاب ہے جس میں تمام علم سما گئے ہیں، تمام دینی علم کا ذخیرہ قرآن کریم میں موجود ہے مگر عام لوگوں کے ذہن اس تک نہیں پہنچتے۔

آیت کے اس حصہ میں قرآن کریم کی سچائی کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کی بددیانتی اور خیانت کا ذکر بھی کیا ہے کہ اہل کتاب قرآن کریم کے ذریعے فیصلے کروانے کے بجائے اپنی خواہش کے مطابق فیصلہ کروانا چاہتے ہیں، اب جب کہ قرآن کریم کا دور ہے تو سب کا فرض ہے کہ اسی کی پیروی کریں اسی لئے اللہ تعالیٰ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرمایا کہ آپ اسی کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ فرمائیں۔

آزمائش

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّ مِنْهَاجًا ؕ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ

واسطے ہر ایک کے کیا ہم نے میں سے تم الگ دستور اور الگ راستہ اور اگر چاہتے اللہ

لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ لٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ

توالبتہ کر دیتے تم کو امت ایک اور لیکن یہ اس لئے کہ آزمائیں تم کو اس میں جو دیا تم کو

فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ

پس دوڑ کرلو بہتری کی باتیں طرف اللہ کے ہے لوٹنا تمہارا سب کا پس خبر دیں گے تم کو

بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۴۸﴾

ساتھ اسکے جو تھے تم میں اس اختلاف کرتے (۴۸)

بامحاورہ ترجمہ:۔تم میں سے ہر ایک کو ہم نے الگ الگ دستور اور راستہ دیا اور اگر اللہ چاہتے تو تم کو ایک دین پر کر دیتے اور لیکن وہ تم کو اپنے دیئے ہوئے حکموں میں آزمانا چاہتے ہیں سو تم خوبیوں کو دوڑ کر لو تم سب کو اللہ کے پاس پہنچنا ہے وہ تم کو جتادیں گے وہ سب باتیں جن میں تم اختلاف کرتے تھے۔(۴۸)

لفظی تحقیق: شِرْعَةً: قانون۔ ''شرع اور شریعت'' اسی لفظ کی دوسری شکلیں ہیں ان سب کے معنٰی ایک ہیں دین کا مقرر کیا ہوا قانون۔ مِنْهَاجٌ: راستہ۔ ''نَهْجٌ'' سے ہے، جس کے معنٰی طرز اور طریقہ کے ہیں اس کیلئے دوسرا لفظ مذہب یا طریقہ ہے، شریعت کا ایک خاص راستہ۔

فائدہ: دین، شرع، مذہب یہ تینوں لفظ تقریباً ایک ہی معنٰی میں عام طور پر استعمال ہوتے ہیں لیکن اصل میں ''دین'' ایک وسیع چیز ہے، اس کے جاری کرنے کیلئے جو پیغمبر مقرر کریں وہ ''شرع'' ہے جس کو دینی قانون کہنا چاہئے، سمجھ دار لوگ اس شرع میں غور وفکر کر کے خاص خاص فیصلے کرتے ہیں ان کا مجموعہ ''مذہب'' ہوتا ہے اور اسی کو ''فقہ'' بھی کہہ دیتے ہیں۔

تفسیر

ہم نے دنیا میں انسان کو جس طرح چاہے رہنے سہنے کا اختیار دے دیا ہے اس نے اپنے آپ کو فرقہ بندی

میں مبتلا کرلیا ہے اور ہر فرقہ نے اپنے لئے الگ الگ راستے اور قانون بنا لئے ہیں اور ہم نے ان کو مہلت دی ہے کیونکہ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ان میں سے کون ہے جو سیدھا راستہ اختیار کرتا ہے۔

ارشاد ہے کہ ہم چاہتے تو سب کو اسی ایک راستہ پر قائم کر دیتے لیکن آزمائش کیلئے الگ الگ راستوں کو بھی رہنے دیا پھر بھی سیدھے راستے کی ایک خاص علامت مقرر کر دی ہے اور وہ یہ کہ اس میں ساری فائدہ مند باتیں انسانوں کیلئے جمع کر دی ہیں اس لئے اگر تم سیدھے راستہ پر آنا چاہتے ہو تو انسان کیلئے جو فائدہ مند باتیں ہیں ان کی طرف لپکو، یہ دنیا ایک امتحان کی جگہ ہے اس کے بعد تم سب اللہ تعالیٰ کے پاس جا کر جمع ہو گے اور وہ تمہارے ان سب راستوں کی حقیقت اور اس کا انجام ظاہر کر دیں گے، قرآن کریم اس سیدھے راستے کا بتانے والا ہے اور مسلمان امت اپنے عمل کے ذریعہ دنیا کے سامنے اسے پیش کرنے کیلئے مقرر ہے۔

بنیادی دین تو تمام پیغمبروں کا ایک ہی رہا ہے تاہم شریعت مختلف پیغمبروں کیلئے مختلف تھی، ''سورۂ شوریٰ'' میں موجود ہے کہ تمہارے لئے بھی اللہ تعالیٰ نے دین کے اصول وہی مقرر فرمائے ہیں جو حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کیلئے مقرر فرمائے تھے تاہم ہر ایک کی شریعت جدا جدا تھی۔

اللہ تعالیٰ نے شریعتوں کے مختلف ہونے کی حکمت بھی بیان فرمائی ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتے تو تمہیں ایک ہی امت بنا دیتے، یعنی: پوری انسانی نسل کیلئے ایک ہی شریعت مقرر فرما دیتے مگر یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت اور مرضی کے خلاف ہے، زمانے اور جگہوں کا بدلنا انسانی زندگی پر گہرے اثرات ڈالتا ہے، ان کے فرائض اور ضروریات مختلف ہوتی ہیں، لہٰذا ہر مقام اور ہر زمانے کیلئے ایک جیسے حکم اتارنا فطرت کے خلاف ہے، کسی ایک انسانی زندگی پر بھی مختلف دور گزرتے ہیں اس کے بچپن کے حالات اور اس کی ضروریات اس کی جوانی کی عمر سے مختلف ہوتی ہیں اکثر غذائیں صحت میں مفید ہوتی ہیں مگر بیماری میں وہی چیزیں نقصان دہ ثابت ہوتی ہیں اسی طرح مختلف دور کے مختلف قوموں کے حالات بھی مختلف ہوتے ہیں اور ان کی ذمہ داریاں اور ضرورتیں بھی مختلف ہوتی ہیں چنانچہ تمام انسانی تقاضوں کے مکمل کرنے کیلئے مختلف زمانوں اور مختلف قوموں کیلئے اللہ تعالیٰ نے علیحدہ علیحدہ شریعتیں اتاریں۔

اگر اللہ تعالیٰ چاہیں تو تمام لوگوں کو ایک ہی شریعت کا پابند کردیں مگر وہ ایسا نہیں کرتے بلکہ شریعت کے مختلف ہونے سے اللہ تعالیٰ یہ چاہتے ہیں کہ تمہیں اس چیز میں آزمائیں جو اس نے تمہیں دی ہیں، اللہ تعالیٰ شریعت کے مختلف حکم دے کر آزمائش کرنا چاہتے ہیں کہ کیا اس کے بندے انہیں قبول کرنے کیلئے تیار ہیں یا نہیں، اللہ تعالیٰ انسانوں کو موقع دیتے ہیں اور پھر دیکھتے ہیں کہ اس کے حکموں پر کون عمل کرتا ہے۔

جب یہ بات ہے تو نیکیوں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کریں اور شریعت کے ہر حکم پر عمل کرنے کیلئے تیار رہیں، آخرت کی منزلیں پار کرنے کیلئے نیکی کو بنیادی حیثیت حاصل ہے، بالآخر سب کو اللہ تعالیٰ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے، پھر وہ تمام چیزیں تمہارے سامنے رکھ دیں گے جن میں تم اختلاف کرتے تھے، وہاں پر حق و باطل کا فیصلہ ہو جائے گا۔

شریعتوں کے مختلف ہونے کی حکمت

شریعتوں کے مختلف ہونے میں یہ ایک بڑی حکمت ہے جس کے ذریعے ہر زمانہ، ہر طبقہ کے لوگوں کو صحیح عبادت و بندگی کی حقیقت سے آگاہ کیا جاتا ہے کہ حقیقت میں عبادت نام ہے بندگی اور فرمانبرداری کا، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج یا ذکر و تلاوت کا مقصد صرف ایک اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت ہے، یہی وجہ ہے کہ جن وقتوں میں نماز سے منع کیا گیا ہے ان میں نماز کوئی ثواب کا کام نہیں بلکہ الٹا گناہ کا کام ہے، عید کے دنوں میں روزہ رکھنا منع ہے تو اس وقت روزہ رکھنا گناہ ہے، نویں ذی الحجہ کے علاوہ کسی دن کسی مہینہ میں عرفات کے میدان میں جمع ہو کر دعا و عبادت کرنا ثواب کا کام نہیں جبکہ نویں ذی الحجہ میں سب سے بڑی عبادت یہی ہے، اسی طرح تمام دوسری عبادت کا حال ہے جب تک ان کے کرنے کا حکم ہے تو وہ عبادت ہیں اور جب اور جس حد پر ان کو روک دیا جائے تو وہ بھی حرام و ناجائز ہو جاتی ہیں، عوام اس حقیقت سے آگاہ نہیں ہوتے جو عبادت ان کی عادت بن جاتی ہیں بلکہ جن قومی رسموں کو وہ عبادت سمجھ کر اختیار کر لیتے ہیں خدا و پیغمبر کے حکموں کو بھی ان کے پیچھے نظر انداز

کر دیتے ہیں یہیں سے بدعتیں دین کا حصہ بن جاتی ہیں جو پچھلی شریعتوں اور کتابوں کے ردوبدل کا سبب بنیں، اللہ تعالیٰ نے مختلف پیغمبروں پر مختلف کتابیں اور شریعتیں اتار کر انسانوں کو یہی سکھایا ہے کہ کسی ایک عمل یا ایک عبادت کی قسم کو زندگی کا مقصد نہ بنالیں بلکہ صحیح معنیٰ میں اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار بندے بنیں اور جس وقت پچھلے عمل کو چھوڑ دینے کا حکم ہو فوراً چھوڑ دیں اور جس عمل کے کرنے کا حکم ہو فوراً اس پر عمل کریں۔

اس کے علاوہ شریعت کے مختلف ہونے کی ایک بڑی حکمت یہ بھی ہے کہ دنیا کے ہر دور اور ہر طبقہ کے انسانوں کے مزاج اور طبیعتیں مختلف ہوتی ہیں زمانہ کا اختلاف انسانی طبیعت پر بہت زیادہ اثر ڈالتا ہے، اگر سب کو ایک جیسے حکم دے دیتے تو انسان بڑی مشکل میں مبتلا ہو جاتے، اس لئے اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضہ یہ ہوا کہ ہر زمانہ اور ہر مزاج کے جذبات کی رعایت رکھ کر حکموں میں مناسب تبدیلی کی جائے، کسی حکم کو منسوخ (Cancel) کرنے کے یہ معنیٰ نہیں ہوتے کہ حکم دینے والے کو پہلے حالات معلوم نہ تھے تو ایک حکم دے دیا پھر نئے حالات سامنے آئے تو اس کو منسوخ کر دیا یا پہلے غفلت اور غلطی سے کوئی حکم دے دیا تھا، پھر غلطی کا پتہ چلا تو بدل دیا، بلکہ کسی حکم کو منسوخ کر کے دوسرا حکم دینے کی مثال بالکل ایک حکیم یا ڈاکٹر کے نسخہ کی مثال ہے کہ جس میں دوائیں درجہ بدرجہ بدل جاتی ہیں کہ حکیم یا ڈاکٹر کو پہلے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ تین روز اس دوا کا استعمال کرنے کے بعد مریض کی یہ حالت ہو گی اس وقت فلاں دوا دی جائے گی جب وہ پچھلا نسخہ منسوخ کر کے دوسرا دیتا ہے تو یہ کہنا صحیح نہیں ہوتا کہ پچھلا نسخہ غلط تھا اس لئے منسوخ کیا گیا بلکہ حقیقت یہ ہوتی ہے کہ پچھلے دنوں میں وہی نسخہ صحیح اور ضروری تھا اور بعد کے حالات میں یہی دوسرا نسخہ صحیح اور ضروری ہے۔

انصاف

وَ اَنِ احۡکُمۡ بَیۡنَہُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ وَ لَا تَتَّبِعۡ اَہۡوَآءَہُمۡ

اور یہ کہ فیصلہ کیجئے درمیان ان کے ساتھ اسکے جو اتارا اللہ نے اور نہ پیچھے چلئے خواہشوں ان کی کے

وَ احْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ
اور بچئے ان سے کہ بہکا دیں وہ آپ کو کسی ایسی بات سے جو اتاری اللہ نے

اِلَيْكَ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ اَنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّصِيْبَهُمْ
آپ کیطرف پس اگر پیٹھ پھیرلیں تو جان لیجئے کہ یہی ارادہ ہے اللہ کا کہ پہنچائے سزا ان کو

بِبَعْضِ ذُنُوْبِهِمْ ؕ
ساتھ بعض گناہوں کی ان کے

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور حکم ہے اللہ کا ان میں اس کے مطابق فیصلہ کیجئے جو اللہ نے اتارا اور ان کی خواہشوں پر نہ چلئے اور ان سے بچتے رہئے کہ کہیں آپ کو کسی ایسے حکم سے نہ بہکا دیں جو اللہ نے آپ کی طرف اتارا، پھر اگر نہ مانیں تو جان لیجئے کہ! اللہ نے یہی چاہا ہے کہ ان کو ان کے گناہوں کی کچھ سزا پہنچائیں۔

لفظی تحقیق: يَّفْتِنُوْكَ: بہکا دیں آپ کو۔ "فِتْنَةٌ" سے ہے، جس کے معنیٰ ہیں بہکا کر غلط راستہ پر ڈال دینا، مراد یہ ہے کہ: ان کی اس بات سے بچئے کہ وہ آپ کو بہکا کر غلط راستہ پر ڈال دیں۔

تفسیر

اے پیغمبر! آپ کو حکم دیا جاتا ہے کہ اگر اہل کتاب آپ کے پاس اپنا جھگڑا فیصلہ کیلئے لائیں تو آپ ان کی خواہشوں کے مطابق فیصلہ نہ کریں بلکہ اس کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف اتارا ہے، یہ لوگ بڑے چالاک ہیں اس بات کیلئے بڑی بڑی رشوتیں پیش کریں گے منت خوشامد کریں گے کہ کسی طرح آپ ان کے بہکاوے میں آ کر ان کی مرضی کے مطابق فیصلہ کر دیں اور وہ آپ کے ذمہ بوجھ ڈال کر اپنی خواہشوں کو پورا کریں۔

حقیقت میں یہ انہوں نے بڑی رشوت پیش کی تھی کہ اگر آپ ہمیں اس جھگڑے میں جتا دیں تو ہم سب

اسلام قبول کرلیں گے، کوئی لیڈر مشکل ہی سے اس کو نامنظور کرسکتا ہے جب کہ ذرا سی دیر میں اس کی جماعت کی قوت اتنی بڑھ سکتی ہے جو اس کے وہم و گمان سے کہیں زیادہ ہو، یہ پیغمبر ہی کا کام ہے کہ عدل و انصاف کا خیال رکھے، چاہے اس کی جماعت کتنی ہی گھٹ جائے۔

حق واضح ہوجانے کے باوجود اگر کوئی شخص ہٹ دھرمی اور ضد پر قائم رہتا ہے تو پھر وہ رحم کے قابل نہیں ہے، اسے لازماً سزا ملنی چاہئے، یہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک سزا ہے کہ انسان کا عقیدہ خراب ہوجائے، نیکی کی توفیق چھین لی جائے اور برائی میں مبتلا کردیا جائے، لہٰذا انسان کو ہر وقت محتاط رہنا چاہئے اور دعا کرنی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ فتنے اور گمراہی سے محفوظ رکھیں، انسان بعض ایسی غلطیاں کرتا ہے جن کا اسے احساس تک نہیں ہوتا مگر ان کے نتیجے اسی زندگی میں نکلنا شروع ہوجاتے ہیں اور اسی دنیا میں سزا ملنے لگتی ہے، لہٰذا اگر یہ لوگ اپنی ضد پر اڑے ہوئے ہیں اور حق کو قبول کرنے سے مسلسل انکاری ہیں تو سمجھ لیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو سزا دینا چاہتے ہیں۔

دین سے دور بھاگنا

وَ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوْنَ ﴿۴۹﴾ اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ

اور بیشک بہت سے آدمیوں میں البتہ نافرمان ہیں (۴۹) کیا پس حکم جاہلیت کا

يَبْغُوْنَ ۭ وَ مَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۵۰﴾ ع ۱۱

تلاش کرتے ہیں اور کون ہے بہتر سے اللہ حکم کرنے میں واسطے ان لوگوں کے جو یقین رکھتے ہیں (۵۰)

بامحاورہ ترجمہ: ۔اور اس میں شک نہیں کہ لوگوں میں نافرمان بہت ہیں۔ (۴۹) پس کیا جاہلیت کے زمانے کا حکم چاہتے ہیں اور یقین کرنے والوں کیلئے اللہ سے بہتر حکم کرنے والا کون ہے؟ (۵۰)

لفظی تحقیق: فٰسِقُوْنَ: نافرمان۔ "فَاسِقٌ" کی جمع ہے، جو "فِسْقٌ" سے بنا ہے، "فِسْقٌ" کے

معنٰی ہیں: حکم نہ ماننا، قانون کی پرواہ نہ کرنا، شاید ہماری زبان میں ایسے ہی لوگوں کو بدمعاش کہتے ہیں اور ان میں بھی درجے ہیں کوئی کم بدمعاش ہے کوئی زیادہ، بعض چھپے ہوئے ہیں بعض کھلم کھلا۔ جَاهِلِيَّةٌ: اس زمانے کو کہتے ہیں جس میں دین کو نہ مانا جاتا تھا اور لوگ اپنی قوت کے بل بوتے پر کمزوروں کو دبانا اپنا حق سمجھتے تھے، جاہلیت کے اصل معنٰی نادانی کے ہیں، اور اسے "جَهْلٌ" یعنی: جہالت بھی کہتے ہیں، فرق یہ ہے کہ جاہلیت اسے کہتے ہیں جس میں قانون کا نہیں بلکہ اپنی خواہشوں کی پیروی کا دور دورہ ہو، اسلام سے پہلے ایسا ہی زمانہ تھا اس لئے اس کو جاہلیت کا زمانہ یا صرف جاہلیت کہتے ہیں۔

تفسیر

ارشاد ہے کہ حقیقت میں اکثر لوگ ایسے ہیں کہ ہر قسم کی پابندیوں سے آزاد رہنا چاہتے ہیں ان کی دلی خواہش یہ ہے کہ کوئی ان کو روکنے ٹوکنے والا نہ ہو اور وہ جو جی چاہے کریں اور اپنا جتھا قائم کر کے اوروں کو اپنا غلام بنا کر رکھیں تاکہ دنیا میں بے کھٹکے گلچھرے اڑائیں اور کوئی ان کے سامنے بات تک نہ کر سکے، یہ لوگ گو شکل وصورت میں انسان ہیں لیکن اصل میں وہ جانور ہیں، وہی جانوروں کی سی آزادی اور وہی جنگل کا قانون، جس کی لاٹھی اس کی بھینس چاہتے ہیں۔

ان سے کہئے کہ یہ تو اس زمانے میں تھا جب انسان اپنی خواہشوں میں گرفتار ہو کر سب قاعدے قانون بھول چکے تھے اور اپنی اصلیت یعنی انسانیت سے بہت دور جا پڑے تھے، تاریخ جاننے والے جانتے ہیں کہ اسلام سے پہلے دو بڑی سلطنتوں "ایران" اور "روم" کی حالت کیا تھی، زبردستوں نے کمزوروں کو دبا رکھا تھا گویا زبردست شیر تھے اور کمزور بھیڑ بکری وغیرہ تھے، حکومت کرنے والے اپنی رعایا سے غلاموں کی طرح کام لیتے تھے بلکہ جانوروں کی طرح ان سے اپنی گاڑیاں تک کھنچواتے تھے۔

ارشاد ہے کہ ان سے پوچھو کہ اسی جاہلیت کے زمانے کی سی حالت کیا آج کل بھی چاہتے ہو، آج کل رات کا سا اندھیرا نہیں ہے دن کی روشنی ظاہر ہو چکی ہے، اللہ تعالیٰ کے قانون اس کے پیغمبر نے سب بتا دیئے

ہیں اور ظاہر بات ہے کہ ایمان ویقین رکھنے والوں کیلئے اللہ تعالیٰ کے حکم سے بڑھ کر کسی کا حکم نہیں ہوسکتا اگر یہ بے ایمان اور یقین سے دور لوگ کسی اور کا یا اپنی خواہشوں کا حکم ماننا چاہتے ہیں تو وہ بہت جلد اپنے کیے کو بھگتیں گے۔

لوگوں کی اکثریت نافرمان ہے وہ اللہ تعالیٰ کے حکموں کو تسلیم کرنے اور ان پر عمل کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں، اللہ تعالیٰ کے نافرمان ہر دور میں زیادہ رہے ہیں، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے بابرکت زمانہ میں بھی یہی حال تھا اور اس کے بعد بھی مسلسل اکثریت بے دینوں کی ہے، آج بھی دنیا کی کل پانچ ارب کی آبادی میں سے چار ارب سے زیادہ لوگ کفر، شرک اور گمراہی میں مبتلا ہیں، پانچویں حصے کے لوگ ہدایت یافتہ ہونے کے دعویدار ہیں ان میں بھی بہت سی خرابیاں پائی جاتی ہیں بالکل صحیح اعتقاد رکھنے والے اور اللہ تعالیٰ کے حکموں کو پورا کرنے والے بہت کم ہیں ان میں اکثریت نافرمانوں اور ناشکر گزاروں کی ہے، ''سورۂ مؤمن'' میں موجود ہے کہ اکثر لوگ ناشکر گزار ہی ہوتے ہیں اسی طرح ''سورۂ سبا'' میں بھی آتا ہے کی میرے شکر گزار بندے بہت کم تعداد میں ہیں بہر حال اللہ تعالیٰ نے یہاں پر یہودیوں اور عیسائیوں کی سازش کو واضح کر کے ان کی برائی بیان فرمائی ہے، یہ جو فرمایا گیا کہ کیا جاہلیت کے زمانے کا فیصلہ چاہتے ہو؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ جاہلیت کا قانون تو یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کے حکموں کو پیٹھ پیچھے پھینک کر اپنی مرضی کا فیصلہ کیا جائے تو اب جب کہ قرآن کریم اتر چکا ہے اسلام کی روشنی پھیل چکی ہے تو اب واپس اندھیروں کی طرف جانا چاہتے ہو تو یہ تو بہت ہی بری بات ہے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے کہ: تین شخص اللہ تعالیٰ کے غضب کے مستحق ہیں: پہلا شخص وہ ہے جو پاک خطے (حرم) میں بے دینی کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی سخت ترین ناراضگی کو دعوت دیتا ہے، دوسرا شخص وہ ہے جو اسلام میں جاہلیت کے دستور کی پیروی کرتا ہے اور تیسرا شخص وہ ہے جو بے گناہ کا خون بہاتا ہے، ناحق خون کرنے کی کوشش کرتا ہے، اس کے حق میں گواہی دیتا ہے، ناحق شکایت کرتا ہے کہ اس کا خون بہے، یہودیوں کا بھی یہی حال ہے نہ وہ اپنی کتاب کے فیصلے کو تسلیم کرتے ہیں اور نہ ہی وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح فیصلہ چاہتے ہیں بلکہ اسلام کے روشن زمانے میں بھی جاہلیت کے تاریکی والے فیصلے کے خواہشمند ہیں۔

خودغرضوں سے بچو

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَ النَّصٰرٰۤى
اے لوگو جو ایمان لائے ہو مت بناؤ یہودیوں اور نصاریٰ (عیسائیوں) کو

اَوْلِيَآءَ ؔ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ وَ مَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ
گہرے دوست بعض ان میں سے دوست ہیں دوسرے کے اور جو کوئی دوستی کرے ان سے میں سے تم

وقف لازم
وقف منزل عند البعض
وقف غفران

فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۱﴾
پس یقیناوہ میں سے ہے انہی بیشک اللہ نہیں ہدایت کرتے ان لوگوں کو جو ظالم ہیں (۵۱)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اے مسلمانو! یہودیوں اور عیسائیوں کو دوست مت بناؤ، وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں اور تم میں سے جو کوئی ان سے دوستی کرے تو وہ انجام کے اعتبار سے انہی میں سے ہے، اور اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں کرتے ۔(۵۱)

لفظی تحقیق: اَوْلِيَآءَ: دوست۔ "وَلِيٌّ" کی جمع ہے، "وَلِيٌّ" کے معنٰی ہیں گہرا دوست، قریبی، طرفدار، مددگار، خیرخواہ، رازدار۔

تفسیر

اس آیت میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ یہودیوں وعیسائیوں سے گہری دوستی نہ کریں جیسا کہ عام غیر مسلموں کا اور یہودیوں وعیسائیوں کا خود یہی دستور ہے کہ وہ گہری دوستی کو صرف اپنی قوم کیلئے مخصوص رکھتے ہیں، مسلمانوں سے یہ معاملہ نہیں کرتے، پھر اگر کسی مسلمان نے اس کی خلاف ورزی کر کے کسی یہودی یا عیسائی سے گہری دوستی کر لی تو وہ اسلام کی نظر میں بجائے مسلمان کے اسی کافر قوم میں شمار ہونے کے قابل ہے۔

شان نزول

امام تفسیر ابن جریر عکرمہ رضی اللہ عنہ کی روایت بیان فرماتے ہیں کہ یہ آیت ایک خاص واقعہ میں اتری ہے وہ یہ کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ طیبہ میں تشریف فرما ہونے کے بعد مدینہ کے اردگرد رہنے والے یہودیوں سے ایک معاہدہ اس پر کرلیا تھا کہ وہ مسلمانوں کے خلاف نہ خود جنگ کریں گے نہ کسی جنگ کرنے والی قوم کی مدد کریں گے، بلکہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر اس کا مقابلہ کریں گے اسی طرح مسلمان نہ ان لوگوں سے جنگ کریں گے نہ ان کے خلاف کسی قوم کی مدد کریں گے بلکہ مخالف کا مقابلہ کریں گے کچھ عرصہ تک یہ معاہدہ دونوں جانب سے قائم رہا لیکن یہودی اپنی سازشی فطرت اور اسلام دشمن طبیعت کی وجہ سے اس معاہدہ پر زیادہ قائم نہ رہ سکے اور مسلمانوں کے خلاف مکہ کے مشرکوں سے سازش کر کے ان کو اپنے قلعہ میں بلانے کیلئے خط لکھ دیا، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جب اس سازش کا پتا چلا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے مقابلہ کیلئے ایک دستہ مجاہدین کا بھیج دیا، بنو قریظہ کے یہ یہودی ایک طرف تو مکہ کے مشرکین سے یہ سازش کر رہے تھے اور دوسری طرف مسلمانوں میں گھسے ہوئے بہت سے مسلمانوں سے دوستی کے معاہدے کئے ہوئے تھے اور اس طرح مسلمانوں کے خلاف مشرکوں کیلئے جاسوسی کا کام دیتے تھے اس لئے یہ آیت اتری جس نے مسلمانوں کو یہودیوں وعیسائیوں کی گہری دوستی سے روک دیا تاکہ مسلمانوں کی خاص خبریں معلوم نہ کرسکیں اس وقت بعض صحابہ کرام حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ وغیرہ نے تو کھلے طور پر ان لوگوں سے اپنا معاہدہ ختم اور دوستی چھوڑنے کا اعلان کردیا اور بعض لوگ جو منافقانہ طور پر مسلمانوں سے ملے ہوئے تھے یا ابھی ایمان ان کے دلوں میں رچا نہیں تھا ان لوگوں سے تعلق توڑ دینے میں یہ خطرہ محسوس کرتے تھے کہ ممکن ہے کہ مشرکوں و یہودیوں کی سازش کامیاب ہوجائے اور مسلمان مغلوب ہوجائیں تو ہمیں ان لوگوں سے بھی ایسا معاملہ رکھنا چاہئے کہ اس وقت ہمارے لئے مصیبت نہ ہوجائے، عبداللہ بن ابی بن سلول نے اسی بناء پر کہا کہ ان لوگوں سے تعلق توڑنے میں تو مجھے خطرہ ہے اس لئے ایسا نہیں کرسکتا اس پر اگلی آیت اتری۔

اللہ تعالیٰ نے بعض حکموں کا ذکر فرمایا ہے جن کے تحت کافروں سے میل ملاپ، تجارت اور دوسرے لین دین جائز ہے ظاہری طور پر خوش اخلاقی اور اچھا طریقہ اختیار کیا جاسکتا ہے مگر دلی دوستی نہ اہل کتاب سے ہوسکتی ہے نہ منافقوں سے اور نہ کافروں سے، جو غیر مسلم قومیں مسلمانوں سے جنگ کرنے پر تیار ہوں ان سے ظاہری میل ملاپ کی بھی اجازت نہیں، ''سورۂ ممتحنہ'' میں یہ مسئلہ بیان ہوا ہے کہ جو کافر مسلمانوں سے نہیں لڑتے اور نہ ہی ان کی مخالفت کرتے ہیں ان کے ساتھ اچھے برتاؤ کی اجازت ہے، اسی سورۃ میں پہلے گزر چکا ہے کہ انصاف کے معاملہ میں سب برابر ہیں اپنا ہو یا غیر سب کے ساتھ انصاف کرو، کیونکہ ناانصافی دشمن کے ساتھ بھی جائز نہیں، البتہ جو شخص اللہ تعالیٰ اور پیغمبر پر ایمان رکھتا ہے اور قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ کا آخری پیغام سمجھتا ہے اس کیلئے کافروں کے ساتھ دلی دوستی کی اجازت ہرگز نہیں ہے، البتہ ہر اپنے اور بیگانے کے ساتھ کیے گئے عہد و پیمان کا پورا کرنا ضروری ہے اس کے علاوہ کافروں سے صلح کی اجازت بھی دی گئی ہے، یعنی اگر وہ صلح کی طرف مائل ہوں تو ان سے صلح کرلیں اور جو لوگ مسلمانوں سے لڑائی نہیں کرتے ان کے ساتھ اچھے اخلاق اور رواداری سے پیش آنے کی اجازت ہے ان کے ساتھ نیکی کا برتاؤ کروگے تو اس سے بھی اسلام کو فائدہ پہنچ سکتا ہے، ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص مسلمانوں کے اچھے برتاؤ کو دیکھ کر ایمان لے آئے، البتہ پکی دوستی کسی بھی صورت میں جائز نہیں ہے، کوئی یہودی ہو یا عیسائی، مجوسی ہو یا دہریہ، ہندو ہو یا سکھ اس کا دوستانہ مسلمانوں کے ساتھ ممکن نہیں ہے کیونکہ دونوں فریقوں کی منزل جدا جدا ہے، دوستی کیلئے کوئی بنیاد ہونی چاہئے مگر یہ بنیاد موجود نہیں، ایک فریق اللہ تعالیٰ کا فرمانبردار ہے اور دوسرا غیر اللہ کا پجاری، دونوں کے نظریوں میں زمین آسمان کا فرق ہے، لہٰذا دلی دوستی ممکن نہیں۔

''سورۂ آل عمران'' میں گزر چکا ہے کہ اگر کسی مقام پر مسلمان مجبور ہوجائیں کافر اس قدر غالب ہوں کہ مسلمانوں میں اپنے بچاؤ کی قوت بھی نہیں ہے تو ظاہری طور پر کافروں سے دوستی ظاہر کرنا بھی جائز ہے ان سے بچاؤ کیلئے وقتی طور پر ایسا کیا جاسکتا ہے، ایک روایت میں آتا ہے کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے اپنا کاتب (سکریٹری) کسی یہودی یا عیسائی کو رکھ لیا تو جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خبر ہوئی تو آپ نے سخت ڈانٹ پلائی اور

کہا کہ خدا کے بندے! تمہیں کوئی مسلمان کاتب (سکریٹری) نہیں ملا، کاتب تو رازداں ہوتے ہیں اس لئے غیر مسلم کو ایسی ذمہ داری نہیں سونپی جاسکتی۔

جو غیروں سے دوستی کرے گا وہ انجام کے اعتبار سے انہی میں سے ہوگا، جو شخص جس قوم کا فلسفہ اختیار کرے گا، جن کے نظریات اپنائے گا انہی کے سانچے میں ڈھل جائے گا، آج پوری مسلم دنیا کی حالت یہ ہوچکی ہے کہ انہیں خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کا فلسفہ پسند نہیں، وہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ، امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا فلسفہ پڑھنے کیلئے تیار نہیں نہ انہیں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ کے فلسفہ سے کچھ تعلق ہے، بلکہ وہ تو کانٹ، فرائیڈ اور ہیگل کا فلسفہ پڑھنا پسند کرتے ہیں، یہودیوں وعیسائیوں کے فلسفے اور دہریوں کے نظریوں کو اپنانے والے قرآن کریم کے پروگرام کو کیسے پاسکتے ہیں؟ جو قوم اپنے قومی نظریہ کو چھوڑ دیتی ہے وہ اپنے مرکز سے علیحدہ ہوجاتی ہے پھر وہ جس قوم کے نظریوں کا مطالعہ کرتی ہے اسی میں مل جاتی ہے، آج مسلمان قوم اس طرف جارہی ہے اس کی مرکزیت انگریز نے ختم کردی ہے یہ مسلمان ملکوں کو آپس میں لڑوا کر ان کی جڑیں کھوکھلی کررہے ہیں مگر مسلمان غفلت کی نیند سورہے ہیں، ایران، عراق جنگ یہودیوں کی سازش ہے دونوں طرف مسلمان کمزور ہورہے ہیں اور غیر قومیں ان میں مداخلت کررہی ہیں، امریکہ اور روس ایک طرف اپنا اسلحہ فروخت کررہے ہیں اور دوسری طرف مسلماقوں کو کمزور کرنے کے پروگرام پر عمل پیرا ہیں مزید ستم یہ کہ ہمارے حکمرانوں کے ذریعے جہاد کو دہشت گردی کا نام دے کر اس پر بھی پابندی عائد کردی ہے یہاں تک کہ جہاد کے نام لیوا کو بھی دہشت گرد کا نام دے کر طرح طرح کی تکلیفیں دی جاتی ہیں، ان سے دوستانہ کرنے کا یہی نتیجہ ممکن ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان کو دوست نہ بناؤ جو ایسا کرے گا انہی جیسا ہوجائے گا۔

اللہ تعالیٰ ظالموں کی رہنمائی نہیں فرماتے، عیسائی کافر اور مشرک ہونے کی وجہ سے ظالم ہیں مگر مسلمان ان کے ساتھ دوستانہ کرکے اپنی حیثیت کو بھول چکے ہیں، یہودیوں وعیسائیوں کی سازشوں کا سلسلہ اس سورۃ میں ابھی مزید بیان ہوگا۔

کافروں کی طرف جھکاؤ

فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ

پس دیکھیں گے آپ انہیں کہ میں دلوں ان کے بیماری ہے دوڑ کر گھستے ہیں میں ان کہتے ہیں

نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ ۭ فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ

ہم ڈرتے ہیں کہ پہنچے ہم کو چکر پس قریب ہے اللہ کہ آئے ساتھ فتح کے یا کسی حکم کے

مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰي مَآ اَسَرُّوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ ۝۵۲

سے پاس اپنے پس ہو جائیں وہ اوپر اسکے کہ چھپایا انہوں نے میں دلوں اپنے پچھتانے والے(۵۲)

بامحاورہ ترجمہ:۔اب آپ انہیں دیکھیں گے جن کے دل میں بیماری ہے یہ کہ دوڑ کر ان میں ملتے ہیں کہتے ہیں ہمیں ڈر ہے کہ ہم پر زمانے کا چکر نہ پڑ جائے، سو قریب ہے کہ اللہ جلد فتح ظاہر فرمادیں یا اپنے پاس سے کوئی حکم اتار دیں تو وہ اپنے دلوں میں چھپائی ہوئی باتوں پر شرمندہ ہوں۔(۵۲)

لفظی تحقیق: مَرَضٌ: بیماری۔یہاں اس سے مراد اپنے نفع کی محبت، لالچ، دنیاوی فائدوں کا خیال، خودغرضی ہے۔یُّسَارِعُوْنَ: "سُرْعَةٌ" سے بنا ہے، سرعت کے معنٰی ہیں جلد "مُسَارَعَةٌ" کے معنٰی ہیں کسی طرف دوڑ کر جانا۔دَآئِرَةٌ: مصیبت۔"دَوْرٌ" سے ہے، جس کے معنٰی ہیں گھومنا، چکر لگانا۔

تفسیر

بعض لوگ خود مسلمانوں میں ایسے تھے کہ ان کو مسلمانوں کی نئی اٹھنے والی جماعت پر بھروسہ نہ تھا ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ایسی پرانی جمی ہوئی قوموں پر کیسے غالب آ جائیں گے؟ یہ لوگ وہی مدینہ کے منافق جو کہ بظاہر مسلمان بنے ہوئے تھے جن کا سردار عبداللہ بن ابی تھا یہ ہمیشہ اس توقع میں رہتا تھا کہ مسلمانوں پر جلد کوئی

مصیبت پڑنے والی ہے۔

آیت میں ارشاد ہے کہ ایسے لوگ دل کے مریض ہیں ان پر دنیاوی شان وشوکت کا رعب چھایا ہوا ہے یہ اللہ تعالیٰ کی شان سے واقف نہیں، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو اور ان کے ساتھیوں کو بے حیثیت سمجھتے ہیں، ایمان کے پاس سے ہو کر بھی نہیں گزرے، کہتے ہیں مسلمانوں پر بھروسہ کوئی عقلمندی کی بات نہیں عقلمندی یہی ہے کہ مصیبت کے وقت کا سہارا یہودیوں کو بنایا جائے چنانچہ ان میں دوڑ دوڑ کر گھستے ہیں۔

آیت میں ارشاد ہے کہ بہت جلد اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ان پر فتح اور غلبہ دینے والے ہیں اور کیا عجب ہے کہ اس سے بھی بڑھ کر کوئی بات ظاہر کر دیں اس وقت یہ پچھتائیں گے۔

عبداللہ بن ابی کے اس جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ خواہ مخواہ زمانے کی گردش سے خوف کھا رہے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو غلبہ عطا فرمائیں گے اور مسلمانوں کی پے در پے کامیابیوں کو دیکھ کر ان کے تمام منصوبے ناکام ہو جائیں گے اور وہ شرمندہ ہو کر رہ جائیں گے اور ہوا بھی ایسا ہی کہ اللہ تعالیٰ نے مکہ والوں کو مغلوب فرمادیا اور مدینے کے یہودی ذلیل وخوار ہو کر رہ گئے ان میں سے کچھ جلاوطن کر دیئے گئے، یعنی: ان کیلئے مدینہ میں رہنے کی کوئی جگہ نہ رہی۔

منافقوں کا انجام

وَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ

اور کہتے ہیں وہ لوگ جو ایمان لائے کیا یہ وہی ہیں جو قسم کھاتے تھے ساتھ اللہ کے پکی

اَيْمَانِهِمْ ۙ اِنَّهُمْ لَمَعَكُمْ ؕ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿۵۳﴾

قسمیں اپنی کہ وہ بیشک ساتھ تمہارے ہیں ضائع ہو گئے عمل ان کے پس ہو گئے وہ نقصان اٹھانے والے (۵۳)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور مسلمان کہیں گے کیا یہ وہی لوگ ہیں جو تاکید سے قسمیں کھاتے تھے اللہ کی کہ ہم

تمہارے ساتھ ہیں ان کے عمل برباد ہو گئے پھر وہ نقصان میں رہ گئے۔ (۵۳)

لفظی تحقیق: جَهْدَ: بس، طاقت، کوشش کی انتہاء۔ اَیْمَانٌ: "یَمِیْنٌ" کی جمع ہے، جس کے معنیٰ قسم کے ہیں۔ جَهْدَ اَیْمَانِهِمْ: اپنی بس اور طاقت کی انتہاء تک پکی اور مضبوط قسمیں۔ حَبِطَتْ: برباد ہو گئے۔ "حَبْطٌ" سے ہے، جس کے معنیٰ ہیں بیکار ہو جانا، برباد ہو جانا، اکارت ہو جانا، مراد یہ ہے کہ کسی کام کے نہ رہے۔

تفسیر

یہ پچھلی آیت کے مضمون کا بقیہ ہے کہ یہ منافق جن کا اسلام صرف زبان تک کا ہی ہے دل میں نہ انہیں اللہ تعالیٰ پر یقین ہے نہ مسلمانوں کے پنپنے کی امید ہے دل کے مریض ہیں اور مرض وہی ہے جس میں یہودی و عیسائی اور سارے کافر مبتلا ہیں یعنی خود غرضی اور صرف اپنے فائدہ کا خیال اور ظاہری دنیاوی طاقت پر بھروسہ؛ اس لئے یہ سوا اس کے اور کچھ اپنے بچاؤ اور حفاظت کی صورت نہیں دیکھتے کہ یہودیوں سے دوستانہ گانٹھیں اور صاف صاف کہہ دیں کہ ہمیں تو یہ مسلمان مٹتے نظر آتے ہیں، بھلا ان کی کیا مجال کہ ایسے طاقتور، عزت والے اور مال دار لوگوں کے مقابلہ میں بازی لے جائیں، ان پر آج نہیں تو کل کوئی زبردست مصیبت آ کر رہے گی اس لئے اگر ہم بھی انہی کے ساتھ ملے رہے تو ظاہر ہے کہ ہماری بھی ان کے ساتھ بری گت بنے گی؛ اس لئے انہوں نے یہ طرز عمل اختیار کیا ہے کہ ظاہر میں وہ مسلمانوں کے ساتھ رہیں اور ان کو قسمیں کھا کھا کر یقین دلاتے رہیں کہ بھلا ہم تمہیں چھوڑ کر کہاں جائیں گے ہم تو پوری طرح تمہارے ساتھ ہیں مسلمانوں کو یہ یقین دلاتے ہیں لیکن ان کے دل میں پختہ یقین ہے کہ ان پر مصیبت آنے والی ہے اور اس سے صرف وہی لوگ بچیں گے جو یہودیوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھیں گے۔

آگے چل کر ان کے سب خیالات بالکل غلط ثابت ہوئے، کافروں اور یہودیوں نے مسلمانوں سے شکست کھائی اور سوا بھاگنے کے اور کچھ ان سے نہ بن پڑا، خیالات، منصوبے اور تدبیریں سب دھرے کے

دھرے رہ گئے اور سوا نقصان اور پچھتاوے کے ان کے پلے کچھ نہ پڑا۔

اس آیت کی مزید تشریح اس طرح بیان فرمائی کہ جب منافقوں کی منافقت کا پردہ چاک ہوگا اور ان کی دوستی کے دعووں اور قسموں کی حقیقت کھلے گی تو مسلمان حیرت میں رہ جائیں گے اور کہیں گے کہ کیا یہ وہی ہیں جو ہم سے اللہ تعالیٰ کی قسمیں کھا کر دوستی کا دعویٰ کرتے تھے اور آج ان کا یہ حشر ہوا کہ ان کے سب اسلامی عمل جو صرف دکھاوے کیلئے کیا کرتے تھے ضائع ہو گئے اور اللہ جل شانہٗ نے ان آیتوں میں جو مکہ کی فتح اور منافقوں کی رسوائی کا ذکر فرمایا ہے وہ چند روز کے بعد سب نے آنکھوں سے دیکھ لیا۔

اِسلام انسانی مذہب ہے

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جو پھرے گا میں سے تم سے دین اپنے تو عنقریب

يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَ يُحِبُّوْنَهٗۤ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ

لائیں گے اللہ ایسی قوم محبت کرتے ہیں وہ جس سے اور محبت کرتے ہیں وہ اس سے نرم دل ہیں اوپر مسلمانوں کے

اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۫ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ لَا

زبردست ہیں اوپر کافروں کے لڑتے ہیں میں راستے اللہ کے اور نہیں

يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ؕ

ڈرتے ملامت سے، کسی ملامت کرنے والے کی

بامحاورہ ترجمہ:۔ اے مسلمانو! تم میں جو کوئی اپنے دین سے پھرے گا تو اللہ عنقریب ایسی قوم کو لائیں گے کہ اللہ ان کو چاہتے ہیں اور وہ اس کو چاہتے ہیں مسلمانوں پر نرم دل ہیں کافروں پر سخت ہیں اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں اور کسی کی الزام تراشی سے نہیں ڈرتے۔

لفظی تحقیق: اِرْتِدَادْ: پھر جانا۔ "رَدٌّ" سے ہے "رَدٌّ" کے معنٰی ہیں واپس کرنا، لوٹا دینا، "اِرْتِدَادْ" کے معنٰی ہیں واپس ہوجانا، لوٹ جانا، ایسا آدمی جو اسلام قبول کر کے پھر کفر کی طرف لوٹ جائے اسے مرتد کہتے ہیں۔ اَذِلَّةٍ: "ذَلِیْلٌ" کی جمع ہے جو "ذِلَّةٌ" سے بنا ہے، "ذِلَّةٌ" کے معنٰی ہیں نرمی، ڈھیلا پن، دوسرے کے آگے جھکنا۔ اَعِزَّةٍ: "عَزِیْزٌ" کی جمع ہے جو "عِزَّتْ" سے بنا ہے "عِزَّتْ" کے معنٰی ہیں سختی، دوسرے سے اکڑنا۔ لَوْمَةَ: طعن و تشنیع، برا کہنا: "لَائِمْ" اسی سے بنا ہے، جس کے معنٰی ہیں برائی کرنے والا، طعنے دینے والا۔

تفسیر

اس آیت میں صاف صاف کہہ دیا گیا ہے کہ یہ مت سمجھنا کہ اسلام دنیا میں رہنے کیلئے تمہارا محتاج ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ تم اچھی زندگی بسر کرنے کیلئے اسلام کے محتاج ہو، اگر تم میں سے کوئی اسلام کو چھوڑ دے گا تو وہ اسلام کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا، اللہ تعالیٰ کو منظور یہ ہے کہ دنیا میں اسلام باقی رہے اور وہ اس کو قائم رکھیں گے تم چھوڑ دو گے تو کیا ہے تم جیسے نکمے لوگوں کے بدلے اللہ تعالیٰ کوئی اور کام کی قوم کھڑی کر دیں گے جس کو وہ پسند فرماتے ہوں گے اور وہ بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ خلوص و محبت رکھتے ہوں گے، وہ اپنے ساتھی مسلمانوں کے ساتھ نرمی اور مہربانی سے پیش آئیں گے کافروں کے ساتھ جو انسانیت کے دشمن ہیں بڑے سخت ہوں گے کسی برا کہنے والے، طعنے دینے والے اور دل توڑنے کی باتیں کرنے والے سے خوف نہ کریں گے، اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کریں گے۔

اکثر مفسروں نے فرمایا ہے کہ یہ آیت حقیقت میں آنے والے فتنہ کی پیشین گوئی اور اس کا ہمت کے ساتھ مقابلہ کر کے کامیاب ہونے والی جماعت کیلئے خوشخبری ہے، وہ آنے والا فتنہ دین سے پھر جانے کا فتنہ ہے جس کے کچھ جراثیم تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے بالکل آخر زمانہ میں پھیلنے لگے تھے اور پھر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد عام ہو کر پورے جزیرۂ عرب میں اس کا طوفان کھڑا ہو گیا اور خوشخبری پانے والی وہ جماعت صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین

کی ہے جس نے مسلمانوں کے پہلے خلیفہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ مل کر اس فتنہ کا مقابلہ کیا۔

واقعے یہ تھے کہ سب سے پہلے تو مسیلمہ کذّاب نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ پیغمبری میں شریک ہونے کا دعویٰ کیا اور یہاں تک جرأت کی کہ آپ کے قاصدوں کو یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ اگر قاصدوں اور سفیروں کو قتل نہیں کیا جاتا تو میں تمہیں قتل کر دیتا، مسیلمہ اپنے دعویٰ میں جھوٹا تھا پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس کے خلاف جہاد کا موقعہ نہیں ملا یہاں تک کہ وفات ہوگئی۔

اسی طرح یمن میں قبیلہ مذحج کے سردار اسود عنسی نے اپنی پیغمبری کا اعلان کر دیا، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی طرف سے مقرر کئے ہوئے یمن کے حاکم کو اس کا مقابلہ کرنے کا حکم دے دیا مگر جس رات میں اس کو قتل کیا گیا اس کے اگلے دن ہی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات ہوگئی، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین تک اس کی خبر ربیع الاول کے آخر میں پہنچی، اسی طرح کا واقعہ قبیلہ بنو اسد میں پیش آیا کہ ان کا سردار طلیحہ بن خویلد نے پیغمبر ہونے کا دعویٰ کر دیا۔

یہ تین قبیلوں کی جماعتیں تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مرض وفات ہی میں مرتد ہو چکی تھیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کی خبر نے اس فتنہ کو ایک طوفانی شکل میں منتقل کر دیا عرب کے سات قبیلے مختلف مقاموں پر اسلام اور اس کی حکومت سے انکاری ہوگئے اور وقت کے خلیفہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اسلامی قانون کے مطابق زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کر دیا۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد ملک وملت کی ذمہ داری مسلمانوں کے پہلے خلیفہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر عائد ہوئی، ایک طرف ان حضرات پر اس بڑے حادثہ کا جان لیوا صدمہ اور دوسری طرف یہ فتنوں اور بغاوتوں کے سیلاب، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد جو صدمہ میرے والد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر پڑا اگر وہ مضبوط پہاڑوں پر بھی پڑ جاتا تو وہ ریزہ ریزہ ہو جاتے مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو ثابت قدمی کا وہ اعلیٰ مقام عطا فرمایا تھا کہ تمام آفتوں اور مصیبتوں کا پوری ہمت کے ساتھ مقابلہ کیا اور بالآخر کامیاب ہوئے۔

بغاوتوں کا مقابلہ ظاہر ہے کہ طاقت استعمال کر کے ہی کیا جا سکتا ہے مگر حالات کی نزاکت اس حد کو پہنچ گئی

تھی کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے مشورہ فرمایا تو کسی کی رائے نہ ہوئی کہ اس وقت بغاوتوں کے مقابلہ میں کوئی سخت قدم اٹھایا جائے، خطرہ یہ تھا کہ حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین اگر اندرونی جنگ میں مشغول ہوجائیں تو بیرونی طاقتیں اس نئی اسلامی حکومت پر دوڑ پڑیں گی لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے صدیق کے دل کو اس جہاد کیلئے مضبوط فرمادیا اور آپ نے ایک ایسی مؤثر تقریر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے سامنے فرمائی کہ اس جہاد کیلئے ان کو بھی دلی اطمینان ہوگیا، اس تقریر میں اپنے پختہ ارادے کو ان الفاظ میں بیان فرمایا کہ:

''جو لوگ مسلمان ہونے کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے دیئے ہوئے حکموں اور اسلام کے حکم کا انکار کریں تو میرا فرض ہے کہ میں ان کے خلاف جہاد کروں، اگر میرے مقابلہ پر تمام جنات وانسان اور دنیا کے درخت و پتھر سب کو جمع کرلائیں اور کوئی میرا ساتھی نہ ہو تب بھی میں تنہا اپنی گردن سے اس جہاد کو انجام دوں گا''۔

اور یہ فرماکر گھوڑے پر سوار ہوئے اور چلنے لگے اس وقت صحابہ کرام آگے آئے اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو اپنی جگہ بٹھا کر مختلف محاذوں پر مختلف حضرات کی روانگی کا نقشہ بن گیا۔

فَسَوْفَ يَأْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَ يُحِبُّوْنَهٗ: اگر تم میں سے کوئی شخص اسلام کو چھوڑ دے تو اس سے دین کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا بلکہ اللہ تعالیٰ اپنے دین کی تائید وحفاظت اس طرح فرمائیں گے کہ وہ تمہاری جگہ ایسی قوم کو لے آئیں گے جن سے وہ محبت کرتے ہوں گے اور وہ لوگ اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہوں گے جیسا کہ پہلے گزرا، پھر آگے ان لوگوں کی نشانیاں بھی بیان فرمائی ہیں، یہ لوگ مسلمانوں کے سامنے نرم ہوں گے اگر کسی معاملہ میں اختلاف بھی ہوا تو آسانی سے قابو میں آجائیں گے، جھگڑا چھوڑ دیں گے اگرچہ وہ اپنے جھگڑے میں حق بجانب بھی ہوں جیسا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ: میں اس شخص کو جنت کے بیچ میں گھر دلوانے کی ذمہ داری لیتا ہوں جو حق پر ہونے کے باوجود جھگڑا چھوڑ دے، تو حاصل اس لفظ کا یہ ہوا کہ یہ لوگ مسلمانوں سے اپنے حقوق اور معاملات میں کوئی جھگڑا نہ رکھیں گے، اس آیت میں ایک جملہ ''اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ'' ہے اور مراد اس کی یہ ہے کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے دین کے مخالفوں کے مقابلہ میں سخت اور طاقتور ہیں اور وہ ان پر

قابو نہ پاسکیں گے اور دونوں جملوں کو ملانے کا حاصل یہ نکل آیا کہ یہ ایک ایسی قوم ہوگی جس کی دوستی، دشمنی اپنی ذات اور ذاتی حقوق و معاملات کے بجائے صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر اور اس کے دین کی خاطر ہوگی تو ان کی لڑائی کا رُخ اللہ تعالیٰ اور پیغمبر کے فرمانبرداروں کی طرف نہیں بلکہ اس کے دشمنوں اور نافرمانوں کی طرف ہوگا، تیسری نشانی اس جماعت کی یہ بیان فرمائی کہ یہ لوگ دینِ حق کو بڑھانے، پھیلانے اور برتری کیلئے جہاد کرتے رہیں گے، چوتھی نشانی یہ بتلائی گئی کہ دین کو قائم کرنے اور اللہ تعالیٰ کے دین کو اونچا کرنے کی کوشش میں یہ لوگ کسی ملامت کی پرواہ نہ کریں گے، غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ کسی تحریک کو چلانے والے کی راہ میں دو قسم کی چیزیں رکاوٹ بنا کرتی ہیں ایک مخالف قوت کا زور، دوسرے اپنوں کے لعن طعن اور ملامت، اور تجربہ گواہ ہے کہ جو لوگ تحریک چلانے کیلئے عزم لے کر کھڑے ہوتے ہیں اور اکثر حالات میں مخالفوں سے تو نہیں دبتے، قید ہونے کو یا ان سے زخم کھانے کو تو برداشت کر لیتے ہیں لیکن اپنوں کے طعنوں سے بڑے بڑے باہمت لوگوں کے قدم لڑکھڑا جاتے ہیں، شاید اسی لئے حق تعالیٰ نے اس جگہ اس کی اہمیت جتلانے کیلئے اس پر اکتفاء فرمایا کہ یہ لوگ کسی کی ملامت کی پروا کئے بغیر اپنا جہاد جاری رکھتے ہیں۔

انسان اپنے نفس کی ہدایت کو خوب پہچانتا ہے ملامت کرنے والوں کی ملامت اسے معمولی چیز معلوم ہوتی ہے اور وہ کچھ بھی پرواہ نہیں کرتا، غرضیکہ اگر کوئی شخص صاف نیت سے دین کا کام کرتا ہے تو کسی کا طعنہ و ملامت اس پر کچھ اثر نہیں کرتا وہ اپنے کام میں مگن رہتا ہے، اگر کوئی شخص پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی سنت پر عمل کرتا ہے اور لوگ اسے مذاق کا نشانہ بناتے ہیں اس کو ملامت کرتے ہیں تو وہ ان چیزوں سے لاپروا ہو کر سنت پر عمل جاری رکھتا ہے اسی چیز کو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے چاہنے والوں کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ وہ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی کچھ پرواہ نہیں کرتے، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے نصیحت فرمائی کہ میں اللہ تعالیٰ اور اس کے دین کے معاملہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا خوف نہ کھاؤں اور اپنی بات پر قائم رہوں۔

آخر آیت میں یہ بھی بتلا دیا کہ یہ صفات اور اچھی عادتیں اللہ تعالیٰ ہی کے انعام ہیں وہی جس کو چاہتے ہیں

عطا فرماتے ہیں، انسان اللہ تعالیٰ کے فضل کے بغیر صرف اپنی کوشش سے ان کو حاصل نہیں کرسکتا۔

اللہ والے ہی غالب ہیں

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۵۴﴾

یہ فضل ہے اللہ کا دیتے ہیں وہ اسے جسے چاہتے ہیں اور اللہ کشائش والے خبردار ہیں (۵۴)

اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ

بات یہی ہے کہ دوست تمہارا اللہ ہے اور پیغمبر اس کا اور وہ جو ایمان لائے جو قائم کرتے ہیں

الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ ﴿۵۵﴾ وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ

نماز اور دیتے ہیں زکوٰۃ اور وہ عاجزی کرنے والے ہیں (۵۵) اور جو دوست رکھے گا اللہ کو

ع ۸/۶ ۱۲ وَ رَسُوْلَهٗ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۵۶﴾

اور پیغمبر اس کے کو اور ان کو جو ایمان لائے پس تحقیق گروہ اللہ کا وہی زبردست ہے (۵۶)

بامحاورہ ترجمہ: ۔ یہ اللہ کا فضل ہے جس کو چاہیں دیں گے اور اللہ کشائش والے خبردار ہیں۔ (۵۴) تمہارے رفیق تو اللہ ہی ہیں اور اس کے پیغمبر، اور ایمان والے ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور وہ عاجزی کرنے والے ہیں۔ (۵۵) جو اللہ کو اور اس کے پیغمبر کو اور ایمان والوں کو دوست رکھے گا تو اللہ ہی کی جماعت سب پر غالب ہے۔ (۵۶)

لفظی تحقیق: رٰكِعُوْنَ: "رَاكِعٌ" کی جمع ہے، اس کا مادہ "رُكُوْعٌ" ہے، اس کے معنیٰ ہیں سر جھکانا، عاجزی کا اظہار کرنا۔ حِزْبَ اللّٰهِ: گروہ، فریق، مددگاروں کی جماعت: "حِزْبَ اللّٰهِ" سے مراد ہے اللہ تعالیٰ کا گروہ، یعنی: اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار بندوں کی جماعت ہے۔

تفسیر

اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے جس پر چاہیں کریں جس سے چاہیں اسلام کی سربلندی کا کام لیں اس کی رحمت تنگ اور محدود نہیں ہے اور وہ ہر ایک کی قابلیتوں سے خوب واقف ہیں، یاد رکھو! تمہارے اصلی دوست اور مددگار اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر اور ایمان والے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوتے ہیں، نماز ادا کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں یہی لوگ اللہ تعالیٰ کے مددگار اور اللہ تعالیٰ کی جماعت ہیں، یاد رکھو! اللہ تعالیٰ کی جماعت اور اس کے مددگار ہی سب پر غالب آکر رہیں گے۔

جو لوگ اللہ تعالیٰ کے دین کے معاملہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا خوف نہیں کھاتے ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا فضل ہے وہ جسے چاہیں عطا کردیں، عقیدے کی پختگی، اللہ تعالیٰ سے محبت، ایمان والوں کیلئے نرمی، کافروں کیلئے سختی، اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد اور ملامت کرنے والوں سے لاپرواہی، یہ سب اللہ تعالیٰ کے فضل میں داخل ہیں، اللہ تعالیٰ وسعت والے اور سب کچھ جاننے والے ہیں وہ ہر شخص کی صلاحیت کو جانتے ہیں اسی کے مطابق وہ عطا کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہی حقیقت میں دوست ہیں اور ایمان والے بھی تمہارے دوست ہیں، اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ دوستی اللہ تعالیٰ، اس کے پیغمبر اور مسلمانوں سے ہونی چاہئے اگر تم اس معیار پر پورے اترے تو اللہ تعالیٰ غلبے کی صورت بھی پیدا کردیں گے اور یہودی، عیسائی اور مرتد لوگ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے، تمہارا کام یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے تعلق قائم رکھو، اسی کے فرمانبردار بن جاؤ، خدا تعالیٰ کو اپنا کارساز اور مالک سمجھتے ہوئے تمام کام اسی کی مرضی کے مطابق انجام دو، اللہ تعالیٰ کے پیغمبر کے ساتھ محبت کرنا بھی ایمان کا حصہ ہے اور اس کی بہترین صورت یہ ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بتلائے ہوئے طریقہ کو اپنا لو اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کو زندہ رکھو اسی طرح اندرونی طور پر میل جول اور دوستی ایمان والوں کے ساتھ ہونی چاہئے، ان کے ساتھ اتحاد و اتفاق ہی

کے ذریعے دشمن کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے اگر ان کاموں کو انجام دیتے رہو گے تو دشمن کبھی غالب نہیں آسکتا، اگر تم مسلمان ہوگئے تو غلبہ تمہارا ہی ہوگا۔

اللہ تعالیٰ نے ان مسلمانوں کی صفات بیان فرمائی ہیں جن کی دوستی کی طرف رغبت دلائی گئی ہے، تمہارے دوست وہ ہونے چاہئیں جو نماز قائم کرتے ہیں، نماز اللہ تعالیٰ سے تعلق کا بہترین ذریعہ ہے، یہ اللہ تعالیٰ کا قرب دلانے والی عبادتوں میں سے بہترین عبادت ہے، تمہارے مسلمان دوست وہ ہوں جو زکوٰۃ ادا کرتے ہوں ظاہر ہے کہ زکوٰۃ کے دو فائدے ہیں اس کی وجہ سے انسان کے اندر سے حرص اور بخل کا مادہ نکل جاتا ہے، یعنی: انسان کو مہذب بنانے والی چیز یہی زکوٰۃ ہے، زکوٰۃ کا دوسرا بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس سے غریبوں اور مسکینوں کی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں یہ انسان کو پاکیزگی دلانے والی چیز ہے، نماز بدنی عبادت ہے اور زکوٰۃ مالی عبادت ہے۔

مسلمانوں کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ وہ رکوع کرنے والے ہیں، یہاں رکوع سے مراد صرف نماز والا رکوع نہیں بلکہ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کے ہر حکم کے آگے جھکنا ہے، بعض دوسرے مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یہاں پر رکوع کا خصوصی ذکر یہودیوں سے فرق کی وجہ سے ہے، یہودیوں کی نماز میں رکوع نہیں ہوتا اس لئے یہاں خاص طور پر فرمایا کہ ان کے ایمان لانے کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ وہ نماز میں رکوع کرنے لگیں، رکوع و سجدے دونوں رکن عاجزی کی علامت ہیں مگر رکوع کی نسبت سجدے میں اعلیٰ درجہ کی عاجزی پائی جاتی ہے۔

جو کوئی اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر کے ساتھ دوستانہ کرے گا اور ان سے دوستی کرے گا جن کی نشانیاں بیان ہوچکی ہیں، یعنی: جو اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر کی اطاعت کرتے ہیں اور پھر اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ ہمدردی اور خیر خواہی کا برتاؤ کرتے ہیں تو یہی اللہ تعالیٰ کی جماعت ہیں اور یہی غالب ہوں گے، آخر کامیابی انہی کے مقدر میں ہے، ''سورۂ مؤمن'' میں فرمایا ہے کہ: ہم اپنے پیغمبروں اور مسلمانوں کی دنیا میں بھی مدد کریں گے اور آخرت میں بھی، جب کہ مدد کی سب سے زیادہ ضرورت ہوگی اس طرح اللہ تعالیٰ کے

دوستوں کو دنیا و آخرت دونوں جہانوں میں کامیابی حاصل ہوگی، آخرت میں خاص طور پر ان کے حق میں گواہیاں ہوں گی ان کے درجے بلند ہوں گے اور وہ عذاب سے بچ جائیں گے، غرضیکہ اللہ تعالیٰ کی جماعت ہی غالب رہے گی۔

دین مذاق کی چیز نہیں

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! مت بناؤ تم انکو جنہوں نے ٹھہرایا دین تمہارے کو

هُزُوًا وَّ لَعِبًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ

ٹھٹھا اور کھیل سے جو دیئے گئے کتاب سے پہلے تم اور

الْكُفَّارَ اَوْلِيَآءَ ۚ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿٥٧﴾

کافروں کو دوست اور ڈرو اللہ سے اگر ہو تم مسلمان (۵۷)

بامحاورہ ترجمہ: ۔ اے مسلمانوں! ان لوگوں کو جو تمہارے دین کو ہنسی اور کھیل ٹھہراتے ہیں یعنی وہ لوگ جنہیں تم سے پہلے کتاب دی گئی ہے اور کافروں کو اپنا دوست مت بناؤ اور اللہ سے ڈرو اگر تم ایمان والے ہو۔ (۵۷)

تفسیر

پچھلے رکوع کی ابتدائی آیت میں حکم دیا گیا تھا کہ یہودیوں و عیسائیوں کو دوست نہ بناؤ، اس رکوع کے شروع میں بھی یہی حکم ہے لیکن کسی قدر فرق کے ساتھ اس میں حکم کی وجہ کی طرف زیادہ واضح اشارہ ہے اور دوسرے کافروں کو بھی اسی حکم میں شامل کیا گیا ہے کیونکہ دونوں کے برتاؤ کی جڑ ایک ہی ہے۔

ارشاد ہے کہ تم اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے ہو، اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا اس بات کا ایمان لانا ہے کہ تمام انسان

اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں، اس لئے تم کو ہدایت کی جاتی ہے کہ تم ان لوگوں سے جو یہودی اور عیسائی کہلاتے ہیں اور جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی ہے، دوستی کی امید نہ رکھو کیونکہ یہ تمہارے دین کی ہنسی اڑاتے ہیں اور تمہارے خیالات بیہودہ سمجھتے ہیں اور تمہارے زندگی کے طریقہ کو کھیل سے زیادہ کچھ نہیں قرار دیتے، ان کے دل میں یہ بیہودہ خیال بیٹھا ہوا ہے کہ ہم سب سے اچھے اور سب سے بڑھ کر ہیں اور سب کو ہم سے دب کر رہنا چاہئے، اب عقل سے سوچو کہ کیا تم میں اور ان میں گہرا میل ملاپ اور سچی دوستی ہو سکتی ہے، ہرگز نہیں! اس لئے تم اپنے ایمان پر قائم رہو اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے نہ ڈرو۔

اسی طرح اور کافر بھی ہیں کہ ایک دوسرے کو لوٹنا اور ان کو دبا کر غلام بنا کر رکھنا ان کا پرانا دستور ہے، انہیں بھی یہودیوں اور عیسائیوں کی طرح اسلام میں اپنی موت نظر آتی ہے، یہ کبھی تمہارے دوست نہیں ہو سکتے، یہاں سے معلوم ہوا کہ جو کافر تمہارے دین کی توہین کرتے ہیں ان کے ساتھ گہری دوستی نہیں ہو سکتی۔

اللہ تعالیٰ نے کافر و مشرک اور یہودیوں و عیسائیوں کے ساتھ دوستی نہ کرنے کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ وہ دین کے حکموں کا مذاق اڑاتے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی اس سے مراد یہودی اور عیسائی ہیں جنہیں عام معنوں میں اہل کتاب کہا جاتا ہے، ایمان والوں کے ایمان کا تقاضہ یہ ہے کہ دین کا مذاق اڑانے والوں کو ہرگز دوست نہ بنائیں۔

نماز کا مذاق اڑانا

وَ اِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّ لَعِبًا ؕ ذٰلِكَ

اور جب | پکارتے ہو تم | طرف | نماز کے | ٹھہراتے ہیں وہ اسکو | ہنسی | اور | کھیل | یہ

بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ ﴿۵۸﴾

اس وجہ سے کہ | قوم جو | نہیں | سمجھ رکھتے | (۵۸)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور جب تم نماز کیلئے پکارتے ہو تو وہ اس کو ہنسی اور کھیل ٹھہراتے ہیں یہ اس واسطے کہ یہ لوگ بے عقل ہیں۔(۵۸)

تفسیر

اس آیت میں ارشاد ہے کہ جب تم نماز کی طرف لوگوں کو پکارتے ہو یعنی اذان دیتے ہو تو یہ لوگ مذاق اڑاتے ہیں، ظاہر بات ہے کہ اذان میں کوئی ایسی بات نہیں جس کو مذاق بنایا جائے اس میں اللہ تعالیٰ کی بڑائی اور عظمت کا اظہار ہے اس کی توحید اور حقیقی خدا ہونے کا اقرار ہے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغمبر ہونے کا اقرار ہے، اذان کے کلموں میں اللہ تعالیٰ اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے برحق ہونے کا اقرار ہے اور سب کو نیکی اور بھلائی کی طرف دعوت دینے کے سوا اور کچھ نہیں، ایسی باتوں کی ہنسی اڑانے والا نادان اور بے وقوف کے سوا اور کون ہوسکتا ہے؟ یہی باتیں ہیں جن پر دھیان دینے سے دنیا میں امن وامان قائم ہوسکتا ہے اور انسان اپنی حالت کو سنوار سکتا ہے۔

اگر غور کیا جائے تو اذان میں تمام انسانوں کیلئے امن وامان کا اعلان ہے اور ان کی زندگی کا صحیح راستہ پورا پورا اس میں بتایا گیا ہے، اذان میں اس بات کی دعوت ہے کہ آؤ سب مل کر ایک ہی سچے خدا کے سامنے ایک دوسرے کے برابر کھڑے ہو جائیں اور مل کر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے راستہ پر چلیں، نہ کوئی کسی سے بڑا ہے نہ چھوٹا، اللہ تعالیٰ کے آگے سب برابر ہیں اور صرف وہی ایک سب سے بڑے ہیں، اسی کے آگے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو اسی کے آگے عاجزی سے جھکو اور اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اذان کے ساتھ مذاق کی خاص طور پر نشاندہی فرمائی ہے، حدیث شریف میں آتا ہے کہ مدینہ کے ایک عیسائی کو اذان سے بہت چڑ تھی، جس وقت مؤذن کہتا "اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّداً رَّسُوْلُ اللّٰهِ" تو وہ بدبخت بددعا کرتا "اَحْرَقَ اللّٰهُ الْكَاذِبَ" (جھوٹا جل جائے) جھوٹا تو وہ خود ہی تھا، اللہ تعالیٰ نے اس کی دعا اس طرح قبول کی کہ ایک دن اس کی لونڈی گھر میں آگ لائی اس کی چنگاری کسی چیز پر گر گئی جس سے سارے

مکان کو آگ لگ گئی اور وہ عیسائی وہیں جل کر راکھ ہو گیا، اللہ تعالیٰ نے اسے گستاخی کی سزا دے دی۔

اذان اللہ تعالیٰ کے دین کا شعار ہے یعنی دین کی خصوصی اور امتیازی بات ہے اس کے کلموں میں اللہ تعالیٰ کے ایک ہونے اور اس کی عظمت اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغمبر ہونے کا اقرار ہے، ایسی بے مثال عبادت کا مذاق اڑانا بہت بری بات ہے، ان کا یہ مذاق اڑانا اس وجہ سے ہے کہ یہ لوگ بے عقل ہیں یعنی آخرت کے بارے میں عقل نہیں رکھتے، یہ اچھے اور برے میں تمیز کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے، وگرنہ دنیا کا کوئی مذہب ایسا نہیں جو دین کے شعائر کی تعظیم نہ کرتا ہو، اذان، نماز، حج وغیرہ تو دین کے شعائر ہیں ان کی بے حرمتی تو احمق لوگ ہی کر سکتے ہیں دوسرے مقام پر فرمایا کہ: جو لوگ اللہ تعالیٰ کے شعائر کی تعظیم کرتے ہیں ان کے دل خدا ترسی سے پُر ہیں اور ظاہر ہے کہ جو مذاق اڑائے گا وہ خدا ترسی سے بالکل خالی ہوگا۔

بروں کو اچھے نہیں بھاتے

قُلْ يَاَهْلَ الْكِتٰبِ هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَآ

کہہ دیجئے اے کتاب والو! کیا بری لگتی ہے تم کو کوئی چیز ہم سے سوا اسکے کہ ایمان لائے ہم پر اللہ اور اس پر

اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ ۙ وَاَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۵۹﴾

جو اترا طرف ہماری اور جو اترا ہوا اس سے پہلے اور یہ کہ زیادہ تر تم میں نافرمان ہیں (۵۹)

بامحاورہ ترجمہ:۔ آپ کہہ دیجئے اے کتاب والو! تم کو ہم سے کیا ضد ہے مگر یہی کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس پر جو اترا ہماری طرف اور اس پر جو اس سے پہلے اترا اور یہی کہ تم میں اکثر نافرمان ہیں۔ (۵۹)

لفظی تحقیق: تَنْقِمُوْنَ: تم برا سمجھتے ہو۔ "نِقْمَتٌ" سے ہے، جس کے معنیٰ ہیں عیب نکالنا، برا سمجھنا، مراد یہ ہے کہ تم ہمارے اوپر جھنجھلاتے ہو، ظاہر ہے کہ کسی کی اچھائی کو برائی ٹھہرا کر اسے ستانا اور برا کہنا ضد ہی کی وجہ سے ہوتا ہے اس لئے "تَنْقِمُوْنَ" کا ترجمہ ضد کیا گیا ہے۔

تفسیر

اس آیت میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اور ان کے ذریعے مسلمانوں سے کہا گیا ہے کہ ان سے پوچھو تو سہی کہ ہم سے تمہیں ضد کیوں ہوگئی ہے؟ ہم نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی جس کی وجہ سے تم ہمارے دشمن ہو جاؤ، ہم میں جو نئی بات دیکھی جاسکتی جاتی ہے وہ اتنی ہی تو ہے کہ ہم نے اپنی بے جا خواہشوں کو چھوڑ کر صرف اللہ تعالیٰ کو اپنا معبود بنایا ہے، ہم اللہ تعالیٰ کو دل سے مانتے ہیں اور قرآن کریم کو سچا مانتے ہیں اور اسی طرح ان کتابوں کو بھی جو اس سے پہلے اتریں سچا مانتے ہیں قرآن شریف نے خود بھی ان کو سچا بتایا ہے اور پچھلی کتابوں کے اصلی حکموں کو جوں کا توں یا مناسب ردوبدل کے ساتھ باقی رکھا ہے، ہمارا کام ان حکموں کی اطاعت اور فرمانبرداری ہے اور تم میں نئی بات یہ دیکھی جاتی ہے کہ تم میں سے اکثر لوگ نافرمانی پر تل گئے ہیں اور خود اپنی کتابوں کے حکموں کے نہ ماننے پر کمر باندھ لی ہے، اگر ان حکموں کو مانتے تو قرآن کریم کا ماننا بھی ان کیلئے ضروری ہو جاتا ہے کیونکہ ان میں انہیں حکم دیا گیا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اور ان کی کتاب قرآن کریم کو سچا ماننا اور ان کے فرمان کے مطابق چلنا یہ دو باتیں ہیں جو ہمارے اندر اور تمہارے اندر کھلم کھلا نظر آ رہی ہیں یعنی ہمارے اندر اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری اور تمہارے اندر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی، تو کیا اچھی بات ہے کہ ہماری فرمانبرداری کو تم برا سمجھو اور اپنی نافرمانی کو اچھی بات سمجھو اور ہم سے دشمنی کرو؟ اگر تمہیں ہم سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی وجہ سے دشمنی نہیں تو پھر بتاؤ اور کون سی بات ہے جو تم میں اور ہم میں بگاڑ کا باعث ہے؟ اگر تم ہمیں ستاؤ گے تو تمام انصاف کرنے والے لوگ یہی کہیں گے کہ یہودی اور عیسائی مسلمانوں کو صرف اس لئے ناپسند کرتے ہیں کہ مسلمان صرف ایک خدا پر ایمان رکھتے ہیں۔

نفرت کے قابل باتیں

قُلْ	هَلْ	اُنَبِّئُكُمْ	بِشَرٍّ	مِّنْ	ذٰلِكَ	مَثُوْبَةً	عِنْدَ	اللّٰهِ ؕ
آپ کہہ دیجئے	کیا	خبر دوں میں تم کو	زیادہ برے کی	سے	ان میں	بہ لحاظ جزاء کے	نزدیک	اللہ کے

مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَ غَضِبَ عَلَيْهِ وَ جَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَ

وہی لعنت کی اس پر اللہ نے اور غضب کیا ان پر اور بنادیا میں سے ان بعض کو بندر اور

الْخَنَازِيْرَ وَ عَبَدَ الطَّاغُوْتَ ؕ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّ اَضَلُّ

خنزیر اور جس نے بندگی کی شیطان کی یہی لوگ بدتر ہیں درجہ کے لحاظ سے اور زیادہ گمراہ ہیں

عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ﴿٦٠﴾

سے سیدھے راستے (۶۰)

بامحاورہ ترجمہ: ۔آپ کہہ دیجئے کیا تم کو بتلاؤں ان میں سے اللہ کے ہاں کس کا برا بدلہ ہے، وہ وہی ہے جس پر اللہ نے لعنت کی اور اس پر غضب اتارا اور ان میں سے بعض کو بندر اور خنزیر بنادیا، اور جنہوں نے شیطان کی بندگی کی وہی لوگ بدتر درجہ کے ہیں اور سیدھی راہ سے بہت بھکے ہوئے ہیں۔ (۶۰)

لفظی تحقیق: مَثُوْبَةً: اس کے معنٰی جزا، یعنی بدلے کے ہیں، خواہ اچھی بات کا ہو یا بری بات کا، یہاں اس سے مراد بری بات کا بدلہ اور سزا ہے۔ اَلْخَنَازِيْرَ: "خِنْزِيْرٌ" کی جمع ہے۔

تفسیر

اس آیت میں پیغمبر ﷺ کو حکم ہورہا ہے کہ آپ کہہ دیجئے کہ کیا میں تمہیں بیوقوفوں اور فاسقوں سے بھی بدتر لوگوں کے متعلق نہ بتاؤں کہ وہ لوگ کون ہیں؟ اللہ تعالیٰ نے خود ہی ان کی عبرتناک سزاؤں کا ذکر کردیا ہے کہ ان میں سے بھی بدتر لوگ وہ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے لعنت کی اور غضب کیا اور ان میں سے بندر اور خنزیر بنادیے۔

اس آیت میں ارشاد ہے کہ یہودیوں سے کہہ دیجئے کہ اگر تم کہو تو ہم تم کو بتادیں کہ دونوں میں سے کون برا ہے اور کس کو سزا ملنی چاہئے، صاف صاف نام تو ہم کسی کا نہیں لیتے لیکن کچھ نشانیاں بتادیتے ہیں ہم دونوں میں سے

جس میں پائی جائیں وہی برا ہے اور سزا کا مستحق ہے۔

ارشاد ہے کہ ان سے کہہ دیجئے کہ ہم بتائے دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک برا اور برے بدلے کا مستحق وہ گروہ ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے لعنت کی اور جس پر اس نے اپنا غضب اتارا، جن میں سے پچھلے زمانے میں بعض کو بندر اور بعض کو سور بنا دیا، جس میں یہ باتیں پائی جائیں وہی انسانیت کے درجے سے گرا ہوا ہے وہی سیدھے راستے سے ہٹا ہوا ہے وہی قابل نفرت ہے اور اسی کو سزا ملنی چاہئے۔

یہودی خود بھی اور جو لوگ ان کی تاریخ سے واقف تھے وہ سب جانتے تھے کہ ساری باتیں انہی پر چسپاں ہوتی ہیں انہی پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہوئی انہی پر اللہ تعالیٰ کا غضب اترا، انہی میں سے بندر اور سور بنائے گئے اور انہی میں سے چند لوگوں نے شیطان کی بات مان کر بچھڑے کی پوجا کی، یہ سب ''سورۂ بقرہ'' میں گزر چکا ہے۔

یہودیوں کی دھوکہ بازی

وَ اِذَا جَآءُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَ قَدْ دَّخَلُوْا بِالْكُفْرِ وَ هُمْ

اور جب آتے ہیں پاس تمہارے تو کہتے ہیں ہم ایمان لائے اور حالانکہ داخل ہوئے ساتھ کفر کے اور وہ

قَدْ خَرَجُوْا بِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا يَكْتُمُوْنَ ﴿٦١﴾

یقینا نکلے بھی ساتھ اسکے اور اللہ خوب واقف ہیں ساتھ اسکے جو تھے وہ چھپاتے (۶۱)

بامحاورہ ترجمہ: ۔اور جب تمہارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں ہم ایمان لائے اور حالت یہ ہے کہ کافر ہی آئے تھے اور کافر ہی چلے گئے اور جو کچھ وہ چھپائے ہوئے تھے اللہ خوب جانتے ہیں۔ (۶۱)

تفسیر

ارشاد ہے کہ: یہودی اپنی شرارتوں سے باز نہیں آتے اور اپنے آپ کو گناہوں سے پاک سمجھتے رہتے

ہیں، اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار بندوں کے ساتھ بُرا برتاؤ کرتے ہیں اور ان میں طرح طرح کے عیب نکالتے ہیں حالانکہ ان میں اس کے سوا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کرتے ہیں اور کوئی عیب نہیں ہے اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے اور اچھے کام کرنے ہی کو عیب سمجھتے ہیں یہ کس قدر ڈھٹائی ہے، اس کے بعد کہا گیا تھا کہ مسلمانوں کے کاموں کی یہاں تک کہ اذان تک کی ہنسی اڑاتے ہیں۔

اس آیت میں ان ہنسی اڑانے والوں میں سے بعض آدمیوں کی ایک اور بری حرکت کا ذکر ہے کہ یہ لوگ جب اپنے لوگوں میں ہوتے ہیں جہاں مسلمان ان کے ساتھ نہیں ہوتے تو خوب مسلمانوں پر اور ان کے کاموں پر ہنستے ہیں اور ان کو نادان، بیوقوف اور جانے کیا کیا بتاتے ہیں لیکن جب مسلمانوں کے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے ہیں تو خوشامد کرنے لگتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم ایمان لا چکے ہیں، ارشاد ہے کہ اے مسلمانو! یہ دھوکے باز ہیں جب یہ تمہارے پاس آتے ہیں تو بیگناہوں کا سامنہ بنا کر کہتے ہیں کہ ہم ایمان والے ہیں اور تمہارے ساتھی ہیں لیکن یہ جھوٹے ہیں اور واقعہ کے خلاف اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتے ہیں ان کے دل کی ناپاکی میں ذرا فرق نہیں آتا، خواہ تمہارے پاس ہوں یا تم سے دور ہوں، دونوں حالتوں میں ان کے دل میں تمہاری حقارت اور دشمنی بھری ہوئی ہے، منہ سے تو کہتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں اور ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں، لیکن حال یہ ہے کہ جب تمہاری مجلس میں داخل ہوتے ہیں جب بھی کافر ہی ہوتے ہیں اور جب تمہارے پاس سے اٹھ کر چلنے لگتے ہیں اس وقت بھی کافر ہی ہوتے ہیں، جیسے آئے ویسے گئے اور کافر کے کافر ہی رہے، لیکن اس کفر کے دل میں چھپانے اور زبان سے ایمان کا اقرار کرنے سے کچھ حاصل نہیں، اللہ تعالیٰ کو ان کے دل کی چھپی ہوئی باتیں سب معلوم ہیں اور اس وقت بھی معلوم تھیں جب یہ تمہارے سامنے زبان سے ایمان کا اقرار کر رہے تھے، یہ سمجھتے تھے کہ ہم بظاہر مسلمانوں سے ملے رہیں گے اور اندر ہی اندر ان کی جڑ کاٹیں گے لیکن اللہ تعالیٰ نے جو سب کچھ جانتے ہیں ان کا راز فاش کر دیا۔

عالم برائی سے روکیں

وَ تَرٰی كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِى الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ وَ
اور دیکھیں گے آپ بہت میں سے ان دوڑتے ہیں میں گناہ اور دوسروں پر زیادتی کرنے میں اور

اَكْلِهِمُ السُّحْتَ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝﴿۶۲﴾ لَوْ لَا يَنْهٰهُمُ
کھانے میں حرام کے البتہ برا ہے جو ہیں وہ کرتے (۶۲) کیوں نہیں روکتے انکو

الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَ الْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَ اَكْلِهِمُ السُّحْتَ ؕ
اللہ والے اور پڑھے لکھے سے بولنے ان کے گناہ کی باتوں کو اور کھانے سے انکے حرام کو

لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ۝﴿۶۳﴾
البتہ برا ہے جو ہیں وہ بناتے (۶۳)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور ان میں سے بہت سوں کو آپ دیکھیں گے کہ گناہ، ظلم اور حرام کھانے کی طرف دوڑتے ہیں، بہت برے کام ہیں جو کر رہے ہیں۔ (۶۲) کیوں نہیں منع کرتے ان کے درویش اور عالم ان کو گناہ کی بات کہنے سے اور حرام کھانے سے، بہت برے عمل ہیں جو وہ کر رہے ہیں۔ (۶۳)

لفظی تحقیق: يَنْهٰى: روکتے۔ "نَهْیٌ" سے ہے، جس کے معنیٰ ہیں: روکنا، منع کرنا۔ الرَّبّٰنِيُّوْنَ: رب والے۔ "رَبَّانِیٌّ" کی جمع ہے، جو "رَب" کی طرف نسبت رکھتا ہے، رب والے، یعنی: اللہ والے، درویش، صوفی، پیر، مشائخ۔ الْاَحْبَارُ: پڑھے لکھے۔ "حِبْرٌ" کی جمع ہے، جس کے معنیٰ ہیں: عقل مند، دانشمند، جاننے والا، عالم۔

تفسیر

اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ارشاد فرمایا کہ: آپ دیکھتے ہیں کہ ان میں سے اکثر لوگ گناہوں

اور غنڈے پن کی طرف تیزی سے لپکتے ہیں وہ دوسروں کو ناحق ستاتے اور دباتے ہیں اور ضرورت مندوں کا کمایا ہوا مال زبردستی چھین کر کھا جاتے ہیں، کیونکہ ان کے ہاں سود کا عام رواج ہے اور وہ ضرورت مندوں ہی سے حاصل ہوسکتا ہے۔

ظاہر بات ہے کہ ضرورت مند کی ضرورت مندی سے ناجائز فائدہ اٹھانا انسانیت کے خلاف ہے اور اس طرح کمایا ہوا مال حرام ہے، ان کے عالم اور پڑھے لکھے لوگ اور جو اللہ والے ہیں ان کو کیوں نہیں منع کرتے کہ منہ سے بری بات نہ نکالیں اور حرام کی کمائی نہ کھائیں، اصل خرابی کی جڑ یہودیوں میں یہی تھی کہ مالدار جو چاہتے تھے کرتے تھے اور ان کے پیرو بزرگ اور عالم ان سے مال لے لے کر ان سے بھی زیادہ عیش اڑاتے تھے اور اس کے بدلے میں ان ہی کی فائدہ کی باتوں کو جائز قرار دیتے چلے جاتے تھے اسی وجہ سے ان کا دین خراب ہوا اور زندگی کے معنٰی صرف یہ رہ گئے کہ غریبوں پر ظلم کر کے اپنا پیٹ بھرو اور خوب عیش و عشرت کرو۔

یہودیوں کی گستاخی

وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ ۭ غُلَّتْ اَيْدِيْهِمْ وَ لُعِنُوْا

اور کہا یہودیوں نے ہاتھ اللہ کا بند ہے بندھوجاویں ہاتھ ان کے اور لعنت ہوان پر

بِمَا قَالُوْا ۘ بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ ۙ يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَآءُ ۭ

بوجاسکے جو کہا انہوں نے بلکہ دونوں ہاتھ اسکے کھلے ہوئے ہیں خرچ کرتا ہیں جس طرح چاہیں

وقف لازم

وَ لَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ

اور البتہ بڑھادیں ضرور بہت سوں کو میں سے ان یہ جو اتارا گیا ہے طرف آپکی طرف سے رب آپ کے کی

طُغْيَانًا وَّ كُفْرًا ۭ

سرکشی اور کفر میں

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور یہودی کہتے کہ اللہ کا ہاتھ بند ہوگیا ان کے ہاتھ بند ہو جائیں اور اس کہنے کی وجہ

سے ان پر لعنت ہو بلکہ اس کے تو دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں جس طرح چاہیں خرچ کرتے ہیں اور ان میں سے بہت سے شرارت اور انکار میں بڑھ جائیں گے اس کلام کی وجہ سے جو آپ پر آپ کے رب کی طرف سے اتارا گیا۔

لفظی تحقیق: مَغْلُوْلَةٌ: بند کیے گئے۔: "غُلٌّ" سے ہے، جس کے معنٰی باندھ دینے کے ہیں اس سے مراد یہ ہے کہ (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ بخیل ہیں۔ غُلَّتْ: بند کر دیے جائیں۔ یہ بھی "غُلٌّ" سے ہے، ان کیلئے بددعا ہے، مراد یہ ہے کہ انہی کے ہاتھ بند ہوں، یہ محاورہ کے مطابق ہے کہ جس سے ناراض ہوتے ہیں اسے بددعا دیتے ہیں، انسان کے کوسنے کا اثر ضروری نہیں اور اللہ تعالیٰ جو کہیں وہ فوراً ہو جاتا ہے۔ لُعِنُوْا: لعنت کیے جائیں۔ مراد یہ ہے کہ لعنت ہو ان پر، دونوں بددعاؤں کا اثر یہ ہے کہ یہودی بخیل بھی ہیں اور لعنتی بھی۔

تفسیر

یہودیوں کی عقل اس قدر ماری گئی تھی کہ اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی کے لفظ منہ سے نکالنے لگتے تھے، "سورۂ آل عمران" میں بھی ایسی ہی ان کی ایک بات بیان کی گئی تھی وہاں یہ تھا کہ ان سے جب کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال خرچ کرو، صدقہ دو، زکوٰۃ ادا کرو اور اس کو یوں سمجھو کہ اللہ تعالیٰ کو گویا قرض دے رہے ہو وہ تمہیں اس کے بدلے دوگنا تگنا دیں گے تو یہ ایسے منہ پھٹ ہیں کہ کہنے لگتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ (نعوذ باللہ) فقیر ہے اور ہم مالدار ہیں جبھی تو وہ ہم سے مال مانگتا ہے، یہاں یہ موقع ہے کہ مسلمانوں کو ترقی کرتے اور بڑھتے دیکھ کر اور اپنی حالت کو دن بدن گرتی دیکھ کر وہ بیہودہ باتیں کرنے لگتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ کے ہاتھ بندھ گئے ہیں اور وہ ہمیں دینے میں (نعوذ باللہ) بخل کرتا ہے، آیت میں ارشاد ہے کہ ایسی باتیں کر کے تم اللہ تعالیٰ کے غضب اور لعنت میں گرفتار ہوتے ہو، اصل میں بخیل تم ہی ہو، اللہ تعالیٰ کے تو دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں، تم اپنی کرتوتوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی لعنتیں سمیٹ رہے ہو۔

اللہ تعالیٰ کے ہاتھ تو ہمیشہ کھلے ہوئے ہیں اس کی سخاوت ہمیشہ سے ہے ہمیشہ رہے گی مگر جس طرح وہ غنی اور وسعت والے ہیں اسی طرح حکیم بھی ہیں حکمت کے ساتھ اس کے تقاضہ کے مطابق خرچ فرماتے ہیں جس پر

مناسب سمجھتے ہیں وسعت فرماتے ہیں اور جس پر مناسب سمجھتے ہیں تنگی اور تنگدستی مسلط فرما دیتے ہیں، ''سورہ رعد'' میں ہے کہ ''اَللّٰہُ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَاءُ وَیَقْدِرُ'' اللہ تعالیٰ جس کیلئے چاہیں اس کے رزق میں کشادگی فرما دیتے ہیں اور جس کیلئے چاہیں اس کے رزق میں تنگی فرما دیتے ہیں۔

فسادی مٹنے کے قابل ہیں

وَ اَلْقَیْنَا بَیْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ ؕ كُلَّمَاۤ
اور ڈال دی ہم نے درمیان انکے دشمنی اور بغض تک دن قیامت کے جب کبھی

اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ ۙ وَ یَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ
سلگاتے ہیں آگ لئےلڑائی کے بجھا دیتے ہیں اسکو اللہ اور دوڑتے ہیں میں زمین

فَسَادًا ؕ وَ اللّٰهُ لَا یُحِبُّ الْمُفْسِدِیْنَ ﴿۶۴﴾
فساد کرنے کو اور اللہ نہیں پسند کرتے فساد کرنے والوں کو (۶۴)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور ہم نے ان میں دشمنی اور بغض قیامت کے دن تک ڈال رکھا ہے جب کبھی لڑائی کے لئے آگ سلگاتے ہیں اللہ اس کو بجھا دیتے ہیں اور ملک میں فساد کرتے ہوئے دوڑتے ہیں اور اللہ فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔ (۶۴)

تفسیر

یہودیوں میں سے کچھ لوگ بظاہر چاپلوسی کی باتیں کرتے نظر آتے ہیں لیکن ان کے دل مسلمانوں سے کبھی صاف نہیں ہوتے ہر گھڑی نئی شرارت کرتے رہتے ہیں خود تو ستانے پر کمر باندھ رکھی ہے دوسروں کو بھی مسلمانوں سے جنگ پر اکساتے رہتے ہیں یہی حال عیسائیوں اور مشرکوں کا ہے۔

ارشاد ہے کہ یہ تو ہر وقت لڑائی کی دھن میں رہتے ہیں کہ مسلمانوں سے لڑیں لیکن اللہ تعالیٰ نے خود ان کے درمیان دشمنی اور پھوٹ ڈال دی ہے یہ لوگ قیامت تک آپس میں ایک دوسرے کے دشمن رہیں گے مسلمانوں کے خلاف ان کے منصوبے خاک میں مل جائیں گے، یہ جب کوئی فتنہ اٹھائیں گے اللہ تعالیٰ اس کو دبائیں گے جب کبھی لڑائی کی آگ بھڑکائیں گے اللہ تعالیٰ اس کو بجھائیں گے۔

ان لوگوں کا یہ مشغلہ رہ گیا ہے کہ دنیا میں فتنے پھیلاتے رہیں اور دنگا فساد مچاتے رہیں یہ نہیں چاہتے کہ لوگ امن و امان سے رہیں اور آپس میں صلح صفائی رکھیں لیکن اللہ تعالیٰ آپس میں لڑوانے والوں کو ذرا پسند نہیں فرماتے، اس لئے اس ناپسندیدگی کا اثر ان کو دنیا میں پریشان رکھے گا اور آخرت میں بھی یہ لوگ اس کی سخت سزا بھگتیں گے۔

اہل کتاب چوک گئے

وَ لَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَ اتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ

اور　اگر　یہ ہوتا　کہ اہل　کتاب　ایمان لاتے　اور　ڈرتے　البتہ دور کر دیتے ہم　سے ان

سَيِّاٰتِهِمْ وَ لَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿۶۵﴾ وَ لَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا

برائیاں ان کی　اور　البتہ داخل کر دیتے ہم انکو　باغوں میں　نعمت کے　(۶۵)　اور　اگر　وہ　قائم رکھتے

التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ وَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا

تورات　اور　انجیل کو　اور　جو　اتارا گیا　طرف ان کی　طرف سے　رب انکے کی　البتہ کھاتے وہ

مِنْ فَوْقِهِمْ وَ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ؕ مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ؕ

سے　اوپر اپنے　اور　سے　نیچے　پاؤں اپنے کے　میں سے ان　کچھ لوگ ہیں　اعتدال کے راستے پر

۹ ع ۱۰ ۱۳ وَ كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۶۶﴾

اور　بہت سے　میں سے ان　برا ہے　جو　کر رہے ہیں　(۶۶)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور اگر اہل کتاب ایمان لاتے اور ڈرتے تو ہم ان سے ان کی برائیاں دور کر دیتے اور ان کو نعمت کے باغوں میں داخل کرتے ۔(۶۵) اور اگر وہ قائم رکھتے ''تورات'' اور ''انجیل'' کو اور اس کو جو ان کی طرف ان کے رب کی طرف سے اترا تو اپنے اوپر سے اور اپنے پاؤں کے نیچے سے کھاتے کچھ لوگ ان میں سے اعتدال کے راستے پر ہیں اور ان میں سے بہت سے برا کام کر رہے ہیں ۔(۶۶)

تفسیر

اللہ تعالیٰ کے حکموں پر پورا عمل کس طرح ہوتا ہے؟

اس آیت میں اسی ایمان اور خدا ترسی کی کچھ تفصیل ذکر ہے جس پر دنیاوی برکتیں آرام وراحت کا وعدہ پچھلی آیت میں کیا گیا ہے اور تفصیل یہ ہے کہ '' تورات وانجیل'' اور ان کے بعد جو آخری کتاب ''قرآن کریم'' بھیجی گئی اس کو قائم کریں، مراد یہ ہے کہ ان کی تعلیمات پر پورا پورا صحیح عمل جب ہوگا کہ نہ اس میں کوتاہی اور کمی ہو اور نہ زیادتی، اس کا حاصل یہ ہوا کہ یہودی اگر '' تورات'' اور ''انجیل'' پر ان کتابوں کے اترنے کے زمانے میں ایمان لے آتے اور ان کتابوں کی ہدایت کے مطابق ان پر پورا پورا عمل کرتے نہ عملی کوتاہی میں مبتلا ہوتے نہ زیادتی کرتے تو آخرت کی وعدہ کی ہوئی نعمتوں کے مستحق ہوتے اور دنیا میں بھی ان پر رزق کے دروازے کھول دیئے جاتے۔

اوپر کی آیت میں تو صرف آخرت کی نعمتوں کا وعدہ تھا اس آیت میں دنیاوی آرام وراحت کا وعدہ بھی بڑی تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا گیا اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ یہودیوں کی بدعملی اور ''تورات اور انجیل'' کے حکموں میں تبدیلی اور توڑ مروڑ کی بڑی وجہ ان کی دنیا پرستی اور مال کا لالچ تھا اور یہ وہ آفت تھی جس نے ان کو قرآن کریم اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی کھلی نشانیاں دیکھنے کے باوجود ان کی اطاعت سے روکا ہوا تھا ان کو خطرہ یہ تھا کہ اگر ہم مسلمان ہوجائیں گے تو ہماری یہ چودھراہٹ ختم ہوجائے گی اور دینی پیشوا اور رہنما ہونے کی حیثیت سے جو بدیے اور

نذرانے ملتے ہیں ان کا سلسلہ بند ہو جائے گا، اللہ تعالیٰ نے ان کے اس وسوسہ کو دور کرنے کیلئے یہ بھی وعدہ فرمالیا تھا کہ اگر وہ سچے طور پر ایمان اور عمل اختیار کر لیتے تو ان کی دنیاوی دولت وراحت میں بھی کوئی کمی نہیں ہوتی بلکہ زیادتی ہوتی چلی جاتی، اس تفصیل سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یہ خاص وعدہ ان یہودیوں کے ساتھ کیا گیا تھا جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مبارک زمانہ میں موجود تھے، وہ اگر ان حکموں کو مان لیتے تو دنیا میں بھی ان کو ہر طرح کی نعمت وراحت دے دی جاتی، چنانچہ اس وقت جن حضرات نے ایمان اور نیک عمل کو اختیار کر لیا ان کو یہ نعمتیں پوری ملیں جیسے نجاشی جو کہ حبشہ کا بادشاہ تھا اور حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ جو یہودیوں کے بڑے عالم تھے۔

آخر آیت میں یہ بھی فرمادیا کہ جو ٹیڑھ پن اور بدعملی یہودیوں کی بیان کی گئی ہے یہ سب یہودیوں کا حال نہیں بلکہ ان میں ایک تھوڑی سی جماعت سیدھے راستے پر بھی ہے لیکن ان کی اکثریت بدکار، بدعمل ہے، سیدھے راستے پر ہونے والوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو پہلے یہودی یا نصرانی تھے پھر قرآن مجید اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لے آئے تھے۔

پیغمبر کا فرض

يَآاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ
اے پیغمبر! پہنچادیجئے جو اتارا گیا طرف آپکی طرف سے رب آپ کے کی اور اگر نہ

تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ
کیا آپ نے تو نہیں پہنچایا آپ نے پیغام اسکا کچھ بھی اور اللہ بچادیں گے آپ کو سے لوگوں بیشک

اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۶۷﴾
اللہ نہیں ہدایت کرتے قوم کو کافروں کی (۶۷)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اے پیغمبر! پہنچادیجئے جو کچھ آپ کے رب کی طرف سے آپ پر اترا اور اگر آپ

نے ایسا نہ کیا تو، آپ نے اس کا پیغام کچھ نہ پہنچایا اور اللہ آپ کو لوگوں سے بچالیں گے بیشک اللہ کافر قوم کو راستہ نہیں دکھاتے۔ (۶۷)

لفظی تحقیق: بَلِّغْ: "تَبْلِیْغٌ" سے ہے، جس کے معنٰی ہیں: پیغام پہنچادینا، اسی سے "بَلَاغٌ" بنا ہے اور اس کے معنٰی ہیں: پہنچادینا۔ رِسَالَتَهٗ: پیغام کوئی لکھی ہوئی چیز جسے دوسروں کو پہنچانا مقصود ہو، "رَسُوْلٌ" اسی سے بنا ہے، جس کے معنٰی ہیں پیغام پہنچانے والا۔

تفسیر

تبلیغ کی تاکید اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلّی

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر انسان ہونے کے ناطے سے ایک طبعی اثر یہ بھی ہوسکتا تھا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نا امید ہوکر اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچانے میں کچھ کمی فرمادیتے اور دوسرا اثر یہ بھی ہوسکتا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مخالفت، دشمنی اور دکھ کی پرواہ کیے بغیر اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچانے میں لگے رہتے اور اس کے نتیجے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دشمنوں کے ہاتھ سے تکلیفوں کا سامنا ہوتا، اس لئے اس آیت میں ایک طرف تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ تاکیدی حکم دے دیا گیا کہ جو کچھ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتارا جائے وہ سب کا سب بغیر کسی جھجک کے آپ لوگوں کو پہنچا دیں کوئی مانے یا نہ مانے ساتھ دے یا نہ دے، اور دوسری طرف پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ خوشخبری دے کر مطمئن بھی کردیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچانے کے سلسلہ میں یہ کافر آپ کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے، اللہ تعالیٰ خود آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حفاظت فرمائیں گے۔

اس آیت میں ایک جملہ تو یہ قابل غور ہے کہ "وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ" مراد اس کی یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کا کوئی ایک حکم بھی آپ نے امت کو نہ پہنچایا تو آپ اپنی پیغمبری کی ذمہ داری کو ادا کرنے والے نہیں سمجھے جائیں گے، یہی وجہ تھی کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمام عمر اس فرض کی ادائیگی میں اپنی پوری ہمت وقوت

خرچ فرمائی اور حجۃ الوداع کا مشہور خطبہ جو ایک حیثیت سے اسلام کا آئین اور دستور تھا اور دوسری حیثیت سے ایک مہربان اور ماں باپ سے زیادہ شفقت کرنے والے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری وصیت تھی، اس خطبہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کے ایک بہت بڑے مجمع کے سامنے اہم ہدایتیں فرمانے کے بعد مجمع سے سوال فرمایا: دیکھو! کیا میں نے آپ کو دین پہنچادیا؟ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اقرار فرمایا کہ ضرور پہنچایا، اس پر ارشاد فرمایا کہ: آپ اس پر گواہ رہو، اسی کے ساتھ یہ بھی ارشاد فرمایا کہ: ''جو لوگ اس مجمع میں حاضر ہیں وہ غائبوں تک میری بات پہنچادیں'' غائبوں میں وہ لوگ بھی داخل ہیں جو اس وقت دنیا میں موجود تھے مگر مجمع میں حاضر نہ تھے اور وہ لوگ بھی داخل ہیں جو ابھی پیدا نہیں ہوئے، ان کو پیغام پہنچانے کا طریقہ دین کے علم کو بڑھانا اور پھیلانا تھا جس کو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین و تابعین رحمۃ اللہ علیہم نے پوری کوشش سے انجام دیا، اسی کا یہ اثر تھا کہ عام حالات میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات وکلمات کو ایک بھاری امانت کی طرح محسوس فرمایا، اور اپنی طاقت کے مطابق اس کی کوشش فرمائی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سنا ہوا کوئی جملہ ایسا نہ رہ جائے جو امت کو نہ پہنچے اگر کسی خاص سبب یا مجبوری سے کسی نے کسی خاص حدیث کو لوگوں سے بیان نہیں کیا تو اپنی موت سے پہلے دو چار آدمیوں کو ضرور سنادیا تاکہ وہ اس امانت کی ادائیگی کرنے والے سمجھے جائیں۔

آیت کے دوسرے جملہ ''وَ اللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ'' میں خوشخبری دی گئی ہے کہ ہزاروں مخالفتوں کے باوجود دشمن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔

حدیث شریف میں ہے کہ اس آیت کے اترنے سے پہلے چند صحابہ کرام پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کیلئے عام طور پر ساتھ لگے رہتے تھے اور ہر حالت میں آپ کی حفاظت فرماتے تھے اس آیت کے اترنے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب کو رخصت فرمادیا کہ اب کسی پہرہ اور حفاظت کی ضرورت نہیں رہی اللہ تعالیٰ نے یہ کام خود اپنے ذمہ لے لیا ہے۔

ایک حدیث میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب مجھے اللہ تعالیٰ کا

پیغام پہنچانے کا حکم ملا تو میرے دل میں اس کا بڑا رعب تھا کہ ہر طرف سے لوگ مجھے جھٹلا دیں گے اور مخالفت کریں گے پھر جب یہ آیت نازل ہوئی تو سکون و اطمینان حاصل ہو گیا، چنانچہ اس آیت کے اترنے کے بعد کسی کی مجال نہیں ہوئی کہ تبلیغ و رسالت کے مقابلہ میں پیغمبر ﷺ کو کوئی نقصان پہنچا سکے، جنگ و جہاد میں عارضی طور سے کوئی تکلیف پہنچ جانا اس کے مخالف نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے پیغمبر ﷺ سے فرمایا کہ: آپ بے خوف ہو کر دین کی تبلیغ کا کام انجام دیتے رہیں اور انکار کرنے والوں کی وجہ سے غمگین نہ ہوں کیونکہ اللہ تعالیٰ کافروں کیلئے ہدایت کے دروازے نہیں کھولتے، ایسے لوگوں کے مسلسل انکار کی وجہ سے ان کے دلوں پر ٹھپہ لگا دیتے ہیں، ایسے لوگ ہدایت سے مکمل طور پر محروم ہو جاتے ہیں البتہ جو لوگ حق کے طلبگار ہوتے ہیں اور ان کے دل میں صحیح بات معلوم کرنے کی خواہش موجود ہوتی ہے اللہ تعالیٰ ان کی ہدایت کیلئے کوئی راستہ پیدا فرما دیتے ہیں اور وہ سیدھے راستے پر آ جاتے ہیں، یہودی و عیسائی کفر پر اڑے ہوئے ہیں آپ ان سے کوئی توقع نہ رکھیں کیونکہ انہیں ہدایت نصیب نہیں ہوگی۔

اہل کتاب کو پھر نصیحت

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ

کہہ دیجئے اے کتاب والو! نہیں تم اوپر کسی راہ کے یہاں تک کہ قائم کرو تورات

وَ الْاِنْجِيْلَ وَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَ لَيَزِيْدَنَّ

اور انجیل اور وہ جو اتارا گیا طرف تمہاری طرف سے رب تمہارے کی اور ضرور بڑھا دیں گے

كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّ كُفْرًا ۚ

بہت سوں کو میں سے ان جو اتارا گیا طرف آپ کی طرف سے رب آپ کے کی شرارت اور کفر میں

فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۶۸﴾

پس نہ افسوس کیجئے اوپر قوم کافروں کے (۶۸)

بامحاورہ ترجمہ: ۔ کہہ دیجئے اے کتاب والو! تم کسی راہ پر نہیں ہو جب تک تم " تورات اور انجیل" کو اور وہ جو تمہارے رب کی طرف سے تم پر اترا قائم نہ کرو اور اس کلام سے ان میں بہتوں کی شرارت اور کفر میں زیادتی ہوگی، پس آپ کافروں پر افسوس نہ کیجئے۔ (۶۸)

لفظی تحقیق: شَیْءٍ: کوئی چیز، کوئی بات، یہاں شے سے مراد چیز، یعنی: ایک راہ ہے۔

تفسیر

اس آیت میں کہا گیا ہے کہ یہودی اور عیسائی جن کو "تورات اور انجیل" جیسی کتابیں ملی ہیں ان کے لائق نہیں کہ کفر کریں اور کافروں کے ساتھ ملے رہیں اس لئے ان سے پھر کہہ دیجئے کہ وہ اپنی اپنی کتاب پر عمل کریں جب اپنی کتاب پر پوری طرح عمل کریں گے تو ان کے اوپر قرآن کریم اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ماننا لازم ہوجائے گا کیونکہ ان کی اپنی کتاب کا یہی حکم ہے کہ آخری پیغمبر کی فرمانبرداری کریں جب تک وہ اپنی کتاب پر عمل نہیں کرتے ان کو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ ٹھیک راہ پر ہیں۔

ارشاد ہے کہ ان اہل کتاب سے کہہ دیجئے کہ تم جب تک اپنی اپنی کتاب "تورات اور انجیل" پر عمل نہیں کرتے اس وقت تک تم بے ڈھنگی چال چلتے رہو گے، کیونکہ جب اپنی کتاب کو پیٹھ پیچھے پھینک دیا تو پھر سوا اس کے کہ اپنی خواہشوں کو اپنا رہنما بنالیں اور کیا ہوگا، اور خواہش کے بندے کی کوئی راہ ہی نہیں جدھر اس کی خواہش نے موڑا مڑ گیا۔

یہ لوگ اتنی بات نہیں سمجھتے کہ قرآن مجید میں وہ اکثر باتیں بھی آ گئی ہیں جو ہماری کتابوں میں ہیں اور ہمارا فرض ہے کہ اس کو ہاتھوں ہاتھ لیں اس کے برخلاف انہیں ضد ہوگئی ہے کہ جو قرآن کریم کہے وہی نہیں کرنا، اس ضد کی وجہ سے قرآن مجید ان کیلئے الٹا گمراہی کا باعث بن گیا اور ان کی سرکشی، ہٹ دھرمی اور کفر میں اور زیادتی ہوگئی۔

اہل کتاب کا حال یہ ہے کہ جب قرآن کریم کی آیتیں اترتی ہیں تو ان میں سے اکثر لوگوں کی سرکشی اور کفر میں زیادتی کا سبب بنتی ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کے کلام سے نصیحت پکڑنے کے بجائے مزید سرکش اور باغی

ہوجاتے ہیں، یہ ان کی بدبختی کی علامت ہے اگر انسان صلاحیت والا ہوتو اسے حق کی پہچان میں کوئی دقت پیش نہیں آنی چاہئے مگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اترنے والی ہدایت سے یہ لوگ الٹا اثر قبول کرتے ہیں اور مزید سرکشی اور کفر میں مبتلا ہوجاتے ہیں، مزید یہ فرمایا گیا کہ اے پیغمبر! اہل کتاب کے اس منہ موڑنے پر افسوس نہ کریں آپ اپنا فرض ادا کرتے رہیں اور ان کی ہدایت کیلئے پریشان نہ ہوں، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرکے اسلام کو دوسروں تک پہنچانے والوں کو بھی تسلی دی گئی ہے کہ آپ اپنا کام کرتے رہیں اور جو شخص کفر پر اڑا ہوا ہے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیں، اللہ تعالیٰ خود اس کی پکڑ کریں گے اور پھر وہ اس کی سزا سے بچ نہیں سکے گا۔

خوف وغم سے نجات

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِيْنَ هَادُوْا وَ الصّٰبِـُٔوْنَ وَ النَّصٰرٰى

بیشک وہ جو ایمان لائے اور وہ جو یہودی ہوئے اور صابی اور عیسائی

مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ

جو بھی ایمان لائے پر اللہ کے اور پر دن آخرت کے اور عمل کرے نیک پس نہیں خوف

عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴿۶۹﴾

پر ان اور نہ وہ غمگین ہوں گے (۶۹)

با محاورہ ترجمہ:۔ بیشک جو لوگ مسلمان ہیں اور جو یہودی ہیں اور صابی فرقہ اور عیسائی جو کوئی اللہ پر ایمان لائے اور قیامت کے دن پر اور نیک عمل کرے ان پر نہ ڈر ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔(۶۹)

تفسیر

امام تفسیر ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے بحوالہ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ ایک یہ قول نقل کیا ہے کہ ''صابئون'' وہ لوگ ہیں جو فرشتوں کی عبادت کرتے ہیں اور قبلہ کے خلاف نماز پڑھتے ہیں اور آسمانی کتاب ''زبور'' کی تلاوت کرتے ہیں جو

حضرت داؤد علیہ السلام پر اتاری گئی تھی، قرآن کریم میں جس انداز سے یہ بات چلائی گئی ہے اس سے اسی کی تائید ہوتی ہے کہ چار آسمانی کتابیں جن کا قرآن مجید میں ذکر ہے ''تورات، زبور، انجیل اور قرآن کریم'' ہیں، اس میں ان چار کتابوں کے ماننے والوں کا ذکر آ گیا۔

ارشاد ہے کہ کوئی اپنے آپ کو مسلمان کہے یا یہودی یا عیسائی یا صابی وغیرہ کچھ ہی کہے بہر حال وہ انسان ہے انسان کے دکھ درد سے چھٹنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو جیسا ماننا چاہئے مانے اس پر ایمان لائے اور قیامت کو برحق سمجھے اور نیک کام کرے ایسے شخص کو خوف اور رنج دونوں سے ہمیشہ کیلئے نجات مل جائے گی، ظاہر ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کو مانے گا ممکن نہیں کہ وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ مانے، پس نجات کی صورت یہ ہوئی کہ اللہ تعالیٰ کو اور اس کے پیغمبروں کو مانو اور نیک کام کرو ایسے آدمی کو نہ کسی کا ڈر رہے گا نہ کسی بات کا رنج پاس پھٹکے گا۔

خواہشوں کے غلام

لَقَدْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمْ رُسُلًا ؕ

البتہ ضرور لیا ہم نے پختہ قول بنی اسرائیل سے اور بھیجے ہم نے طرف ان کی پیغمبر

كُلَّمَا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُهُمْ ۙ فَرِيْقًا كَذَّبُوْا

جب کبھی آیا ان کے پاس کوئی پیغمبر ساتھ اسکے جو نہ چاہتے تھے جی ان کے بہتوں کو جھوٹا کہہ دیا

وَ فَرِيْقًا يَّقْتُلُوْنَ ﴿۷۰﴾

اور بہتوں کو مار ڈالتے تھے (۷۰)

با محاورہ ترجمہ:۔ ہم نے بنی اسرائیل سے پختہ قول لیا تھا اور ہم نے ان کی طرف پیغمبر بھیجے جب ان کے پاس پیغمبر وہ حکم لایا جو ان کے جی کو پسند نہ آیا تو انہوں نے بہتوں کو جھٹلایا اور بہتوں کو قتل کر دیتے تھے۔ (۷۰)

تفسیر

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اصلی کمزوری جو اسے گناہ کی طرف لے جاتی ہے اس کو کھول کر بتا دیا ہے اور اس کی مثال میں پھر بنی اسرائیل کا طرز عمل بیان کیا گیا ہے کہ بنی اسرائیل کے پاس پیغمبر آئے جو کہ اللہ تعالیٰ کے حکم لائے لیکن یہ حکم ان کو ان کی بے جا خواہشوں سے روکنے والے تھے اور یہ لوگ اس بات کے عادی ہو چکے تھے کہ جو جی میں آئے وہی کریں خواہ بعد میں تکلیف ہی اٹھائیں، انسان کا تجربہ بھی یہی کہتا ہے کہ جب کسی کی شامت آتی ہے تو وہ باؤلوں کی طرح اپنی خواہشیں پوری کرنے میں لگ جاتا ہے، چنانچہ جس شخص یا جس قوم کو دیکھو کہ وہ مویشیوں کی طرح چرتی ہے درندوں کی طرح پھاڑتی ہے اور جانوروں کی طرح من کی چاہت پوری کرنے میں لگی رہتی ہے سمجھ لو کہ دیر یا سویر اس کے سر پر کوئی بڑی زبردست آفت آنے والی ہے۔

بنی اسرائیل نے پیغمبروں کی ایک نہ سنی بہت سوں کو تو جھوٹا کہہ کر ٹال دیا جو زیادہ سمجھانے لگے انہیں جان سے مار ڈالا، مثلاً: حضرت زکریا علیہ السلام اور حضرت یحییٰ علیہ السلام وغیرہ، یہ سب کچھ انہوں نے شیطانی خواہشوں میں پھنس کر کیا، یہی کم بخت خواہشیں ہیں جو انسان کو نیک کام کرنے سے روکتی ہیں۔

گناہوں کا بدلہ

وَحَسِبُوْٓا اَلَّا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ فَعَمُوْا وَصَمُّوْا ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ

اور گمان کیا انہوں نے کہ نہ ہوگی کچھ خرابی پس وہ اندھے ہوئے اور بہرے ہوئے وہ پھر توجہ کی اللہ نے پر ان

ثُمَّ عَمُوْا وَ صَمُّوْا كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ ؕ وَ اللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۷۱﴾

پھر اندھے ہوئے اور بہرے ہوئے بہت میں سے ان اور اللہ دیکھتے ہیں اسکو جو وہ کرتے ہیں (۷۱)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور انہوں نے خیال کیا کہ کچھ خرابی نہ ہوگی پس اندھے اور بہرے ہو گئے پھر اللہ نے ان کی توبہ قبول کی، پھر ان میں سے بہت اندھے اور بہرے ہوئے، اور اللہ دیکھتے ہیں جو کچھ وہ

کرتے ہیں۔ (۷۱)

تفسیر

اس آیت میں یہ ذکر ہے کہ انہوں نے اس کے بجائے کہ قیامت کو برحق مانیں اور برے کاموں کی سزا ملنے کے قائل ہونے کے بجائے یہ خیال دل میں جمالیا کہ جو جی چاہے کرو کوئی حرج نہ ہوگا، چنانچہ انہوں نے نیک کام کرنے والوں کی باتیں سنی چھوڑ دیں اور اندھے اور بہرے بن گئے، اللہ تعالیٰ نے ان پر دنیا کا عذاب مسلط فرمادیا اور بخت نصر نے ان پر حملہ کرکے ان کے ملک کو ویران کر دیا اور ان کو قیدی بنا کر بابل شہر لے گیا، اس بلا سے مشکل سے پیچھا چھوٹا تو توبہ کی اور اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول کی، لیکن تھوڑے دنوں کے بعد آنے والی نسلوں نے پھر وہی رویہ اختیار کیا، دل کھول کر گناہوں میں پھنس گئے اور پھر ویسے ہی اندھے بہرے بن گئے۔

عیسائیوں کا شرک

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ؕ

البتہ تحقیق کافر ہوئے وہ لوگ جنہوں نے کہا تحقیق اللہ وہی مسیح ہے بیٹا مریم کا

وَ قَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَ

اور کہا مسیح نے اے بنی اسرائیل عبادت کرو اللہ کی رب میرا اور

رَبَّكُمْ ؕ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ

رب تمہارا بیشک بات یہ ہے جو شرک کرے ساتھ اللہ کے پس تحقیق حرام کردی اللہ نے پر اس جنت

وَ مَاْوٰىهُ النَّارُ ؕ وَ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۷۲﴾

اور ٹھکانہ اسکا آگ ہے اور نہیں واسطے ظالموں کے سے مددگار (۷۲)

بامحاورہ ترجمہ:۔ بیشک کافر ہوئے جنہوں نے کہا تحقیق اللہ وہی مریم کا بیٹا مسیح ہے اور مسیح نے کہا اے بنی اسرائیل! اللہ کی عبادت کرو جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے، بیشک جس نے اللہ کا شریک ٹھہرایا پس تحقیق حرام کردی اللہ نے اس پر جنت، اور اسکا ٹھکانہ دوزخ ہے، اور کوئی گناہگاروں کی مدد کرنے والا نہیں۔ (۷۲)

تفسیر

اس آیت میں عیسائیوں کا حال بیان کیا جاتا ہے اوران کو بتایا جاتا ہے کہ تم بھی اپنے پیغمبر مریم کے بیٹے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حکم کی نافرمانی کررہے ہو اور " انجیل" کے حکم کو صاف صاف جھٹلا رہے ہو کہ اس آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں لاتے اور خبر نہیں کس وجہ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کہتے ہو، کان کھول کر سن لو! کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تو یہی ہے جو مریم کے بیٹے کی شکل میں دنیا کے اندر ظاہر ہوا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے مرتبہ کو نہیں جانتے اور کافر ہیں، حضرت مسیح علیہ السلام نے جو کچھ کہا تھا یہ اس کے بالکل خلاف کرتے ہیں کیونکہ انہوں نے تو بنی اسرائیل کو یہ کھلا پیغام دیا کہ اے اسرائیل کی اولاد! میرا رب اور تمہارا رب اللہ ہے اس کے آگے سر جھکاؤ اور اس کی عبادت کرو، اس میں بالکل شک کی گنجائش نہیں کہ جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور کو شریک کرے گا اور اس کو اس کے برابر کا معبود مانے گا اللہ تعالیٰ نے اسے جنت سے بالکل محروم کردیا ہے اور جنت کا دروازہ اس کیلئے بند ہے وہ اس میں داخل نہیں ہوسکتا اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے، وہ یہ ظلم کررہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس کے مرتبے سے نیچے لارہا ہے اور ایک انسان کو اس کے برابر ٹھہرا رہا ہے، ان ظالموں سے پوچھو کہ حضرت مسیح (علیہ السلام) تو اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کا بندہ کہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کو اپنا آقا اور رب مانتے ہیں پھر حضرت مسیح (علیہ السلام) کو خدا کیسے کہتے ہو؟

تین خداؤں والا عقیدہ کفر ہے

وقف لازم

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ وَ مَا مِنْ اِلٰهٍ

البتہ بیشک کافر ہوئے وہ لوگ جنھوں نے کہا تحقیق اللہ تیسرا ہے تین کا اور نہیں کوئی معبود

اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ وَ اِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ

سوا معبود ایک کے اور اگر نہ رُکے وہ اس سے جو وہ کہتے ہیں تو البتہ ضرور پہنچے گا

الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۷۳﴾ اَفَلَا يَتُوْبُوْنَ اِلَى اللّٰهِ

انکو جنھوں نے کفر کیا میں سے ان عذاب دکھ والا (۷۳) کیا پس نہیں توبہ کرتے ہیں طرف اللہ کی

وَ يَسْتَغْفِرُوْنَهٗ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۷۴﴾

اور گناہ بخشواتے اس سے اور اللہ بخشنے والے مہربان ہیں (۷۴)

بامحاورہ ترجمہ:۔ بیشک کافر ہوئے جنھوں نے کہا اللہ تین میں کا ایک ہے، حالانکہ ایک معبود کے سوا کوئی معبود نہیں، اور اگر وہ اس بات سے باز نہ آئے جو وہ کہتے ہیں تو بیشک ان میں سے کفر پر قائم رہنے والوں کو دردناک عذاب پہنچے گا۔ (۷۳) یہ کیوں اللہ کے آگے توبہ نہیں کرتے اور اس سے گناہ کیوں نہیں بخشواتے؟ اور اللہ بخشنے والے مہربان ہیں۔ (۷۴)

لفظی تحقیق: لَيَمَسَّنَّ: البتہ ضرور پہنچے گا۔ یہ "مَسٌّ" سے بنا ہے، جس کے معنٰی چھونے کے ہیں اس کی مثال جو چیز بدن کو چھوئے گی وہ جسم تک ضرور پہنچے گی اس لئے اس کا ترجمہ "پہنچے گا" کیا گیا ہے۔

تفسیر

عیسائیوں کا ایک فرقہ جس کا ذکر اس آیت میں ہے کہ یہ لوگ عجیب بات کہتے ہیں کہ اللہ تین میں سے

ایک ہے، ان تین کی فہرست یہ ہے: اللہ تعالیٰ، حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام اور روح القدس، یا اللہ تعالیٰ، حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام اور حضرت مریم، مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ دو چیزوں سے مل کر پورے ہوتے ہیں اور ان کے مانے بغیر ایمان ادھورا رہتا ہے اس آیت میں ان عقیدہ والوں کو بھی کافر قرار دیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ اپنے وجود میں کسی اور کے محتاج نہیں ہیں وہی اکیلے معبود حقیقی ہیں۔

آگے ارشاد ہے کہ یہ ان بیہودگیوں سے اللہ تعالیٰ کے آگے توبہ کیوں نہیں کرتے اور اس سے اپنا گناہ کیوں نہیں بخشواتے؟ وہ بڑے مہربان اور بخشش کرنے والے ہیں۔

حضرت مسیح علیہ السلام اور حضرت مریم کی حیثیت

مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ

نہیں مسیح بیٹے مریم کے مگر پیغمبر تحقیق گزر چکے سے پہلے اس

الرُّسُلُ ؕ وَ اُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ؕ كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ

بہت پیغمبر اور ماں اسکی نہایت سچی ہیں تھے وہ دونوں کھاتے کھانا دیکھئے کیسے

نُبَيِّنُ لَهُمُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝۷۵ قُلْ اَتَعْبُدُوْنَ

بیان کرتے ہیں ہم لئے ان کے دلیلیں پھر دیکھئے کہاں الٹے جارہے ہیں وہ (۷۵) کہہ دیجئے کیا پوجتے ہو تم

مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّ لَا نَفْعًا ؕ وَ اللّٰهُ

سے سوا اللہ کے وہ جو نہیں مالک ہے لئے تمہارے برائی کا اور نہ بھلائی کا اور اللہ

هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝۷۶

وہی ہیں سننے والے جاننے والے (۷۶)

بامحاورہ ترجمہ:۔ مریم کے بیٹے مسیح پیغمبر کے سوا کچھ نہیں ان سے پہلے بہت پیغمبر گزر چکے اور اس کی

ماں نہایت سچی ہیں یہ دونوں کھانا کھاتے تھے، دیکھئے ہم ان کو کیسے دلیلیں بتاتے ہیں، پھر دیکھئے کہ وہ کہاں الٹے جا رہے ہیں۔ (۷۵) آپ کہہ دیجئے! کیا تم اللہ کو چھوڑ کر ایسی چیز کی بندگی کرتے ہو جو تمہارے برے کی مالک ہے نہ بھلے کی؟ اور اللہ وہی سننے والے جاننے والے ہیں۔ (۷۶)

لفظی تحقیق: صِدِّیْقَةٌ: سب سے اونچے درجے کا انسان پیغمبر ہوتا ہے یہ سب مرد ہوتے ہیں عورتیں پیغمبر نہیں ہوتی، اس سے دوسرے درجے کا انسان صدیق ہے جو سچی باتوں کو صاف سمجھ لیتا ہے، ایک پاکباز عورت بھی اس درجہ کو پہنچ سکتی ہے اور اس کو "صِدِّیْقَةٌ" کہتے ہیں۔

تفسیر

اس آیت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ٹھیک ٹھیک باتیں بتائی گئی ہیں، اول تو یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کے رسول تھے اس سے بڑھ کر ان کو کچھ اور نہ سمجھنا چاہئے، وہ نہ خدا ہو سکتے ہیں نہ اس کی خدائی کے حصہ دار، اور رسول ہونا کوئی حیران کن بات نہیں ان سے پہلے بہت سے رسول ہو چکے ہیں، جیسے: پہلے نبی اور رسول انسان تھے ایسے ہی حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام بھی ہیں، ہاں! نبی کی حیثیت سے ان کا مرتبہ بلند ہے ان کی والدہ بھی انسان ہیں اور ان کا مرتبہ بھی بلند ہے اور وہ صدیقہ (نہایت پاکباز) ہیں ان دونوں کے انسان ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ وہ دونوں کھانا کھاتے تھے جس سے ان کی زندگی قائم رہے، اللہ تعالیٰ کسی بھی چیز کے محتاج نہیں اور ارشاد ہے کہ دیکھو! ہم ان کے سامنے سچی سچی باتیں کس قدر کھول کھول کر بیان کرتے ہیں پھر بھی یہ لوگ غلط باتوں میں بھٹکتے پھرتے ہیں، بھلا! جو نہ فائدہ پہنچا سکتا ہو اور نہ نقصان پہنچا سکتا ہو اور نہ سنے نہ سمجھے اس کی عبادت کیسی؟ یہ سب صفتیں تو اللہ تعالیٰ ہی میں ہیں۔

پھر تم ہی بتاؤ کہ جو ذات تمام انسانوں کی طرح اپنی زندگی کو قائم رکھنے کیلئے کھانے پینے اور دوسری ضرورتوں سے بے نیاز نہ ہو وہ خدا کیونکر بن سکتا ہے؟ یہ ایسی مضبوط اور کھلی دلیل ہے جسے عالم و جاہل یکساں طور پر سمجھ سکتے ہیں۔

ایک علمی نکتہ، حضرت مریم بتول پیغمبر تھیں یا ولی؟

حضرت مریم کے ولی یا پیغمبر ہونے میں اختلاف ہے، آیت میں لفظ صدیقہ سے بظاہر اشارہ اسی طرف معلوم ہوتا ہے کہ آپ ولی تھیں، پیغمبر نہیں تھیں، کیونکہ جب کسی کی تعریف کی جاتی ہے وہ اس کے سب سے اچھے درجہ کو ذکر کیا جاتا ہے، اگر آپ کو پیغمبری حاصل ہوتی تو یہاں ''پیغمبر'' کہا جاتا حالانکہ یہاں ''صدیقہ'' کہا گیا ہے جو کہ ولی ہونے کی طرف اشارہ کرتا ہے، امت کے اکثر علماء کی تحقیق یہی ہے کہ عورتوں میں پیغمبری نہیں آئی یہ منصب مردوں کیلئے ہی خاص رہا ہے۔

دین میں زیادتی

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَ لَا

کہہ دیجئے اے اہل کتاب! مت بڑھاؤ میں دین اپنے ناحق اور مت

تَتَّبِعُوْٓا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَ اَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّ

پیروی کرو خیالات کی اس قوم کے جو بچ بچ بھٹکے اس سے پہلے اور گمراہ کر گئے بہت سوں کو اور

ضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ﴿۷۷﴾ ع ۱۰/۱۱/۱۴

بہک گئے طرف سے سیدھے راہ کی (۷۷)

با محاورہ ترجمہ:۔ آپ کہہ دیجئے اے اہل کتاب! اپنے دین کی باتوں کو ناحق بڑھا چڑھا کر بیان نہ کرو اور ان لوگوں کے خیالات پر نہ چلو جو پہلے گمراہ ہو چکے ہیں اور بہت سوں کو گمراہ کر گئے اور سیدھی راہ سے بہک گئے۔ (۷۷)

لفظی تحقیق: لَا تَغْلُوْا: مت بڑھاؤ۔ ''غُلُوٌّ'' سے ہے، جس کے معنیٰ ہیں: حد سے نکل جانا، ضرورت سے زیادہ کہنا یا کرنا۔ اَهْوَآءَ: خیالات۔ ''هَوَآئِ'' کی جمع ہے، جس کے معنیٰ ہیں: من گھڑت خواہش اور بے اصل بات۔

تفسیر

اس آیت میں ارشاد ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں سے کہہ دیجیے کہ وہ اپنے دین میں غلط اور جھوٹی باتیں نہ بڑھائیں اور لوگوں کی نقل نہ کریں کیونکہ وہ تو خود بھی گمراہ تھے اور بہت سوں کو گمراہ کر گئے، یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ "انجیل" میں تو شرک سے منع کیا گیا تھا لیکن بعد میں عیسائیوں کے ایک عالم پولوس نے یونانیوں اور رومیوں کی دیکھا دیکھی اپنے مذہب میں بھی بت پرستی کو ترقی دی اور جیسے وہ اپنے دیوتاؤں کو خدا کا بیٹا کہا کرتے تھے انہوں نے بھی اپنے پیغمبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہنا شروع کر دیا اور ان دیوتاؤں کی طرح خدائی صفتیں بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں بیان کرنی شروع کر دیں یہاں تک کہ عیسائی مذہب پرانے غلط مذہبوں کی نقل بن کر رہ گیا۔

بنی اسرائیل کے ٹیڑھ پن کا دوسرا پہلو

ان آیتوں سے انہیں بنی اسرائیل کے ٹیڑھ پن کا دوسرا رُخ بتلایا گیا ہے کہ یہ جاہل یا تو سرکشی اور نافرمانی کے اس کنارے پر تھے کہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں کو جھوٹا کہا اور بعض کو قتل کر ڈالا اور یا گمراہی کے اس کنارے پر پہنچ گئے کہ پیغمبروں کی تعظیم میں زیادتی کر کے ان کو خدا ہی بنا دیا، یعنی: وہ بنی اسرائیل کافر ہو گئے جنہوں نے یہ کہا کہ اللہ تعالیٰ تو عیسیٰ ابن مریم ہی کا نام ہے، یہاں تو یہ قول صرف عیسائیوں کا مذکور ہے دوسری جگہ یہی گمراہی یہودیوں کی بھی بیان فرمائی گئی ہے، یعنی: یہودیوں نے تو یہ کہہ دیا کہ حضرت عزیر علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں اور عیسائیوں نے یہ کہہ دیا کہ حضرت عیسیٰ بن مریم اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں۔

ارشاد ہے کہ وہ لوگ تو خود بھٹکے ہوئے اور دوسروں کو بہکانے والے تھے سیدھا راستہ چھوڑ چکے تھے تم ان کی باتیں مت سیکھو، اپنی کتاب کی ٹھیک پیروی کرو۔

لعنت کا سبب

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَ
لعنت کیے گئے وہ لوگ جو کافر ہوئے میں سے بنی اسرائیل اوپر زبان داؤد اور

عِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿۷۸﴾ كَانُوْا
عیسیٰ بیٹے مریم کے وہ اس لئے کہ نافرمانی کی انہوں نے اور تھے وہ حد سے گزرتے (۷۸) تھے وہ

لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۹﴾
نہ منع کرتے سے برے کام وہ کرتے تھے البتہ برا ہے وہ جو تھے وہ کرتے (۷۹)

بامحاورہ ترجمہ: بنی اسرائیل میں سے کافر لوگ داؤد اور مریم کے بیٹے عیسیٰ کی زبانی لعنت کیے گئے یہ اس لئے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے اور حد سے گزر گئے تھے۔ (۷۸) آپس میں برے کام سے جو وہ کر رہے تھے ایک دوسرے کو منع نہ کرتے تھے بہت ہی برا کام ہے جو وہ کرتے تھے۔ (۷۹)

لفظی تحقیق: عَصَوْا: انہوں نے نافرمانی کی۔ "عَصْيَانٌ" سے ہے، جس کے معنیٰ ہیں نافرمانی کرنا اور حکم نہ ماننا، لفظ "عَاصِیْ" (گنہگار) بھی اسی سے بنا ہے۔ يَعْتَدُوْنَ: حد سے گزرتے تھے۔ "يَعْتَدُوْنَ عُدْوَانٌ" سے ہے، جس کے معنیٰ ہیں حد سے آگے بڑھنا، زیادتی اور سرکشی کرنا۔ لَا يَتَنَاهَوْنَ: نہ روکتے تھے۔ "تَنَاهِیْ" سے ہے، اس کا مادہ "نَهْیٌ" ہے "نَهْیٌ" کے معنیٰ ہیں منع کرنا، "تَنَاهِیْ" کے معنیٰ ہیں خود رُک جانا اور آپس میں ایک دوسرے کو روکنا۔

تفسیر

اس آیت میں ان کو ڈرایا گیا ہے کہ تمہاری بری عادتوں کی وجہ سے دو بڑے پیغمبر یعنی حضرت داؤد علیہ السلام

اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام تمہیں لعنتی قرار دے چکے ہیں اس لعنت سے نکلنا ہے تو اسلام قبول کرو ورنہ اس کا نتیجہ تمہارے لئے برا ہوگا۔

اللہ تعالیٰ نے یہاں پر جس لعنت کا ذکر کیا وہ دو مختلف زمانوں میں دو مختلف پیغمبروں کی نافرمانی کی وجہ سے تھی، پہلا واقعہ حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ کا ہے، اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر لعنت بھیجی یعنی حضرت داؤد علیہ السلام کی زبان سے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان سے، اس گروہ کا ذکر'' سورۂ اعراف''میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے،'' روح المعانی''میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے ان لوگوں کو حکم دیا تھا کہ وہ ہفتے کے دن مچھلی کا شکار نہ کریں یہ لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں تو اس بات پر عمل کرتے رہے مگر حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں اس حکم سے منہ موڑا اور حیلے بہانے سے مچھلی کا شکار کرتے رہے ان کی حیلہ سازی یہ تھی کہ بظاہر تو ہفتہ کے دن مچھلیوں کو نہیں پکڑتے تھے مگر اس دن انہیں حوض میں جمع کر لیتے تھے کہ انہوں نے حوض ایسے بنائے کہ ان میں مچھلیاں آ کر دوبارہ نکل نہ سکتیں تھیں اور پھر اگلے دن ان کا شکار کر لیتے تھے، حضرت داؤد علیہ السلام کے بار بار منع کرنے کے باوجود وہ لوگ باز نہ آئے آخر کار ان پر اللہ تعالیٰ کا غضب اترا اور وہ اسی دنیا میں اللہ تعالیٰ کے عذاب میں آ گئے، اللہ تعالیٰ نے ان کی شکلیں تبدیل کر کے انہیں بندر اور خنزیر بنا دیا اور پھر تین دن کے بعد انہیں دنیا سے مٹا دیا گیا اور یہ بگڑی ہوئی شکلوں والے بنی اسرائیل ہلاک ہو گئے، اگرچہ ان کی تعداد کا ذکر قرآن کریم وحدیث میں نہیں ہے تاہم تفسیری روایتوں کے مطابق ان کی تعداد ہزاروں میں تھی، اس واقعہ کے مقام کے متعلق'' تورات''میں ایلات کا ذکر آتا ہے اور یہ وہی جگہ ہے جو خلیج عقبہ کے پاس ہے اور آجکل اسرائیل کے قبضہ میں ہے اس مقام کے متعلق'' سورۂ اعراف''میں حاضرۃ البحر کا ذکر آتا ہے'' اور ان سے اس بستی کا حال پوچھو جو دریا کے کنارے واقع تھی'' دوسرا واقعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کا ہے قوم کے کہنے پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی تو اللہ تعالیٰ نے آسمان سے کھانے سے بھرا ہوا دسترخوان اتارا، آپ نے بار بار تاکید فرمائی کہ وقت پر جتنا کھانا آئے وہ سب میں تقسیم کر دو اور اسے ذخیرہ نہ بنانا مگر لوگ باز نہ آئے اور ذخیرہ

اندوزی شروع کردی بعض لوگوں کو یہ کھانا کھانے سے منع کیا گیا تھا مگر وہ بھی کھانے سے باز نہ آئے نتیجہ یہ ہوا کہ ان پر اللہ تعالیٰ کی لعنت اتری، اس واقعہ کا ذکر اسی سورۃ کے آخری حصہ میں آئے گا، جو لوگ بار بار منع کرنے کے باوجود باز نہ آئے اللہ تعالیٰ نے ان کی شکلیں بگاڑ کر خنزیروں کی شکل میں تبدیل فرمادی، ان لوگوں کی تعداد کا ذکر بھی قرآن وحدیث میں نہیں ہے تاہم تفسیری روایتوں کے مطابق ان کی تعداد پانچ ہزار تھی۔

صرف دو پیغمبروں کی زبانی ان پر لعنت ہونے کا ذکر کیا گیا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ ان پر لعنت کی ابتداء حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ہوئی اور انتہاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوئی اس طرح مسلسل چار پیغمبروں کی زبانی ان لوگوں پر لعنت پڑی جنہوں نے پیغمبروں کی مخالفت کی یا جنہوں نے ان کو حد سے آگے بڑھا کر اللہ تعالیٰ کی صفات میں شریک بنادیا۔

ارشاد ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہودیوں پر لعنت کی اس کی تین وجہیں بیان کی گئیں:

(۱)..... ایک یہ کہ جان بوجھ کر گناہوں میں پھنسے ہوئے تھے۔

(۲)..... دوسرے یہ کہ دین کی قائم کی ہوئی حدیں توڑ چکے تھے اور برے کاموں کی عادتیں ان میں عام ہو چکی تھیں۔

(۳)..... تیسری وجہ یہ ہے کہ نہ تو گناہوں سے کوئی خود رکتا تھا اور نہ دوسرے کو روکتا تھا۔

جب کسی قوم کی عادتیں اس قدر بگڑ جائیں کہ گناہ کو معمولی شغل بنالے اور بری باتوں سے ان میں نہ کوئی رُکنے والا ہو نہ روکنے والا، بلکہ اس کے برخلاف بزدلی کو اچھا سمجھا جانے لگے تو وہ قوم لعنت کی مستحق ہوتی ہے وہ اگر اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے تو اس کا ذلیل اور برباد ہوجانا یقینی ہے کیونکہ گناہ پر کوئی پوچھ گچھ نہ ہو تو اول تو گنہگار خود بھی گناہ چھوڑنے کی کوشش نہیں کرتا، پھر اس کی کوئی پکڑ نہ ہوتی دیکھ کر اوروں کو بھی گناہ کرنے کی دلیری ہوتی ہے یوں ساری قوم بگڑ کر برباد ہوجاتی ہے۔

کافروں کی دوستی

تَرٰی كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ لَبِئْسَ مَا

دیکھتے ہیں آپ بہت سے میں سے ان کہ دوستی کرتے ہیں وہ ان سے جو کافر ہوئے البتہ برا ہے جو

قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ

پیشگی بھیجا لئے اپنے خود انہوں نے وہ یہ کہ غضبناک ہوا اللہ پر ان اور میں عذاب وہ

خٰلِدُوْنَ ﴿۸۰﴾ وَلَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ وَمَآ اُنْزِلَ

ہمیشہ رہنے والے ہیں (۸۰) اور اگر ہوتے وہ کہ ایمان لاتے ساتھ اللہ کے اور پیغمبر کے اور جو اترا

اِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَآءَ وَلٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۸۱﴾

طرف اسکے نہ بناتے ان کو دوست اور لیکن بہت سے میں سے ان نافرمان (۸۱)

بامحاورہ ترجمہ:۔ آپ دیکھتے ہیں ان میں کہ بہت سے لوگ اپنے لئے کافروں سے دوستی کرتے ہیں جو کام انہوں نے آگے کیلئے کیا ہے بہت ہی برا ہے وہ یہ کہ اللہ کا غضب ان پر ہوا اور وہ عذاب میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ (۸۰) اور اگر وہ لوگ اللہ پر اور پیغمبر پر اور اس پر جو پیغمبر پر اترا یقین رکھتے تو کافروں کو دوست نہ بناتے لیکن ان میں بہت سے لوگ نافرمان ہیں۔ (۸۱)

تفسیر

اس آیت میں ارشاد ہے کہ یہ لوگ اب بھی ٹھیک راستے پر چلنے والوں سے دشمنی کر رہے ہیں اور گمراہ لوگوں سے دوستی گانٹھتے ہیں، وہ نہیں سمجھتے کہ یہ بہت برا کام ہے، دنیا سے ٹھیک باتوں کو مٹانے اور بری باتوں کے پھیلانے کا باعث بنے اس کی سزا یہ ہوگی کہ ان پر دنیا اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کا غضب اترے گا۔

آگے فرمایا کہ اگر ان کا اللہ تعالیٰ پر اس کے پیغمبروں پر اور ان کی کتابوں پر ایمان ہوتا تو یہ کبھی کافروں، شریروں اور فسادیوں سے دوستی نہ گانٹھتے لیکن یہ تو پرلے درجے کے نافرمان ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں دراصل اللہ تعالیٰ اور پیغمبر پر ایمان ہی نہیں ہے۔

یہودیوں وعیسائیوں کا موازنہ

لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ

البتہ ضرور پائیں گے آپ سخت ترین سب لوگوں سے دشمنی میں ان کیساتھ جو ایمان لائے یہودیوں کو اور ان کو جو

اَشْرَكُوْا ۚ وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا

مشرک ہوئے اور البتہ آپ ضرور پائیں گے زیادہ قریب ان میں سے محبت کرنے میں ساتھ انکے جو ایمان لائے

الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ۭ

ان کو جو کہتے ہیں کہ ہم عیسائی ہیں

بامحاورہ ترجمہ:۔ آپ یہودیوں اور مشرکوں کو مسلمانوں کا سب سے زیادہ دشمن پائیں گے، اور آپ محبت میں مسلمانوں سے نزدیک ان لوگوں کو پائیں گے جو کہتے ہیں کہ ہم عیسائی ہیں۔

تفسیر

اسلام کے ظاہر ہوتے ہی اس کے بہت سے دشمن پیدا ہو گئے اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ لوگ صرف دنیا کے فائدے چاہتے تھے کہ سب پر غالب تو صرف ہم رہیں اور باقی لوگ ہم سے دب کر ہماری خدمت کریں اور جس طرح ہم چلائیں چلیں، اس کا نتیجہ سوا اس کے کچھ ہو ہی نہیں سکتا کہ آپس میں ہر وقت لڑائی رہے اور ضرورت کی چیزیں ایک دوسرے سے چھین کر حاصل ہوں، اسلام نے ان خرابیوں کو دور کرنا چاہا اور سب کو ایک خیال پر جمع

کر کے ان کو آپس میں بھائی چارے کے طریقے پر ڈالنا چاہا، خودغرض لوگوں کو اس میں اپنی موت دکھائی دی، ہر ایک نے یہ سوچا کہ اس طرح مل جل کر رہنے سے تو ہماری سرداری کا کبھی موقعہ نہیں آسکتا۔

سب سے زیادہ خودغرضی یہودیوں میں تھی اس لئے سب سے بڑھ کر اسلام کے دشمن وہی ہوئے ان کے بعد عرب کے مشرک لوگ تھے، یہ تھے ہی جاہل، جب یہودیوں جیسے پڑھے لکھے لوگ بگڑ گئے تو ان کا تو ذکر ہی کیا تھا یہ تو مسلمانوں سے خوب ہی لڑے، اس آیت میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ان حالات کی وجہ بتائی گئی ہے، ارشاد ہے کہ سب سے زیادہ مسلمانوں کے دشمن یہودی اور مشرک ہیں، کیونکہ یہ پرلے درجے کے ضدی اور خودغرض ہیں۔

اس آیت میں یہودیوں کی پھر سخت برائی بیان کی گئی ہے البتہ عیسائیوں کے حق میں اچھی بات بھی کہی گئی ہے، ان آیتوں کی روشنی میں بعض مفسرین نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اسلام دشمنی میں یہودی عیسائیوں کی نسبت زیادہ سخت ہیں اور عیسائی اسلام سے قریب تر ہیں برخلاف اس کے مفسر قرآن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما آپ کے شاگرد حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ وغیرہم فرماتے ہیں کہ ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے تمام عیسائیوں کی تعریف نہیں فرمائی بلکہ یہاں ایک خاص گروہ کی طرف اشارہ کر کے ان کی تعریف کی گئی ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مجموعی حیثیت سے یہودیوں اور عیسائیوں کی اسلام دشمنی میں کوئی فرق نہیں، جس طرح یہودی اسلام کو مٹانے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں اسی طرح عیسائیوں نے بھی ہر دور میں اسلام دشمنی میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہے، چنانچہ یہودیوں کی دشمنی کے متعلق ارشاد ہے کہ مسلمانوں کے حق میں شدید ترین دشمنی رکھنے والے تم یہودیوں کو پاؤ گے، ان کی اسلام دشمنی کا حال تاریخ میں محفوظ ہے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے مبارک زمانہ میں وہ کمینگی کا اظہار کرتے رہتے تھے، چنانچہ ان بدبختوں نے پتھر گرا کر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو (نعوذ باللہ) مار دینے کی کوشش کی مگر اللہ تعالیٰ نے ان کی اس کوشش کو ناکام بنا دیا، پھر انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کھانے میں زہر دے دیا مگر اللہ تعالیٰ نے وہاں بھی آپ کی حفاظت فرمائی، انہوں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو نقصان

پہنچانے میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی، جب اعلانیہ اسلام کے ساتھ ٹکر لینے میں ناکام ہوئے تو اندرونی سازشیں شروع کردیں کچھ براہِ راست مشرکوں سے مل گئے اور بعض دوسروں نے زبان سے تو کلمہ پڑھ لیا مگر اندر اندر منافقوں کا کردار ادا کرتے رہے۔

ایک تو یہودی اسلام دشمنی میں سخت ہیں دوسرے نمبر پر فرمایا کہ مشرک بھی اسلام کے خلاف سازشوں میں پیش پیش ہیں مشرکوں میں سے مکہ کے مشرک خاص طور پر قابل ذکر ہیں، مکی زندگی میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ساتھ مشرکوں کی دشمنی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان مکہ مکرمہ سے ہجرت کرنے پر مجبور ہوگئے، مسلمانوں کو دو دفعہ حبشہ کی طرف ہجرت کرنا پڑی مگر مشرکوں نے وہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا، بالآخر مسلمان مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کر گئے، وہاں بھی مکہ والوں نے انہیں چین سے نہ بیٹھنے دیا اور پے در پے لڑائیاں ہوئیں جن میں بدر اور احد کی لڑائیاں تاریخ کا حصہ بن چکی ہیں، حدیبیہ کا واقعہ بھی مکہ کے مشرکوں کی اسلام دشمنی کا نتیجہ تھا آخر جب مکہ فتح ہوگیا تو مسلمانوں کو چین نصیب ہوا کچھ مشرک ایمان لائے کچھ مارے گئے اور کچھ بھاگ گئے۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا ہے کہ اس آیت میں عیسائیوں کے جس گروہ کی تعریف کی گئی ہے وہ حبشہ کا وفد تھا جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں مدینہ طیبہ حاضر ہوا اس وفد میں ستر آدمی تھے جن میں درویش اور عالم بھی تھے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے سامنے ''سورۂ یٰسین'' کی تلاوت فرمائی، ایمان تو پہلے ہی قبول کر چکے تھے قرآن پاک کی آیتوں کو سن کر انہوں نے اسلام کے حق ہونے کو پہچان لیا اور وہ خوب روئے، انہی لوگوں کے متعلق یہاں فرمایا ہے کہ جن لوگوں نے کہا کہ ہم عیسائی ہیں ان کے دل میں خدا تعالیٰ کا خوف تھا آپ ان کو ایمان والوں سے دوستی میں زیادہ قریب پائیں گے، حبشہ کا یہی وفد یہاں مراد ہے اللہ تعالیٰ نے جن کی تعریف بیان فرمائی ہے۔

نرم دلی کے سبب

ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۸۲﴾

یہ بوجا سکے کہ میں سے ان عالم ہیں اور درویش ہیں اور یہ کہ وہ نہیں بڑے بنتے (۸۲)

بامحاورہ ترجمہ:۔ یہ اس واسطے کہ عیسائیوں میں عالم اور درویش ہیں اور وہ تکبر نہیں کرتے۔(۸۲)

لفظی تحقیق: قِسِّيْسِيْنَ: "قِسِّيْسٌ" کی جمع ہے، "قِسِّيْسٌ" کے معنٰی: عالم ہیں۔ رُهْبَانٌ: "رَاهِبٌ" کی جمع ہے، "رَاهِبٌ" کے معنٰی ہیں: دنیا سے تعلق توڑ کر کے دینی کام اور عبادت میں مشغول رہنے والا فقیر اور درویش۔

تفسیر

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ دشمنی اور دوستی کا دارومدار چند باتوں پر ہے۔

جس وقت قرآن مجید اترا اس زمانے میں ان باتوں کا یہودیوں میں اور مشرکوں میں نام ونشان بھی نہ تھا اور عیسائیوں میں یہ باتیں موجود تھیں، اگر کبھی عیسائیوں میں بھی یہ باتیں نہ رہیں تو وہ بھی مسلمانوں کے ان جیسے دشمن ہو سکتے ہیں، اس آیت میں ان باتوں میں سے دو باتیں بیان کی گئی ہیں باقی آگے بیان کی جائیں گی۔

ارشاد ہے کہ مسلمانوں سے یہودیوں اور مشرکوں کی دشمنی اور نسبتاً عیسائیوں کے قریب ہونے کی وجہ یہ ہے کہ عیسائیوں کے اندر اپنے آپ کو سب سے بڑا سمجھنے کی بیماری نہیں ہے، یہاں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اُس زمانے کے یہودی دین کے صحیح علم سے بالکل کورے تھے۔

اس کے برخلاف عیسائیوں نے مختلف موقعوں پر ظاہر کیا کہ ان میں دین کی باتوں کی سمجھ زیادہ ہے، ان سب سے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ یہودی سخت دل اور ضدی تھے اور یہ ان کی جہالت کی نشانی ہے، وہ مال ودولت

کے بہت لالچی تھے اور اپنے ہی نفع کی دھن میں ہر وقت رہتے تھے یہ دنیا کی محبت کی علامت ہے وہ اپنے آپ کو خواہ مخواہ سب سے بڑا سمجھتے تھے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تکبر میں مبتلا تھے جس میں یہ بری باتیں ہوں گی وہ نیک لوگوں کا دشمن ہوگا خواہ وہ یہودی ہو یا عیسائی یا مشرک۔

کسی قوم میں صاحبِ علم لوگوں کا ہونا نیک شگون ہے اور عاجزی اور درویشی بھی ایک اچھی صفت ہے اور ان لوگوں کی تعریف کی دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ تکبر نہیں کرتے تھے بلکہ یہودیوں کی اکڑ کے برخلاف یہ لوگ عاجزی کرتے تھے، چوتھی صدی کے بڑے مفسر قرآن امام ابوبکر جصاص رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں جن عیسائیوں کی تعریف بیان کی گئی ہے وہ یہی گروہ تھا اس تعریف کے مستحق تمام عیسائی نہیں ہیں۔

اس وفد کے بعد حبشہ کے بادشاہ نجاشی نے ایک دوسرا وفد بھی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں بھیجا تھا جس میں اسی (۸۰) یا ایک سوتیس (۱۳۰) آدمی تھے جن میں نجاشی کا بیٹا بھی شامل تھا مگر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ بحری سفر کے دوران یہ پورا قافلہ طوفان کی زد میں آ گیا اور ان میں سے کوئی بھی زندہ نہ بچ سکا، لہٰذا یہ وفد پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں نہ پہنچ سکا۔

اس سے پہلے خود مسلمان حبشہ کی طرف دو دفعہ ہجرت کر چکے تھے جس کا خاطر خواہ اثر ہوا اور وہاں کا بادشاہ اصحمہ نجاشی اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ ایمان لے آیا، جب مکہ کے مسلمانوں کو کافروں نے بہت زیادہ تکلیفیں دینا شروع کر دیں تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو حبشہ کی طرف ہجرت کر جانے کی اجازت دے دی، نجاشی عیسائی مذہب رکھتا تھا اور روم کے بادشاہ کے ماتحت تھا جب مسلمانوں کا دوسرا گروہ ہجرت کر کے حبشہ پہنچا تو نجاشی نے ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا، جب مکہ کے کافروں کو علم ہوا کہ مسلمانوں کو حبشہ میں پناہ مل گئی ہے تو انہوں نے اپنا ایک وفد نجاشی کے پاس بھیجا تاکہ اسے اس بات پر تیار کیا جا سکے کہ وہ مسلمانوں کو پناہ نہ دے بلکہ یہ مطالبہ کیا کہ ان حضرات کو ان کے حوالے کر دے، وفد کے لوگوں نے نجاشی کو ورغلانے کیلئے مختلف حربے استعمال کیے اور یہاں تک اس کے کان بھرے کہ مسلمان حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی (نعوذ باللہ) توہین کرتے ہیں اور انہیں غلام کہتے ہیں

نیز یہ کہ مسلمان عیسائی مذہب کے سخت مخالف ہیں، اگر چہ نجاشی پر اس بات کا بہت زیادہ اثر نہ ہوا تاہم اس نے مسلمانوں کو بلا کر ان کے دین اور عقیدوں کے متعلق پوچھا، اس کے جواب میں اسلامی وفد کے قائد حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ نے نجاشی کے دربار میں جو پراثر تقریر فرمائی وہ تاریخ میں محفوظ ہے۔

"آپ نے فرمایا کہ: اے بادشاہ! ہم ایک سخت جاہل قوم تھے، خود کے گھڑے ہوئے بتوں کی پوجا کرتے تھے، مردار کھاتے تھے، بدکاری کرتے تھے اور بے رحمی ہماری معاشرت کا جزء بن گیا تھا، ہم نہ ہمسایہ کے حقوق سے واقف تھے اور نہ اخوت وہمدردی سے واقف، ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے ہم میں ایک ایسا عظیم الشان پیغمبر بھیجا جس کے حسب نسب سے ہم واقف تھے اور جس کی صاف ستھری زندگی اور پاکدامنی ہمارے سامنے تھی، اس نے ہمیں جہالت کی تاریکی سے نکال کر ہدایت کی روشنی عطا کی، ہم اس پر ایمان لے آئے، شرک سے توبہ کی، حلال وحرام میں تمیز سیکھی، یہ ہمارا جرم ہے جس کی وجہ سے ہمیں آپ کے ملک میں پناہ لینے پر مجبور کیا گیا"۔

حبشہ کے بادشاہ پر اس کا بہت زیادہ اثر ہوا اور اس نے قریش کے وفد کو بتادیا کہ وہ ایسے نیکوکار لوگوں کو واپس کر کے ظلم وستم کا نشانہ نہیں بنانا چاہتا، نجاشی نے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ جو کلام تمہارے پیغمبر پر اترتا ہے وہ کیسا ہے؟ اس پر حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے "سورۂ مریم" تلاوت فرمائی جس کو سن کر نجاشی اور اس کے دربار کے علماء کے آنکھوں میں آنسو آگئے، نجاشی نے کہا کہ یہ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی توہین نہیں کرتے بلکہ اسی قسم کی بات کہتے ہیں جو خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہی تھی، "سورۂ مریم" میں صاف موجود ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ہیں، بہر حال نجاشی نے فریقین کی بات سننے کے بعد کہا کہ جاؤ تمہیں میرے ملک میں امن حاصل ہے اور تم اپنے دین پر قائم رہتے ہوئے جہاں چاہو رہائش اختیار کر سکتے ہو، اس پر مکہ کے مشرک ناکام واپس لوٹ آئے۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا کہ جن عیسائیوں کی یہاں تعریف کی گئی ہے وہ حبشہ کا وفد تھا تاہم عام عیسائیوں

کی اسلام دشمنی یہودیوں سے کسی طرح کم نہیں یہ لوگ بھی ابتداء سے لے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اتارے جانے تک اسلام کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے رہیں گے، یہودیوں کے پاس تو اقتدار نہیں تھا مگر عیسائی ہمیشہ برسرِ اقتدار رہے ہیں، لہٰذا انہوں نے ہر دور میں دشمنی کا مظاہرہ کیا ہے، ترکوں نے چارسوسال تک عیسائیوں کا مقابلہ کیا، زارِ روس بھی عیسائی تھا، اس کے ساتھ بھی مسلمانوں کی ٹکر ہوتی رہی، سلطان صلاح الدین ایوبی رحمۃ اللہ علیہ کے دور میں دوسوسال تک عیسائیوں اور مسلمانوں میں جنگیں ہوتی رہیں جو صلیبی جنگوں کے نام سے مشہور ہیں، جب عیسائیوں نے بیت المقدس پر قبضہ کیا تو چالیس ہزار بے گناہ انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا ان میں بچے بوڑھے اور عورتیں بھی شامل تھیں، پھر جب سلطان صلاح الدین ایوبی رحمۃ اللہ علیہ نے بیت المقدس پر دوبارہ قبضہ کیا تو کسی عیسائی کو ناحق قتل نہیں کیا گیا یہ بات تاریخ میں محفوظ ہے، اس وقت سے لے کر آج تک عیسائی مسلمانوں کے خلاف اپنی پوری قوت استعمال کرتے رہے ہیں، لبنان میں فلانگ پارٹی کے لوگ سب عیسائی ہیں جنہوں نے مسلمانوں کا جینا دوبھر کر رکھا ہے جب یہاں پر ایوب کی حکومت تھی اس وقت قبرص میں وہاں کے میکاریوس نے چالیس ہزار ترکوں کو ہلاک کیا، ادھر فلپائن میں مارکوس نے وہاں کے پچاس لاکھ مسلمانوں کو تنگ کر رکھا ہے انہیں قذاق مسلمان کہا جاتا ہے اور ان پر طرح طرح کی مصیبتوں کے پہاڑ توڑے جاتے ہیں وہاں پر بھی ہزاروں مسلمان عیسائیوں کے ہاتھوں قتل ہوچکے ہیں۔

انگریزوں کی اسلام دشمنی کی پوری تاریخ گواہ ہے کہ انہوں نے ایک ایک کرکے مسلمانوں کی کتنی حکومتیں ختم کیں، صلیبی جنگوں کے دوسوسالہ دور میں مسلمانوں کو جس طرح تباہ کیا گیا وہ عیسائیوں کی خونخواری کی منہ بولتی تصویر ہے، حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام کے اتارے جانے کا زمانہ جس قدر قریب آتا جائے گا مسلمانوں پر عیسائیوں کے ظلم وستم بڑھتے جائیں گے یہ اس بات کی دلیل ہوگی کہ حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام کے اتارے جانے کا زمانہ قریب آگیا ہے پھر جب آپ تشریف لے آئیں گے تو نہ کوئی یہودی باقی رہے گا اور نہ عیسائی ہر طرف اسلام ہی کا کلمہ بلند ہوگا۔

بعض انگریز پرست مسلمان بھی کہتے ہیں کہ انگریزوں کا دامن صاف ہے حالانکہ یہ قوم مسلمانوں کی عظیم ترین دشمن ہے جتنا نقصان اسلام کو اس قوم نے پہنچایا ہے کسی دوسری قوم سے نہیں پہنچا، انگریز نے پچھلی چار صدیوں میں مسلمانوں کی تہذیب وثقافت کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے انہوں نے مسلمانوں کی خلافت اور اس کے ساتھ مرکزیت کو ختم کیا ان کے کئی ملک چھین لیے اور انہیں غلام بنا لیا، امریکہ تو ابھی کل کا بچہ ہے یہ پرانے انگریز جنہوں نے اسلام دشمنی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا یہ سب عیسائی تھے، بہرحال اس آیت میں عیسائیوں کی جو تعریف کی گئی ہے وہ حبشہ کے لوگوں کے ارکان کی ہے نہ کہ سب عیسائیوں کی۔

نرم دل ہونے کی پہچان

الحزب ۲۰

وَ اِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ

اور جب سنتے ہیں جو اتارا گیا طرف پیغمبر کی تو دیکھیں گے آپ آنکھیں ان کی بہہ پڑتی ہیں

مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا

سے آنسوؤں اس وجہ سے کہ انہوں نے پہچان لیا سچی بات کو کہتے ہیں وہ اے رب ہمارے ایمان لائے ہم

فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۸۳﴾ وَ مَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ

پس لکھ لے ہم کو ساتھ گواہوں کے (۸۳) اور کیا ہوا ہم کو کہ نہ ایمان لائے ہم پر اللہ اور

مَا جَآءَنَا مِنَ الْحَقِّ ۙ وَ نَطْمَعُ اَنْ يُّدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ

اسکے جو آئی ہمارے پاس سچائی سے اور توقع رکھیں ہم یہ کہ داخل کرے ہم کو رب ہمارا ساتھ

الْقَوْمِ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۸۴﴾

قوم نیک بختوں کے (۸۴)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور جو کچھ پیغمبر پر اترا جب وہ اسے سنتے ہیں آپ دیکھے گے کہ ان کی آنکھوں سے

آنسو بہہ پڑتے ہیں چونکہ انہوں نے حق بات کو پہچان لیا، کہتے ہیں: اے ہمارے رب! ہم ایمان لائے سو آپ ہم کو ماننے والوں کیساتھ لکھ لیجئے۔ (۸۳) اور ہمیں کیا حق ہے کہ ہم ایمان نہ لائیں اللہ پر اور حق بات پر جو ہمارے پاس آئی ہے اور اسکی توقع رکھیں کہ ہمارا رب ہم کو نیک بختوں کیساتھ داخل کر دے گا۔ (۸۴)

لفظی تحقیق: تَفِیْضُ: یہ لفظ "فَیْضٌ" سے بنا ہے جس کے معنٰی ہیں کسی چیز سے بھر کر ابل پڑنا یہاں مراد یہ ہے کہ ان کی آنکھوں میں اتنے آنسو بھر آتے ہیں کہ باہر نکل پڑتے ہیں۔ شٰھِدِیْنَ: "شَاھِدٌ" کی جمع ہے وہ شخص جو کسی بات کو سچا کہے اور اس کو مانے۔

تفسیر

سب لوگ ایک جیسے نہیں ہوتے "سورۃ آلِ عمران" میں گزر چکا ہے "لَیْسُوْا سَوَآءً" یعنی سارے یہودی اور عیسائی برابر نہیں، پچھلی سورۃ میں بھی دو دفعہ اللہ تعالٰی کا یہ فرمان آ چکا ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں میں بعض اچھی خصلت کے لوگ بھی ہیں مگر ان کی تعداد بہت کم ہے، البتہ ان میں سے اکثر نافرمان ہیں، یہاں بھی جن لوگوں کی تعریف بیان کی گئی ہے وہ اچھی خصلت والے، اعتدال پسند، سادہ لباس اور عاجزی والے لوگ تھے، ان میں آسمانی کتابوں کے عالم اور درویش طبیعت لوگ تھے، ان کے متعلق اللہ تعالٰی نے فرمایا جس وقت وہ سنتے ہیں اس چیز کو جو پیغمبر کی طرف اتاری گئی ہے، آپ ان کی آنکھوں سے آنسو بہتے ہوئے دیکھیں گے، جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ وفد کے لوگ نے جب "سورۃ یٰسین" سنی تو ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، ان کا تفصیلی بیان چھٹے پارے کے آخر میں گزر چکا ہے بہر حال یہ آیت نجاشی اور اسکے ساتھیوں کے بارے میں اتری۔

اللہ تعالٰی کا کلام سن کر ان کی آنکھوں میں آنسو آ جانا اس وجہ سے تھا کہ انہوں نے حق کو پہچان لیا تھا، "سورۃ یٰسین" میں اسلام کے تمام بنیادی عقیدوں کا بیان ہے، اس میں توحید، پیغمبری، قیامت، قرآن کریم کے حق ہونے اور دوسرے تمام اہم باتیں اس سورۃ میں موجود ہیں، چنانچہ وفد کے لوگ یہ سچا کلام سن کر رو دیئے، انہوں نے حق کو پہچان لیا اور کہنے لگے اے ہمارے پروردگار! ہم ایمان لائے ہیں۔

اس آیت میں اس زمانے کے یہودیوں اور عیسائیوں میں فرق دکھایا گیا ہے کہ یہودی اتنے سخت دل تھے کہ قرآن پاک سن کر اس کی ہنسی اڑاتے تھے، دوسری طرف عیسائی قرآن کریم سن کر اس کی سچائی کی تاثیر سے روتے تھے، ایک تو جس وقت مکہ مکرمہ سے کچھ مسلمان مجبور ہو کر حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے اور وہاں کے بادشاہ نجاشی کو قرآن شریف کی "سورۂ مریم" سنائی تو بادشاہ پر اتنا اثر ہوا کہ وہ رونے لگا اور قرآن شریف کی سچائی کو مان گیا۔

دوسرے جب مدینہ منورہ میں کچھ عیسائی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاس عیسائیوں کے نمائندے بن بن کر آئے تو قرآن شریف کو سن کر ان پر اتنا اثر ہوا کہ ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور وہ ایمان لے آئے اور کہہ اٹھے کہ اے ہمارے رب! ہم اس پر ایمان لائے، ہم کو ایمان لانے والوں میں لکھ لیجئے اور کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس پر ایمان نہ لائیں اور ہمارے پاس جو سچی بات پہنچی ہے اسے نہ مانیں اور پھر امید رکھیں کہ اللہ تعالیٰ ہم کو اپنے نیک بندوں میں شامل کر لیں گے۔

ایمان کا بدلہ

فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوْا جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ

پس ثواب دیا انکو اللہ نے بدلے اسکے جوانہوں نے کہا ایسے باغات کہ چلتی ہیں سے جن کے نیچے نہریں

خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ؕ وَ ذٰلِكَ جَزَآءُ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۸۵﴾ وَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا

ہمیشہ رہنے والے ہیں میں اس اور یہ ہے بدلا نیکی کرنے والوں کا (۸۵) اور جو لوگ کافر ہوئے

وَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَاۤ اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَحِیْمِ ﴿۸۶﴾ ع ۹

اور جھٹلایا آیتوں ہماری کو وہ ہیں والے دوزخ (۸۶)

بامحاورہ ترجمہ:۔ پھر ان کے اس کہنے پر اللہ نے ان کو بدلے میں ایسے باغات دیئے کہ جن کے نیچے

نہریں بہتی ہیں ان میں ہی رہا کریں اور یہ نیکی کرنے والوں کا بدلہ ہے۔(۸۵) اور جو لوگ انکاری ہوئے اور ہماری آیتوں کو جھٹلانے لگے وہ دوزخ والے ہیں۔(۸۶)

لفظی تحقیق: اَثَابَ: بدلہ دیا۔ یہ "اِثَابَةٌ" سے ہے جو ثواب سے بنا ہے ثواب کے معنیٰ ہیں نیک بدلہ، "اِثَابَةٌ" کے معنیٰ ہیں: بدلہ دینا۔ اَصْحٰبُ: ساتھی۔ "صَاحِبُ" کی جمع ہے جو "صُحْبَتٌ" سے بنا ہے، "صُحْبَتٌ" کے معنیٰ ہیں: ساتھ ہونا۔ "صَاحِبُ" کے معنیٰ ہیں: ساتھی، دوست، کسی چیز کے ساتھ ہمیشہ رہنے والا، کسی لفظ کے ساتھ مل کر اس کے معنیٰ "والا" کر لئے جاتے ہیں، مثلاً: اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ: جنت والے، اَصْحٰبُ النَّارِ: دوزخ والے۔

تفسیر

جن لوگوں نے پیغمبر ﷺ سے قرآن مجید سنا اور کہا کہ یہ سچے پیغمبر ہیں اور یہ سچی کتاب ہے ان کیلئے ان کے اس کہنے کے بدلے میں اللہ تعالیٰ نے بڑا اچھا انعام تیار کر رکھا ہے جو ان کو آخرت میں دیا جائے گا اور چونکہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ضرور پورا ہوگا اس لئے اس آیت میں اس کو اس طرح کہا گیا ہے کہ "دے دیا گیا" یہ لوگ جو قرآن مجید سن کر ایمان لے آئے عیسائیوں میں بہت زیادہ تھے اور یہودیوں میں بہت کم، اسی لئے پچھلی آیتوں میں کہا گیا ہے کہ یہودی مسلمانوں کے سخت دشمن ہیں اور عیسائی اتنے سخت نہیں، اس کے بعد کہا گیا ہے کہ یہ بات صرف یہودیوں اور عیسائیوں کیلئے نہیں بلکہ جس قوم میں یہ باتیں ہوں گی، یعنی: دین کا علم، دنیا سے دل ہٹا ہوا ہونا اور تکبر نہ ہونا، وہ قوم مسلمانوں سے جلد محبت کرنے لگے گی ورنہ پھر وہ مسلمانوں کے سخت دشمن ہوں گے۔

ارشاد ہے کہ: اللہ تعالیٰ ایمان لانے والوں کو بدلے میں سرسبز و شاداب باغوں میں رہنے کی جگہ دیں گے، جس میں خوش گوار نہریں بہتی ہوں گی اور ان کے رہنے کی جگہ ہمیشہ کیلئے وہی ہوگی، نیک لوگوں اور اچھے عمل والوں کا بدلہ یہی ہے۔

آگے ارشاد ہے کہ: جو لوگ ہماری اتاری ہوئی آیتوں کو جھوٹی بتلاتے ہیں ان لوگوں کی سزا یہ ہے کہ وہ

ہمیشہ دوزخ کی آگ میں جلتے رہیں گے۔

یہودیوں اور عیسائیوں کا طریقۂ کار

قرآن مجید انسان کو اس دنیا میں اس راستہ پر چلنا سکھاتا ہے، جس پر چلنے سے اس کو دنیا میں چین اور آرام ملے اور مرنے کے بعد بھی اس کو ہمیشہ کی راحت نصیب ہو، حقیقت میں انسان کیلئے یہی مقصد ہے، اس کو چھوڑ کر وہ جو راستہ بھی اختیار کرے گا پچھتائے گا اور اگر اس دنیا میں ظاہری طور پر بڑی آفتوں سے بچا ہوا بھی نظر آئے پھر بھی اس کو اصلی خوشی نہیں حاصل ہوسکتی اور مرنے کے بعد تو یقیناً اس کو بڑی سخت سزا بھگتنی پڑے گی۔

قرآن مجید کے سمجھانے کا طریقہ اس قدر عجیب وغریب ہے کہ ہو ہی نہیں سکتا کہ کوئی اس پر ٹھنڈے دل سے غور کرے اور اس کی سمجھ میں نہ آئے لیکن مشکل یہ ہے کہ اس پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا ہر ایک کو آسانی سے نصیب نہیں ہوتا۔

اس سورۃ میں بہت پہلے سے کافروں، مشرکوں، یہودیوں، عیسائیوں اور منافقوں کا کچا چٹھا کھولا جارہا ہے اور مقصود یہ ہے کہ جس کی قسمت میں بچنا ہو ان برائیوں سے بچے اور صحیح راستہ اختیار کرے، ان پانچوں قسم کے لوگوں میں سے جس کا جی چاہے ایمان لا کر اور نیک کام کر کے اپنی دنیا اور آخرت سنوار لے ورنہ وہ پچھتائے گا اور ایک وقت آئے گا کہ وہ سر پکڑ کر روئے گا۔

یہودیوں اور عیسائیوں کا ذکر زیادہ اس لئے کیا گیا ہے کہ ان سے توقع تھی کہ یہ بات کو سمجھیں گے اور خود بھی گمراہی سے رکیں گے اور دوسروں کو بھی روکیں گے لیکن یہودیوں کا یہ حال تھا کہ پہلے زمانہ میں نیک ہونے کا اقرار کر کے پھر گئے اور اپنے نصیحت کرنے والوں کو تکلیفیں پہنچائیں یہاں تک کہ پیغمبروں تک کو قتل کر ڈالا، عیسائی ان سے کسی قدر بہتر تھے انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ وہ نفرت نہیں برتی جیسی یہودیوں نے برتی لیکن افسوس ہے کہ انہوں نے بھی اسلام کو اور پیغمبر کو نہ مانا اور اپنے ہی خیالات میں پھنسے رہے، آخر میں جو سبق سکھایا ہے وہ یہ ہے کہ اسلام سے وہ شخص فائدہ اٹھائے گا جو دین کا علم سیکھے گا اور دنیا سے زیادہ دل نہ لگائے گا اور

اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا نہ سمجھے گا، یعنی: تکبر میں مبتلا نہ ہوگا، عیسائیوں میں پہلے یہی باتیں تھیں اور یہودی ان سے کورے تھے اس لئے ان کے دل بنسبت یہودیوں کے اسلام کی طرف جلد مائل ہو جاتے تھے۔

حلال کو حرام نہ ٹھہراؤ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ

اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! مت حرام کرو پاکیزہ چیزیں جو حلال کیں اللہ نے

لَكُمْ وَ لَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝۸۷ وَ

لئے تمہارے اور مت حد سے بڑھو بیشک اللہ نہیں پسند کرتا حد سے بڑھنے والوں کو (۸۷) اور

كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۪ وَّ اتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ

کھاؤ اس میں سے جو دیا تم کو اللہ نے حلال پاکیزہ اور ڈرو اللہ سے وہ

اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ۝۸۸

کہ تم جس پر ایمان لانے والے ہو (۸۸)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اے مسلمانوں! وہ لذیز چیزیں جو اللہ نے تمہارے لئے حلال کر دیں حرام مت ٹھہراؤ اور حد سے مت بڑھو بیشک اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔ (۸۷) اور اللہ کے دیئے ہوئے میں سے جو چیز حلال پاکیزہ ہو کھاؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو جس پر تم ایمان رکھتے ہو۔ (۸۸)

تفسیر

قرآن مجید لوگوں کو سیدھے راستہ پر چلانا چاہتا ہے کہ جو باتیں فائدے کی ہیں انہیں اختیار کیا جائے اور جو نقصان پہنچانے والی ہیں انہیں چھوڑ دیا جائے اس لئے اس کی آیتوں میں ”امر“ بھی ہے اور ”نہی“ بھی، امر کے معنٰی ہیں کسی چیز کے کرنے کا حکم، ”نہی“ کے معنٰی ہیں کسی چیز کے نہ کرنے کا حکم، یہ حکم کہیں تو صاف صاف ہیں کہ

یہ کرو یہ مت کرو اور کہیں دوسرے لوگوں کے حالات ایسے طریقے سے بیان کیے گئے ہیں جن سے سوچنے پر معلوم ہوجاتا ہے کہ ان کی اچھی باتیں ہمیں اختیار کرنی چاہئیں اور ان کی بری باتیں ہمیں چھوڑ دینی چاہئیں، یہودیوں میں یہ برائی ہے کہ دین سے بے پرواہ ہیں اور خواہشوں کی پیروی میں لگ گئے ہیں، عیسائی دین میں بہت کچھ اپنی طرف سے بڑھا کر اسے بھی دین سمجھتے ہیں۔

ارشاد ہے کہ اچھی اور صاف ستھری چیزوں کو جو تمہارے لئے حلال ہیں کھاؤ پیو، لیکن دین کی حد کے اندر رہو نہ اس میں کمی کرو نہ زیادتی، یہودیوں نے حرام چیزوں کو اپنے لئے حلال کر کے جو جی چاہا کیا، عیسائیوں نے حلال چیزوں کو بھی چھوڑ دیا اور جوگی اور راہب بن گئے، تمہیں چاہئے کہ اس کمی زیادتی سے بچو، اور اللہ تعالیٰ کا ڈر اور خوف دل میں پیدا کرو اور اس کی مہربانیوں سے اسی کے حکم مانو اور اپنی خواہشوں کے مطابق فیصلے نہ کرو۔

حلال کو حرام قرار دینے کی صورتیں

مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں کہ کسی حلال چیز کو حرام قرار دینے کی تین مختلف صورتیں ہیں: اور ان کے حکم بھی مختلف ہیں، پہلی صورت یہ ہے کہ: جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے حلال قرار دیا ہے کوئی شخص اگر اس کو حرام سمجھنے لگے تو وہ کافر ہو گیا، مثلاً: کوئی اونٹ یا گائے کو حرام سمجھے، کسی حلال چیز کو حرام سمجھنے والا آدمی اسلام سے نکل جاتا ہے، اسی طرح اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حلال سمجھتا ہے تو وہ بھی کافر ہو جاتا ہے، مثلاً: کتے یا خنزیر کو حلال سمجھے۔

حلال وحرام ہونے کی دوسری صورت یہ ہے کہ: کوئی شخص عقیدے کے طور پر تو حرام کو حلال یا حلال کو حرام نہیں سمجھتا مگر صرف اپنی زبان سے اس چیز کو حرام کہہ دیتا ہے، جیسے: کوئی شخص قسم اٹھالے کہ اگر میں نے فلاں چیز کھائی تو وہ میرے لئے خنزیر جیسی ہے یہ چیز کفر تو نہیں البتہ قسم کے دائرہ میں آتی ہے اور اس کا ذکر اگلی آیت میں آرہا ہے بہر حال اگر کسی شخص نے کسی حلال چیز کو استعمال نہ کرنے کی قسم اٹھائی ہے تو اسے چاہئے کہ وہ اپنی قسم توڑ

دے اور اس کا کفارہ ادا کرے اور اگر قسم نہیں اٹھائی ہے ویسے ہی کوئی بیہودہ بات کہہ دی ہے تو اسے توبہ کرنے کا حکم دیا جائے گا کفارہ ادا نہیں کرنا پڑے گا۔

صراحتاً قسم کے الفاظ ہوں یا ان سے قسم کا مطلب نکلتا ہو تب بھی کفارہ ادا کرنا ضروری ہوجاتا ہے، "سورۂ تحریم" میں اس کی مثال موجود ہے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے شہد کے متعلق فرمادیا تھا کہ میں اسے استعمال نہیں کروں گا تو اللہ تعالیٰ کا حکم آ گیا کہ آپ ایسی چیز کو اپنے اوپر کیوں حرام قرار دیتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے آپ کیلئے حلال قرار دی ہے اور پھر ساتھ ہی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری قسموں کا کفارہ مقرر کردیا ہے لہٰذا پاکیزہ چیزوں کو استعمال کرو اور قسم کا کفارہ ادا کرو۔

حلال وحرام کی تیسری صورت یہ ہے کہ: کوئی شخص کسی حلال چیز کو ثواب کا کام سمجھ کر چھوڑ دے اور سمجھے کہ ایسا کرنے سے اللہ تعالیٰ کی نزدیکی حاصل ہوگی تو اس کو سادھوپن اور بدعت کہا جاتا ہے اور اس کی مخالفت کرنا ضروری ہوجاتا ہے کیونکہ اسلام میں سادھوپن کی کوئی گنجائش نہیں ہے، سادھوپن کی مثالی صورت یہ ہے کہ کوئی ثواب کا کام سمجھ کر یا اللہ تعالیٰ کی نزدیکی حاصل کرنے کی خاطر نکاح نہ کرے کسی حلال اور لذیذ چیز کا کھانا چھوڑ دے یہ سب سادھوپن کے دائرہ میں آتا ہے اور اسلام نے اس کی اجازت نہیں دی بلکہ اس کی برائی بیان کی ہے۔

حلال کو چھوڑنے کی جائز صورت یہ ہے کہ انسان کسی چیز کے چھوڑنے کو ثواب سمجھے بغیر کسی جسمانی یا روحانی بیماری کے علاج کیلئے ایسا کرے، مثلاً: بعض آدمی بعض سبزیاں نہیں کھاتے کہ جسمانی طور پر ان کیلئے نقصان دہ ہوتی ہیں، بعض لوگوں کو گائے کا گوشت موافق نہیں آتا، بعض بیماریوں میں گھی اور دودھ کا استعمال صحت کیلئے نقصان دہ ہوتا ہے لہٰذا ان چیزوں کو چھوڑ دیا جاتا ہے مگر ثواب یا اللہ تعالیٰ کے قریب ہونے کا ذریعہ سمجھ کر نہیں بلکہ پرہیز کی غرض سے ایسا کیا جاتا ہے، اسی طرح بعض روحانی بیماریوں کیلئے بھی حلال چیزوں کو کچھ وقت کیلئے چھوڑ دیا جاتا ہے، بزرگانِ دین جو اس قسم کے علاج تجویز کرتے ہیں وہ جائز ہے اور اس سے کوئی گناہ لازم نہیں

آ تا، بعض اوقات بزرگ عبادت میں مشغولیت کیلئے کم کھانے کو تجویز کرتے ہیں مگر نہ تو وہ کھانے کو حرام سمجھتے ہیں اور نہ کم کھانے کو ثواب کے کام میں داخل کرتے ہیں۔

طیب، یعنی: پاکیزہ چیز میں ظاہری پاکیزگی کا ہونا بھی لازم ہے گندی اور ناپاک چیز کا استعمال جائز نہیں، قرآن پاک میں "سورۂ اعراف" میں پیغمبر کا ایک وصف یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ وہ پاکیزہ چیزوں کو حلال اور ناپاک چیزوں کو حرام قرار دیتے ہیں اسی لئے محدثین اور فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ پکا ہوا سالن حلال اور پاکیزہ ہے لیکن اگر وہ گل سڑ جائے اور اس میں بدبو پیدا ہو جائے تو وہ سالن مکروہ ہو جائے گا۔

مؤمنوں کو حکم ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہیں جو کہ ہمارے خالق اور مالک ہیں، اس آیت میں واضح فرما دیا کہ حلال اور پاک چیزوں کو ثواب سمجھ کر چھوڑ دینا تقویٰ (پرہیزگاری) نہیں بلکہ تقویٰ اس میں ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی نعمت سمجھ کر استعمال کرے اور شکرادا کرے، ہاں! کسی جسمانی یا روحانی مرض کی وجہ سے علاج کے طور پر کسی چیز کو چھوڑے تو وہ اس میں داخل نہیں۔

قسموں کے حکم

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْۤ اَيْمَانِكُمْ وَ لٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ

نہیں | پکڑتا تم کو | اللہ | بوجہ بیہودہ کے | میں | قسموں تمہاری | اور | لیکن | پکڑتا ہے تم کو

بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ ۚ فَكَفَّارَتُهٗۤ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ

بوجہ اسکے کہ | مضبوط باندھو تم | قسموں کو | پس کفارہ اس کا | کھانا کھلانا ہے | دس | محتاجوں کو

مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ؕ

درمیانی درجہ کا | جو | کھلاتے ہو تم | گھروالوں اپنے کو | یا | کپڑا پہنانا ان کو | یا | آزاد کرنا | ایک گردن (غلام) کا

بامحاورہ ترجمہ:۔ اللہ تم کو تمہاری لغو قسموں پر نہیں پکڑتے لیکن اس پر پکڑتے ہیں جو قسمیں تم نے سنجیدگی

سے کھائیں سواس کا کفارہ دس محتاجوں کو کھانا دینا ہے درمیانے درجوں کا کھانا جو تم اپنے گھر والوں کو دیتے ہو، یا دس محتاجوں کو کپڑا پہنا دینا یا ایک غلام یا باندی کو آزاد کرانا۔

لفظی تحقیق: لَا یُؤَاخِذُکُمْ: نہیں پکڑتا۔ "مُؤَاخَذَۃٌ" سے بنا ہے، "اَخْذٌ" کے معنیٰ ہیں تھامنا، پکڑنا، "مُؤَاخَذَۃٌ" کے معنیٰ ہیں کسی بات پر جواب طلب کرنا، سزا دینا۔ لَغْوٌ: بیکار، بیہودہ۔ وہ کام جو بے ارادہ ہوجائے، یہاں مراد وہ قسم ہے جو بغیر ارادہ کے منہ سے نکل جائے۔ اَیْمَانٌ: قسمیں۔ "یَمِیْنٌ" کی جمع ہے۔ عَقَّدْتُّمْ: باندھ لو تم۔ اس سے مراد ہے جان بوجھ کر سنجیدگی سے قسم کھانا۔ کَفَّارَۃٌ: وہ چیز جس کی ادائیگی سے گناہ جھڑتے اور معاف ہوتے ہیں۔

تفسیر

حلال چیزوں کو حرام کر لینے کی ایک صورت یہ تھی کہ لوگ قسمیں کھا لیتے اور اگر کوئی کسی چیز یا بات کے نہ کرنے کی قسم کھالے تو اس چیز یا بات کو وہ نہیں کرسکتا اگر وہ کرلے تو اسے اس کی سزا بھگتنی پڑے گی جس کو قسم کا کفارہ کہتے ہیں۔

قسم کی قسمیں

قسم کی تین قسمیں ہیں: لغو، غموس اور منعقدہ، لغو کا معنیٰ بیہودہ ہوتا ہے، یعنی: ایسی قسم جو بغیر ارادہ اور نیت کے زبان سے نکل جائے، عربوں کے ہاں یہ عام محاورہ تھا کہ وہ بات بات پر قسم اٹھاتے تھے حالانکہ ان کا دلی ارادہ قسم اٹھانے کا نہیں ہوتا تھا محض زبان پر قسم کے الفاظ جاری ہوجاتے تھے، ایسی قسم پر نہ کوئی پکڑ ہے اور نہ اس کا کفارہ ادا کرنا پڑتا ہے؛ لغو ہی کی دوسری قسم غموس ہے اور اس میں آدمی گناہ گار تو ہوتا ہے البتہ اس پر کفارہ نہیں، اور یہ قسم یہ ہے کہ کوئی گزرتے ہوئے زمانہ میں کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کی قسم اٹھائے تو یہ یمین غموس ہے، کیونکہ غمس کا معنیٰ ہے غوطہ دینا، جھوٹی قسم انسان کو گناہ میں غوطہ دے دیتی ہے۔

لغو قسم کے متعلق "سورۂ بقرہ" میں بھی آیت گزر چکی ہے، "اللہ تعالیٰ پکڑ نہیں فرماتے تمہاری لغو قسموں پر مگر ان قسموں پر پکڑ ہے جو تم سنجیدگی سے یعنی دل کے ارادے سے اٹھاتے ہو"۔ پکڑ میں دنیا اور آخرت دونوں کی پکڑ شامل ہیں، دنیاوی پکڑ یہ ہے کہ قسم توڑنے والے کو کفارہ ادا کرنا پڑتا ہے اور آخرت میں پکڑ ہو سکتی ہے، بہر حال اس آیت میں بھی قسم کے متعلق ویسے ہی الفاظ ہیں، یعنی: اللہ تعالیٰ تم سے تمہاری بیہودہ قسموں کے متعلق پکڑ نہیں فرماتے بلکہ ان قسموں پر پکڑ فرماتے ہیں جو پکے طریقے سے یعنی دل کے ارادے سے سنجیدگی سے اٹھاتے ہو، قسم کی اس تیسری قسم کو منعقدہ کہا جاتا ہے، اس قسم کا تعلق مستقبل سے ہوتا ہے کہ کوئی شخص یوں قسم اٹھائے کہ میں آئندہ فلاں کام کروں گا یا نہ کروں گا، اگر ایسی قسم کسی جائز کام کیلئے ہے اور اس شخص نے قسم کو پورا کر دیا تو اس پر کوئی گناہ نہیں اور اگر اس جائز قسم کو توڑ دیا ہے تو اس کا کفارہ ادا کرنا ہوگا جس کا ذکر آگے آ رہا ہے اور اگر یہی قسم کسی ناجائز کام کیلئے ہے تو اس کا توڑنا واجب ہو جاتا ہے۔

ایسی ہی قسم کے کفارے کے متعلق ارشاد ہوتا ہے کہ اس کا کفارہ دس مسکینوں اور محتاجوں کو درمیانے درجے کا کھانا کھلانا ہے جو تم اپنے گھر والوں کو کھلاتے ہو، مقصد یہ ہے کہ کھانا درمیانی درجے کا ہو نہ ایسا کمتر کہ بالکل خشک روٹی ہو اور نہ بہت اعلیٰ درجہ کا جس میں کئی قسم کے کھانے ہوں درمیانی درجے میں عام روٹی سالن آ سکتا ہے جو عام طور پر لوگ گھروں میں کھاتے ہیں۔

احکام و مسائل

مسئلہ (۱):.... دس مسکینوں کو دو وقت کھانا خواہ گھر بلا کر کھلا دے یا ان کے ٹھکانے پر پہنچا دے۔

مسئلہ (۲):.... مسکین میں وہ لوگ شمار ہوں گے جو زکوٰۃ کے مستحق ہوں ان میں بالغ ہونے کی شرط نہیں، بالغ ہوں یا بالغ ہونے کے قریب ہوں ان کو کھلانے سے کفارہ ادا ہو جائے گا، البتہ بہت چھوٹے بچے اور ایسے بیمار جو پورا کھانا نہیں کھا سکتے وہ ان میں شامل نہیں ہوں گے۔

مسئلہ (۳):.... کفارہ کی دوسری صورت یہ بھی ہے کہ کھانا پکا کر کھلانے کے بجائے ہر مسکین کو روزے کے فدیہ کے برابر اناج دے دے اس لئے پونے دو کلو یا احتیاطاً دو کلو خالص گندم یا اس کا آٹا یا پھر اس کی قیمت دے دے۔

مسئلہ (۴):.... کفارہ ادا کرنے کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ دس مسکینوں کو کپڑا پہنا دے، کپڑے کی مقدار کے متعلق فقہائے کرام اور محدثین عظام فرماتے ہیں کہ ہر مسکین کو اتنا کپڑا دینا چاہئے جس سے اس کا پورا جسم ڈھک جائے، مثلاً: ایک بڑا کرتہ یا بڑی چادر دے دے تو کفارہ ادا ہو جائے گا، ایک بڑی شلوار سے بھی جسم کا اکثر حصہ ڈھک جاتا ہے، لہٰذا یہ بھی دی جاسکتی ہے تاہم بہتر یہ ہے کہ ہر ایک کو ایک ایک جوڑا کپڑے دے دے جسے پہن کر آدمی آسانی سے نماز ادا کر سکے۔

مسئلہ (۵):.... قسم کے کفارے کی تیسری صورت غلام یا باندی آزاد کرنا ہے، اسلام نے مختلف طریقوں سے غلاموں کو آزاد کرنے کی ترغیب دی ہے، "مسلم شریف" کی روایت میں آتا ہے کہ کسی غلام کو آزاد کرنے والے شخص کا ہر ہر عضو اس آزادی کے بدلے میں جہنم کی آگ سے آزاد ہو جائے گا، مختلف شرعی سزاؤں میں غلام کی آزادی کو کفارہ قرار دیا ہے، چنانچہ روزہ توڑنے کا کفارہ، قتل کا کفارہ اور قسم کا کفارہ غلام کی آزادی میں رکھا، صرف قتل کے کفارہ میں مؤمن غلام کی آزادی شرط ہے دیگر سزاؤں میں مؤمن یا کافر بچہ یا بڑا، عورت یا مرد کوئی بھی کفارہ کے طور پر آزاد کیا جاسکتا ہے، غرضیکہ قسم کے کفارہ کے متعلق فرمایا کہ: دس مسکینوں کو کھانا کھلائے یا انہیں کپڑا پہنائے یا ایک غلام آزاد کرے۔

مسئلہ (۶):.... اگر کوئی شخص ان تینوں میں سے کسی چیز کی بھی قدرت نہیں رکھتا تو لگاتار تین روزے رکھ لے جس کی اگلی آیت میں تفصیل آرہی ہے۔

قسموں کے مزید احکام

فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ۭ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ

پس جو نہ پائے تو روزے رکھے تین دن کے یہ کفارہ ہے قسموں تمہاری کا

اِذَا حَلَفْتُمْ ۭ وَ احْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ

جب تم قسم کھالو اور حفاظت کرو قسموں اپنی کی اسی طرح بیان کرتا ہے اللہ لئے تمہارے

اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۸۹﴾

حکم اپنے تاکہ تم شکر کرو (۸۹)

بامحاورہ ترجمہ:۔ پھر جس کو یہ چیزیں میسر نہ ہوں تو تین دن کے روزے رکھنے لازم ہیں یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے جب تم قسم کھا بیٹھو اور اپنی قسموں کی حفاظت رکھو، اللہ تعالیٰ اپنے حکم اسی طرح بیان کرتے ہیں تاکہ تم احسان مانو۔(۸۹)

لفظی تحقیق: حَلَفْتُمْ: ''حَلَفَ'' سے ہے جس کے معنیٰ قسم کے ہیں، اس آیت میں قسم کیلئے دو الفاظ آئے ہیں، ''حَلَفَ'' اور ''يَمِيْن'' جس کی جمع ''اَيْمَانٌ'' ہے۔

تفسیر

کفارے کی تین صورتیں بیان کرنے کے بعد فرمایا: جو شخص ان تین میں سے کوئی صورت نہ پائے، یعنی: نہ تو وہ کھانا کھلانے کی استطاعت رکھتا ہو اور نہ کپڑا پہنانے کی اور نہ غلام آزاد کرنے کی، تو تین دن کے روزے رکھے یہ کفارہ کی چوتھی صورت ہوگی بشرطیکہ پہلی تین صورتوں میں سے کسی پر بھی قدرت نہ ہو، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت میں آتا ہے کہ یہ تین روزے لگاتار رکھنا ہوں گے ان کے درمیان وقفہ نہیں ہونا چاہئے، فقہائے کرام یہ بھی فرماتے ہیں کہ اگر کسی شخص نے

کفارے کے دوروزے رکھے اور اس کے بعد اس کے پاس اتنا مال آ گیا جس سے وہ دس مسکینوں کو کھانا کھلا سکتا ہے یا کپڑا پہنا سکتا ہے یا ایک غلام آزاد کر سکتا ہے، تو روزوں سے کفارہ ادا نہیں ہوگا بلکہ اسے پہلی تین صورتوں میں سے کوئی ایک صورت اختیار کرنی ہوگی۔

قسم توڑنے کا کفارہ قسم کے توڑنے سے پہلے ادا کرنا چاہئے یا قسم کے ٹوٹ جانے کے بعد؟ جواب اس کا یہ ہے کہ قسم ٹوٹنے سے پہلے کفارہ ادا نہیں کیا جا سکتا۔

قسم اٹھانا کوئی اچھی بات نہیں اس سے بچنے کی کوشش کرو اور اگر کسی معاملہ میں گواہ موجود نہ ہوں اور قسم کے بغیر چارہ نہ ہو تو پھر اس کی بھی اجازت ہے اور اس کا پورا کرنا بھی ضروری ہے، اگر قسم اٹھا کر توڑ دی جائے تو کفارہ کی ادائیگی لازم ہو جائے گی، قسم کی حفاظت کا یہی مطلب ہے۔

یاد رہے! قسم صرف اللہ تعالیٰ کے نام کی کھائی جا سکتی ہے اس کے علاوہ کسی دوسرے کے نام کی قسم درست نہیں ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جو آدمی قسم اٹھاتا ہے اس کے پاس دلیل نہیں ہوتی اور نہ گواہ پیش کر سکتا ہے تب وہ قسم اٹھاتا ہے۔

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ: اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اپنی آیتیں بیان فرماتے ہیں، آیت کا معنیٰ دلیل، نشانی، معجزہ یا حکم ہوتا ہے، یہاں پر حلال وحرام کے حکم مراد ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں واضح طور پر بیان فرما دیا ہے کہ کون کون سی چیز حلال ہے اور کون سی حرام ہے، یہ اس وجہ سے ہے تاکہ تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کر سکو، اس نے تمہیں جہالت سے نکال کر واضح راستہ بتا دیا ہے کہ فلاں فلاں مشکل کا فلاں فلاں حل ہے ان حکموں کے ذریعے تم گناہ سے بچ سکتے ہو اور اپنے آپ کو پاک کر سکتے ہو لہٰذا ان حکموں پر عمل کر کے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرو۔

کھانے پینے کی حلال وحرام چیزوں کا ذکر اس سورۃ میں خاص طور پر کیا گیا ہے، پچھلی سورتوں میں خون، مردار، خنزیر کے گوشت اور اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کے نام کی منت ماننے کا ذکر ہو چکا ہے، بعض حلال وحرام چیزوں کا ذکر یہاں بھی آ گیا ہے اس کے بعد اگلی آیت میں بعض دیگر حرام چیزوں کا ذکر آ رہا ہے۔

شراب اور جوا

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَيْسِرُ وَ الْاَنْصَابُ

اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو! اس کے سوا کچھ نہیں کہ شراب اور جوا اور بت

وَ الْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ

اور پانسے گندگی ہے سے کام شیطان کے پس بچو تم ان سے

لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿٩٠﴾

تا کہ تم فلاح پاؤ (۹۰)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اے ایمان والو! بات یہی ہے کہ شراب اور جوا اور بت اور پانسے یہ سارے گندے کام شیطانی عمل ہیں، سو ان سے بچتے رہو، تا کہ تم نجات پاؤ۔ (۹۰)

لفظی تحقیق: اَنْصَابُ: تھان یا استھان۔ بت کے نام کی جگہ مقرر کر کے ان کے نام پر ذبح کرنا، یہ لفظ شروع سورت میں گزر چکا ہے۔ اَزْلَامُ: تیر۔ ''زَلَمٌ'' کی جمع ہے، پانسہ ان سے عرب جوا کھیلتے تھے اور بتوں کے پاس بھی یہ تیر رکھے رہتے تھے جن پر اس طرح کے حکم جیسے: کرو، نہ کرو، اچھا ہے، برا ہے وغیرہ جملے لکھے ہوتے تھے، جب کوئی کام کرنا ہوتا تو ایک تیر ان میں سے کھینچ لیتے اور جو اس میں لکھا ہوا نکلتا تھا، اس کے مطابق عمل کرتے تھے گویا یہ بت کا حکم حاصل کرنے کا ایک طریقہ تھا۔

تفسیر

اس آیت میں صاف صاف حکم بتا دیا ہے کہ تم چار چیزوں کے پاس نہ پھٹکو، شراب، جوا، بت اور پانسے، قرآن کریم کے اترنے سے پہلے عربوں کو ان چار چیزوں کی بڑی عادت تھی، جب قرآن مجید نے انسان کو اس دنیا میں رہنے کا اصلی طریقہ سکھایا تو پہلے پہل شراب سے سختی کے ساتھ منع نہیں کیا شراب بھی چلتی رہی اور دین کے

حکم بھی جاری ہوتے رہے، آخر تجربے نے یہی بتلایا کہ شراب پینے والے دین کے کام جیسے کرنے چاہئیں نہیں کرسکتے بلکہ بعض وقت جو کام نہ کرنے چاہئیں وہ نشہ کی حالت میں کر بیٹھتے ہیں، جب سمجھ دار لوگوں کو یقین ہوگیا کہ دین اور شراب ساتھ نہیں چل سکتے تو انہوں نے شراب کے بارے میں صاف صاف حکم چاہا۔

پہلے ایسی آیتیں اتریں جن میں شراب سے رفتہ رفتہ روکا جاتا رہا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اس بری چیز سے لوگوں کو مکمل طور پر روک دیا جائے، تو یہ آیت اتری اور اس میں چار چیزوں کو گندگی ٹھہرایا، یعنی: ان سے ایسے بچو، جیسے: گندی چیزوں سے بچتے ہو، کیونکہ ان کے ذریعے شیطان اپنا مطلب نکالتا ہے اور انسان کو تباہ و برباد کرتا ہے اور یہی چیزیں ساری گندی باتوں کی جڑ ہیں، یعنی: شراب جوا اور بتوں کی تعظیم اور ان سے مدد مانگنا اور پانسے پھینکنا اور اس طرح حکم معلوم کرنا۔

شراب جیسی بری چیز کے متعلق ابھی واضح حکم نہیں آیا تھا اس لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کسی اٹل حکم کیلئے دعائیں مانگتے رہے حتیٰ کہ یہ آیت اتری "اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَيْسِرُ...الخ" اور شراب، جوا، بت اور تقسیم کے تیر ہمیشہ کیلئے حرام قرار دے دیئے گئے گویا شراب کے حرام ہونے کا حکم درجہ بدرجہ اترا، سب سے پہلے "سورۂ نحل" میں نشہ آور چیزوں کی تیاری کی طرف اشارہ کیا، پھر "سورۂ بقرہ" کی آیت کریمہ اتری، جس میں فرمایا گیا کہ شراب اور جوئے میں فائدہ اور نقصان دونوں چیزیں پائی جاتی ہیں، مگر ان کا گناہ ان کے فائدے سے بڑا ہے، پھر تیسرے نمبر پر "سورۂ نساء" کی آیت اتری، جس میں نشے کی حالت میں نماز کے قریب جانے سے منع کیا گیا اور آخر میں "سورۂ مائدہ" کی اس آیت نے شراب اور دوسرے چیزوں کو مکمل طور پر حرام قرار دے دیا، اس آیت کے اترنے پر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اعلان فرمایا کہ: شراب کا پینا، بنانا، خریدنا اور بیچنا بالکل منع ہوگیا ہے، پھر آپ نے شراب کے برتنوں کو استعمال کرنے سے بھی منع فرما دیا، اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے شراب کشید کرنے والے مٹکے اور پینے پلانے والے دوسرے برتن توڑ ڈالے، تاہم مزید کچھ عرصہ بعد شراب کے برتنوں کے استعمال کی اجازت دے دی البتہ فرمایا کہ ہر نشہ والی چیز حرام ہے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ بھی فرمان ہے کہ: شراب تمام گناہوں کی

جڑ ہے جو شخص شراب پئے گا وہ دنگا فساد کرے گا، قتل اور بدکاری کرے گا اور دوسری برائیاں انجام دے گا، اسی لئے اس چیز کو گناہوں کی جڑ کہا گیا ہے، اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے جوئے کو بھی مکمل طور پر حرام قرار دیا ہے عربوں میں تیروں کے ذریعے جوا کھیلا جاتا تھا مگر اب تاش، شطرنج، گھوڑ دوڑ، لاٹری وغیرہ اس کی مختلف صورتیں ہیں جن کے ذریعے ہار جیت کا فیصلہ کیا جاتا ہے اور یہ سب صورتیں حرام ہیں۔

بیشک شراب اور جوا اور بت اور تقسیم کے تیر یہ سب حرام ہیں، ظاہر ہے کہ بت اور بت پرستی تو اسلام میں مکمل طور پر حرام ہیں، بتوں کے نام پر جانور کو ذبح کرنے کو بھی حرام قرار دیا گیا ہے، تاہم مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ: اللہ تعالیٰ کے علاوہ جس چیز کی بھی عبادت کی جائے یا نذر و نیاز دی جائے وہ بھی اس حکم میں داخل ہو کر حرام ہے، یہاں پر دوسری چیز "ازلام" کا ذکر ہے، اللہ تعالیٰ نے جہاں دوسری چیزوں کو حرام قرار دیا، وہاں جوئے (پانسے) کے تیروں کے ذریعے کسی چیز کو تقسیم کرنے کو بھی حرام قرار دیا، تیروں کا استعمال دو طریقے سے ہوتا تھا، قسمت کا حال معلوم کرنے کیلئے کاہن لوگ یہی تیر استعمال کرتے تھے ان کے پاس بہت سے تیر ہوتے تھے، جب کوئی غرض مند سفر، تجارت یا شادی وغیرہ کے متعلق حال معلوم کرنا چاہتا تو وہ کاہن کے پاس جاتا جو اس کیلئے تیر نکالتا، اس کام کیلئے عام طور پر تین تیر استعمال کیے جاتے تھے، ایک پر لفظ "نَعَمْ" (ہاں)، دوسرے پر لفظ "لَا" (نہیں)، تیسرا خالی ہوتا، حسب ضرورت ان میں سے کوئی ایک تیر نکالا جاتا اگر "نَعَمْ" (ہاں) والا تیر نکلتا تو کاہن کہتا کہ جس کام کا ارادہ کیا ہے وہ کر ڈالو، اس کا نتیجہ تمہارے حق میں نکلے گا، اگر "لَا" (نہیں) والا تیر نکلتا تو اس شخص کو وہ کام کرنے سے منع کر دیا جاتا کہ اس کا نتیجہ تمہارے حق میں بہتر نہیں ہے اور اگر تیسرا خالی تیر نکل آتا تو پھر معاملہ ملتوی کر دیتے اور پھر کسی آئندہ موقع پر دوبارہ تیر نکلواتے۔

تیروں کے استعمال کی ایک صورت یہ تھی کہ کل دس تیروں میں سے سات تیروں پر ایک سے لے کر سات نمبر لکھے ہوتے اور تین تیر خالی ہوتے، عام طور پر قحط کے زمانے میں ایسا ہوتا کہ کوئی دس آدمی مل کر اونٹ خریدتے پھر اس کو ذبح کر کے اس کے گوشت کے دس برابر حصے کرتے، اونٹ میں حصے دار ایک ایک کر کے تیر

نکالتے جس کے نام پر جتنے نمبر کا تیر نکل آتا وہ گوشت کے اتنے حصے لے جاتا، اس طرح بعض حصے داروں کو حصے سے زیادہ گوشت مل جاتا اور بعض بالکل محروم رہ جاتے، حصہ پانے والے گوشت خود بھی استعمال کرتے اور غریبوں میں بھی تقسیم کرتے، حصہ سے محروم رہنے والے ترغیب دیتے کہ چلو دوبارہ اونٹ خریدیں اور ذبح کریں، پھر ایسا ہی کرتے بعض کو حصہ مل جاتا اور بعض محروم رہ جاتے، اور اس طرح یہ سلسلہ جاری رہتا، یہ جوا تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس قسم کے جوئے کے تیروں کو بھی حرام قرار دے دیا، بعض روایتوں میں اس کا دوسرا طریقہ بھی درج ہے جس کا ذکر چھٹے پارے میں گزرا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے چار چیزوں، یعنی: شراب، جوا، بت اور تقسیم کے تیروں کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا کہ: یہ گندہ اور شیطانی کام ہے، پس اس سے بچ جاؤ، تاکہ تمہیں کامیابی نصیب ہو، مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ عربی زبان میں "رِجْسٌ" اس گندی اور ناپاک چیز کو کہا جاتا ہے جس سے صحیح عقل ودماغ نفرت کرے، اس آیت میں جن چار چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ سب نفرت کے قابل اور شیطانی کام ہیں، بظاہر تو یہ سب کام انسان ہی انجام دیتے ہیں مگر ان میں موجود برائی کی طرف شیطان بہکاتا ہے اس لئے انہیں شیطانی کام کہا گیا ہے، شیطان ہی کے وسوسہ ڈالنے کی وجہ سے ان برے کاموں کی طرف رغبت ہوتی ہے اور پھر شیطان ایسے کاموں پر خوش بھی ہوتا ہے، لہٰذا انہیں شیطانی کام کہا گیا ہے، بت پرستی تو ویسے ہی حرام ہے یہ شرک اور کفر ہے، اسی طرح قسمت آزمائی کے تیر بھی شرک میں داخل ہیں، بہر حال ان چاروں چیزوں کو اکٹھا ذکر کرنے کے بعد فرمایا کہ ان سے بچو تاکہ تمہیں کامیابی حاصل ہو جائے۔

شراب وجوئے وغیرہ کی خرابیاں

اِنَّمَا	يُرِيْدُ	الشَّيْطٰنُ	اَنْ	يُّوْقِعَ	بَيْنَكُمُ	الْعَدَاوَةَ	وَ
سوا اسکے کچھ نہیں کہ	چاہتا ہے	شیطان	یہ کہ	ڈالے	درمیان / تمہارے	دشمنی	اور

الْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ وَ يَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ
بغض میں شراب اور جوئے اور روکے تم کو سے یاد اللہ کی

وَ عَنِ الصَّلٰوةِ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ﴿۹۱﴾
اور سے نماز پس کیا تم رک جانے والے ہو ان سے (۹۱)

بامحاورہ ترجمہ:۔ شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ تم میں شراب اور جوئے کے ذریعے دشمنی اور بغض ڈالے اور تم کو اللہ کی یاد سے اور نماز سے روکے، سو اب بھی تم باز آؤ گے؟ (۹۱)

تفسیر

شراب اور جوئے میں سب سے زیادہ خرابی یہ ہے کہ یہ دونوں اس راستے سے جو انسان کی بھلائی کا ذمہ لیتا ہے اور جس پر قرآن مجید اسے چلانا چاہتا ہے انسان کیلئے بڑی رکاوٹ ہیں، کیونکہ ان کے ذریعے سے شیطان کو جو ہر وقت انسان کو بہکانے اور گمراہ کرنے کے بہانے ڈھونڈتا رہتا ہے انسان پر قابو پانے کے بہت سے راستے مل جاتے ہیں۔

اسلام انسان کو مل جل کر رہنا سکھاتا ہے اور آپس کے لڑائی جھگڑے اور فساد سے روکنا چاہتا ہے لالچ، خود غرضی، خراب خواہشیں آپس میں فساد کا باعث ہوتی ہیں اس کے روکنے کا طریقہ اسلام نے پیش کیا ہے۔

شراب اور جوا تمام نیک کاموں سے رکاوٹ بنتے ہیں یہ آدمی کو شہوت پرست، لالچی اور خود غرض بناتے ہیں، اور ان چیزوں کے کرنے پر اکساتے ہیں، جن سے آپس میں لڑائی جھگڑے اور فساد کی بنیاد پڑتی ہے، سب عقلمند اس سے اتفاق کریں گے کہ شراب اور جوا دشمنی اور لڑائی کی اصل جڑیں ہیں، تعجب ہے کہ وہ اس کی خرابیوں کو جانتے ہیں اور پھر بھی ایسی چیزوں کو نہیں چھوڑتے ہیں۔

شیطان چاہتا ہے کہ تمہارے درمیان شراب اور جوئے کے ذریعے دشمنی اور نفرت ڈال دے، جب انسان نشے میں ہوتا ہے تو گالی گلوچ کرتا ہے جس کی وجہ سے دوسرے کے دل میں نفرت پیدا ہو جانا قدرتی

بات ہے، جوئے میں بھی ایسا ہوتا ہے کہ ہارنے والے کے دل میں جیتنے والے کے خلاف نفرت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ کوشش کرتا ہے کہ کسی طرح اس سے بازی جیت لے اس طرح دشمنی کا یہ سلسلہ جاری ہو جاتا ہے، پھر دنگا فساد، لڑائی اور ایک دوسرے کی بے عزتی ہوتی ہے، اسی لئے فرمایا کہ: شراب اور جوئے کے ذریعے شیطان تمہارے درمیان دشمنی اور نفرت پیدا کرنا چاہتا ہے، اور اس کا دوسرا عمل یہ ہوتا ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ تمہیں اللہ تعالیٰ کے ذکر اور نماز سے روک دے، شراب پینے والا تو ویسے ہی نماز کے قریب نہیں جا سکتا، جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے اور جوا بھی ایسی بری لت ہے کہ اس میں مگن ہو کر انسان فرضوں تک کو بھول جاتا ہے، کھیلنے والے کھیل میں مگن رہتے ہیں، حتیٰ کہ اذان ہو جاتی ہے نماز کا وقت گزر جاتا ہے اور وہ اپنے کھیل میں مشغول رہتے ہیں، نہ انہیں اللہ تعالیٰ کے ذکر کی فکر رہتی ہے اور نہ نماز کا خیال رہتا ہے اور شیطان کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ انسان کو اس کے فرضوں سے روک دے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر اور نماز سے غفلت اگر غور سے دیکھا جائے تو ان میں دنیا اور آخرت دونوں طرح کی خرابی ہے، اس لئے ممکن ہے کہ ''رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ'' سے خالص آخرت کی اور روحانی نقصان کو بیان کرنا مقصود ہو اور ''يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ'' سے خالص دنیاوی اور جسمانی خرابی بتلانا ہو اور ''يَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللهِ وَ عَنِ الصَّلٰوةِ'' سے دین و دنیا دونوں کی تباہی و بربادی کا ذکر کرنا مقصود ہو۔

یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر میں تو نماز بھی داخل ہے، پھر نماز کو علیحدہ بیان کرنے میں کیا حکمت ہے؟ وجہ یہ ہے کہ اس میں نماز کی اہمیت کی اور اللہ تعالیٰ کے ذکر کی تمام قسموں میں افضل و بہتر ہونے کی طرف اشارہ کرنے کیلئے نماز کو مستقل طور پر ذکر فرمایا گیا ہے۔

فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ: اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق جب شراب اور جوئے کے شیطانی کام ہونے میں کوئی شبہ نہ رہا تو کیا اب تم باز آ جاؤ گے؟ شراب اور جوئے کے متعلق اللہ تعالیٰ نے اپنا آخری حکم دے دیا ہے، لہٰذا اب ان کو جاری رکھنے کا کوئی بہانہ باقی نہ رہا، جو شخص اب بھی باز نہیں آئے گا وہ بہت بڑا گناہ گار ہوگا۔

اللہ اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت

وَ اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَ احۡذَرُوۡا ۚ فَاِنۡ تَوَلَّیۡتُمۡ

اور فرمانبرداری کرو اللہ کی اور فرمانبرداری کرو پیغمبر کی اور بچتے رہو پس اگر پیٹھ موڑ دو گے

فَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّمَا عَلٰی رَسُوۡلِنَا الۡبَلٰغُ الۡمُبِیۡنُ ﴿۹۲﴾

تو جان لو کہ اسکے سوا کچھ نہیں کہ اوپر (ذمے) پیغمبر ہمارے کے پہنچا دینا ہے کھلم کھلا (۹۲)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور اللہ کا حکم مانو اور پیغمبر کا حکم مانو اور بچتے رہو، پھر اگر تم پھر جاؤ گے تو جان لو کہ ہمارے پیغمبر کے ذمے صرف کھول کھول کر پہنچا دینا ہے۔(۹۲)

تفسیر

اس آیت میں قرآن مجید کا مقصد بالکل کھول کر بیان کر دیا گیا ہے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذمے جو کام ہے اس کو بھی خوب واضح کر دیا گیا ہے، قرآن مجید کا مقصد یہ ہے کہ ہمارے لئے اس دنیا میں زندگی گزارنے کا طریقہ مقرر کر دے اس لئے اس میں بعض باتوں اور کاموں کے کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور بعض باتوں سے روکا گیا ہے۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذمے یہ کام ہے کہ قرآن پاک کو لوگوں تک پہنچا دیں اور اس پر عمل کرنے کا طریقہ خود عمل کر کے دکھا دیں اور پھر اپنی امت کے ذمہ یہ کام سپرد فرما دیں کہ آپ کے قائم کیے ہوئے راستہ کو مٹنے نہ دیں اور اس پر چلنے کو آسان بنانے میں ایک دوسرے کی مدد کریں، تاکہ دنیا کے پاس یہ بہانہ نہ رہے کہ ہمیں اسلام کا راستہ اچھی طرح معلوم ہی نہ ہو سکا جو اس پر چلتے، اس کے بعد انسان کا کام صرف اتنا رہ جاتا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کی لائی ہوئی اللہ تعالیٰ کی کتاب قرآن مجید کو دل سے سچا مان کر آپ کے بتائے ہوئے اور مقرر کیے ہوئے راستہ پر چلتے چلیں اور قرآن مجید کو اچھی طرح سمجھ کر پڑھنے کی کوشش کرتے رہیں اور عمر بھر یہ کام جاری رکھیں، ہر انسان کا یہ کام نہیں کہ ہر ہر حکم کی وجہ تلاش کرے اور جب تک اس کے فائدے معلوم نہ ہو جائیں ان پر عمل نہ

کرے، اس کام کا پہلے تو یقین کرنا ہے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ اور ان کے پیغمبر نے مجھے کرنے کو کہا ہے اس میں یقیناً میرا فائدہ ہے، چاہے مجھے اس وقت اس کی وجہ معلوم ہو سکے یا نہ ہو سکے اور جن چیزوں سے مجھے روکا ہے اس میں میرا سراسر نقصان ہے چاہے مجھے معلوم ہو یا نہ ہو۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ لوگو! ایمان لانے کے بعد تمہارا کام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اور اس کے پیغمبر کا کسی حیل وحجت کے بغیر کہنا مانو اور قرآن کریم کے مقرر کئے ہوئے حکم کے خلاف چلنے سے بچتے رہو، اسی میں تمہارا فائدہ ہے اور اگر تم نے اس میں غفلت کی اور اس سے منہ موڑ لیا تو یاد رکھو! پیغمبر کے ذمے جو فرض تھا وہ انہوں نے ادا فرما دیا، آگے تم جانو اور تمہارا کام۔

شراب کا حکم اترنے سے پہلے شراب پینے والوں کی مشروط معافی

لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا

نہیں اوپر ان کے جو ایمان لائے اور کام کئے نیک کوئی گناہ میں اس

طَعِمُوْٓا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا

جو کھایا انہوں نے جب کہ پرہیز کیا اور ایمان لائے اور کام کئے نیک پھر بچتے رہے

۱۲ ع ۷ ۲ وَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّ اَحْسَنُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۹۳﴾

اور ایمان لائے پھر بچتے رہے اور نیک کام کئے اور اللہ پسند کرتے ہیں نیکی کرنے والوں کو (۹۳)

بامحاورہ ترجمہ:۔ جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کئے ان پر گناہ نہیں اس میں جو پہلے کھا چکے جبکہ وہ آئندہ کو ڈرتے رہے اور ایمان لے آئے اور نیک عمل کئے پھر ڈرتے رہے اور یقین کیا پھر ڈرتے رہے اور نیکی کی اور اللہ نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتے ہیں۔ (۹۳)

لفظی تحقیق: **اِتَّقَوْا:** پرہیز کیا، بچے رہے: "اِتِّقَاءٌ" سے ہے جو "تَقْوٰی" سے بنا ہے اور جس کے معنٰی ہیں بری باتوں سے بچنا، اور اللہ سے ڈرنا، پرہیز کرنا، قانون کے مطابق چلنا۔ **اَحْسَنُوْا:** نیک کام اچھی

طرح کئے: ''اِحْسَانٌ'' سے ہے جس کے معنیٰ ہیں دل لگا کر اچھی طرح کام کرنا، مثلاً: نماز پڑھنا بہرحال نیک کام ہے لیکن دل لگا کر اچھی طرح پڑھنا احسان ہے۔

تفسیر

پچھلی آیتوں میں شراب اور جوئے کو شیطانی کام بتایا کر اس سے بچنے کا حکم دیا گیا، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے یہ حکم سن کر شراب کے مٹکے توڑ ڈالے، مدینہ کی گلیوں میں اس دن شراب بہہ رہی تھی ایک ہی دن میں شراب سے ہمیشہ کیلئے نجات مل گئی، یہ سب سے بڑی فرمانبرداری کی مثال ہے۔

اس کے بعد اس آیت میں ان لوگوں کا حال بتایا جاتا ہے جو شراب کے حرام ہونے سے پہلے اسے پیتے رہے اور دین کا کام بھی کرتے رہے یہاں تک کہ جنگِ اُحد میں بعض مسلمان شراب پی کر لڑائی میں شامل ہوئے اور شہید ہو گئے۔

ارشاد ہے کہ: جو لوگ ایمان لا کر اسلام کے حکم کے فرمانبردار بن گئے اور برے کاموں سے بچتے رہے ان چیزوں کے استعمال کی وجہ سے کوئی پکڑ نہ ہوگی جن کو پہلے حرام نہیں کیا گیا تھا بشرطیکہ آئندہ باقاعدہ حکم کی پابندی کرتے رہیں اور ان کے ایمان میں خلل نہ آئے اور نیک کاموں میں لگے رہیں اور روز بروز ان کا تقویٰ بڑھتا جائے اور ایمان صاف اور روشن ہوتا چلا جائے یہاں تک کہ ان کے نیک کام اور ان کی عبادتیں دل لگا کر بہت ہی اچھے طریقے سے ہونے لگیں۔

شراب اور جوئے کے حرام ہونے کے بعد بعض ذہنوں میں یہ خیال آیا کہ ہم نے تو اسے چھوڑ دیا مگر جو لوگ اس حکم سے پہلے شراب پیتے تھے اور اب وفات پا چکے ہیں ان کا کیا ہوگا؟ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اس وسوسہ کا جواب دیا ہے۔

جو لوگ اس سے پہلے ایمان لائے اور اچھے عمل کئے، انہیں ان کے کھانے، یعنی: اس حالت میں شراب پینے پر کوئی گناہ نہیں ہے جب کہ وہ ڈرتے رہے اور کفر و شرک سے بچتے رہے، اور ایمان لائے اور نیک عمل کئے،

پھر وہ ڈرتے رہے اور ایمان پر قائم رہے، پھر وہ ڈرتے رہے اور ان کے دل پر اللہ تعالیٰ کے حکموں کی خلاف ورزی کا خوف چھایا رہا اور انہوں نے نیکی کے کام کئے، یہاں پر "اِتَّقٰی" کا لفظ تین بار استعمال ہوا ہے، پہلے "تقویٰ" کا مقصد یہ ہے کہ انسان عقیدے میں پکّا رہے، یعنی: کفر و شرک سے بچے، دوسرے "تقویٰ" سے مراد یہ ہے کہ انسان حرام چیزوں سے پرہیز کرے، اور تیسرے "تقویٰ" کا مطلب یہ ہے کہ انسان پرہیزگاری پر قائم رہے، یہاں پر آخر میں "اَحْسَنُوْا" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو کہ ایمان اور اسلام کے بعد نیکی کا آخری درجہ ہے، حدیث جبرائیل علیہ السلام کے مطابق پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے احسان کا معنیٰ یہ بتایا تھا کہ: تم اللہ تعالیٰ کی عبادت اس یکسوئی کیساتھ کرو گویا کہ اللہ تعالیٰ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو اور اگر تم پر اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی کیفیت پیدا نہ ہو سکے تو کم از کم یہ تو سمجھ لو کہ وہ تمہیں ضرور دیکھ رہا ہے، گویا احسان سے مراد اعلیٰ درجے کی نیکی ہے جو پورے خلوص کے ساتھ انجام دی جائے، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: جن لوگوں کو ایمان کی دولت نصیب ہوئی اور پھر انہوں نے نیکی کے کام نہایت خلوص کے ساتھ کئے اگر انہوں نے شراب حرام قرار دیئے جانے سے پہلے شراب پی ہے تو ان پر کوئی گناہ نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کو نیکی کے کام کرنے والے لوگ بہت پسند ہیں، اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں اعلیٰ درجے کی نیکی کرنے والے پسندیدہ لوگ ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائشیں

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَيَبْلُوَنَّكُمُ اللّٰهُ بِشَيْءٍ مِّنَ الصَّيْدِ

اے | لوگو! جو | ایمان لائے ہو | البتہ آزمائیگا تم کو | اللہ | ساتھ ایک بات کے | سے | شکار میں

تَنَالُهٗٓ اَيْدِيْكُمْ وَ رِمَاحُكُمْ لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّخَافُهٗ

کر لے سکتے ہیں اسکو | ہاتھ تمہارے | اور | نیزے تمہارے | تاکہ جان لے | اللہ | کہ کون | ڈرتا ہے اس سے

بِالْغَيْبِ ۚ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۹۴﴾

بن دیکھے پس جو زیادتی کرے بعد اس کے پس واسطے اسکے ہے عذاب دردناک (۹۴)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اے مسلمانو! البتہ اللہ تم کو ایسے شکار کے بارے میں آزمائیں گے جس پر تمہارے ہاتھ اور نیزے پہنچ سکیں گے تا کہ اللہ تعالیٰ یہ معلوم کریں کہ کون بغیر دیکھے اس سے ڈرتا ہے پس جس نے اس کے بعد زیادتی کی تو اس کے لئے دردناک عذاب ہے۔ (۹۴)

تفسیر

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَيَبْلُوَنَّكُمُ اللّٰهُ بِشَيْءٍ مِّنَ الصَّيْدِ تَنَالُهٗۤ اَيْدِيْكُمْ: اسلام میں حلال جانور کا شکار کرنے اور اسے کھانے کی عام اجازت ہے بلکہ عرب کے بعض خطوں میں تو یہی ان کی گذران کا ذریعہ تھا، آج بھی دنیا میں کئی ایسے خطے ہیں جن کی گزران صرف شکار پر ہے، جنگلوں اور ریگستانوں میں رہنے والے لوگ جنگلی جانوروں کے شکار سے پیٹ پالتے ہیں بعض برفانی علاقوں میں بھی شکار ہی گذران کا ذریعہ ہے، سمندر کے کنارے رہنے والے لوگ مچھلی کے شکار پر گزر بسر کرتے ہیں، چنانچہ شکار کی عام اجازت دی گئی ہے اسی سورۃ میں شکار کے بعض مسئلے پہلے بھی بیان ہو چکے ہیں، خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی شکار کے بعض مسئلے بیان فرمائے ہیں، چنانچہ حدیث کی ہر کتاب میں "بَابُ الصّید" کے نام سے باب موجود ہے جس میں صرف شکار کی حدیثوں کا ذکر ہے، البتہ ان میں زیادہ مشغول ہونے سے منع کیا گیا ہے، "ترمذی شریف" میں روایت ہے کہ جو شکار کا پیچھا کرے گا وہ غفلت میں مبتلا ہو جائے گا اور جو ہمیشہ حاکم کے دروازے پر جائے گا فتنہ میں پڑ جائے گا۔

کھیل کود کی طرح شکار بھی غافل کر دینے والی چیز ہے جس طرح تاش اور شطرنج اور آج کل کرکٹ وغیرہ بڑے ذوق وشوق سے کھیلا اور دیکھا جاتا ہے اسی طرح شکاری بھی ہر طرف سے بے نیاز ہو کر شکار کرنے میں مگن

ہو جاتے ہیں، پھرانہیں نماز کی فکر تک باقی نہیں رہتی، کپڑے پھٹ جاتے ہیں، بدن زخمی ہو جاتا ہے مگر وہ اپنے کام میں مگن رہتے ہیں، اسی لئے شکار میں زیادہ مشغول رہنے کو ناپسند کیا گیا ہے، تاہم خشکی اور تری کے تمام حلال جانوروں کا شکار جائز ہے۔

حج وعمرہ کا احرام دراصل مرکز کے احترام کی وجہ سے ہے چونکہ یہ شخص حج یا عمرہ کیلئے بیت اللہ شریف کی طرف جارہا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ کے اس گھر اور اسلام کے مرکز کا تقاضہ ہے کہ وہاں احرام کی حالت میں جائے، جیسا کہ پہلے عرض کیا حرم کی طرف حج کیلئے جانے والوں کیلئے بعض پابندیاں ہیں جو اس پر عائد ہو جاتی ہیں اور ان میں خشکی کے شکار سے بھی منع کیا گیا ہے، احرام کی حالت میں شکار کرنا یا شکار کو ذبح کرنا حرام ہو جاتا ہے اور ایسے شخص کا ذبح کیا ہوا جانور مردار کی طرح ہوتا ہے بہرحال یہ احرام کی خصوصیتوں اور حرم کے احترام کی وجہ سے ہے۔

شکار انسانی ہاتھوں سے بھی ہوتا ہے اور نیزے یا دوسرے اوزار کے ساتھ بھی، چونکہ قرآن کریم کے اترنے کے زمانے میں نیزہ ایک مؤثر ہتھیار کے طور پر استعمال ہوتا تھا، اس لئے اس کا ذکر کیا گیا تھا، مگر مراد یہ ہے کہ احرام کی حالت میں خشکی کے جانور کا شکار خواہ ہاتھ سے کیا جائے یا تیر وتلوار وغیرہ سے، مسلمان کیلئے یہ آزمائش ہے کہ وہ حکم کی کس حد تک پابندی کرتے ہیں اگر وہ اس حالت میں شکار کرنے سے باز رہے تو آزمائش میں پورے اتریں گے اور اس کے خلاف کیا تو ناکام ہو جائیں گے، " لَيَبْلُوَنَّكُمُ " کا یہی مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں حج یا عمرہ کا موقع فراہم کرتے ہیں اور اس کے ساتھ یہ حکم دیتے ہیں کہ احرام کی حالت میں خشکی کا شکار نہیں کرنا، اب آزمائش یہ ہے کہ کون اس حکم کی تعمیل میں شکار سے باز رہتا ہے؟

حدیبیہ کے مقام پر جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پڑاؤ کیا تو وہ احرام کی حالت میں تھے، شکار ان کے خیموں کے آس پاس دوڑتے پھرتے تھے مگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ان کو ہاتھ نہیں لگاتے تھے، کیونکہ اس حالت میں شکار منع تھا، چنانچہ وہ اس آزمائش میں پورے اترے، بہرحال فرمایا کہ: احرام کی حالت میں شکار سے منع کرنا آزمائش کیلئے ہے، اللہ تعالیٰ ہی حقیقی معنیٰ میں بادشاہ ہیں جس طرح چاہیں اپنے بندوں کی آزمائش فرماتے ہیں، وہ خیر کے ساتھ بھی

آزماتے ہیں اور شر کے ساتھ بھی آزماتے ہیں، لہٰذا بندوں کا کام ہے کہ اس کی طرف سے آنے والی ہر آزمائش پر پورا اتریں۔

بعض لوگ شکار کے بڑے شوقین ہوتے ہیں اور وہ صبر نہیں کر سکتے ایسا آدمی اگر احرام کی حالت میں شکار کرے گا تو اسے بدلہ ادا کرنا پڑے گا اور اگر پھر بھی باز نہیں آتا تو اللہ تعالیٰ کی پکڑ میں آئے گا، آگے اس بات کی وضاحت فرمادی کہ تمہیں آزمائش میں اس لئے ڈالا جارہا ہے تاکہ اللہ تعالیٰ دیکھیں کہ کون اس سے بغیر دیکھے ڈرتا ہے اور اس کے حکموں کو پورا کرتا ہے، اس کے بعد جو کوئی زیادتی کرے گا اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی کر کے آزمائش میں ناکام ہو جائے گا وہ دردناک عذاب کا مستحق ٹھہرے گا، لہٰذا ہر مُحرم شخص کو یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر شکار کی پابندی عائد کر کے اسے امتحان میں ڈالا ہے جس میں اسے پورا اترنا ہے۔

شکار کی ممانعت

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَ اَنْتُمْ حُرُمٌ ؕ وَ

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو مت مارو شکار اس حال میں کہ تم احرام میں ہو اور

مَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ

جو مارے اس کو میں سے تم جان بوجھ کر پس بدلہ ہے برابر اسکے جو قتل کیا اس نے جنس سے

النَّعَمِ يَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ

مویشی کی تجویز کریں اسکو دو انصاف والے میں سے تم

بامحاورہ ترجمہ:۔ اے ایمان والو! جس وقت تم احرام میں ہو تو شکار نہ مارو اور جو کوئی تم میں سے جان بوجھ کر اس کو مارے گا تو اس پر اس مارے ہوئے کے برابر مویشی میں سے بدلہ ہے جو تم میں سے دو معتبر آدمی تجویز کریں۔

تفسیر

اس سورۃ کی پہلی آیت میں اس کا ذکر آیا تھا کہ مسلمانوں پر سارے پالتو اور غیر پالتو مویشی حلال کئے گئے ہیں کیونکہ اس سے پہلے "سورۂ نساء" میں اس کا ذکر گزر چکا تھا کہ یہودیوں پر ان کی زیادتیوں اور ظلموں کی وجہ سے بہت سی پاک صاف چیزیں حرام کردی گئی تھیں، اس لئے اس سورۃ کے شروع میں کہہ دیا گیا کہ مسلمانوں کیلئے اللہ تعالیٰ نے سب پاکیزہ جانور حلال کردیئے، لیکن جنگل کے جانوروں کے شکار کرنے پر پابندیاں لگادی گئی ہیں تاکہ فرمانبرداری کی آزمائش ہوجائے، وہ پابندیاں یہ ہیں:

(۱)....حج کا احرام باندھ لینے کے بعد جب تک احرام نہ کھول لے شکار نہیں کرسکتا۔

(۲)....حرم کے احاطہ کے اندر احرام کی حالت میں ہو یا نہ ہو شکار حرام ہے۔

ارشاد ہے: مسلمانو! جب حج کا احرام باندھ لو تو شکار مت کرو اور نہ کسی اور سے شکار کی فرمائش کرو اور نہ کسی شکاری کو اشارہ سے یا کسی طرح سے شکار کا پتہ بتاؤ، اور اگر تم میں سے کوئی جان بوجھ کر احرام کی حالت میں ان جرموں میں سے کوئی بھی جرم کرے گا جن کا ابھی ذکر ہوا تو اسے جرمانہ دینا ہوگا، جو جانور شکار میں مارا گیا ہے اس کی قیمت کا اندازہ کرکے اس کی قیمت کے برابر کوئی دوسرا جانور بدلے کے طور پر ذبح کرنا ہوگا اس کو صرف فقیر اور مسکین لوگ کھاسکتے ہیں، شکار کرنے والے کو اس میں سے کھانے کی اجازت نہیں اور اس کی صورت یہ ہوگی کہ دو معتبر آدمیوں سے مارے ہوئے جانور کی وہیں مارنے کی جگہ یا اس کے قریب کے گاؤں میں قیمت لگوالے اور جب وہ دو شخص قیمت مقرر کردیں تو اس کے بعد کیا کرنا چاہئے؟ اس کا حکم آگے کی آیتوں میں آرہا ہے۔

اگر احرام کی حالت میں شکار زندہ پکڑلیا تو اس کا فوراً چھوڑ دینا فرض ہے اور اگر ماردیا تو اگر جان بوجھ کر مارا ہے تو اس کے جرمانہ کا اس آیت میں ذکر ہے اور اس کے بعد یہ بھی ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے انتقام لیں گے، یعنی: آخرت میں سزا دیں گے اور اگر بھول کر مارا ہے تو اس کو جرمانہ تو یہیں دینا ہوگا لیکن اس سے انتقام نہ لیا جائے گا۔

جرمانے کی صورتیں

هَدْيًا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ اَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِيْنَ اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ

نیاز ہے پہنچنے والی کعبہ کو یا کفارہ ہے کھانا چند مسکینوں کا یا برابر اس کے

صِيَامًا لِّيَذُوْقَ وَبَالَ اَمْرِهٖ ؕ عَفَا اللّٰهُ عَمَّا سَلَفَ ؕ وَ مَنْ

روزے رکھے تاکہ چکھے سزا اپنے کام کی معاف کیا اللہ نے اس سے جو گذرا اور جو

عَادَ فَيَنْتَقِمُ اللّٰهُ مِنْهُ ؕ وَ اللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ﴿۹۵﴾

کام کرے تو بدلہ لے گا اللہ سے اس اور اللہ ہے زبردست بدلا لینے والا (۹۵)

بامحاورہ ترجمہ:۔اس طرح سے کہ وہ بدلے کا جانور نیاز کے طور پر کعبہ تک پہنچایا جائے یا اس پر کفارہ چند محتاجوں کا کھانا ہے یا اس کے برابر روزے، تاکہ وہ اپنے کام کی سزا چکھے جو کچھ ہو چکا، وہ اللہ نے معاف کیا اور جو کوئی پھر کرے گا اس سے اللہ بدلا لیں گے اور اللہ زبردست بدلا لینے والے ہیں۔(۹۵)

لفظی تحقیق: هَدْیٌ: تحفہ، نیاز، نذرانہ۔ كَفَّارَةٌ: جرمانہ، کسی کام کا اتار، کسی کام کی سزا کے طور پر کچھ کرنا۔ الْكَعْبَةِ: یہاں پر بولا تو کعبہ گیا ہے مگر اس سے مراد حرم کی حدود ہیں جو کعبہ کے چاروں طرف کئی کئی میل تک ہیں۔

تفسیر

اس آیت میں ہے کہ احرام کی حالت میں شکار کے بدلے میں اس کی قیمت کا ایک جانور، مثلاً: گائے، بکری، دنبہ وغیرہ خرید کر حرم کی حدود میں پہنچا دے، اور وہاں وہ ذبح کیا جائے، خود اس میں سے کچھ نہ کھائے یا اس قیمت کا غلّہ خرید کر محتاجوں میں بانٹ دے، اس طرح ہر ایک محتاج کو صدقہ فطر کے برابر اناج پہنچ جائے یا حساب لگا کر کہ یہ غلّہ بانٹنے سے کتنے محتاجوں کو پہنچتا، ان کی تعداد کے مطابق اتنے ہی دن کے روزے رکھے، یہ

اس کے کرتوت کی سزا ہے جو اسے بھگتنی پڑے گی۔

آگے ارشاد ہے کہ: اسلام سے پہلے بھی احرام کی حالت میں شکار کرنا جرم سمجھا جاتا تھا، اگر اللہ تعالیٰ چاہتے تو جس نے اس وقت اس حالت میں شکار کیا تھا اس کا بدلہ اس وقت لے لیتے لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی مہربانی سے گزرے ہوئے پچھلے گناہ معاف کردیئے، ہاں! جو اس وقت اسلام کی حالت میں وہی گناہ پھر کرے گا اس سے اللہ تعالیٰ بدلہ لیں گے، اللہ تعالیٰ زبردست ہیں کوئی مجرم اس سے بچ کر بھاگ نہیں سکتا اور اس کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ برائی کا بدلہ لینے والے ہیں، دنیا میں یہی بدلہ بھول چوک کر احرام کی حالت میں شکار کرنے والے سے بھی لیا جائے گا، لیکن جان بوجھ کر شکار کرنے والے کو آخرت میں بھی سزا ملے گی۔

احکام ومسائل

مسئلہ (۱):.... وہ شکار جو کہ حرم اور احرام میں حرام ہے یہ حکم عام ہے خواہ حلال جانور کا ہو یا حرام جانور کا۔

مسئلہ (۲):.... شکار ان جانوروں کو کہا جاتا ہے جو جنگلی ہوں، عادۃً انسانوں کے پاس نہ رہتے ہوں، پس جو انسانوں کے پاس رہتے ہوں، جیسے: بھیڑ، بکری، گائے، اونٹ ان کا ذبح کرنا اور کھانا درست ہے۔

مسئلہ (۳):.... دریائی جانور کا شکار حلال ہے۔

مسئلہ (۴):.... بعض ایسے پرندے اور خشکی کے جانور جو تکلیف پہنچاتے ہیں ان کو مارنا جائز ہے، جیسے: کوا، چیل، بھیڑیا، سانپ، بچھو اور کاٹنے والا کتا، اسی طرح جو درندہ خود حملہ کرے اس کا قتل کرنا بھی جائز ہے، ان کے مارنے پر کوئی جرمانہ نہیں دینا پڑے گا۔

مسئلہ (۵):.... جو شکار حرم میں نہ کیا گیا ہو اور اسے کسی مُحرم (احرام کی حالت والے شخص) نے شکار نہ کیا ہو اس کا کھانا محرم کو جائز ہے جبکہ اس کے قتل وغیرہ میں مددگار یا بتلانے والا نہ ہو، حدیث میں ایسا ہی ارشاد ہے۔

مسئلہ (۶):.... حرم کے شکار کو جس طرح جان بوجھ کر قتل کرنے پر بدلہ واجب ہے اسی طرح بھول

چوک میں بھی بدلہ واجب ہے۔

مسئلہ (۷):.... جیسا پہلی بار میں بدلہ واجب ہے اسی طرح دوسری بار قتل کرنے میں بھی بدلہ واجب ہے۔

مسئلہ (۸):.... بدلہ کا حاصل یہ ہے کہ جس وقت اور جس جگہ میں یہ جانور قتل ہوا ہے بہتر تو یہ ہے کہ دو عادل شخص سے اور جائز یہ بھی ہے کہ ایک ہی عادل شخص سے اسی وقت اور اسی جگہ اس جانور کی قیمت کا اندازہ لگوائے، پھر اس میں یہ تفصیل ہے کہ وہ مارا ہوا جانور اگر حرام ہے، جیسے: لومڑی، گیدڑ، بھیڑیا وغیرہ تب تو ایک بکری کی قیمت سے زیادہ واجب نہ ہوگی اور اگر وہ جانور حلال تھا، مثلاً: خرگوش، ہرن، بارہ سنگا وغیرہ تو جس قدر اندازہ لگایا جائے گا وہ سب واجب ہوگا اور دونوں حال میں آگے اس کو تین صورتوں میں اختیار ہے خواہ تو اس قیمت کا کوئی ایسا جانور جس میں قربانی کی تمام شرطیں پائی جاتی ہوں خرید لے اور حرم کے حدود کے اندر ذبح کر کے فقیروں کو بانٹ دے یا اس قیمت کے برابر غلّہ صدقہ فطر کی شرط کے مطابق فی مسکین آدھا صاع، یعنی: پونے دو سیر اور احتیاطاً پورے دو سیر گندم فقیروں کو دے دے اور یا جتنے مسکینوں کو وہ غلّہ دیا جاسکتا ہے اتنے مسکینوں کی تعداد کے مطابق اتنے روزے رکھ لے، اور غلّہ کی تقسیم اور روزوں کے رکھنے میں یہ شرط نہیں کہ وہ حرم میں ہوں اور اگر قیمت نصف صاع سے بھی کم واجب ہوئی ہے تو اختیار ہے خواہ ایک مسکین کو دے دے یا ایک روزہ رکھ لے، اسی طرح اگر فی مسکین نصف صاع دے کر نصف صاع سے کم بچ گیا تو بھی یہی اختیار ہے کہ خواہ وہ بقیہ ایک مسکین کو دے یا ایک روزہ رکھ لے۔

مسئلہ (۹):.... مذکورہ اندازے میں جتنے مسکینوں کا حصہ قرار پائے اگر ان کو دو وقت کھانا پیٹ بھر کر کھلا دے تب بھی جائز ہے۔

مسئلہ (۱۰):.... اگر اس قیمت کے برابر ذبح کیلئے جانور تجویز کیا مگر کچھ قیمت بچ گئی تو اس بقیہ میں اختیار ہے خواہ دوسرا جانور خرید لے یا اس کا غلّہ دے دے یا غلّہ کے حساب سے روزے رکھ لے، جس طرح قتل میں بدلہ واجب ہے اسی طرح ایسے جانور کو زخمی کرنے میں بھی اندازہ کروایا جائے گا کہ اس سے جانور کی کس قدر قیمت کم ہوگئی، اس قیمت کی مقدار میں پھر وہی تین صورتیں جائز ہوں گی۔

مسئلہ (۱۱):.... محرم کو جس جانور کا شکار کرنا حرام ہے اس کا ذبح کرنا بھی حرام ہے اگر اس کو ذبح کرے گا تو اس کا حکم مردار کا سا ہوگا۔

مسئلہ (۱۲):.... اگر جانور کے قتل ہونے کی جگہ جنگل ہے تو جو آبادی اس سے قریب ہو وہاں کے اعتبار سے اس کی قیمت کا اندازہ کیا جائے گا۔

مسئلہ (۱۳):.... شکار کیلئے اشارہ کرنا یا شکار میں مدد دینا شکار کرنے کی طرح حرام ہے۔

احرام میں شکار

اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَ طَعَامُهٗ مَتَاعًا لَّكُمْ وَ لِلسَّيَّارَةِ ۚ

حلال کیا گیا لئے تمہارے شکار سمندر کا اور کھانا اس کا فائدہ لئے تمہارے اور لئے مسافروں کے

وَ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا ؕ وَ اتَّقُوا

اور حرام کیا گیا پر تم شکار جنگل کا جب تک رہو تم احرام میں اور ڈرو

اللّٰهَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۹۶﴾

اللہ سے وہ طرف جس کی اکٹھے کئے جاؤ گے تم (۹۶)

بامحاورہ ترجمہ:۔ تمہارے لئے سمندر کا شکار اور اس کا کھانا تمہارے فائدے کیلئے اور سب مسافروں کے فائدے کیلئے حلال قرار دیا گیا ہے اور تم پر حرام ہوا جنگل کا شکار جب تک تم احرام میں رہو، اور اللہ سے ڈرتے رہو جس کے پاس تم سب کو جمع کیا جائے گا۔ (۹۶)

تفسیر

اس آیت میں شکار کے کچھ اور حکم بیان کیے گئے ہیں، ارشاد ہے کہ: اے مسلمانو! تمہارے لئے سمندر کا شکار، یعنی: مچھلی پکڑنا ہر حالت میں حلال ہے اور احرام کی حالت میں بھی اس سے منع نہیں کیا گیا، اسی طرح بغیر

پکڑے کوئی مچھلی تمہارے ہاتھ لگ جائے بشرطیکہ وہ پانی سے زندہ نکل آئی ہو اور باہر آ کر مری ہو اس کا کھانا تمہارے لئے حلال ہے اور اس لئے حلال کی گئی ہے کہ اس رخصت سے وقت پر فائدہ اٹھاؤ اور سفر کی حالت میں مسافر بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

تالاب، گڑھے، کنویں، جوہڑ وغیرہ جہاں پانی بھرا ہو اور اس میں مچھلیاں ہوں سب سمندر کے حکم میں ہیں، یعنی: جس طرح محرم کیلئے سمندر سے مچھلی پکڑنا حلال ہے اسی طرح ان جگہوں سے بھی مچھلی پکڑنا حلال ہے، اس کے آگے پھر دوبارہ فرما دیا کہ: جب تک احرام کی حالت میں رہو، تو تم پر جنگل میں شکار کرنا یا اس میں کسی طرح شامل ہونا، فرمائش کرنا یا شرکت کرنا حرام ہے، اس سے یہ سمجھانا مقصود ہے کہ احرام کے اندر صرف جنگلی جانوروں کا شکار منع ہے مچھلی کے شکار کی اجازت ہے چاہے خود پکڑو چاہے تمہارے لئے دوسرے پکڑیں اور تم ان سے فرمائش کر کے پکڑواؤ اور یہ اجازت ہر وقت ہے۔

جیسے احرام کی حالت میں جنگلی شکار مارنا منع ہے ایسے ہی مکہ مکرمہ حرم کی حدود کے علاقے میں بھی ہر شخص کیلئے چاہے وہ احرام میں ہو یا نہ ہو شکار کرنا منع ہے۔

ایک علمی نکتہ

اس مقام پر لفظ "سَيَّارَةً" سے یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ احرام کی حالت میں سمندر کا سفر ہو تو اس دوران شکار کی کتنی اہمیت ہے خشکی کے سفر کے دوران اگر خوراک کا ذخیرہ ختم ہو جائے تو انسان کسی نہ کسی طرح سے جان بچا سکتا ہے اگر شکار نہ بھی کرے تو درختوں کے پتے اور جڑی بوٹیاں کھا کر بھی زندہ رہ سکتا ہے، اور اگر یہی صورت سمندری سفر کے دوران پیش آ جائے تو وہاں سوائے دریائی جانوروں کے خوراک کا کوئی اور ذریعہ میسر نہیں ہوتا اس لئے اللہ تعالیٰ نے احرام کے دوران دریائی شکار کی اجازت دے دی ہے مگر خشکی کے شکار سے منع فرما دیا ہے۔

تمہارے لئے خشکی کا شکار حرام قرار دیا گیا ہے جب تک کہ تم احرام کی حالت میں ہو، یہ وقتی طور پر حرام کی ہوئی چیزوں کا ذکر ہے، خشکی کا شکار صرف احرام تک کیلئے حرام ہوتا ہے جب انسان احرام سے باہر آ جاتا ہے تو شکار کرنا پھر حلال ہو جاتا ہے، یہ حکم بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ سے ڈر جاؤ، کیونکہ جب قیامت کے دن سب لوگ اللہ رب العزت کی عدالت میں حاضر ہوں گے تو ہر ایک کو اپنے عمل کا حساب دینا ہوگا، اللہ تعالیٰ سے خوف دلانے کا مقصد یہ ہے کہ اس کے عائد کئے ہوئے حکم کی پابندی کرو، اس نے احرام کی حالت میں شکار سے منع کر کے تمہیں آزمائش میں ڈالا ہے تمہیں اس آزمائش میں پورا اترنے کی کوشش کرنا ہوگی کیونکہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دینا ہے۔

کعبہ کیا ہے؟

جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ وَ الشَّهْرَ
بنادیا اللہ نے کعبہ کو جو گھر ہے بزرگی والا ٹھہراؤ واسطے لوگوں کے اور مہینے

الْحَرَامَ وَ الْهَدْيَ وَ الْقَلَآئِدَ ؕ ذٰلِكَ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ
بزرگی والے اور قربانی اور پٹے پڑے ہوئے جانور یہ اس لئے کہ جان لو تم کہ اللہ

يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ وَ اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ
جانتا ہے جو ہے میں آسمانوں اور جو ہے میں زمین اور یہ کہ اللہ ساتھ ہر

شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۹۷﴾
چیز کے علم رکھنے والا ہے (۹۷)

با محاورہ ترجمہ: ۔ اللہ نے کعبہ کو جو بزرگی والا گھر ہے لوگوں کے قائم رہنے کا ذریعہ بنا دیا، اور بزرگی والے مہینوں کو اور قربانی کو اور وہ جانور جو کعبہ کی نیاز ہو اور جن کے گلے میں پٹہ ڈال کر کعبہ کو لے جائیں یہ

اس لئے کہ تم جان لو کہ جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے اللہ سب کے جاننے والے ہیں، بیشک اللہ ہر چیز سے واقف ہیں۔ (۹۷)

تفسیر

یہاں کعبہ کے بارے میں چند حکموں کا بیان ہے کہ اس گھر کا احترام کرنا چاہئے اور اس کی طرف آنے والے حاجیوں کی اور ان کی قربانیوں کی اور اس سے متعلق تمام حکموں کی بہت قدر کرنی چاہئے، ارشاد ہے کہ:

اللہ تعالیٰ نے شروع ہی سے کعبہ کو جو ہمیشہ سے عزت اور امن وامان کا گھر رہا ہے تمام لوگوں کی زندگی کا باعث اور ان کے قائم رہنے کا سبب بنا دیا ہے اور حج کے مہینے اور حج میں جو باتیں ہوتی ہیں، جیسے: قربانی کے جانور لے کر آنا اور ان کے گلے میں پٹے یا اور چیزیں ان کی پہچان کیلئے لٹکانا، ان سب کو بھی انسانوں کیلئے زندگی اور اس کی چہل پہل کا ذریعہ مقرر فرما دیا ہے، یہ باتیں پہلے بھی امن وامان کی اور دنگا فساد روکنے کی علامتیں تھیں اور آج بھی ہیں، یہ اس قدر صاف پیشگوئی ہے کہ سوا اس کے جو ہر چیز کا جاننے والا ہو کوئی نہیں کرسکتا اور جوں جوں زمانہ گزرتا جائے گا اس کی سچائی تمہیں معلوم ہوتی رہے گی، اور تم جان لوگے کہ! بیشک اللہ تعالیٰ تمام آسمان وزمین کی تمام باتوں اور سب بھیدوں سے واقف ہیں اور اسے ہر چیز کا علم ہے، اور اسی نے کعبہ کو دنیا کی زندگی کا سبب قرار دیا ہے اور اس کا احترام اور حج کے اندر دنیا کی بہتری اور اس کے قائم رہنے کا راز پوشیدہ ہے۔

نَاسٌ: لوگ۔ لغت میں عام انسانوں کیلئے بولا جاتا ہے، اس جگہ خاص مکہ والے یا عرب والے بھی مراد ہوسکتے ہیں اور عام دنیا کے انسان بھی، اور ظاہر یہی ہے کہ پوری دنیا کے انسان اس میں داخل ہیں، البتہ مکہ اور عرب والے ایک خاص خصوصیت رکھتے ہیں اس لئے مطلب آیت کا یہ ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ نے کعبہ، یعنی: بیت اللہ کو پوری دنیا کیلئے باقی رہنے اور امن وسکون کا ذریعہ بنا دیا ہے، جب تک دنیا کا ہر ملک، ہر خطہ اور ہر سمت کے لوگ اس بیت اللہ کی طرف رخ کر کے نماز ادا کرتے رہیں اور بیت اللہ کا حج ہوتا رہے، یعنی: جن پر حج فرض ہو وہ

حج ادا کرتے رہیں اس وقت تک یہ پوری دنیا قائم اور محفوظ رہے گی اور اگر ایک سال بھی ایسا ہو جائے کہ کوئی حج نہ کرے یا کوئی شخص بیت اللہ کی طرف رخ کر کے نماز ادا نہ کرے تو پوری دنیا سے امن اٹھ سکتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ سے لے کر قرآن کریم کے اترنے کے زمانے تک ہزاروں سالہ دور میں عرب کے خطہ میں کوئی باقاعدہ حکومت نہیں تھی، یہاں پر قبائلی نظام رائج تھا، مصر، شام، روم، ایران اور ہندوستان وغیرہ میں تو باقاعدہ حکومتیں تھیں مگر جزیرہ نمائے عرب میں کوئی مرکزی حکومت نہیں تھی، اس افراتفری اور نفسا نفسی کے عالم میں بھی اللہ تعالیٰ نے حرم پاک کو لوگوں کے باقی رہنے کا ذریعہ بنا رکھا تھا، سال بھر میں چار حرمت والے مہینوں کے دوران لڑائی بند رہتی تھی، قافلے بلا روک ٹوک سفر کر سکتے تھے خوب تجارت ہوتی تھی اور لوگوں کو امن حاصل ہوتا تھا اور یہ سب کچھ بیت اللہ شریف کے احترام کی وجہ سے ہوتا تھا، یہاں پر لوگوں کے قیام سے مراد یہ ہے کہ اس قابلِ احترام گھر کی وجہ سے لوگ قائم ہو سکتے تھے، یعنی: اپنی زندگی بسر کر سکتے تھے اگر امن وامان کے یہ چار مہینے بھی لوگوں کو نہ ملتے تو جنگ اور لوٹ مار کی وجہ سے ہر قسم کا کاروبار، کھیتی باڑی اور تجارت ٹھپ ہو کر رہ جاتے اور لوگوں کو زندگی گزارنا مشکل ہو جاتا، رہی یہ بات کہ دنیا کے نظام اور بیت اللہ میں جوڑ کیا ہے؟ سو اس کی حقیقت معلوم ہونا ضروری نہیں جس طرح مقناطیس اور لوہے کے آپس کے جوڑ کی حقیقت اکثروں کو معلوم نہیں ہوتی مگر وہ ایک ایسی حقیقت ہے جو دیکھنے میں آتی ہے اس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا، بیت اللہ اور دنیا کے نظام کے آپس کے جوڑ کی حقیقت کا علم بھی انسان کے قبضہ میں نہیں وہ اللہ تعالیٰ کے بتلانے ہی سے معلوم ہو سکتا ہے، بیت اللہ کا پورے جہان کے باقی رہنے کیلئے سبب ہونا تو ایک پوشیدہ چیز ہے ظاہری نظریں اس کو نہیں پا سکتیں لیکن عرب اور مکہ والوں کیلئے اس کا امن وسلامتی کا سبب ہونا بہت سے تجربوں سے ثابت ہے۔

بیت اللہ شریف ایک لحاظ سے لوگوں کیلئے معاش کا ذریعہ ہے اور اس کی بدولت لوگ گزر اوقات کرتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا بھر کے لوگوں کو حکم ہے کہ وہ استطاعت والے ہیں تو زندگی بھر میں کم از کم ایک دفعہ بیت اللہ شریف کا حج کریں، جب لوگ وہاں جاتے ہیں تو کعبہ شریف کا طواف کرتے ہیں، نماز ادا کرتے ہیں، تلاوت کرتے ہیں، "صفا و مروہ" کی سعی کرتے ہیں اور قربانی کرتے ہیں اور یہی چیزیں ہیں جن کی بدولت

حاجیوں کو جسمانی، روحانی، علمی اور اخلاقی فائدے حاصل ہوتے ہیں، اس کا تذکرہ اللہ تعالیٰ نے "سورۂ حج" میں بھی فرمایا ہے کہ حج کے موقع پر لوگوں کو بہت سے فائدے حاصل ہوتے ہیں، اس لحاظ سے بیت اللہ شریف کو لوگوں کے قیام کا ذریعہ کہا گیا ہے، "سورۂ آل عمران" میں گزر چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اس زمین پر سب سے پہلا گھر یہی ہے جو لوگوں کی عبادت کیلئے مکہ معظّمہ میں تعمیر کیا گیا اور یہ بڑی برکتوں والا گھر ہے، بعض حدیثوں میں آتا ہے کہ حرم شریف میں ہر روز اللہ تعالیٰ کی ایک سو بیس رحمتیں اترتی ہیں جن میں سے ساٹھ طواف کرنے والوں کیلئے اور باقی ساٹھ دوسری عبادت کرنے والوں کیلئے مخصوص ہیں، اللہ تعالیٰ کی یہ خصوصی رحمتیں ہیں جو دیگر مہربانیوں کے علاوہ ہیں انہی فضیلتوں کی وجہ سے دنیا بھر سے لوگ کھنچ کھنچ کر آتے ہیں اور گزران کا ذریعہ بنتے ہیں۔

بیت اللہ شریف کے علاوہ جن باقی چیزوں کا یہاں ذکر کیا گیا ہے، یعنی: حرمت کے مہینے، حج کی قربانی کے جانور اور پٹے والے جانور ہیں، یہ سب شعائر اللہ میں داخل ہیں، بیت اللہ شریف خود بھی شعائر اللہ میں داخل ہے اس کے علاوہ حج، طواف، صفا مروہ، منیٰ، عرفات، مزدلفہ، زیارات وغیرہ شعائر اللہ میں ہی شمار ہوتے ہیں، اور شعائر اللہ کی تعظیم ہمارے دین کی بنیادوں میں سے ہیں، "سورۂ حج" میں موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ کے شعائر کی تعظیم دلوں کے تقویٰ کی نشانی ہے، بیت اللہ شریف ظاہری طور پر بھی پوری کائنات کا مرکز ہے اور روحانی طور پر بھی یہ مسلمانوں کا مرکز ہے۔

بیت اللہ شریف کو انسانوں کی سدھار، اخلاق، اور ہدایت کا مرکز بنایا ہے، اسی زمین میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی پیدائش ہوئی اور یہیں پلے بڑھے، قرآن کریم یہیں اترا، اسی بیت اللہ کو ہمیشہ کیلئے نمازوں کا قبلہ مقرر کیا گیا اسے حج و عمرہ کا مرکز بنایا گیا، لہٰذا یہ لوگوں کے قیام کا ذریعہ ہے، اس کا بلند مرتبہ قیامت کے قریب تک قائم رہے گا، حدیث شریف میں آتا ہے کہ پھر حبشہ کا موٹی پنڈلیوں والا ایک ظالم انسان اس پر حملہ آور ہوکر اسے گرادے گا اور اس کے بعد جلد ہی قیامت قائم ہوجائے گی، اسی لئے فرماتے ہیں کہ جب تک کعبہ شریف اور دوسری شعائر اللہ کی عزت و حرمت اور مرکزیت قائم ہے تو دنیا قائم ہے اور جب یہ نہ رہے گی تو دنیا بھی باقی نہیں رہے گی۔

بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والے ہیں وہ ان کی مصلحتوں سے بھی واقف ہیں اسی لئے اس نے بیت اللہ کو مرکزیت عطا فرمائی ہے جب تک مسلمان اس مرکز سے وابستہ رہیں گے ان کو عزت حاصل رہے گی جب اس مرکز کا احترام دلوں سے نکل جائے گا تو اللہ تعالیٰ کے ایک ہونے اور اس کی بندگی کی حقیقت بھی جاتی رہے گی اور لوگ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بے حقیقت ہو کر رہ جائیں گے، غرضیکہ بیت اللہ شریف تمام جہان کے لوگوں کیلئے قیام کا ذریعہ ہے اسے دنیا میں مرکزی حیثیت حاصل ہے، اللہ تعالیٰ کی عبادت اس کی روح ہے اور جب تک یہ روح قائم ہے ڈھانچہ بھی قائم ہے۔

اللہ تعالیٰ کی صفتیں

اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ وَ اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۹۸﴾

جان لو تم | یہ کہ | اللہ | سخت ہے | عذاب میں | اور | یہ کہ | اللہ | بخشنے والا | مہربان ہے (۹۸)

مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ

نہیں | اوپر | پیغمبر کے | مگر | پہنچا دینا | اور | اللہ | جانتا ہے | جو | تم ظاہر کرتے ہو

وَ مَا تَكْتُمُوْنَ ﴿۹۹﴾

اور | جو تم | چھپا کر کرتے ہو (۹۹)

بامحاورہ ترجمہ:۔ جان لو کہ بیشک اللہ کا عذاب سخت ہے اور بیشک اللہ بخشنے والے مہربان ہیں۔ (۹۸)

پیغمبر کے ذمے صرف پہنچا دینا ہے اور اللہ کو معلوم ہے جو تم ظاہر میں کرتے ہو اور جو تم چھپا کر کرتے ہو۔ (۹۹)

تفسیر

قرآن مجید انسان کو جو باتیں سکھانا چاہتا ہے ان کا خلاصہ ان جیسی آیتوں میں جگہ جگہ بیان کر دیا جاتا ہے،

اس سورۃ میں شروع ہی سے کچھ کاموں کے کرنے کا اور کچھ کاموں سے رکنے کا حکم دیا جارہا ہے ان پر غور کرنے سے صاف سمجھ میں آجائے گا کہ ہمارا طریقہ کارزندگی میں کیا ہونا چاہئے؟

ارشاد ہے کہ: خوب سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والے ہیں، اور وہ اپنی مہربانی سے قصور معاف کرنے والے بھی ہیں اس کے بعد پھر وہی جملہ دہرایا گیا ہے کہ پیغمبر کا کام صرف پیغام پہنچا دینا ہے، آگے ہر ایک کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے وہ سب کھلے اور چھپے کاموں سے واقف ہیں، ان آیتوں پر غور کرنے سے صاف سمجھ میں آجاتا ہے کہ دنیا میں انسان کو اپنے کام شروع کرنے سے پہلے اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ اس ساری دنیا کے اور سارے کاموں کے اور خود اس کے پیدا کرنے والے ایک اللہ ہیں جو سب سے زبردست ہیں وہی سب کے مالک ہیں اور سب اس کے بندے ہیں اور خادم ہیں، اس کے سوا کوئی کسی کو نہ کچھ دے سکتا ہے نہ چھین سکتا ہے، اس کے حکم کے بغیر نہ کوئی کسی کا کچھ بگاڑ سکتا ہے نہ سنوار سکتا ہے؛ اس لئے اس کے سوا نہ کسی سے ڈرنے کی ضرورت ہے اور نہ کسی کی خوشامد اور بندگی کرنے کی ضرورت ہے، وہ برے کاموں پر سخت سزا دینے والے ہیں اور اپنے سامنے عاجزی کے ساتھ جھکنے والوں کے قصور اور گناہ معاف کرنے والے ہیں، برے کام وہ ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں منع فرمادیا ہے اور اچھے کام وہ ہیں جن کے کرنے کا حکم فرمادیا ہے؛ اسے لئے ہماری زندگی کا سوا اس کے کوئی مقصد نہیں کہ اس کا حکم مانیں اور جو اس کے پیغمبر کہیں وہ کریں اور جس سے وہ روکیں اس سے رک جائیں اس کو چھوڑ کر ہم چاہے جو کریں سب فضول اور بیکار ہے۔

اس آیت سے ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سخت سزا بھی دے سکتے ہیں اور اپنی مہربانی سے معاف بھی کرسکتے ہیں، اور اس آیت میں یہ بھی بتلا دیا گیا کہ جو حلال وحرام کے حکم دیئے گئے ہیں ان میں ضرور حکمت و مصلحت ہے ان پر عمل کرنے میں ہی بھلائی ہے ان کی خلاف ورزی میں سخت وبال وعذاب ہے، ساتھ ہی یہ بھی بتلا دیا گیا کہ انسانی بھول اور غفلت سے کوئی گناہ ہو جائے تو اللہ تعالیٰ فوراً عذاب نہیں دیتے بلکہ توبہ کرنے والوں اور گناہ پر شرمندہ ہونے والوں کیلئے مغفرت کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ تو اتنا ہی کام ہے کہ ہمارے حکم مخلوق کو پہنچا دیں، پھر وہ مانیں نہ مانیں اس کا نقصان

نہیں کو پہنچے گا، ان کی نافرمانی سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا کچھ نقصان نہیں، اور یہ بھی سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ کو کوئی فریب نہیں دے سکتا وہ تمہارے کھلے اور چھپے ہر کام سے واقف ہیں۔

حلال و حرام

قُلْ لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيْثُ وَ الطَّيِّبُ وَلَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ

کہہ دیجئے نہیں برابر ہے ناپاک اور پاک اگرچہ بھلی لگے آپ کو بہتات

ع ۱۳ ۳ الْخَبِيْثِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰۤاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

ناپاک چیزوں کی پس ڈرو اللہ سے اے عقل والو! شاید تم فلاح پاؤ (۱۰۰)

بامحاورہ ترجمہ:- آپ کہہ دیجئے کہ ناپاک اور پاک برابر نہیں اگرچہ ناپاک چیزوں کی بہتات تمہارے دل کو لبھائے، اے عقلمندو! اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم کو نجات ہو۔ (۱۰۰)

تفسیر

اس رکوع سے پہلے پاک چیزوں کو اپنے اوپر حرام کرنے سے مسلمانوں کو منع کیا تھا اور کہا گیا تھا کہ بعض چیزیں جو ناپاک اور خبیث ہیں ان کو چھوڑ دو، حلال صاف ستھری چیزوں میں اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے بڑے بڑے فائدے رکھے ہیں، اس سے یہ سمجھانا مقصود تھا کہ اللہ تعالیٰ جن چیزوں سے منع فرماتے ہیں ان میں ضرور انسان کا نقصان ہوتا ہے اور جن چیزوں کے کرنے کا حکم دیتے ہیں اس میں ضرور انسان کا فائدہ ہوتا ہے خواہ دنیا کا ہو یا آخرت کا، اس لئے مسلمانوں کو جس سے اللہ تعالیٰ منع فرمائیں اس سے فوراً رک جانا چاہئے اور جن چیزوں کے کرنے کا حکم دیں ان کو فوراً کرنا چاہئے۔

قُلْ لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيْثُ وَ الطَّيِّبُ: عربی زبان میں "طَيِّب" اور "خَبِيْث" ایک دوسرے کے مقابل دو لفظ ہیں، "طَيِّب" سے کسی چیز کی عمدگی کو اور "خَبِيْث" سے کسی چیز کی خرابی کو بیان کیا جاتا ہے،

اس آیت میں اکثر مفسرین کے نزدیک "خَبِیْث" سے مراد حرام یا ناپاک ہے اور "طَیِّب" سے مراد حلال یا پاک ہے، معنٰی اس آیت کے یہ ہوگئے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بلکہ ہر صحیح عقل رکھنے والے کے نزدیک پاک اور ناپاک یا حلال وحرام برابر نہیں ہوسکتے۔

اس جگہ لفظ "خَبِیْث" اور "طَیِّب" میں حرام وحلال مال ودولت بھی مراد ہوسکتی ہے اور اچھے اور برے انسان بھی، اور بھلے وبرے عمل واخلاق بھی، مطلب آیت کا واضح ہے کہ کسی صحیح عقل والے کے نزدیک نیک اور بد اور بھلا بُرا برابر نہیں ہوتا، اسی فطری قانون کے مطابق اللہ تعالیٰ کے نزدیک حلال وحرام یا پاک وناپاک چیزیں برابر نہیں، اسی طرح اچھے اور برے عمل واخلاق برابر نہیں، اسی طرح نیک وبد انسان برابر نہیں۔

آیت کا شانِ نزول

اس آیت کے شانِ نزول کے متعلق بعض روایتوں میں ہے کہ جب اسلام میں شراب کو حرام اور اس کی خرید وفروخت کو بھی ممنوع قرار دے دیا گیا تو ایک شخص نے جس کا کاروبار شراب بیچنے کا تھا اور اس کے ذریعہ سے اس نے کچھ مال جمع کر رکھا تھا، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ اے اللہ کے پیغمبر! یہ مال جو شراب کی تجارت سے میرے پاس جمع ہوا ہے اگر میں اس کو کسی نیک کام میں خرچ کروں تو کیا وہ میرے لئے فائدہ مند ہوگا؟ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اگر تم اس کو حج یا جہاد وغیرہ میں خرچ کروگے تو وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مچھر کے ایک پر کے برابر بھی قیمت نہ رکھے گا، اللہ تعالیٰ پاک اور حلال چیز کے سوا کسی چیز کو قبول نہیں فرماتے۔

حرام مال کا یہ بے حیثیت ہونا تو آخرت کے اعتبار سے ہوا اور اگر گہری نظر سے دیکھا جائے اور سب کاموں کے آخری انجام کو سامنے رکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ دنیا کے کاروبار میں بھی حلال وحرام مال برابر نہیں ہوتے، حلال سے جتنے فائدے اور اچھے نتیجے اور حقیقی آرام وراحت نصیب ہوتی ہے وہ کبھی حرام سے نہیں ہوتی۔

اس آیت میں اسی مضمون کو اور صاف کردیا گیا ہے کہ انسان کا علم چیزوں کی بھلائی برائی معلوم کرنے

کیلئے کافی نہیں اسی لئے انہیں بتادینا چاہئے کہ پاکیزہ چیزیں اور ناپاک چیزیں درجہ میں ہرگز برابر نہیں، پاکیزہ چیز اگر تھوڑی بھی ہوتب بھی وہ ناپاک چیز سے بہتر ہے اگر چہ ناپاک ہر طرف پھیل جائے اور عام رواج ہو جانے سے یہ دھوکا ہوتا ہو کہ جب سب جگہ رائج ہو گئی تو اچھی ہی ہو گی، کوئی چیز اگر پھیل جائے اور لوگ اسے بہت زیادہ کرنے لگیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اچھی ہی ہو گی، کسی چیز کے اچھے یا برے ہونے کا دارومدار اللہ تعالیٰ کے حکم پر ہے۔

آگے ارشاد ہے کہ: عقلمند لوگوں کو چاہئے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈر کر کام کریں اسی میں ان کی نجات کی امید ہے اس آیت میں اشارہ نکلتا ہے کہ فیصلہ کا دارومدار کثرت رائے پر نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر ہے۔

بے ضرورت سوالات

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْــَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ

اے | وہ لوگو! | جو ایمان لائے ہو | مت | پوچھو | بابت | ان باتوں کے | کہ اگر | کھولی جائیں پر تم

تَسُؤْكُمْ ۚ وَاِنْ تَسْــَٔلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ ؕ

بری لگیں تم کو | اور | اگر | پوچھو تم | سے ان | جب کہ | اتارا جارہا ہو | قرآن | تو کھول دی جائیں تم پر

عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۰۱﴾

درگذر کی | اللہ نے | سے ان | اور | اللہ | بخشنے والا | حلم والا ہے (۱۰۱)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اے ایمان والو! ایسی باتیں مت پوچھو کہ اگر تم پر کھولی جائیں تو تمہیں بری لگیں اور اگر یہ باتیں ایسے وقت میں پوچھو گے جبکہ قرآن اتارا جارہا ہے تو تم پر ظاہر کر دی جائیں گی، اللہ نے ان سے درگذر کی ہے اور اللہ بخشنے والے برداشت کرنے والے ہیں۔ (۱۰۱)

تفسیر

پچھلے دو رکوع میں جو کچھ بیان ہوتا رہا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ دین کی باتوں میں اپنی طرف سے کمی زیادتی نہ کرو، جس بات کے کرنے کا حکم دیا جائے وہ کرو اور جس سے منع کیا جائے اس سے رک جاؤ، اس آیت میں مسلمانوں کو ایک اور بات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، بعض لوگوں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسے سوال پوچھنے شروع کیے کہ اگر ان کا جواب دے دیا جاتا تو وہ شرعی حکم بن جاتا اور اس پر عمل کرنا ضروری ہو جاتا، ایسی کھود کرید سے اس آیت میں منع کیا گیا ہے اس میں خواہ مخواہ ایک کھلے راستہ کو تنگ کرنا ہے۔

ارشاد ہے کہ: مسلمانوں کیلئے لازم ہے کہ ایسی چیزوں کے بارے میں سوال نہ کیا کریں جن کے جواب سے مشقت بڑھ جائے یا رنج وغم پیدا ہو جائے، کیونکہ وحی کے اترنے کے زمانے میں ہر جواب وحی سے دیا جائے گا، اور پھر اس کے مطابق عمل ضروری ہو جائے گا، یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آسانی ہے کہ بہت سی باتوں کو یونہی چھوڑ دیا ہے، پھر اسی کے ساتھ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ قصور معاف کرنے والے بھی ہیں، ہونا یہ چاہئے کہ جو حکم دیا جائے اس پر عمل کرنے کیلئے تیار رہیں اور اپنی طرف سے خواہ مخواہ ہر بات کے بارے میں نہ پوچھیں، اس آیت میں وہی تعلیم ہے جس کو قانون سازی کا بہترین طریقہ مان لیا گیا ہے یعنی جو چیزیں صاف طور پر فائدہ مند ہیں اس کو جائز قرار دینا اور جو چیزیں کھلم کھلا نقصان دہ ہیں ان سے بالکل روک دینا اور بیچ کی باتوں کو کرنے والے کی مرضی پر چھوڑ دینا کہ وہ خود سوچ کر فیصلہ کرے، اسلام نے یہی طریقہ اختیار کیا ہے، افسوس کہ! بہت سے لوگ نہیں سمجھتے یا سمجھتے ہیں تو اس کے مطابق عمل نہیں کرتے۔

"مسلم شریف" میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے کہ: پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فضول باتیں کرنے کو اور زیادہ سوال کرنے سے منع فرمایا، اس کا کیا فائدہ؟ بات تو وہ ہونی چاہئے جس سے دنیا میں بھی فائدہ ہو اور آخرت میں بھی فائدہ ہو، اسی طرح مال کے ضائع کرنے سے بھی منع فرمایا گیا ہے، حلال مال کو بے بنیاد رسموں کی نذر کر دینا

بے جا زیب وزینت میں اڑا دینا نہایت ناپسندیدہ بات ہے۔

سوال کی زیادتی کے ضمن میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی موجود ہے کہ: مسلمانوں میں بڑا مجرم وہ ہے جس کے سوال کی وجہ سے جو چیز حرام نہیں تھی وہ حرام قرار دے دی گئی ہو اور اس کی وجہ سے لوگوں پر تنگی پیدا ہو گئی ہو، "مسلم شریف" کی روایت میں آتا ہے کہ جب حج کا حکم اتارا گیا تو اقرع بن حابس رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر سوال کیا کہ کیا حج کرنا ہر سال فرض ہے؟ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم بہت ناراض ہوئے، اور فرمایا کہ: اگر میں کہہ دیتا کہ ہاں حج ہر سال کرنا ہے تو تمہیں کرنا پڑتا، اور پھر کتنی مشکل پیش آتی، لہٰذا حکم کو پورا کیا کرو اس قسم کے سوال مت کیا کرو، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے بہتر کسی قوم کو نہیں دیکھا کہ وہ زیادہ سوال نہیں کیا کرتے تھے۔

قرآن پاک میں "یَسْئَلُوْنَکَ: اے پیغمبر! لوگ آپ سے سوال کرتے ہیں" کا لفظ ۱۳ مقامات پر آیا ہے، ان میں زیادہ تر یہودیوں اور مشرکوں کے سوالات ہیں اور مسلمانوں کی طرف سے بہت کم سوال کیے گئے ہیں، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سوال کرنے کے بجائے آپ کے ارشادات سننے کے منتظر رہتے تھے، اور پھر جو کچھ سنتے تھے اس پر عمل شروع کر دیتے تھے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ہر وقت حاضر رہنے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تو یہ حالت تھی، البتہ دیہات کے رہنے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم چونکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی اکثر مجلسوں میں شریک نہیں ہو سکتے تھے اس لئے ان کی تعلیم کیلئے ہر قسم کے سوال پوچھنے کی اجازت تھی۔

آیت میں یہ کہا گیا ہے کہ تم سے پہلے بعض امتیں اسی سوال کی زیادتی کی وجہ سے ہلاک ہو چکی ہیں کہ جو چیزیں اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر نے فرض نہیں کی تھیں سوال کر کر کے ان کو فرض کرا لیا اور پھر اس کی خلاف ورزی میں مبتلا ہو گئے، تمہارا کام یہ ہونا چاہئے کہ جس چیز کا میں حکم دوں اس کو پورا کرنے کی کوشش کرو اور جس سے منع کر دوں اس کو چھوڑ دو، مراد یہ ہے کہ جن چیزوں کے بارے میں بتانا ضروری نہ سمجھا جائے ان کے متعلق کھود کرید نہ کرو۔

اس آیت میں ایک ضمنی جملہ میں یہ بھی ارشاد فرمایا گیا ہے کہ "وَاِنْ تَسْـَٔلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ "یعنی: قرآن کریم کے اترنے کے زمانہ میں اگر تم ایسے سوالات کروگے تو وحی کے ذریعہ ان کا جواب آجائے گا اس میں قرآن کریم کے اترنے کے زمانے کا ذکر کرکے اشارہ فرمادیا کہ قرآن کریم کے مکمل ہوجانے کے بعد پیغمبری اور وحی کا سلسلہ بند کردیا جائے گا۔

پیغمبری اور وحی کا سلسلہ بند ہوجانے کے بعد ایسے سوالات کا اگرچہ یہ اثر نہ ہوگا کہ نئے احکام آجائیں جو چیزیں فرض نہیں ہیں وہ فرض ہوجائیں یا وحی کے ذریعہ کسی کا خفیہ راز ظاہر ہوجائے لیکن بے ضرورت سوالات گھڑ گھڑ کر علماء وفقہاء کو پیش کرنا یا خود ان کی تحقیقات میں پڑنا یا بے ضرورت چیزوں کے متعلق سوالات کرنا اب بھی ناپسندیدہ اور ممنوع ہی رہے گا کیونکہ اس میں اپنا اور دوسروں کا وقت ضائع کرنا ہے، پیغمبر ﷺ کا ارشاد ہے کہ مسلمان ہونے کی ایک خوبی یہ ہے کہ آدمی فضول باتوں کو چھوڑ دیتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ بہت سے مسلمان جو بالکل فضول چیزوں کی تحقیق میں لگے رہتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا نام کیا تھا، اور حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی کی لمبائی اور چوڑائی کیا تھی، جن کا کوئی اثر انسان کے عمل پر نہیں، ایسے سوالات کرنا ناپسندیدہ ہے، خصوصاً جبکہ یہ بھی معلوم ہو کہ ایسے سوالات کرنے والے حضرات اکثر ضروری اور اہم دینی مسائل سے بے خبر ہوتے ہیں، فضول کاموں میں پڑنے کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ آدمی ضروری کاموں سے محروم ہوجاتا ہے، رہا یہ معاملہ کہ حضرات فقہاء نے خود ہی مسائل کی بہت سی صورتیں نکال کر اور سوالات قائم کرکے ان کے حکم بیان کردیئے ہیں، سو یہ بے ضرورت چیز نہ تھی، آنے والے واقعات نے بتلادیا کہ آئندہ نسلوں کو ان کی ضرورت تھی؛ اس لئے وہ فضول اور بے مقصد سوالات نہ تھے، اسلام کی تعلیمات میں یہ بھی ایک تعلیم ہے کہ علم ہو یا عمل، کوئی کام ہو یا کلام جب تک اس میں کوئی دینی یا دنیاوی فائدہ نہ ہو اس میں لگ کر وقت ضائع نہ کریں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: اب تک جو سوال ہوچکے ہیں اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف فرمادیا ہے اور اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والے اور برداشت کرنے والے ہیں۔

”بَحِیْرَة“ اور ”سَآئِبَة“ وغیرہ کی حقیقت

قَدْ سَاَلَهَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ اَصْبَحُوْا بِهَا كٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۲﴾

تحقیق پوچھ چکی ہے انکے بارے میں ایک جماعت سے پہلے تم پھر ہو گئے وہ سے اس انکار کرنے والے (۱۰۲)

مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِيْرَةٍ وَّ لَا سَآئِبَةٍ وَّ لَا وَصِيْلَةٍ وَّ لَا

نہیں مقرر کیا اللہ نے سے بحیرۃ اور نہ سائبہ اور نہ وصیلہ اور نہ

حَامٍ ۙ وَّ لٰكِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ

حامی اور لیکن وہ لوگ جو کافر ہوئے گھڑتے ہیں اوپر اللہ کے جھوٹ

وَ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۱۰۳﴾

اور بہت سے میں ان نہیں سمجھتے (۱۰۳)

بامحاورہ ترجمہ:۔ ایسی باتیں تم سے پہلے ایک جماعت پوچھ چکی ہے، پھر وہ ان باتوں سے انکاری ہو گئے۔(۱۰۲) اللہ نے نہیں مقرر کیا بحیرہ اور نہ سائبہ اور نہ وصیلہ اور نہ حامی، لیکن کافر لوگ اللہ پر بہتان باندھتے ہیں اور ان میں اکثروں کو عقل نہیں۔(۱۰۳)

تفسیر

ارشاد ہے کہ: تم سے پہلے ایک جماعت نے ایسی باتوں کے بارے میں سوالات کئے تھے جن کو صاف طور پر حرام نہیں کیا گیا تھا، پھر جب ان کو جواب دیا گیا انہیں معلوم ہوا کہ اس پر عمل کرنا مشکل ہے اور اس کے ماننے سے انکار کر بیٹھے، ایک تو یہ کہ ایسی بات کا حکم پوچھ کر جو آسانی کیلئے یونہی چھوڑ دی گئی تھی انہوں نے سوال کر کے اپنے لئے مشکل پیدا کر لی دوسرے یہ کہ اس بارے میں حکم ملنے کے بعد اس کے ماننے سے انکار کر دیا

اور کافر ہو گئے۔

دوسری آیت میں بت پرستوں کی ایک اور بیہودہ رسم سے منع کیا گیا ہے جس کی وجہ سے ایسی چیزوں کو حرام کرلیا جاتا تھا جو اللہ تعالیٰ نے حرام نہیں کیں، مثلاً: کسی جانور کا دودھ پینا چھوڑ دیتے اور کہتے تھے کہ ان کو فلاں بت کے نام پر چھوڑ دیا گیا ہے ان سے وہی فائدہ اٹھائے گا، ان جانوروں کے نام الگ الگ تھے جن کی تفصیل آگے آرہی ہے، وہ یہ سارے کام بتوں کو خوش کرنے کیلئے کرتے تھے لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ بھی ان باتوں سے خوش ہوتے ہیں، ارشاد ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ حکم کہیں نہیں دیا جو لوگ اسے اللہ تعالیٰ کا حکم کہتے ہیں وہ جھوٹے ہیں عقل سے کام نہیں لیتے۔

مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِيْرَةٍ: اللہ تعالیٰ نے کوئی "بحیرہ" نہیں بنایا بلکہ یہ تو مشرکوں کی طرف سے اللہ تعالیٰ پر بہتان ہے، مفسرین کرام "بحیرہ" کی تفسیر دو طرح کرتے ہیں، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب التفسیر میں فرمایا ہے کہ مشرک لوگ جس جانور کا دودھ اپنے باطل معبودوں کے نام پر وقف کر دیتے تھے اس کا دودھ اپنے اوپر حرام کر لیتے تھے اور پھر ایسے جانور کا کان بھی چھید دیتے تھے جس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ اس جانور کا دودھ کوئی شخص استعمال نہیں کرسکتا ایسے جانور کو "بحیرہ" کہتے تھے، "بحیرہ" کی دوسری تفسیر یہ ہے کہ یہ نام اس مادہ جانور کو دیا جاتا تھا جو مسلسل دس مادہ بچے جنے اور اس کا آخری بچہ نر ہو اسے بھی باطل معبودوں کے نام پر وقف کر دیتے تھے اور اس کا دودھ استعمال نہیں کرتے تھے۔

وَ لَا سَآئِبَةٍ: اور "سائبہ" بھی اللہ تعالیٰ نے نہیں بنایا، "سائبہ" اس جانور کو کہتے تھے جو کسی منت کے پورا ہونے پر بتوں کے نام پر چھوڑ دیا جاتا، نہ اس کا دودھ استعمال کیا جاتا نہ اس پر سواری کی جاتی اور نہ اس سے سامان اٹھانے کا کام لیا جاتا اور نہ کوئی دوسرا کام لیا جاتا۔

وَ لَا وَصِيْلَةٍ: اللہ تعالیٰ نے کسی کو "وصیلہ" بھی نہیں بنایا بلکہ یہ بھی مشرکوں کی اپنی من گھڑت بات ہے، "وصیلہ" اس اونٹنی کو کہتے تھے جو مسلسل ۱۲ اونٹنیاں جن چکی ہو اور ان کے بیچ میں کوئی نر نہ جنا ہو، مشرک اس کو مقدس

جاننے کی وجہ سے اس کا استعمال بھی درست نہیں سمجھتے تھے، اسے بتوں کے نام پر وقف کر دیتے تھے اور پھر نہ اس کا دودھ پیتے تھے اور نہ اس سے کوئی اور کام لیتے تھے۔

وَ لَا حَامٍ: اور اللہ تعالیٰ نے کوئی "حام" بھی مقرر نہیں فرمایا، "حام" کا معنیٰ بچا لینے والا ہے، جس اونٹ کی جفتی سے دس بچے پیدا ہو جائیں اسے "حام" یعنی: اپنی نسل کا محافظ کہتے تھے، پھر نہ اس سے سامان اٹھانے کا کام لیتے اور نہ اسے کسی دوسرے کام میں استعمال کرتے تھے۔

بہر حال مشرکوں نے جاہلیت کے زمانہ میں اس قسم کی رسموں کو جاری کر کے بعض جانوروں کو اپنے اوپر حرام کر رکھا تھا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: ہم نے تو ایسا کوئی حکم نہیں دیا، یہ ان کی اپنی من گھڑت بات ہے اور پھر بتوں کے نام پر جانوروں کو وقف کر دینا تو ویسے ہی شرک ہے جس کے ذمہ دار یہ لوگ خود ہیں، اللہ تعالیٰ نے ایسی تمام رسموں کو غلط قرار دیا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ سے لے کر تقریباً ڈیڑھ ہزار سال تک عرب کے لوگ صحیح دین ابراہیمی پر قائم تھے، بت پرستی کی ابتداء پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے بھیجے جانے سے تقریباً چار سو سال پہلے ہوئی، ایک شخص عمرو ابن لحی کسی دوسرے ملک میں گیا وہاں اس نے بت اور مجسمے دیکھے جو اسے پسند آئے وہ ان میں سے کچھ اپنے ساتھ بھی لے آیا اور اس طرح اس نے عرب میں بت پرستی کی ابتداء کی، جھوٹے خداؤں کے نام پر جانور وقف کرنے کا کام بھی اسی شخص نے شروع کیا تھا، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: میں نے عمرو ابن لحی کو دوزخ میں اس حالت میں دیکھا ہے کہ وہ اپنی آنتوں کو اس طرح زمین پر گھسیٹتا جا رہا تھا جس طرح گدھا خراس کو کھینچتا ہے، آپ نے اپنے ایک صحابی حضرت اکثم رضی اللہ عنہ کو فرمایا کہ عمرو ابن لحی کی شکل تم سے ملتی جلتی ہے اس پر انہوں نے عرض کیا کہ کیا میرا اس بدبخت کا ہم شکل ہونا میرے لئے وبال کا سبب تو نہیں؟ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ کوئی عیب کی بات نہیں، فرمایا: تم مؤمن ہو اور وہ کافر تھا، اور مؤمن اور کافر ہم شکل تو ہو سکتے ہیں مگر ان دونوں کا انجام الگ الگ ہے، بہر حال بت پرستی شروع ہونے کے بعد اس کا رواج اس قدر بڑھا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں مکہ کے فتح کے دن

خانہ کعبہ کے اندر اس کی دیواروں پر اور اس کے قریب تین سو ساٹھ بت موجود تھے جنہیں توڑ کر باہر پھینک دیا گیا اور اس طرح بیت اللہ شریف کو بتوں کی گندگی سے پاک کر دیا گیا۔

وَ لٰكِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ۚ وَ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ: اللہ تعالیٰ نے نہ کوئی "بحیرہ" بنایا ہے، نہ "سائبہ"، نہ "وصیلہ" اور نہ "حام" بلکہ یہ کافر لوگ اللہ تعالیٰ کے خلاف جھوٹی باتیں گھڑتے ہیں، انہوں نے غیر اللہ کی نذر و نیاز کی سب جھوٹی کہانیاں بنا رکھی ہیں کہ ایسا کرنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ یہ سب غلط اور اللہ تعالیٰ پر بہتان ہے، انہوں نے خود ہی اپنے اوپر بعض جانور حرام قرار دے لئے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں حلال قرار دیا ہے، ان لوگوں میں سے اکثر بے عقل ہیں، انہوں نے اپنی بے وقوفی اور حماقت کی وجہ سے خود بنائے ہوئے عقیدے اور رسمیں جاری کر رکھیں ہیں، یہ تو صحیح عقل کے بھی خلاف ہے، اللہ تعالیٰ کا ان بیہودہ باتوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔

حرام چیزوں کی کچھ تفصیل اگلی سورۃ "سورۂ انعام" میں بھی آ رہی ہے وہاں پر شرک کی تمام قسمیں تفصیل کے ساتھ بیان کی جائیں گی۔

کافر باپ دادوں کی بے سوچے سمجھے پیروی

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ اِلَى الرَّسُوْلِ

اور جب کہا جائے ان سے آؤ طرف اسکے جو اتارا اللہ نے اور طرف پیغمبر کے

قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ

کہیں وہ کافی ہے ہمیں وہ جو پایا ہم نے پر جس باپ دادا اپنے کو اگرچہ ہوں باپ دادا انکے

لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا وَّ لَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰۴﴾

نہ جانتے کچھ اور نہ وہ ہدایت پاتے (۱۰۴)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور جب ان کو کہا جاتا ہے اس کی طرف آؤ جو اللہ نے اتارا ہے اور آؤ پیغمبر کی طرف، تو کہتے ہیں وہ ہم کو کافی ہے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا، بھلا اگرچہ ان کے باپ دادا کچھ علم نہ رکھتے ہوں اور نہ وہ ہدایت پر ہوں۔(۱۰۴)

شانِ نزول

اس آیت کا شانِ نزول یہ ہے کہ جاہلیت کی رسموں میں سے ایک رسم باپ دادوں کی بے سوچے سمجھے پیروی بھی تھی جس نے ان کو ہر برائی میں مبتلا اور ہر بھلائی سے محروم کررکھا تھا، "تفسیر درمنثور" میں ابن ابی حاتم کے حوالہ سے نقل کیا گیا ہے کہ ان میں سے کوئی خوش نصیب اگر حق بات کو مان کر مسلمان ہوجاتا تو اس کو یوں شرم دلائی جاتی تھی کہ تو نے اپنے باپ دادوں کو بیوقوف ٹھہرایا کہ ان کے طریقے کو چھوڑ کر دوسرا طریقہ اختیار کرلیا، ان کی اس گمراہی در گمراہی پر یہ آیت اتری۔

اس آیت میں اسلام کی اصل تعلیم بہت دلچسپ طریقہ سے کھول کر بتادی گئی ہے کہ اسلام چاہتا ہے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر کہیں اس پر عمل کیا جائے، باپ دادا کے طریقے اگر اس کے خلاف ہوں تو انہیں بالکل چھوڑ دیا جائے کیونکہ ان طریقوں اور رسموں کے اچھا ہونے کی دلیل نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر جو کہتے ہیں اس کی دلیل بھی موجود ہے اور اس کے ساتھ ہی کامیابی اور نجات کی ذمہ داری بھی ہے اس لئے یہ بہانہ کرنا کہ یہ بات ہمارے باپ دادا سے چلی آرہی ہے اسے کیسے چھوڑ دیں بالکل بیہودہ ہے، عقل سے ذرا کام لینے سے اس کا فضول ہونا ظاہر ہوجائے گا۔

ارشاد ہے کہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر کے مقرر کیے ہوئے راستہ کی طرف بلایا جاتا ہے تو وہ یہ بہانہ کرتے ہیں کہ ہمارے لئے تو یہی طریقہ کافی ہے جو ہمارے باپ دادا ہمارے لئے چھوڑ گئے ہیں، وہ خود ساری عمر یہی باتیں کرتے رہے ہیں اور ہمیں بھی یہی سکھاتے رہے، اس کے جواب میں کہا گیا ہے کہ ان سے یہ پوچھو کہ

تمہارے باپ دادا کا اصلی باتوں سے ناواقف ہونا ممکن ہے یا نہیں، کیا یہ ممکن نہیں کہ انہیں ٹھیک راستہ کا پتہ ہی نہ چلا ہو، تو کیا ایسی حالت میں بھی تم ان ہی کے پیچھے چلنا پسند کرو گے؟ یہ بات تو عقل کے خلاف ہے، موٹی سی بات ہے کہ اگر کوئی ان سے زیادہ جاننے والا اور راستوں سے زیادہ واقف شخص یوں کہے کہ یہ راستہ جس پر وہ خود بھی چلتے رہے اور اولاد کو بھی چلاتے رہے آخر میں ایک اندھے گڑھے میں جا کر گرادے گا اور پھر وہاں سے نکلنا نصیب نہ ہوگا تو یقیناً اس تجربہ کار اور واقف کار شخص کی بات توجہ سے سننے اور ماننے کے قابل ہے۔

مشرک باپ دادوں کی پیروی اور علم وہدایت والے

اماموں کی پیروی میں فرق

باپ دادوں کی اندھا دھند پیروی کے برخلاف اگر علم والوں کی پیروی اس بناء پر کی جائے کہ وہ قرآن پاک اور شریعت کو بہتر طور پر جانتے ہیں تو ایسی پیروی نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہوتی ہے، اماموں اور عالموں وفقیہوں کی پیروی صرف اس لئے کی جاتی ہے کہ وہ قرآن وسنت کو بہتر جاننے والے ہوتے ہیں، لہٰذا امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی پیروی مشرکانہ پیروی نہیں ہے بلکہ بالکل جائز ہے، وہ ہم سے زیادہ علم والے تھے اور شرعی مسئلوں کا حل بہتر طور پر پیش کر سکتے تھے، جاہلانہ پیروی میں بعض غلط کرنے والے صوفیوں کا بھی حصہ ہے جب انہیں قرآن وسنت کی بات بتائی جاتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو اپنے بزرگوں کے طریقہ پر چلیں گے، یہ بھی مشرکانہ پیروی میں آتا ہے، صحیح پیروی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور پیغمبر کی بات کو سب سے آگے رکھا جائے، جو چیز اس کے مطابق ہے اسے قبول کرلیا جائے اور اگر کوئی شیخ قرآن وسنت کے خلاف کہتا ہے تو وہ گمراہی کی بات ہوگی، اسے رد کردیا جائے گا۔

کسی پر تنقید کرنے کا مؤثر طریقہ

قرآن کریم نے اس جگہ باپ دادوں کی پیروی کے عادی لوگوں کی غلطی کو واضح فرمایا اور اس کے ساتھ ہی کسی دوسرے پر تنقید اور اس کی غلطی ظاہر کرنے کا ایک خاص مؤثر طریقہ بھی بتلا دیا ہے جس سے سامنے والے کا

دل نہ دکھے، کیونکہ باپ دادوں کے دین کی پیروی کرنے والوں کے جواب میں یوں نہیں فرمایا کہ تمہارے باپ دادا جاہل یا گمراہ ہیں بلکہ ایک سوالیہ عنوان بنا کر ارشاد فرمایا کہ: کیا باپ دادا کی پیروی اس حالت میں بھی کوئی معقول بات ہوسکتی ہے جب کہ باپ، دادا نہ علم رکھتے ہوں نہ ہدایت۔

تم اپنی فکر کرو

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۚ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ
اے | لوگو! جو | ایمان لائے ہو | فکر کرو تم | جانوں اپنی کی | نہیں | نقصان دیتا تم کو | جو

ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ ۭ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ
بھٹکا | جب | راہ پر تم ہو | طرف | اللہ کے | لوٹنا ہے تم کو | سب کو | پھر جتلا دیگا وہ تم کو

بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۱۰۵
ساتھ اسکے | جو تھے تم | کرتے | (۱۰۵)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اے ایمان والو! تم پر اپنی جان کی فکر لازم ہے جو کوئی گمراہ ہو وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑتا جب کہ تم راہ پر ہو، تم سب کو اللہ کے پاس لوٹ کر جانا ہے پھر وہ تم کو جتلا دیں گے جو کچھ تم کرتے تھے۔ (۱۰۵)

تفسیر

مخلوق کی اصلاح کی فکر کرنے والوں کو ایک تسلی

مخلوق کی اصلاح کی فکر میں سب کچھ قربان کرنے والے مسلمانوں کو تسلی دی گئی ہے کہ جب تم نے حق کی تبلیغ وتعلیم میں اپنی طاقت کے مطابق کوشش کرلی اور نصیحت وخیرخواہی کا حق ادا کردیا تو پھر بھی اگر کوئی گمراہی پر جما

رہے تو تم اس کی فکر میں نہ پڑو اس حالت میں دوسروں کی گمراہی یا غلط کاری سے تمہارا کچھ نہ بگڑے گا۔

اس آیت میں مسلمانوں کو ایک ایسا قاعدہ بتایا گیا ہے جو تمام انسانوں کیلئے فائدہ مند ہے اور اس پر عمل کرنے سے سب کو سیدھا راستہ مل جاتا ہے، اور وہ قاعدہ یہ ہے کہ ہر شخص اپنے اپنے کام کا ذمہ دار ہے کسی شخص کو یہ نہیں چاہئے کہ دوسرے کی دیکھا دیکھی اپنا نقصان کرلے، بلکہ لازم ہے کہ ایسے کاموں سے خود بھی باز رہے اور جہاں تک ہوسکے دوسروں کو بھی ان سے روک دے، اگر کوئی نہ مانے تو وہ جانے اور اس کا کام۔

ارشاد ہے کہ مسلمانو! تمہیں لازم ہے کہ اپنی جانوں کو ہلاکت سے بچاؤ، بلکہ ہر ایک کو یہ سمجھادو کہ برے کام کا وبال اسی کے سر پڑے گا، اس لئے ہر ایک کو برے کاموں سے بچنا چاہئے، اگر وہ تمہاری نصیحت نہیں مانتا تو اپنے لئے ہی بگاڑ پیدا کرتا ہے، تمہارا بال بیکا نہیں کرسکتا، دوسروں کی دیکھا دیکھی بری باتوں میں پھنس جانے سے تم اپنا نقصان کرلوگے اور یہ بات کسی عقل مند کے نزدیک اچھی نہیں کہ اپنا نقصان کرے۔

یاد رکھو! تم سب ایک دن اللہ تعالیٰ کے پاس جمع ہوگے اور اس دن اللہ تعالیٰ تمہیں دکھا دیں گے کہ ہر انسان کو اپنے برے کاموں کی سزا خود بھگتنی پڑے گی، اور جس کی نقل کرکے وہ برائی میں پھنسا تھا وہ خواہ باپ دادا ہوں یا کوئی اور اس کے کچھ کام نہ آئے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ ہر انسان کو کسی کام کے کرنے سے پہلے خوب سوچ لینا چاہئے کہ اس کام کا ذمہ دار وہ خود ہے اگر وہ برا کام ہے تو اسے ہرگز نہ کرے ورنہ اس کی سزا وہ خود بھگتے گا، دوسروں کو برائی سے روکنا ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے اور تبلیغ کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ وہ خود نیک کام کرے تاکہ اسے دیکھ کر دوسرے بھی نیک کام کریں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ: اگر دوسرے لوگ تمہاری تبلیغ کا اثر قبول نہیں کرتے تو اس کی زیادہ فکر نہ کرو بلکہ اپنی اصلاح کی فکر کرو، اور پھر اپنی اصلاح کے ساتھ ساتھ ضرورت اور ہمت کے مطابق دوسروں کی اصلاح کی بھی کوشش کرو تاہم تمہارے حق میں زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ اپنی درستگی کو سامنے رکھو، اگر ایسا کروگے تو گمراہ ہونے والا شخص تمہیں کچھ نقصان نہیں پہنچا سکے گا، بعض اوقات ایمان والے یہ خطرہ محسوس کرتے

ہیں کہ اگر دوسرے لوگ ہدایت قبول نہیں کریں گے تو شاید ہم بھی گمراہ ہوکر انہی میں شامل نہ ہو جائیں، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: جو شخص خود گمراہ ہو چکا ہے وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا، مگر شرط یہ ہے کہ تم خود ہدایت کے راستے پر قائم رہو، امام ابوبکر جصاص رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس تسلی کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ غیر ہدایت یافتہ لوگوں کو تبلیغ کرنا ہی چھوڑ دیا جائے، بلکہ تمہارا فرض یہ ہے کہ حق کی بات دوسروں تک پہنچاتے رہو، ہاں! اگر ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ تمہاری بات بالکل غیر مؤثر ثابت ہو رہی ہے لوگ حق بات سننے تک کیلئے تیار نہیں اور سختی پر اتر آئے ہیں تو پھر ان کے زیادہ پیچھے نہ پڑیں اور اپنی اصلاح کی طرف توجہ دیں تاہم ان سے بالکل ہی کٹ کر نہ رہ جائیں بلکہ ان کے ساتھ اس حد تک رابطہ رہنا چاہئے کہ جب بھی مناسب موقع ملے دین کی تبلیغ کا کام پھر سے شروع کیا جا سکے۔

وصیّت پر گواہی

يٰٓاَيُّهَا	الَّذِيْنَ	اٰمَنُوْا	شَهَادَةُ	بَيْنِكُمْ	اِذَا	حَضَرَ	اَحَدَكُمُ
اے	لوگو! جو	ایمان لائے ہو	گواہی	درمیان تمہارے	جب	آ پہنچے	کسی کے پاس میں سے تم

الْمَوْتُ	حِيْنَ	الْوَصِيَّةِ	اثْنٰنِ	ذَوَا	عَدْلٍ	مِّنْكُمْ	اَوْ	اٰخَرٰنِ
موت	وقت	وصیت کے	دو	والے	انصاف	میں سے تم	یا	دو

مِنْ	غَيْرِكُمْ	اِنْ	اَنْتُمْ	ضَرَبْتُمْ	فِي	الْاَرْضِ	فَاَصَابَتْكُمْ
سے	سوا اوروں تمہارے میں	اگر	تم	سفر کر رہے ہو	میں	زمین	پس پہنچے تم کو

مُّصِيْبَةُ	الْمَوْتِ ؕ
مصیبت	موت کی

بامحاورہ ترجمہ:۔ اے ایمان والو! جب تم میں سے کسی کو موت آ پہنچے تو شہادت (کا نصاب) یہ ہے کہ

وصیت کے وقت تم (مسلمانوں) میں سے دو معتبر مرد گواہ ہوں یا اگر (مسلمان نہ ملیں اور) تم سفر کر رہے ہو اور (اس وقت) تم پر موت کی مصیبت واقع ہو تو کسی دوسرے مذہب کے دو (شخصوں کو) گواہ کرلو۔

تفسیر

ان آیتوں میں مرتے وقت وصی مقرر کرنے کا طریقہ بتایا گیا ہے، وصی وہ ہے جس کو مرنے والا اپنا مال حوالے کر جائے کہ میرے بعد میرے وارثوں کو دے دینا، بہتر تو یہ ہے کہ وصی دو معتبر عدل و انصاف کرنے والے مسلمان ہوں، لیکن اگر معتبر شخص نہ ملیں تو مسلمانوں میں سے جس کو چاہے وصی بنا سکتا ہے لیکن اگر سفر میں ہو اور موت آجائے تو غیر مسلم کو بھی وصی بنا سکتا ہے۔

ارشاد ہے کہ مسلمانوں کو یہ طریقہ اختیار کرنا چاہئے کہ اگر مرتے وقت کسی کو وصی بنائیں تو وصی دو انصاف پسند مسلمان ہوں، اس سے مراد یہ ہے کہ وہ ایسے شخص ہوں جن پر سب اعتماد کرتے ہوں اور ایمانداری کے اندر مشہور ہوں، اگر ایسے معتبر مرتے وقت نہ ملیں تو مسلمانوں میں سے کوئی سے دو آدمی جن کی دیانت داری اور گواہی اتنی مشہور نہیں مگر ان کی برائی اور بد دیانتی بھی تمہاری نظروں میں نہیں مقرر کیے جاسکتے ہیں کیونکہ مسلمان یوں بھی بے ایمان نہیں ہوسکتا۔

اکثر علماء کا یہی مذہب ہے کہ سفر میں اگر مسلمان نہ ملیں تو غیر مسلم کو وصی بنا سکتا ہے ورنہ وصی مسلمان ہی کو بنانا چاہئے اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے زمانہ میں مسلمان ہی ایسے لوگ تھے جنہیں بے ایمانی سے بالکل پاک سمجھا جاتا تھا۔

ایک علمی نکتہ

گواہوں کے مقرر کرنے کے متعلق ایک عام قانون "سورۂ بقرہ" میں گزر چکا ہے "وَ اسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ" کہ تم اپنوں (مسلمانوں) میں سے دو مردوں کو گواہ بنالو، اور اگر دو مرد موجود نہ

ہوں تو ایک مرد اور دو عورتوں کو گواہ بنالو، مگر یہ چونکہ سفر کا معاملہ ہے یہاں پر کافی آسانی پیدا کی گئی ہے کہ تم میں سے دو انصاف پسند ہوں، بعض فقہاء فرماتے ہیں کہ یہاں پر "مِنْكُمْ" سے مراد قریبی رشتہ دار ہیں جو مسلمان ہوں اور "غَيْرِكُمْ" سے مراد رشتہ دار کے علاوہ ہیں، ان کی دلیل یہ ہے کہ کسی مسلمان کے حق میں یا اس کے خلاف کسی غیر مسلم کی گواہی معتبر نہیں ہوتی، مگر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے فقہاء فرماتے ہیں کہ سفر کے دوران مسلمان گواہوں کا ہونا لازمی نہیں ہے اگر مسلمان گواہ موجود نہ ہوں تو ایسے موقعوں پر غیر مسلموں کی گواہی اور حلفیہ بیان بھی قابل قبول ہے، آپ کی دلیل یہ ہے کہ "غَيْرِكُمْ" کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے ہم مذہب نہ ہوں تب بھی ان کی گواہی پر مقدمہ کا فیصلہ ہوسکتا ہے، جیسا کہ ایک سفر کے واقعہ میں ہے کہ دو گواہوں میں سے ایک عیسائی اور دوسرا مشرک تھا مگر ان کی گواہی پر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے مقدمہ کا فیصلہ صادر فرمایا، بہر حال یہاں پر گواہ بنانے سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص مرنے سے پہلے انہیں اپنا وصی بنائے جو اس کی وصیت کی گواہی دیں۔

وصی کی جانچ پڑتال

تَحْبِسُوْنَهُمَا مِنْۢ بَعْدِ الصَّلٰوةِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ اِنِ ارْتَبْتُمْ

روک لوان دونوں کو | سے | بعد | نماز کے | پس قسمیں کھائیں دونوں | کی اللہ | اگر | شبہ ہو تمہیں

لَا نَشْتَرِيْ بِهٖ ثَمَنًا وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۙ وَ لَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ ۙ

کہ نہیں | لیتے ہم | بدلے اسکے | مال | اگر چہ | ہو وہ | قریبی رشتہ دار | اور نہیں | چھپاتے ہم | گواہی

اللّٰهِ اِنَّآ اِذًا لَّمِنَ الْاٰثِمِيْنَ ﴿۱۰۶﴾

اللہ کی | بیشک ہم | اس وقت | میں سے | گناہگاروں میں (۱۰۶)

با محاورہ ترجمہ:۔ ان دونوں کو نماز کے بعد کھڑا کرو اور وہ دونوں اللہ کی قسم کھائیں اگر تم کو شبہ پڑے وہ یہ کہیں کہ ہم قسم کے بدلے مال نہیں لیتے اگر چہ ہم کو کسی سے رشتہ داری ہی ہو اور ہم اللہ کی گواہی نہیں چھپاتے ورنہ

بیشک ہم گناہگار ہونگے ۔ (۱۰۶)

تفسیر

اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ اگر وارثوں کو شبہ ہو جائے کہ وصیوں نے میت کا کچھ مال غائب کر دیا ہے اور دیانت داری سے کام نہیں لیا مگر غبن ثابت کرنے کیلئے گواہ موجود نہ ہوں تو اس صورت میں وصیوں سے قسم لی جائے گی کہ انہوں نے غبن نہیں کیا اور قسم ان سے نماز کے بعد لی جائے گی، مفسروں نے لکھا ہے کہ عصر کی نماز کے بعد قسم لینا زیادہ مناسب ہے ورنہ ہر طرح کی قسم ہر نماز کے بعد لی جاسکتی ہے کیونکہ خدا کا خوف تو ہر نماز کے بعد ہوگا اور اگر وصی غیر مسلم ہوں تو ان سے ان کی عبادت کے وقت کے بعد قسم لینی چاہئے کیونکہ بہر حال پوجا پاٹ کے بعد ہر شخص کے دل میں خدا کا خوف اور وقتوں کی بہ نسبت زیادہ ہوتا ہے۔

ارشاد ہے کہ: اگر تمہیں وصیوں پر بددیانتی کا شبہ ہو اور تمہارے پاس ان کی بددیانتی کے ثابت کرنے کیلئے گواہ نہ ہوں تو دونوں وصیوں کو نماز کے بعد ٹھہرالو اور وہ سب کے سامنے اس بات پر اللہ تعالیٰ کی قسم کھائیں کہ ہم دیانت دار ہیں اور کہیں کہ اس قسم سے ہم ہرگز جھوٹ بول کر مال دبانا نہیں چاہتے نہ ہمیں خود مال کا لالچ ہے اور نہ رشتہ داری ہمیں بے ایمانی پر اکسا سکتی ہے کہ کسی قریبی رشتہ دار کو کچھ زیادہ مال دلوایں، ہم اللہ تعالیٰ کو حاضر ناظر جان کر کہتے ہیں کہ ہم اس کا نام لے کر جھوٹی گواہی نہ دیں گے اور نہ اس کا حکم ٹالیں گے اور نہ سچی بات چھپائیں گے، بعض اوقات جتنی گواہی دی جاتی ہے وہ بالکل ٹھیک ہوتی ہے مگر کسی اہم معاملہ کو چھپا لیا جاتا ہے جس سے مقدمہ پر غلط اثر مرتب ہوسکتا ہے لہٰذا گواہ یہ بھی حلفاً کہیں کہ وہ گواہی میں سے کسی بات کو نہیں چھپائیں گے، اگر ایسا کریں تو ہم گناہگار ہونگے، ایسا ایک واقعہ خود پیغمبر ﷺ کے زمانے میں پیش آیا تھا جس میں وصی دو عیسائی تھے ان کی دیانت داری میں شبہ ہوا تو ان سے قسم لی گئی۔

وصی کی غلط بیانی

فَاِنْ عُثِرَ عَلٰٓى اَنَّهُمَا اسْتَحَقَّآ اِثْمًا فَاٰخَرٰنِ يَقُوْمٰنِ مَقَامَهُمَا

پھر اگر کوئی واقف ہوا اس پر کہ ان دونوں نے حق دبایا گناہ کر کے پس دو اور کھڑے ہوں جگہ ان دونوں کی

مِنَ الَّذِيْنَ اسْتَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْاَوْلَيٰنِ

سے ان میں کہ حق دبایا ہے ان کا جو قریب ترین رشتہ دار ہو

بامحاورہ ترجمہ:۔ پھر اگر خبر ہو جائے کہ وہ دونوں حق بات دبا گئے تو ان کی جگہ دو گواہ اور کھڑے ہوں ان میں سے جن کا حق دبایا ہے جو میت کے سب سے زیادہ قریب ہوں۔

تفسیر

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بدیل نامی ایک مسلمان اور دو عیسائی تیم اور عدی مل کر سفر پر گئے، راستہ میں بدیل کا انتقال ہو گیا اور وہ مرتے وقت اپنا سارا سامان ان دو عیسائیوں کے سپرد کر گیا کہ میرے وارثوں کو پہنچا دینا، انہوں نے مال لا کر وارثوں کو دے دیا اس میں سے مال کی فہرست نکلی تو معلوم ہوا کہ چاندی کا ایک کٹورا جس پر سونے کا پانی چڑھا ہوا تھا گم ہے، دونوں عیسائیوں سے پوچھا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ ہمارے پاس کٹورا نہیں ہے وہ کٹورا دوا دارو میں خرچ ہو گیا اس پر وارث پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے اور عرض کیا کہ ایک کٹورا غائب ہے اس پر آپ نے پہلی آیت کے مطابق عیسائیوں سے قسم لی، وہ دونوں قسم کھا گئے کہ کل مال یہی ہے ہم نے کچھ نہیں دبایا، آپ نے ان کو بری فرما دیا، کچھ دنوں بعد وہ کٹورا مکہ مکرمہ میں ایک آدمی کے پاس ملا، اور اس نے کہا کہ تیم اور عدی میرے ہاتھ بیچ گئے ہیں، اس کے بعد اس آیت کے مطابق کاروائی کی گئی کیونکہ وارثوں کے پاس گواہ نہ تھے، ارشاد ہے کہ اگر اس کے بعد یہ ظاہر ہو کہ دونوں نے بے ایمانی کی ہے اور کچھ مال دبا لیا ہے اور جو قسم انہوں نے کھائی وہ جھوٹی تھی تو جن حق داروں کا اس بے ایمانی سے نقصان ہوا ہے ان میں سب سے زیادہ

میت کے دو قریبی رشتہ داران وصیوں کی جگہ آگے بڑھ کر کھڑے ہوں، اس کے بعد وہ کیا کریں اس کا بیان آگے کی آیت میں ہے۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاس میت کے وارث جب دوبارہ مقدمہ لے کر آئے اور گواہ نہ لاسکے تو آپ نے یہی کیا کہ ان میں سے دو سب سے زیادہ قریبی رشتہ داروں کو بلا کر آگے کھڑا کیا اور چونکہ اب وہ وصیوں کے سچا ہونے کے دعوے کا انکار کر رہے تھے اس لئے ان سے قسم لی گئی۔

قابل غور بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں کس قدر چھوٹی چھوٹی باتوں کا واضح طور پر ذکر کر دیا گیا ہے، مقصد یہ ہے کہ انسان کے اخلاق اور عقائد کی طرح اس کے تمام کام اور آپس کے تعلقات بھی درست ہو جائیں کوئی کسی کا حق نہ مار سکے اور اگر کوئی بدکار ایسا کر بیٹھے تو اس کی تلافی کی جاسکے کیونکہ سارے دین کی پرکھ تو معاملات ہی ہیں۔

وارثوں کی قسمیں

فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ لَشَهَادَتُنَآ اَحَقُّ مِنْ شَهَادَتِهِمَا وَ مَا

پس قسمیں کھائیں دونوں ساتھ اللہ کے کہ بیشک گواہی ہماری زیادہ وزنی ہے بہ نسبت گواہی ان دونوں کے اور نہیں

اعْتَدَيْنَآ ۖ اِنَّآ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٠٧﴾ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا

زیادتی کی ہم نے بیشک ہم اس وقت ضرور ظالموں میں سے ہونگے (۱۰۷) یہ قریب ہے اسکے کہ لائیں وہ

بِالشَّهَادَةِ عَلٰى وَجْهِهَآ اَوْ يَخَافُوْٓا اَنْ تُرَدَّ اَيْمَانٌۢ بَعْدَ

گواہی کو اوپر طریقہ کے اسکے یا ڈریں کہ رد کردی جائیگی قسم ہماری بعد

اَيْمَانِهِمْ ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اسْمَعُوْا ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِى

قسم ان کی کے اور ڈرتے رہو اللہ اور سنو اور اللہ نہیں راہ دکھاتا

ع ۱۴ ۸ ۴

الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ ﴿۱۰۸﴾

قوم کو نافرمانوں کی (۱۰۸)

بامحاورہ ترجمہ:۔ پھر وہ اللہ کی قسم کھائیں کہ ہماری گواہی پہلوں کی گواہی کے مقابلہ میں حق ہے اور ہم نے زیادتی نہیں کی نہیں تو بیشک ہم ظالم ہیں۔(۱۰۷) یہ قریب تر ہے کہ گواہی کو ٹھیک طرح پر ادا کریں اور ڈریں کہ ہماری قسم ان کی قسم کے بعد الٹی پڑے گی اور اللہ سے ڈرتے رہو اور سن رکھو، اور اللہ نافرمانوں کو سیدھی راہ نہیں دکھاتے۔(۱۰۸)

تفسیر

آیت مسلسل چل رہی ہے، پہلے حصہ میں جو بات باقی تھی وہ اب بیان ہورہی ہے؛ وہ دونوں رشتہ دار اللہ تعالیٰ کی قسم کھائیں کہ ہماری گواہی ان وصیوں کی گواہی سے زیادہ سچی ہے اور ہم زیادتی نہیں کررہے ہیں ورنہ پھر ہمارے ظالم ہونے میں کوئی شک نہیں رہیگا، ارشاد ہے کہ اس طرح قسم کھانے سے امید ہوتی ہے کہ قسم زیادہ زوردار رہے گی، اور وہ پھر اس سے بھی ڈریں گے کہ کہیں پہلے وصیوں کی طرح ہماری گواہی بھی رد نہ کردی جائے۔

پھر ارشاد ہے کہ: کام توجبھی ٹھیک ہوگا جب دل میں اللہ تعالیٰ کا ڈر ہوگا اور اس کی سزا کے ڈر سے بری باتوں سے بچا جائے گا اور اس کی باتیں کان لگا کر سنی جائیں گی؛ اس لئے بار بار یاد دلایا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور اس کی بات سنو، جو اس سے نہ ڈرے نہ اس کی بات سنے وہ نافرمان نہیں تو اور کیا ہے؟ اور اللہ تعالیٰ کے ہاں قاعدہ مقرر ہے کہ وہ نافرمانوں کو سیدھے راستے پر نہیں چلاتے اور وہ بھٹکتے پھرتے ہیں، جو نہ دھمکی سے ڈرے اور نہ سیدھی بات سنے وہ ٹھیک راستے پر کیسے چل سکتا ہے؟

پیغمبروں سے سوال

يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ ؕ قَالُوْا لَا

جس دن جمع کرے گا اللہ سب پیغمبروں کو پھر کہے گا کیا جواب ملا تمہیں وہ کہیں گے نہیں

عِلْمَ لَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴿۱۰۹﴾

خبر ہم کو بیشک آپ آپ ہی ہیں جاننے والے چھپی باتوں کو(۱۰۹)

بامحاورہ ترجمہ:۔ جس دن اللہ سب پیغمبروں کو جمع کریں گے پھر کہیں گے کہ تم کو کیا جواب ملا تھا، وہ کہیں گے کہ ہم کو خبر نہیں بیشک آپ ہی چھپی باتوں کے جاننے والے ہیں۔(۱۰۹)

تفسیر

اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے پاس قیامت کے دن سب لوگ جمع ہوں گے اور اللہ تعالیٰ تمام پیغمبروں کو اکٹھا فرما کر ان سے فرمائیں گے کہ بتاؤ! لوگوں نے تمہارے وعظ و نصیحت کا اور اچھے کاموں کی طرف بلانے کا تمہیں کیا جواب دیا؟ پیغمبر کہیں گے کہ اس کے بارے میں ہمیں کچھ علم نہیں کہ انہوں نے ہماری بات مانی یا نہ مانی کیونکہ ماننے نہ ماننے کا تعلق دل سے ہے اور وہ ایک چھپی ہوئی چیز ہے اور چھپی ہوئی چیزوں کا حال آپ کے سوا کوئی نہیں جانتا، ہمارا کام یہ تھا کہ جب تک ہم ان میں رہے ان کو آپ کا پیغام پہنچاتے رہے اور اس پر خود عمل کرکے دکھاتے رہے، اس مدت میں بھی ان کے دل کا اصلی حال ہمیں معلوم نہیں تھا، پھر ہماری وفات ہوگئی اس کے بعد تو ان کے ماننے نہ ماننے کا حال آپ ہی کو معلوم ہے، جو چیزیں ہماری نظروں سے غائب ہیں ان کا علم صرف آپ ہی کو ہے سوائے اس کے کہ جس کو جتنا آپ بتادیں، اس سے عام انسانوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ جب پیغمبر بھی سوال سے نہ بچ سکیں گے تو تم کیا چیز ہو؟

يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ: اس دن کو خیال میں لاؤ جس دن اللہ تعالیٰ تمام پیغمبروں کو اکٹھا فرمائیں

گے اور حساب کتاب لیں گے، مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جتنے بھی نبی اور رسول بھیجے سب کو جمع فرما کر حساب کتاب کا عمل شروع فرمائیں گے اور کہیں گے کہ تم کو کیا جواب دیا گیا، یعنی: جس قوم کی طرف تمہیں بھیجا گیا تھا اور جس کو تم نے دین کی دعوت دی تھی اس قوم نے اس دعوت کا کیا جواب دیا؟ پیغمبر جواب دیں گے کہ ہمیں کچھ علم نہیں تمام پوشیدہ باتوں کو جاننے والے آپ ہی ہیں۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے سوال فرمانے پر پیغمبروں کا یہ کہنا کہ ہم کو پتہ نہیں یہ بات قابل توجہ ہے، کیونکہ دوسرے جگہ پر قرآن کریم میں موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر امت میں سے ایک پیغمبر کو گواہ کے طور پر لائیں گے اور وہ اپنی اپنی امت کے حق میں گواہی بھی دیں گے مگر یہاں پر کسی چیز کے علم سے بالکل انکار کر دیا گیا ہے، اس کے بارے مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ محشر کے میدان کی کاروائی بڑی وسیع ہوگی اور اس کی مختلف کیفیتیں ہوں گی وہاں پر ایک وقت ایسا بھی ہوگا جب ہر طرف دہشت طاری ہوگی اور جیسا کہ "مسلم شریف" کی روایت میں موجود ہے کہ اس وقت تمام پیغمبر بھی "نفسی نفسی" پکار رہے ہوں گے اور کہیں گے، اے پروردگار! آج بچا لیجئے، اس آیت میں لاعلمی کا ذکر کیا گیا ہے وہ ایسے ہی موقع کی بات ہے کہ کسی کو کچھ پتہ نہیں چلے گا، ہر شخص خوف میں مبتلا ہوگا حتیٰ کہ جب پیغمبروں سے اللہ تعالیٰ ان کی امتوں کے بارے میں سوال فرمائیں گے تو وہ کہینگے کہ ہمیں خبر نہیں، پھر جب سکون ہو جائے گا تو اللہ کے پیغمبر سوالوں کے جواب بھی دیں گے اور اپنی اپنی امت کے حق میں گواہی بھی دیں گے اور عرض بھی کریں گے۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ پیغمبروں کا یہ کہنا کہ ہمیں کچھ پتہ نہیں اس کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اے اللہ! آپکے علم کے مقابلے میں ہمارا علم تو نہ ہونے کے برابر ہے، تمام پوشیدہ باتوں کو آپ ہی جاننے والے ہیں اسی وجہ سے وہ کہیں گے کہ ہمیں کچھ علم نہیں، یعنی: بہت ہی کم علم ہے، گویا اللہ تعالیٰ کی عظمت اور جلال کے سامنے اپنے علم کے نہ ہونے کو بیان فرمائیں گے اور اس کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہم جب تک دنیا میں رہے ہمارا علم تو ظاہری چیزوں تک ہی محدود تھا پوشیدہ باتوں تک تو ہماری پہنچ نہیں تھی، ہم نہیں جانتے تھے کہ کس شخص کے دل میں

صحیح ایمان موجود ہے اور کون شخص حقیقی ایمان سے محروم ہے؟

غیب کی باتیں صرف اللہ تعالیٰ جانتے ہیں اور یہ مخلوق میں سے کسی دوسری ہستی کو حاصل نہیں، حتیٰ کہ پیغمبر علیہم السلام بھی ہر چیز کو نہیں جانتے، جب تک کہ اللہ تعالیٰ الہام، کشف یا وحی کے ذریعے ظاہر نہ فرمادیں، "ترمذی شریف" کی روایت میں آتا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک مقدمہ پیش ہوا، آپ نے فرمایا کہ: غیب تو صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں، میں ایک انسان ہوں اور انسان عالم الغیب نہیں ہوا کرتے میں تو فریقوں کے ظاہری بیانوں اور گواہوں کی گواہی پر فیصلہ کرتا ہوں، ہوسکتا ہے کہ کوئی آدمی زبان کا تیز ہو، اور اپنے معاملہ کو اچھے طریقے سے پیش کرسکتا ہو جب کہ دوسرا آدمی اپنا موقف بہتر طور پر پیش نہ کرسکے، ظاہری حالات کے مطابق اگر میرا فیصلہ غیر حقدار آدمی کے حق میں ہوجائے تو اس شخص کو وہ چیز نہیں لینی چاہئے اگر ایسا کرے گا تو وہ چیز اس کے حق میں دوزخ کا ٹکڑا ہوگی۔

اب اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان انعام کا ذکر فرمایا ہے جو اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر فرمائے، چونکہ دنیا میں بہت سے لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کہتے ہیں؛ اس لئے انہیں یہ بتلانا مقصود ہے کہ حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام بھی اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں، انہیں بھی اللہ تعالیٰ کے انعاموں کی ضرورت ہے اور وہ خود خدا نہیں ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خصوصیتیں

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِيْ عَلَيْكَ وَ

جب کہینگے اللہ اے عیسیٰ! بیٹے مریم کے یاد کرو انعام میرا اپنے اوپر اور

عَلٰى وَالِدَتِكَ ۘ اِذْ اَيَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۣ تُكَلِّمُ النَّاسَ

اوپر والدہ اپنی کے جب مدد کی میں نے آپکی ساتھ روح پاک کے باتیں کرتے تھے آپ لوگوں سے

فِي الْمَهْدِ وَ كَهْلًا ۚ

میں گود اور بڑے پن میں

وقف لازم

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور یاد کرو! جب اللہ کہے گا اے مریم کے بیٹے عیسٰی! میرا احسان جو آپ پر اور آپ کی ماں پر ہوا اسے یاد کر، یاد کر! جب میں نے روح القدس، (یعنی: جبرائیل) سے آپ کی مدد کی، آپ لوگوں سے بات کرتے تھے گھوارے میں اور باتیں کرتے تھے بڑے ہو کر۔

تفسیر

اس آیت سے ان پیغمبروں میں سے خاص طور پر حضرت عیسٰی علیہ السلام کا ذکر شروع ہوتا ہے کیونکہ ان کے ساتھ یہودیوں نے بہت زیادتیاں کیں اور عیسائیوں نے ان کے مرتبے کو اتنا بڑھایا کہ وہ ان کو خدا کا بیٹا کہتے تھے، اس لئے اس سارے رکوع میں ان کی فضیلتیں اور خصوصیتیں بیان کی گئی ہیں اور ان کو ان تمام برائیوں سے پاک صاف بتایا گیا ہے جو یہودی ان میں نکالتے تھے، اس کے بعد رکوع میں ایک اور سوال اور جو وہ جواب دیں گے اس کا ذکر ہے تاکہ عیسائیوں کو معلوم ہو جائے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام بھی اللہ تعالیٰ کے ویسے ہی بندے ہیں جیسے اور لوگ (اللہ کے بندے ہیں)، اور وہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کے جواب میں غور کر کے اس میں سے اپنے لئے نصیحت نکالیں اور اپنے عملوں کو درست کریں، اس کے بغیر حضرت عیسٰی علیہ السلام ان کے کسی کام نہ آئیں گے اور ان کا یہ خیال کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام ان کے تمام گناہوں کا کفارہ ہو گئے ہیں اور ان کو کوئی عذاب نہ ہوگا بالکل فضول اور بیہودہ ہے۔

اِذْ قَالَ اللّٰهُ یٰعِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ: جب اللہ تعالیٰ حضرت عیسٰی علیہ السلام سے بات کریں گے، اے عیسٰی مریم کے بیٹے! یعنی: اللہ تعالیٰ آپ کو مریم کا بیٹا کہہ کر پکاریں گے اور آگے انہی آیتوں میں جہاں آپ کے حواریوں (ساتھیوں) نے کھانے سے بھرے ہوئے دسترخوان کے اتارے جانے کی درخواست کی تو وہاں بھی انہوں نے آپ کو مریم کا بیٹا ہی کہہ کر پکارا۔

"سورۂ آل عمران" میں گزر چکا ہے کہ فرشتوں نے حضرت مریم سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں جہاں بھر

کی عورتوں میں منتخب کیا ہے اور تمہیں فضیلت بخشی، مقصد یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بیٹے نہیں، بلکہ حضرت مریم کے بیٹے ہیں، مگر عیسائیوں نے کس قدر ظلم کیا ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدائی کے درجے تک پہنچا دیا ہے، زیادتی کی حد یہ ہے کہ عیسائیوں نے اپنی لغات میں عیسیٰ کا معنیٰ "ابن اللہ" (اللہ کا بیٹا) کہا ہے حالانکہ ایسا کہنا خالصۃً شرکیہ بات ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک عورت کے پیٹ سے پیدا ہوئے، آپ کے ساتھ بھی انسانی ضرورتیں لگی ہوئی تھیں، کھاتے پیتے تھے، موت اور زندگی آپ کے ساتھ ساتھ ہے مگر اس کے باوجود لوگوں نے آپ کو انسانیت کی صف سے نکال کر خدائی کے درجے پر بیٹھا دیا، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ قیامت کے دن تمام لوگوں کو ان کے باپ کی نسبت سے پکارا جائے گا صرف حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام کو ماں کی نسبت سے پکارا جائے گا (مسیح ابن مریم)، اور پھر سب کے اعمال نامے ان کے سامنے رکھ کر حساب کتاب کا عمل شروع ہوگا، ویسے عام قانون بھی یہی ہے کہ لوگوں کو باپوں کی نسبت سے پکارو، فلاں ابن فلاں، الغرض اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مسیح ابن مریم کہہ کر ان کی خدائی کی نفی فرمادی ہے۔

اذْكُرْ نِعْمَتِىْ عَلَيْكَ وَ عَلٰى وَالِدَتِكَ ۘ اِذْ اَيَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ: اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں یہ بھی فرمایا کہ مسیح علیہ السلام خدا کے بندے اور پیغمبر ہیں ان پر ہم نے اپنے احسان کیے، سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ ان کو اپنا پیغمبر بنایا، معجزانہ طور پر بغیر باپ کے پیدا کرنا بھی اللہ تعالیٰ کا احسان ہے، آپ کو بچپن میں ہی پیغمبری عطا کی گئی، دوسرے معجزات دیئے اور پھر سب سے آخر میں جان کے دشمنوں کے ہاتھوں سے محفوظ رکھا گیا، یہ سب اللہ تعالیٰ کے انعام اور احسان ہیں، آپکی والدہ پر یہ احسان کیا کہ اسے ولی بنایا اور بغیر شوہر کے اپنے حکم سے بچہ عطا کیا، لوگوں کی توہین سے محفوظ رکھا، اس کی عزت اور عصمت کو وحی کے ذریعے کتابوں میں اتارا، آپکی والدہ پر یہ بھی احسان کیا کہ اس کی پرورش غیر معمولی طریقے سے ہوئی، بے موسم پھل اور کھانے پینے کی دوسری چیزیں غیر معمولی طریقے سے مہیا کیں، یہ سب کچھ قرآن پاک میں موجود ہے۔

آگے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر کیئے گئے احسانات کی مزید تفصیل بیان فرمائی ہے، "رُوْحِ الْقُدُسِ" کا عام

معنیٰ حضرت جبرائیل علیہ السلام کیا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے انہیں تائید کیلئے مقرر فرمایا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کیلئے بھی حضرت جبرائیل علیہ السلام ہی نے حضرت مریم کے گریبان میں پھونک ماری تھی، بہر حال حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ہر موقع پر حضرت جبرائیل علیہ السلام کی تائید حاصل رہی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے لوگوں سے گہوارے میں بات چیت فرمائی، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بچپن کے بات کرنے کا ذکر تو "سورۂ مریم" میں موجود ہے، آپ نے پیدائش کے پہلے دن ہی اعلان فرمادیا کہ میں اللہ تعالیٰ کا بندہ ہوں، مجھے کتاب دی گئی ہے اور مجھے پیغمبر بنایا گیا ہے، یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا پہلا معجزہ تھا جو ان کے ہاتھ پر اللہ کے حکم سے ظاہر ہوا ورنہ چند گھنٹے کا بچہ کیسے بات کرسکتا ہے؟ تاہم معجزانہ طور پر بات کرنے والے دنیا میں چند اور بچے بھی ہوئے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے بچپن میں بولنے کی قوت عطا فرمائی۔

ادھیڑ عمر میں بات کرنے سے متعلق سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو ابھی ادھیڑ عمر کو پہنچے بھی نہیں تھے کہ جوانی کے وقت اللہ تعالیٰ نے آپ کو آسمان پر اٹھالیا، بعض فرماتے ہیں کہ ادھیڑ عمر تیس سال بعد شروع ہوجاتی ہے جب کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آسمانوں کی طرف اٹھایا جانا ۳۳ سال کی عمر میں ہو، الہٰذا ادھیڑ عمر میں بات کرنا بھی ثابت ہوتا ہے، بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ ادھیڑ عمر چالیس سال کے بعد شروع ہوتی ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اس عمر تک پہنچنے سے پہلے ہی اٹھالیا گیا، لہٰذا ادھیڑ عمر میں ان کا بات چیت کرنا ثابت نہیں ہوتا، البتہ یہ آپ کے دوبارہ اترنے کی طرف اشارہ ہے کہ جب آپ دوبارہ زمین پر آئیں گے تو نکاح بھی فرمائیں گے بچے بھی جوان ہوں گے اور اس دوران آپ ادھیڑ عمر کو بھی پہنچیں گے اور اس عمر میں آپ کا بات چیت فرمانا دوبارہ اترنے کے بعد ہوگا، بہر حال مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ جس طرح آپ ادھیڑ عمر میں پیغمبری کی بات چیت فرماتے تھے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے گہوارے میں بھی پیغمبری کا اعلان فرمادیا تھا، لہٰذا یہاں پر اللہ تعالیٰ نے ان دونوں زمانوں کا اکٹھا ذکر فرمادیا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزے

وَ اِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ ۚ وَ

اور جب سکھائی میں نے آپ کو کتاب اور حکمت کی باتیں اور تورات اور انجیل اور

اِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ بِاِذْنِيْ فَتَنْفُخُ فِيْهَا

جب بناتے تھے آپ گارے سے مانند صورت پرندہ کے ساتھ میرے حکم کے پھر پھونک مارتے تھے آپ میں اس

فَتَكُوْنُ طَيْرًۢا بِاِذْنِيْ وَ تُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَ الْاَبْرَصَ بِاِذْنِيْ ۚ

پس ہوجاتی تھی وہ اڑنے والی سے حکم میرے اور اچھا کرتے آپ پیدائشی اندھے اور کوڑھی ساتھ حکم میرے

وَ اِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰى بِاِذْنِيْ ۚ

اور جب نکال کھڑا کرتا تھا تو مردوں کو ساتھ حکم میرے کے

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور یاد کرو جب میں نے آپ کو کتاب اور حکمت کی باتیں سکھائیں اور "تورات" اور "انجیل" سکھائی اور یاد کر جب آپ میرے حکم سے گارے سے پرندوں کی صورت بناتے تھے، پھر اس میں پھونک مارتے تھے تو وہ میرے حکم سے پرندہ ہوجاتا اور میرے حکم سے پیدائشی اندھے اور کوڑھی کو اچھا کرتے تھے اور یاد کر! جب آپ میرے حکم سے تو مردوں کو نکال کھڑا کرتے تھے۔

تفسیر

ارشاد ہے کہ اے عیسیٰ! وہ وقت یاد کرو جب میں نے آپ کو اپنے پاک کلام کے سمجھنے کی قوت عطا کی اور بھید کی باتیں بتائیں اور "تورات" اور "انجیل" کا علم دیا اور وہ واقعہ بھی یاد کرو جب آپ میری اجازت سے گندھی ہوئی مٹی کی ایک چڑیا بناتے اور پھر اس میں پھونک مارتے وہ میرے حکم سے زندہ پرندہ ہو کر اڑنے لگتی، پھر یہ بھی یاد کرو کہ میرے حکم سے آپ مردے کو زندہ کرکے اٹھاتے تھے۔

اس آیت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی چار خصوصیتوں کا ذکر ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خاص معجزے کہلاتے ہیں۔

(۱)....وہ مٹی کا گارا لے کر اس سے ایک پرندہ کی سی شکل بناتے اور پھر اس میں پھونک مارتے تو وہ پرندہ زندہ ہو کر اڑنے لگتا تھا۔

(۲)....پیدائشی اندھے کو اچھا کر دیتے تھے اور اندھا آدمی آنکھوں والا ہو کر دیکھنے لگتا تھا۔

(۳)....کوڑھ کے مریض کو اچھا کر دیتے تھے۔

(۴)....مردے کو "قُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ" (اللہ کے حکم سے اٹھ) کہہ کر زندہ کر دیتے تھے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر اس سے پہلے "سورۂ بقرہ" میں تیسرے پارے کے شروع میں آچکا ہے اور پھر "سورۂ آل عمران" کے پانچویں اور چھٹے رکوع میں آیا ہے، یہاں تمام باتوں کو اکٹھے ذکر کر دیا گیا ہے جس پر غور کرنے سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش اور ان کے معجزوں کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔

وَ اِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ: مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ کتاب سے مراد لکھنا ہے، یعنی: اللہ تعالیٰ نے بغیر استاد کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو لکھنا سکھایا، اور بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ کتاب سے مراد تمام آسمانی کتابیں ہیں جن کا علم اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دیا اور ان کتابوں میں قرآن پاک بھی آتا ہے، جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام اتریں گے تو وہ قرآن کریم کی تعلیم کسی استاد سے حاصل نہیں کریں گے بلکہ اللہ تعالیٰ خود انہیں سکھا دیں گے اور حکمت سے مراد پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت ہے، دوبارہ اترنے پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نائب یعنی قائم مقام کی حیثیت سے آپ کی سنت اور قرآن پاک کے مطابق فیصلے فرمائیں گے اور قرآن کریم کے علاوہ سنت کا علم بھی اللہ تعالیٰ براہ راست حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سکھائیں گے، بہر حال! بعض مفسرین کرام کی رائے یہ ہے کہ کتاب سے مراد لکھنا ہے اور حکمت سے مراد دانشمندی کی باتیں ہیں، ان دونوں چیزوں کا ذکر اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر احسان کے طور پر کیا ہے۔

وَ التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ : اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جس طرح کتاب اور حکمت کی تعلیم دی اسی طرح "تورات" اور "انجیل" کی تعلیم بھی دی، "تورات" کا معنیٰ قانون ہے جبکہ "انجیل" کا معنیٰ خوشخبری ہے، "تورات" تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اتری، تاہم آپ کا فرمان ہے کہ میں "تورات" کے بعض حکموں کو منسوخ کرتا ہوں اور "تورات" کی بعض حرام کی ہوئی چیزوں کو حلال قرار دیتا ہوں مقصد یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو "تورات" کا مکمل علم عطا فرمایا تھا جہاں تک "انجیل" کا تعلق ہے وہ تو خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اتری اس کی اصل زبان آرامی یا سریانی یا عبرانی تھی مگر اب وہ اصل "انجیل" موجود نہیں ہیں، "انجیل" میں تبدیلیوں کا اندازہ اس حقیقت سے ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اتاری ہوئی ایک کتاب کو ایک سو بیس "انجیلوں" میں تقسیم کر دیا گیا اب بھی پانچ مشہور "انجیلیں" تو دنیا میں موجود ہیں اگرچہ ان میں اصل "انجیل" کے کچھ حکم بھی موجود ہیں تاہم اس کا اکثر حصہ تبدیلی کا شکار ہو چکا ہے۔

معجزہ کا ظاہر کرنا پیغمبر کے اختیار میں نہیں ہوتا بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہوتا ہے اکثر لوگ اس مقام پر آ کر گمراہ ہو جاتے ہیں، وہ معجزہ یا کرامت کو پیغمبر یا ولی کے اختیار میں سمجھ بیٹھتے ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے، "سورۂ مؤمن" میں موجود ہے کہ کسی نبی یا رسول کے اختیار میں نہیں کہ وہ کوئی نشانی، یعنی: معجزہ پیش کر سکے جب تک اللہ تعالیٰ کا حکم نہ ہو، اسی طرح کسی مؤمن کے ہاتھ پر عموماً نہ ہونے والے کام کا ظاہر ہو جانا اس مؤمن کیلئے اعزاز ہوتا ہے اور اسے کرامت کہتے ہیں، امام اعظم امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "فقہ اکبر" میں اس عقیدے کا اظہار کیا ہے کہ پیغمبروں کے معجزے اور اولیاء کی کرامات برحق ہیں، جو ان کو صحیح نہیں مانتا وہ اہل سنت کی جماعت سے خارج ہے، بڑے بڑے فلاسفر، معتزلہ، نیچری، سرسید کے ماننے والے، پرویزی، چکڑالوی وغیرہ اسی نکتے پر آ کر گمراہ ہوئے ہیں، کہتے ہیں کہ یہ عقل کے خلاف ہے جبکہ ہر چیز کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنا ہی ان کی بے عقلی کی دلیل ہے۔

بعض اوقات اللہ تعالیٰ آزمائش کے طور پر عموماً نہ ہونے والے کسی کام کو کسی کافر کے ہاتھ پر بھی ظاہر

فرما دیتے ہیں، یہ معجزہ یا کرامت نہیں بلکہ استدراج (اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈھیل) کہلاتا ہے، یہ خدا کی عطا کردہ مہلت ہوتی ہے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ آزمائش میں مبتلا کر دیتے ہیں جیسے دجال کے ہاتھ پر بہت سے کرشمے ظاہر ہوں گے، بہرحال معجزہ یا کرامت کیلئے ایمان کا ہونا شرط ہے اور پھر یہ کہ معجزہ یا کرامت پیغمبر یا ولی کے اختیار میں نہیں ہوتا، اسے پیغمبر یا ولی کے اختیار میں سمجھ کر ہی لوگ انہیں حاجت روا اور مشکل کشا سمجھنے لگتے ہیں اور پھر شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

وَاِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّیْنِ كَهَیْـَٔةِ الطَّیْرِ بِاِذْنِیْ: آیت کے اس حصہ میں اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات کا ذکر بھی فرمایا ہے، خلق کا معنیٰ بنانا، پیدا کرنا، گھڑنا وغیرہ آتا ہے تاہم شریعت کی زبان میں خالق بول کر اللہ تعالیٰ مراد ہوتے ہیں کیونکہ حقیقت میں ہر چیز کے پیدا کرنے والے اور بنانے والے اللہ تعالیٰ ہیں، اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یہ معجزہ عطا فرمایا کہ وہ مٹی سے پرندے کی شکل بناتے، پھر اس میں پھونک مارتے پھر وہ جاندار پرندہ ہو کر اڑنے لگتا، یہاں پر دو دفعہ "بِاِذْنِیْ" کا لفظ آیا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مٹی کے بنے ہوئے پرندے کو جاندار بنا دینا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اختیار میں نہیں تھا بلکہ یہ سب کچھ میرے حکم سے ہوتا تھا، "سورۂ آل عمران" میں "بِاِذْنِ اللّٰهِ" کا لفظ گزر چکا ہے مقصد یہ ہے کہ معجزہ یا کرامت کا ظاہر ہونا اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوتا ہے نہ کہ پیغمبر یا ولی کے اختیار سے۔

وَتُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ بِاِذْنِیْ: حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے یہ معجزہ بھی عطا فرمایا تھا کہ آپ پیدائشی اندھے کو اچھا کر دیتے تھے حالانکہ عام حالات میں اس کی بینائی کا لوٹنا نہایت مشکل ہوتا ہے مگر اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ پر ایسا ہو جاتا تھا کہ آپ آنکھوں پر ہاتھ پھیرتے تھے وہ روشن ہو جاتی تھیں اسی طرح کوڑھی مریض پر ہاتھ پھیرتے تو وہ تندرست ہو جاتا، یہ بھی اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوتا تھا۔

وَاِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰى بِاِذْنِیْ: حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے یہ معجزہ بھی عطا فرمایا تھا کہ آپ جب مردہ کو اللہ تعالیٰ کے حکم سے قبر سے نکال لیتے تھے پھر آپ مردہ سے کہتے "قُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ" یعنی: اللہ تعالیٰ کے

حکم سے اٹھ بیٹھو تو وہ مردہ زندہ ہو کر اٹھ بیٹھتا، آپ اس سے بات چیت کرتے اور کچھ عرصہ بعد وہ پھر ختم ہو جاتا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزوں میں اس قسم کے چار واقعوں کا ذکر ملتا ہے جن میں آپ نے مردوں کو زندہ کیا، یہ سب آپ کے نمایاں معجزے تھے۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ: حضرت مسیح علیہ السلام کے زمانے میں طب کے علم کا بڑا چرچا تھا بڑے بڑے طبیب موجود تھے جو مہلک سے مہلک بیماریوں کا علاج کرتے تھے، بقراط جسے طبیبوں کا بابائے طب مانا جاتا ہے اسی زمانہ میں ہوا ہے، ارسطو اور فیثاغورث اسی دور کے حکیم ہیں، ذی مقراطیس جس نے سب سے پہلے ایٹمی ذرات پر تحقیق کی تھی اسی دور کا ہے، یہ لوگ اپنے اپنے زمانے میں سائنسی ایجادات کے ذریعے علاج معالجے کے حیرت انگیز کام انجام دیتے تھے مگر یونان کے قابل ترین ڈاکٹر بھی نہ پیدائشی اندھے کو بینائی دلا سکتے تھے اور نہ کوڑھی کو تندرست کر سکتے تھے اور نہ مردے کو زندہ کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے، اس زمانے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ پر اللہ تعالیٰ نے یہ تینوں معجزے ظاہر فرما دیئے جس کی وجہ سے ان لوگوں کے تمام کارنامے بے حقیقت ہو گئے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مزید معجزے

وَ اِذْ كَفَفْتُ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ عَنْكَ اِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ

اور جب روکا میں نے بنی اسرائیل کو سے آپ جب آئے آپ پاس انکے ساتھ نشانیوں کے

فَقَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ﴿۱۱۰﴾

پس کہا انہوں نے جو کافر تھے میں سے ان نہیں یہ مگر جادو کھلم کھلا (۱۱۰)

وَ اِذْ اَوْحَیْتُ اِلَى الْحَوَارِیّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِیْ وَ بِرَسُوْلِیْ

اور جب دل میں ڈالا میں نے طرف حواریوں کی کہ ایمان لاؤ پر مجھ اور پر پیغمبر میرے

قَالُوْۤا اٰمَنَّا وَ اشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

کہنے لگے ایمان لائے ہم اور گواہ رہو کہ تحقیق ہم فرمانبردار ہیں (۱۱۱)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور یاد کرو! جب میں نے بنی اسرائیل کو آپ سے روکا جب آپ ان کے پاس نشانیاں لیکر آئے تو جو ان میں کافر تھے کہنے لگے یہ تو کھلم کھلا جادو کے سوا کچھ نہیں۔(۱۱۰) اور یاد کر جب میں نے حواریوں کے دلوں میں ڈال دیا کہ ایمان لاؤ مجھ پر اور میرے پیغمبر پر تو کہنے لگے ہم ایمان لائے اور گواہ رہئے کہ ہم فرمانبردار ہیں۔(۱۱۱)

تفسیر

یہاں پر اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر کیے گئے مزید احسانوں کا ذکر فرمایا ہے کہ بنی اسرائیل کو آپ سے روک دیا، انہوں نے آپ کا انکار کیا، مخالف ہوگئے، آپ کی توہین کی، آپ کو دجال کہا، آپ کی والدہ پر بدکاری کی تہمت لگائی اور آپ کی جان کے درپے ہوگئے، کہتے تھے کہ یہ شخص ہمارے باپ دادوں کی رسموں کو ختم کرنا چاہتا ہے اور ہمیں ہماری آمدنی کے ذریعوں سے محروم کرنا چاہتا ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: یہ اس وقت کی بات ہے جب آپ ان کے پاس کھلی اور واضح نشانیاں اور معجزات لے کر آئے مگر ان کی کوئی تدبیر کارآمد نہ ہوئی، میں نے آپ کی ان بدبختوں سے حفاظت کی اور ان کے ناپاک ہاتھوں کو آپ تک نہیں پہنچنے دیا، "سورۂ آل عمران" میں گزر چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: اے عیسیٰ! گھبراؤ نہیں میں ان کے ناپاک ہاتھ آپ تک نہیں پہنچنے دوں گا چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بحفاظت آسمان پر اٹھالیا۔

اتنی واضح نشانیاں دیکھنے کے باوجود ان میں سے کفر کرنے والوں نے کہا کہ یہ تو کھلا جادو ہے، ان لوگوں نے اپنی آنکھوں سے مٹی کے بنائے ہوئے پرندوں کو اڑتے دیکھا، پیدائشی اندھوں اور کوڑھیوں کو تندرست دیکھا اور مردوں کو زندہ ہوتے دیکھا مگر پکار اٹھے یہ تو کھلا جادو ہے اور کافروں نے ہمیشہ ایسا ہی کہا ہے۔

وَاِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ذرا اس بات کو بھی یاد کرو جب میں نے حواریوں کی طرف وحی کی، حواریوں کی طرف وحی کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کے دل میں یہ بات ڈال دی، "اَوْحَيْتُ" کا

یہ معنیٰ بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو وحی کی کہ یہ بات اپنے حواریوں تک پہنچادیں، حواری مخلص ساتھی کو کہا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ کے حواریوں کے دلوں میں یہ بات ڈال دی کہ وہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر پر ایمان لائیں اس کے جواب میں حواریوں نے کہا کہ اے اللہ! ہم ایمان لے آئے اور حضرت مسیح علیہ السلام کو پیغمبر مان لیا اور ساتھ ہی یہ بھی عرض کیا کہ اے عیسیٰ! آپ گواہ ہوجائیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرمانبرداری کرنے والے ہیں، ہم اللہ تعالیٰ پر اور آپ کے پیغمبر ہونے پر ایمان لے آئے ہیں، لہٰذا آپ ہمارے ایمان کے گواہ بن جائیں، بہرحال حواریوں کے دلوں میں اچھی بات ڈال دینا ان کا ایمان قبول کرنا، حضرت مسیح علیہ السلام کا ساتھ اختیار کرنا اور آپ کے حکم کے مطابق تبلیغ کا فریضہ انجام دینا، یہ سب اللہ تعالیٰ کا احسان اور انعام تھا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو عطا کیا گیا، اس کے بعد کچھ مزید معجزوں کا ذکر ہوگا اور پھر حساب کتاب کے ضمن میں سوال و جواب کا بیان آئے گا۔

حواریوں کی درخواست

اِذْ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ یٰعِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ هَلْ یَسْتَطِیْعُ

جب کہا حواریوں نے اے عیسیٰ بیٹے مریم کے! کیا کرسکتا ہے

رَبُّكَ اَنْ یُّنَزِّلَ عَلَیْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ ؕ قَالَ اتَّقُوا

رب تیرا کہ اتارے پر ہم کھانے سے بھرا ہوا دسترخوان سے آسمان کہا ڈرو

اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۱۱۲﴾ قَالُوْا نُرِیْدُ اَنْ نَّاْكُلَ مِنْهَا وَ

اللہ سے اگر ہو تم ایمان والے (۱۱۲) انہوں نے کہا ہم چاہتے ہیں کہ کھائیں ہم سے اس اور

تَطْمَئِنَّ قُلُوْبُنَا وَ نَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا وَ نَكُوْنَ عَلَیْهَا

مطمئن ہوں دل ہمارے اور جانیں ہم کہ بیشک سچ کہا آپ نے ہم سے اور ہوں ہم پر اس

مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۱۱۳﴾

سے گواہوں میں سے (۱۱۳)

بامحاورہ ترجمہ:۔ جب حواریوں نے کہا اے مریم کے بیٹے عیسیٰ! کیا آپ کا رب ہمارے اوپر (معجزہ کے طور پر) کھانوں سے بھرا ہوا دسترخوان اتار سکتا ہے انہوں نے جواب دیا اللہ سے ڈرو اگر تم مؤمن ہو۔ (۱۱۲) وہ بولے ہم چاہتے ہیں کہ اس میں سے کھائیں اور ہمارے دل مطمئن ہو جائیں اور ہم جان لیں کہ آپ نے ہم سے سچ کہا اور ہم اس پر گواہ رہیں۔ (۱۱۳)

تفسیر

جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ماننے والے حواریوں نے دیکھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بیماروں کو اچھا کر دیتے ہیں، مردوں کو زندہ کر دیتے ہیں اور لوگوں کو ان کے چھپے ہوئے بھید بتا دیتے ہیں تو انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ایک سوال کیا، انہوں نے کہا کہ اے عیسیٰ! کیا اللہ تعالیٰ ہمارے لئے ایسا کر سکتے ہیں کہ تیار کھانوں سے بھرا ہوا ایک دسترخوان ہمارے واسطے آسمان سے اتار دیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا کہ اگر تم اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے ہو تو اس سے ڈرو اور اس کے حکموں پر عمل کرو، انہوں نے کہا کہ ہمارا ایمان تو درست ہے، ہم اللہ تعالیٰ کی آزمائش نہیں کر رہے ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمت سے ہمارے دلوں کا اطمینان بڑھ جائے، اللہ تعالیٰ کی عبادت خوب کریں اور اس کی مہربانی پر گواہ رہیں اور ہمیں اس میں ذرا بھی شبہ نہ رہے کہ جو راستہ آپ ہمیں بتا رہے ہیں وہ ٹھیک ہے اور آپ بالکل سچے ہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جواب میں یہ ہدایت پوشیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کیلئے اس کی اپنی ضرورت کی چیزیں مہیا کرنے کا جو طریقہ مقرر فرما دیا ہے اسی طریقہ سے ان چیزوں کو حاصل کرنا چاہئے فقط تقویٰ (خدا ترسی) کا خیال رکھنا ضروری ہے جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ اس کی مقرر کی ہوئی حدوں سے باہر نہ نکلے اور اس کے غصہ سے ڈرتا رہے یہ انسان کیلئے عام قاعدہ ہے۔

حواریوں کی فرمائش کے جواب میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان سے دو باتیں کیں ایک یہ کہ ''خدا تعالیٰ سے ڈرو'' اور دوسری یہ کہ ''اگر تم ایمان والے ہو'' تو خدا تعالیٰ سے ڈرانے سے مقصود یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ قادر ہیں وہ جو چاہیں کر سکتے ہیں، لہٰذا اس کی قدرت اور طاقت میں شک کرنے سے ڈرو کیونکہ یہ بالکل غلط بات ہے؛ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دوسری بات میں حواریوں کے ایمان کا جائزہ لیا کہ کسی ایمان والے آدمی کے لئے یہ مناسب نہیں کہ وہ بڑی بڑی فرمائشیں کرے یا پیغمبر سے معجزے طلب کرے، پہلی بات یہاں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بہت مہربان ہیں بندے کو اس کی آزمائش نہیں کرنی چاہیئے کہ آیا وہ میری بات مانتے ہیں یا نہیں کیونکہ یہ چیز ادب کے سراسر خلاف ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اس تنبیہ کے بعد حواریوں نے اپنی فرمائش کی وضاحت کرتے ہوئے عرض کیا کہ حضرت! ہماری یہ فرمائش کسی قسم کی آزمائش کیلئے نہیں ہے بلکہ ہماری خواہش ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی طرف سے براہ راست اتارا ہوا بابرکت کھانا کھائیں، آپ کے ہاتھ پر اللہ تعالیٰ معجزے ظاہر فرماتے ہیں تو ہم بھی اس قسم کا عظیم الشان کھانا چاہتے ہیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس وقت حواریوں کے پاس خوراک کا ذخیرہ ختم ہو چکا ہو اور کھانا حاصل کرنے کی بظاہر کوئی صورت بھی نظر نہ آتی ہو تو ان حالات میں انہوں نے آسمانی کھانے کی فرمائش کی ہو اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے اس کیلئے دعا کی درخواست کی ہو، ظاہر ہے کہ جو کھانا اللہ تعالیٰ کی طرف سے براہِ راست اترے گا اس کے کھانے سے انسان کس قدر مطمئن ہوں گے، اس کے علاوہ حواریوں نے اپنی فرمائش کے حق میں یہ بھی دلیل پیش کی کہ ایسا بابرکت کھانا کھا کر ہم جان لیں گے کہ آپ ہم سے سچ فرماتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے جنت میں بہت سی نعمتیں تیار کر رکھیں ہیں جن کا ایک نمونہ دسترخوان کی صورت میں ہم استعمال کریں گے اس طرح گویا آپ کی سچائی کا مشاہدہ بھی ہو جائے گا، حواریوں نے یہ بھی کہا کہ ہماری خواہش کے مطابق اگر اللہ تعالیٰ دسترخوان اتار دیں گے تو ہم اس پر گواہی دینے والے بن جائیں گے گویا ہم اس بات کی گواہی دیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ پر ایسا غیر معمولی واقعہ ظاہر فرمایا ہے۔

الغرض! اس گفتگو سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یقین ہو گیا کہ ان کے حواری کھانے سے بھرے ہوئے دسترخوان کے اتارے جانے کا مطالبہ کسی شک وشبہ کی بناء پر نہیں کر رہے ہیں بلکہ وہ اس کا مشاہدہ کر کے دلی سکون حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اس نیت کے ساتھ یہ کوئی مطالبہ نہیں ہے، اب جبکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے حواریوں کے جائز مطالبہ سے مطمئن ہو گئے تو انہوں نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کھانے سے بھرے ہوئے دسترخوان کے اتارے جانے کیلئے ہاتھ اٹھائے، اس کا ذکر اگلی آیت میں آرہا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعا

قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً

کہا عیسیٰ بیٹے مریم کے نے اے اللہ! رب ہمارے اتاریئے پر ہم کھانے سے بھرا ہوا دسترخوان

مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا وَاٰيَةً مِّنْكَ ۚ

سے آسمان ہو جائے وہ لئے ہمارے عید واسطے پہلوں ہمارے کے اور پچھلوں ہمارے کے اور نشانی سے طرف آپکی

وَ ارْزُقْنَا وَ اَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿۱۱۴﴾

اور روزی دے ہم کو اور آپ ہی بہترین روزی دینے والے ہیں (۱۱۴)

بامحاورہ ترجمہ: عیسیٰ بن مریم نے کہا کہ اے اللہ! ہمارے رب ہم پر آسمان سے کھانے سے بھرا ہوا دسترخوان اتاریئے کہ ہمارے پہلوں اور پچھلوں کے لئے عید کا دن ہو اور آپ کی طرف سے نشانی ہو اور ہم کو روزی دیجئے اور آپ ہی سب سے بہتر روزی دینے والے ہیں۔ (۱۱۴)

لفظی تحقیق: مَآئِدَةً : دسترخوان۔ اس لفظ میں حواریوں کی اس خواہش کی طرف اشارہ ہے کہ وہ چاہتے تھے کہ آسمان سے تیار کھانے دسترخوان میں لگے ہوئے اتریں۔

تفسیر

جب حواریوں نے کہا کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کی آزمائش مقصود نہیں ہے بلکہ اس کی خاص عنایت طلب کرتے ہیں تاکہ فراغت کے ساتھ اس کی شکرگزاری اور عبادت میں جی لگا کر مشغول ہوں اور اس کے حکم بجالائیں اور آپ کی سچائی ہم پر بالکل واضح ہوجائے اور اس کی کھلی نشانی ہماری آنکھوں کے سامنے آجائیں تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حضور عرض فرمایا کہ: اے اللہ! آپ ہی ہماری ساری ضرورت کی چیزیں مہیا کرنے والے ہیں اپنی رحمت سے ان کے حاصل کرنے میں ہماری محنت ومشقت کی ضرورت نہ چھوڑیئے بلکہ تیار کھانے سے سجا سجایا دسترخوان ہمارے اوپر آسمان سے بھیج دیجئے تاکہ ہمارے اگلے پچھلے سب کیلئے خوشی اور عید کا باعث بن جائے اور آپ کی شفقت اور مہربانی کی ایک کھلی نشانی ہمارے ہاتھ آجائے، آپ ہم سب کو رزق دینے والے ہیں اور ہر صورت میں رزق آپ ہی کی طرف سے آتا ہے، آپ کو رزق دینے کا طریقہ بدلنے میں کیا دیر لگے گی، آپ کی قدرت میں سب کچھ ہے اور رزق اور روزی دینے میں آپ کی برابری تو کیا آپ کی نقل بھی کوئی نہیں کرسکتا، گو بظاہر کتنا ہی فیاض اور مالدار ہو۔

ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی یہ دعا حواریوں کیلئے آسانی پیدا کرنے کیلئے تھی تاکہ وہ کھانے پینے کی فکر سے آزاد ہوکر سارا وقت اللہ تعالیٰ کی شکرگزاری اور اس کے حکموں کے پورا کرنے میں خرچ کریں۔

نافرمانی کی سزا

قَالَ اللّٰهُ اِنِّیْ مُنَزِّلُهَا عَلَیْكُمْ ۚ فَمَنْ یَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ

کہا اللہ نے بیشک میں اتارنے والا ہوں اس کو پر تم پس جو ناشکری کریگا اس کے بعد میں سے تم

ع ۱۵/۷ ۵ فَاِنِّیْۤ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّاۤ اُعَذِّبُهٗۤ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۱۵﴾

تو بیشک میں عذاب دونگا اسے ایسا عذاب کہ نہ عذاب دونگا ایسا کسی کو میں سے جہان والوں (۱۱۵)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بیشک میں وہ دسترخوان تم پر اتاروں گا پھر جو کوئی تم میں سے اس کے بعد ناشکری کرے گا تو میں اسے ایسا عذاب دوں گا کہ جہان والوں میں سے کسی کو ایسا عذاب نہ دوں گا۔ (۱۱۵)

تفسیر

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دعا فرمائی تو آسمان پر بادل نظر آئے اور ان کے درمیان فرشتے دسترخوان اٹھائے ہوئے تھے، اس میں پانچ یا سات روٹیاں اور اتنی ہی تلی ہوئی مچھلیاں تھیں اس کے علاوہ سرکہ، نمک مختلف سبزیاں اور زیتون کا تیل بھی تھا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کا نام لے کر دسترخوان کھولا اور لوگوں کو کھانے کی اجازت دی، یہ دسترخوان ایک ایک دن کے وقفے سے چالیس دن تک اترتا رہا، بعض فرماتے ہیں کہ دسترخوان صبح کے وقت اترتا تھا اور پچھلے پہر خود بخود اٹھ جاتا تھا، "ترمذی شریف" میں "سورۂ مائدہ" کی تفسیر میں حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کی ایک ضعیف روایت موجود ہے جس کے مطابق دسترخوان آسمان سے اترا اور اس میں گوشت اور روٹیاں تھیں یہ روایت دسترخوان کے اترنے کیساتھ کچھ مناسبت رکھتی ہے۔

تفسیری روایتوں میں آتا ہے کہ دسترخوان اترنے کے ابتدائی دنوں میں تو اس میں سے ہر شخص کو کھانے کی اجازت تھی اور اس غذا کی خاصیت یہ تھی کہ جو غریب آدمی کھاتا تھا وہ امیر ہوجاتا تھا اور جو مریض کھاتا وہ شفایاب ہوجاتا تھا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی گواہی

وَ اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ

اور جب | کہا | اللہ نے | اے عیسیٰ | بیٹے | مریم کے! | کیا آپ نے | کہا | واسطے لوگوں کے

اتَّخِذُوْنِيْ وَ اُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا

ٹھہرالو مجھ کو | اور ماں میری کو | دو معبود | سے | سوا | اللہ کے | کہا | پاک ہیں آپ | نہیں

يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ ۗ بِحَقٍّ ۭ

لائق لئے میرے یہ کہ کہوں میں وہ بات کہ نہیں لئے میرے ٹھیک

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور یاد کیجئے! جب اللہ کہے گا اے مریم کے بیٹے عیسیٰ! کیا لوگوں کو آپ نے کہا تھا کہ مجھ کو اور میری ماں کو اللہ کے سوا دو معبود ٹھہرالو؟ (عیسیٰ علیہ السلام) کہیں گے کہ آپ پاک ہیں، مجھ کو لائق نہیں کہ ایسی بات کہوں جس کا مجھ کو حق نہیں۔

تفسیر

ارشاد ہے کہ: قیامت میں اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے دریافت فرمائیں گے کہ کیا تم نے ان لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو معبود بنا کر ہماری پوجا کرنا؟ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جواب میں عرض کریں گے کہ اے سب عیبوں سے پاک اللہ! میری کیا مجال کہ میں ایسی بات منہ سے نکالوں جس کا منہ سے نکالنا میرے لئے کسی طرح لائق نہیں، بھلا مجھ سے یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میں آپ کا بندہ اور پیغمبر ہو کر ایسی بات کہوں کہ جس کو کوئی معمولی بندہ بھی نہیں کہہ سکتا۔

اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: اے عیسیٰ ابن مریم! کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اللہ تعالیٰ کے سوا معبود بنالو؟ ظاہر ہے کہ دنیا میں ماں بیٹا دونوں کی پوجا ہوتی رہی، امہات المؤمنین حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے بیان کیا کہ ہم نے حبشہ کے گرجا میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم کی تصویریں دیکھیں، وہ لوگ ان تصویروں کو سلام کرتے تھے اور ان کی تعظیم اور پوجا کرتے تھے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: ایسے لوگ اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں بدترین لوگ ہیں، جب ان میں سے کوئی نیک آدمی فوت ہوجاتا تو یہ اس کی تصویر یا مجسمہ بنا کر رکھ لیتے اور پھر اس کی پوجا کرنے لگتے، آپ نے فرمایا کہ یہ کفر کا راستہ ہموار کرنے والے بدترین لوگ ہیں، عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بیٹا بنالیا ہے اور اسے اختیار

دے دیا ہے کہ جو چاہے کرے جس کا چاہے بیڑا پار کرے جس کو چاہے گرفتار کر لے، کہتے ہیں کہ وہ ہماری مرادیں پوری کرتا ہے، انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام، حضرت مریم اور اللہ تعالیٰ کو ملا کر تین خداؤں والا شرکیہ عقیدہ گھڑ لیا ہے اور اسی کے متعلق قیامت کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے سوال ہوگا کہ کیا آپ نے ان لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو دو معبود بنالو۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ سوال ہونے پر حضرت مسیح علیہ السلام پر جو کیفیت طاری ہوگی اس کے متعلق مفسرین نے کئی باتیں لکھی ہیں ان میں "تفسیر کبیر، تفسیر ابن جریر، تفسیر روح المعانی" قابل ذکر ہیں، "روح المعانی" میں ہے کہ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام سے پوچھیں گے کہ کیا آپ نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو معبود بنالو؟ تو آپ پر کپکپی طاری ہو جائے گی، دہشت کی وجہ سے آپ کے بال کھڑے ہو جائیں گے اور ان کی جڑوں سے خون نکلنے لگے گا، علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: بعض روایتوں میں یہ بھی آتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام پر یہ حالت پانچ سو سال تک طاری رہے گی اور وہ زبان سے کچھ نہیں بول سکیں گے؛ جب حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام سے دہشت کی کیفیت دور ہوگی تو وہ اللہ تعالیٰ کے سوال کا نہایت عاجزی سے جواب دیں گے اور پہلے اللہ تعالیٰ کی پاکیزگی بیان فرمائیں گے کہ اے اللہ! آپ کی ذات پاک ہے، آپ ہر عیب، نقص اور کمزوری سے پاک ہیں، میرے لئے یہ لائق نہیں ہے کہ میں ایسی بات کہوں جس کا مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا، یعنی: مجھے کیا حق ہے کہ میں لوگوں سے اپنی اور اپنی والدہ کی خدائی کا اقرار کراؤں۔

دل کا حال

اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ؕ تَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِیْ وَ لَاۤ

اگر | میں نے | کہا ہو یہ | پس تحقیق | جانتے ہیں آپ اسکو | جانتے ہیں آپ | وہ جو ہے | میں | جی میرے | اور نہیں

اَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِكَ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ ﴿۱۱۶﴾

جانتا میں　جو　میں　جی آپ کے　بیشک　آپ　جاننے والے ہیں　چھپی باتوں کو (۱۱۶)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اگر میں نے یہ کہا ہوگا تو آپ کو ضرور معلوم ہوگا جو میرے جی میں ہے آپ جانتے ہیں اور میں نہیں جانتا جو آپ کے جی میں ہے، بیشک آپ چھپی باتوں کے جاننے والے ہیں۔ (۱۱۶)

تفسیر

اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ انہوں نے عرض کیا کہ اے اللہ! اگر میں نے کہا ہوگا تو آپ کو ضرور معلوم ہوگا کیونکہ آپ سب چیزوں سے اچھی طرح واقف ہیں اور آپ کے علم سے کوئی چیز باہر نہیں، پھر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ آپ یہ نہ جانتے ہوں کہ میں نے ایسی فضول اور بیہودہ بات منہ سے نکالی ہے، میرے تو دل میں بھی ایسا خیال کبھی نہیں گزرا اور نہ وہ بھی آپ کو معلوم ہوجاتا کیونکہ آپ کھلی اور چھپی دونوں طرح کی چیزوں سے اچھی طرح واقف ہیں اور میرے تو علم کیا وہم وگمان میں بھی کبھی آپ کے راز کی باتیں نہیں گزر سکتیں، حقیقت میں علم غیب (چھپی باتیں) صرف آپ ہی جانتے ہیں۔

پچھلی آیت میں جو حضرت عیسٰی علیہ السلام کے جواب کا حصہ گزرا اس میں زور اس بات پر تھا کہ جب آپ نے مجھے پیغمبری کا اعلٰی درجہ عطا فرمایا تو پھر میرے منہ سے ایسی بات کیسے نکل سکتی تھی؟ جس میں آپ کی بے ادبی ہو اور یہ ثابت ہو کہ معاذ اللہ آپ کسی مددگار کے محتاج ہیں، آپ کو کسی کا محتاج ہونا ایک عیب کی بات ہے اور آپ ہر عیب سے پاک ہیں، اس لئے جواب کے شروع میں "سُبْحٰنَكَ" فرمایا، پیغمبر ہو کر مجھ سے کبھی نہیں ہوسکتا کہ میں اپنے آپ کو اور ماں کو خدا کہہ کر یہ ظاہر کروں کہ نعوذ باللہ آپ خدا ہونے کیلئے کافی نہیں، آیت کے اس حصہ میں یہ کہا کہ آپ عالم الغیب ہیں میری کھلی اور چھپی باتوں کو جانتے ہیں، میں آپ کے علم کو اپنا گواہ بنا کر پیش کرتا ہوں کہ میں نے ہرگز یہ بات نہیں کہی، غرض ہر طرح اس جرم سے اپنا بری ہونا ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔

پیغمبر کی گواہی

مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِيْ بِهٖٓ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَ

نہیں کہا میں نے سے ان مگر جو حکم دیا تو نے مجھ کو اسکا یہ کہ بندگی کرو اللہ کی رب میرا اور

رَبَّكُمْ ۚ وَ كُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا

رب تمہارا اور تھا میں پر ان دیکھ بھال کرنے والا جس مدت تک رہا میں اندر انکے پس جب

تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ۭ وَ اَنْتَ عَلٰى كُلِّ

اٹھالیا تو نے مجھ کو تو تھے آپ آپ نگہبان پر ان اور آپ اوپر ہر

شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴿۱۱۷﴾

چیز کے دیکھ بھال رکھنے والے ہیں (۱۱۷)

با محاورہ ترجمہ:۔ میں نے ان کو کچھ نہیں کہا مگر جو آپ نے حکم کیا کہ اللہ کی بندگی کرو جو میرا اور تمہارا رب ہے اور جب تک میں ان میں رہا میں ان سے خبر دار تھا پھر جب آپ نے مجھے اٹھالیا تو ان کی خبر رکھنے والے آپ ہی تھے اور آپ ہر چیز سے خبر دار ہیں۔ (۱۱۷)

تفسیر

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے حضور میں اپنا بے قصور ہونا ظاہر کرنے کیلئے بے قرار ہیں وہ سمجھ رہے ہیں کہ اتنا بڑا سوال بے وجہ نہیں، ضرور اس میں کچھ حکمت ہے پہلے وہ عرض کرتے ہیں کہ اے اللہ! آپ ہر نقص و عیب سے پاک ہیں ایک آپ کا بندہ جس پر آپ نے اپنی بڑی مہربانی کی کہ اپنا پیغمبر مقرر کیا ایسی گستاخی کیسے کر سکتا ہے کہ آپ کی برابری کا دعویٰ کرے؟ پھر عرض کرتے ہیں کہ مجھے تو اتنا علم نہیں ہے کہ آپ کے بھید سمجھ

سکوں اور اس سوال کے اندر جو حکمت ہے اس کو دریافت کرسکوں، آپ جانتے ہیں کہ میرے دل میں یہ خیال بھی نہیں گزرا کہ خود خدا بن بیٹھوں پھر جو کچھ انہوں نے اپنا فرض ادا کرنے کیلئے دنیا میں کیا وہ بیان کرتے ہیں، اس آیت میں اسی کا بیان ہے وہ کہتے ہیں کہ:

"اے اللہ! میں نے ان سے سوا اس کے کچھ نہیں کہا جس کے کہنے کا آپ نے مجھے حکم دیا تھا یعنی میرا اور تمہارا پالنے والا اور حفاظت کرنے والا اللہ ہے اس لئے اس کے آگے بندوں کی طرح سر جھکاؤ اور اس کے ساتھ اپنی بے بسی اور بے چارگی کا اقرار کرو، اس کے سوا کوئی عبادت کے قابل نہیں ہے، اے اللہ! مجھے تو ان کی باتوں کی اس وقت تک کی خبر تھی جب تک میں ان کے اندر موجود تھا، جب آپ نے مجھے اٹھا لیا تو پھر اس کے بعد کا علم آپ ہی کو ہے اور آپ کے سوا اور کون ہے جو دیکھ بھال کرے کیونکہ آپ ہی ہر چیز کے نگران اور محافظ ہیں"۔

اس کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خیال آیا کہ ضرور اس سوال سے غرض یہ ہوگی کہ میری پیروی کے دعوے داروں کا اس طریقہ سے قصور ثابت کرکے ان کو ان کے کرتوتوں کی سزا دی جائے اس لئے ایک رحم دل پیغمبر کی حیثیت سے ان کی نہایت مناسب الفاظ میں سفارش کرتے ہیں جو آگے کی آیت میں آرہا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے رحم کی درخواست

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَ اِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ

اگر عذاب دے یں آپ انکو تو بیشک وہ بندے ہیں آپکے اور اگر بخش دیں آپ ان کو پس بیشک آپ

اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۱۸﴾

آپ (بلاشبہ) زبردست حکمت والے ہیں (۱۱۸)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اگر آپ ان کو عذاب دیں تو وہ آپ کے بندے ہیں اور اگر آپ ان کو معاف کردیں تو آپ زبردست حکمت والے ہیں۔ (۱۱۸)

تفسیر

ایک زبردست حاکم کے سامنے مجرم کی بخشش کی درخواست کرنے کیلئے اس سے بہتر طریقہ نہیں ہوسکتا کہ جب کسی مجرم کا جرم بلاشبہ ثابت ہوجائے اور حاکم بھی ایسا ہو کہ جس کے فیصلے کو نہ کوئی ٹال سکتا ہے نہ اس کی اپیل ہوسکتی ہے تو سفارش کرنے والا یہی الفاظ استعمال کرسکتا ہے جو یہاں حضرت عیسیٰ نے کئے ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جو کچھ اب تک کہا وہ ایسا صاف بیان ہے کہ اس کے بعد خود عیسائیوں کا قصور ثابت ہونا لازمی ہے، اس واقعہ میں تو کوئی شک ہی نہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ دونوں کی دنیا میں پوجا کی گئی اس کی وجہ دو کے سوا تیسری نہیں ہوسکتی یا تو خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جو انہیں اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچانے والے تھے کہا کہ اللہ تعالیٰ کی نہیں بلکہ میری اور میری ماں کی پوجا کرو اور یا عیسائیوں نے یہ راستہ خود بخود اختیار کیا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جواب سے ان کے خود کے بے گناہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہتا اس طرح اس حقیقت میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ یہ کام عیسائیوں کا اپنا ایجاد کیا ہوا ہے اور اس لئے وہ مجرم ہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسی خیال سے عرض کریں گے کہ اے اللہ! آپ ان کو عذاب دیں تو کوئی آپ کو روکنے والا نہیں کیونکہ آپ ان کے پورے طور پر مالک ہیں اور یہ آپ کے بے بس اور لاچار بندے ہیں، شیطان کے بہکانے سے سب سے بڑا جرم کر بیٹھے ہیں اور اگر آپ چاہیں تو ان کو بخش بھی سکتے ہیں، اس صورت حال میں بھی آپ کو کوئی روک نہیں سکتا کیونکہ آپ سب سے زیادہ طاقت اور قوت والے ہیں کسی کی کیا مجال کہ آپ کے فیصلہ میں چون و چرا کر سکے اور پھر آپ ہی یہ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان کے معاف کر دینے میں کوئی خرابی تو نہیں ہے کیونکہ آپ حکیم ہیں اور ہر بات کی تہہ کو پہنچے ہوئے ہیں اور ہر کام کے نتیجہ سے واقف ہیں، ایک زبردست حاکم سے رحم و کرم کی درخواست کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ جہاں تک ہوسکے اپنی بے بسی کا اور اس کی بے پناہ قدرت اور طاقت کا اقرار کیا جائے۔

اللہ تعالیٰ کا فیصلہ

قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ ؕ لَهُمْ جَنّٰتٌ

فرمایا اللہ نے یہ دن ہے کہ نفع دے گا سچوں کو سچ ان کا لئے ان کے ایسے باغ ہیں

تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا ؕ رَضِيَ اللّٰهُ

بہتی ہونگی سے نیچے ان کے نہریں رہیں گے میں اس ہمیشہ راضی ہوا اللہ

عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۱۹﴾ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ

سے ان اور راضی ہوئے وہ سے اس یہی ہے کامیابی بڑی (۱۱۹) لئے اللہ کے ہے سلطنت آسمانوں کی

وَالْاَرْضِ وَمَا فِيْهِنَّ ؕ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۲۰﴾ ۱۶ ع ۵ ۶

اور زمین کی اور جو کچھ میں ہے ان اور وہ اوپر ہر چیز کے قدرت والا ہے (۱۲۰)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اللہ نے فرمایا یہ دن ہے کہ سچوں کو ان کا سچ کام آئے گا ان کیلئے ایسے باغ ہونگے جن کے نیچے نہریں بہتی ہونگی انہیں میں ہمیشہ رہا کریں گے ان سے اللہ راضی ہوا اور وہ اس سے راضی ہوئے، یہی بڑی کامیابی ہے۔(۱۱۹) زمین اور آسمان کی سلطنت اور جو کچھ ان کے بیچ میں ہے اللہ ہی کیلئے ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔(۱۲۰)

تفسیر

اللہ تعالیٰ کی طرف سے سوال اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف سے جواب کے بعد اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ یہ وہ دن ہے جس دن سچوں کو ان کا سچ فائدہ دے گا جنہوں نے دنیا میں سچا عقیدہ، سچا عمل اور سچا اخلاق اختیار کیا آج ان کا احترام ہوگا، عزت ہوگی، یہاں پر "صِدْقُ" سے مراد قیامت والے دن کا "صِدْقُ" نہیں کیونکہ اس

دن تو کافر بھی سچ بولیں گے اور صاف کہیں گے کہ ہم کفر کرنے والے تھے اور ہم نے غلط کام کیا مگر اس دن کا سچ بولنا کچھ بھی فائدہ نہ دے گا، اس دن وہ سچ کام آئے گا جو لوگوں نے اس دنیا میں اختیار کیا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام سچے تھے، لہٰذا قیامت کے دن ان کا اعزاز و اکرام ہوگا اور ان کے متعلق غلط عقیدے رکھنے والے عذاب میں مبتلا ہوں گے، سچوں کی سچائی کا یہی مطلب ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بیان سن کر فیصلہ فرمایا کہ آج ٹھیک راستے پر چلنے والوں کیلئے ان کا ٹھیک ٹھیک رہنا ان کو فائدہ دے گا اور آج سچے آدمیوں کو ان کی سچائی کام آئے گی، اس فیصلہ میں مجرموں کا کوئی ذکر نہیں کیا کیونکہ ان کا حال اسی فیصلہ سے اچھی طرح سمجھ میں آسکتا ہے، اس کے صاف صاف ذکر کی کوئی ضرورت نہیں اور یہ وہ بیان کا طرز ہے جو کلام پاک ہی کا حصہ ہے۔

ارشاد ہے کہ: آج کا دن وہ ہے کہ جس میں اچھے کام کرنے والوں کو ان کے اچھے کاموں کا بدلہ ملے گا اور جنہوں نے سچائی اور خلوص کے ساتھ دنیا میں اللہ تعالیٰ کے حکموں کو پورا کیا ہے آج وہ اس کا پھل پائیں گے، انہیں رہنے کیلئے ایسے باغ ملیں گے جن کے صحنوں اور درختوں کے نیچے صاف شفاف نہریں بہہ رہی ہوں گی اور پھر یہ باغ ان سے کبھی چھینے نہیں جائیں گے بلکہ وہ انہیں کو بخش دیئے جائیں گے تاکہ وہ ان میں ہمیشہ رہیں، یہ سب سے بڑی کامیابی ہے، یہ انعام اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملیں گے جس کے قبضہ میں آسمان، زمین اور ان کے اندر کی تمام چیزیں ہیں اور کوئی چیز ایسی نہیں ہوسکتی جو اس کی قدرت سے باہر ہو۔

اللہ تعالیٰ نے اس فائدہ کا ذکر فرمایا ہے جو سچوں کا اس دن حاصل ہوگا اور مزید یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اس فیصلہ پر راضی ہوگئے، وہ کیوں راضی نہ ہوں گے؟ اللہ تعالیٰ نے انہیں دنیا میں نیکی کی توفیق عطا فرمائی، ایمان کا نور بخشا اور اپنے انعام و اکرام سے نوازا، وہ اللہ تعالیٰ سے راضی ہوجائیں گے، یہ بہت بڑی کامیابی ہے کہ انسان جنت میں پہنچ جائے جو خدا کی رحمت کا مقام ہے اور پھر اسے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہوجائے، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے اے جنت والو! کیا میں تمہیں کچھ اور بھی دوں؟ تو جنتی عرض کریں گے اے ہمارے رب! آپ نے

ہر قسم کی نعمتیں عطا فرمادیں ہیں اب اور کیا ہوسکتا ہے؟ تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے میں اپنی خوشنودی کا اعلان کرتا ہوں اب اس کے بعد کبھی بھی تم سے ناراض نہیں ہوں گا، تمہیں میری ہمیشہ کی رضا حاصل ہوگی، اس سے بڑھ کر کوئی کامیابی نہیں ہوسکتی۔

اٰیاتها — ۱۶۵ سُوْرَةُ الْاَنْعَامِ مَكِّيَّةٌ رکوعاتها — ۲۰

سورۃ الانعام مکی ہے، اس میں ایک سو پینسٹھ آیتیں اور بیس رکوع ہیں۔

اللہ تعالیٰ سب کے خالق ہیں

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ جَعَلَ

ساری تعریفیں ہیں لئے اللہ کے جس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو اور بنایا

الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ ۬ ثُمَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ یَعْدِلُوْنَ ①

اندھیروں کو اور اجالے کو پھر وہ لوگ جو کافر ہوئے ساتھ رب اپنے کے برابر ٹھہراتے ہیں (اوروں کو)(۱)

بامحاورہ ترجمہ: سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس نے آسمان اور زمین پیدا کئے اور اندھیرا اور اجالا بنایا، پھر بھی کافر اپنے رب کیساتھ اوروں کو برابر ٹھہراتی ہیں۔(۱)

لفظی تحقیق: السَّمٰوٰتِ: یہ "سَمَآءٌ" کی جمع ہے، جس کے معنیٰ آسمان کے ہیں۔ الظُّلُمٰتِ: یہ "ظُلْمَۃٌ" کی جمع ہے جس کے معنیٰ اندھیرے کے ہیں، اس سے مراد رات اور دن کے اندھیرے ہیں۔ النُّوْرَ: روشنی۔ یَعْدِلُوْنَ: "عَدْلٌ" سے ہے، عدل کے معنیٰ ہیں دو چیزوں کے درمیان برابری۔

تفسیر

اس سورۃ کی فضیلت یہ ہے کہ اس کی چند آیتوں کو چھوڑ کر باقی ساری سورۃ ایک ہی وقت میں اتری، اس سورۃ کے ساتھ ستّر ہزار فرشتوں کی جماعت زمین پر اتری جس سے پوری وادی بھر گئی۔

اس آیت میں وہ اصل بات جو اسلام انسانوں کو سکھانا چاہتا ہے بڑی خوبی سے بیان کردی گئی ہے یعنی تمام جہان کے اور اس کی ساری چیزوں کے پیدا کرنے والے ایک اللہ تعالیٰ ہیں۔

آسمان اور زمین اللہ تعالیٰ نے پیدا کیے اور ان میں وہ ساری چیزیں آ گئیں جو آسمان و زمین میں پائی جاتی ہیں یعنی یہ سب بھی اسی نے پیدا کی ہیں، اندھیرے اور اجالے کو اللہ تعالیٰ ہی نے پیدا فرمایا ہے، پھر بھی یہ کافر لوگ اللہ تعالیٰ کی قدرت کو دیکھنے کے باوجود غیروں کو اللہ تعالیٰ کے برابر ٹھہراتے ہیں۔

انسان کی پیدائش

هُوَ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِيْنٍ ثُمَّ قَضٰٓى اَجَلًا ؕ وَ اَجَلٌ

وہی ہے جس نے پیدا کیا تم کو سے مٹی پھر مقرر کردی ایک مدت اور ایک مدت

مُّسَمًّى عِنْدَهٗ ثُمَّ اَنْتُمْ تَمْتَرُوْنَ ﴿۲﴾

مقرر ہے نزدیک اسکے پھر بھی تم شک کرتے ہو (۲)

بامحاورہ ترجمہ:۔ وہی ہے جس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا پھر ایک وقت مقرر کیا اور اللہ کے نزدیک ایک مدت مقرر ہے پھر بھی تم شک کرتے ہو۔ (۲)

لفظی تحقیق: تَمْتَرُوْنَ: شک کرتے ہو۔ یہ لفظ "مِرْيَةٌ" سے بنا ہے اور "مِرْيَةٌ" کے معنٰی شک کے ہیں۔

تفسیر

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ اسی اللہ تعالیٰ نے انسان کو بنایا ہے انسان خود اپنی بناوٹ اور حالت کو سمجھ سکتا ہے۔

ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا اور تمہارے لئے زندہ اور قائم رہنے کی ایک مدت مقرر کردی اسی سے سمجھ لو کہ سارے جہان کے قائم رہنے کی بھی مدت مقرر ہے اور جس طرح ایک نہ ایک دن تمہاری اپنی عمر ختم ہوجاتی ہے اسی طرح ایک دن سارے جہان کی عمر بھی ختم ہوجائے گی اور قیامت آجائے گی۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِیْنٍ: اللہ تعالیٰ کی ذات وہ ہے جس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا، پہلے انسان یعنی حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش مٹی سے ہوئی، صحیح حدیث میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کا وجود ساری زمین سے ہر قسم کی مٹی لیکر بنایا، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: جس طرح مختلف مقاموں کی مٹی مختلف یعنی سفید، سیاہ، سرخ، پیلی وغیرہ ہے کہیں کی مٹی چکنی ہے اور کہیں کی ریتیلی اسی طرح کے اثرات تمام انسانی نسل میں بھی پائے جاتے ہیں کوئی اچھے اخلاق کا آدمی ہے اور کوئی برے اخلاق والا ہے، کسی کا رنگ سفید ہے اور کسی کا سیاہ، اسی طرح کوئی سرخ رنگ والا ہے اور کوئی گندمی یہ سب مٹی کے اثر کی وجہ سے ہیں۔

جس طرح انسان کے پیدا کرنے اور مارنے میں کوئی اللہ تعالیٰ کا شریک نہیں اسی طرح سارا جہان اسی ایک اکیلے اللہ تعالیٰ نے بنایا ہے، اس کے بنانے میں نہ کوئی اس کا شریک ہے نہ اس کے انتظام میں اور اس کے ختم کرنے میں کسی اور کا کچھ حصہ ہے، اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کا یہ تصور انسان کے دل پر بٹھانا چاہتے ہیں اور اسی پر اسلام کے سارے حکموں اور نظام کا دارومدار ہے۔

وَ اَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهٗ ثُمَّ اَنْتُمْ تَمْتَرُوْنَ: اللہ تعالیٰ نے قیامت کے واقع ہونے کا علم نہ کسی فرشتے کو دیا اور نہ کسی پیغمبر کو دیا، اس کا علم صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے کہ قیامت کب واقع ہوگی، اللہ تعالیٰ نے اس کی نشانیاں تو پیغمبروں کو بتائی ہیں مگر اس کے آنے کا وقت کسی کو نہیں بتایا، جس طرح ہر انسان کیلئے موت کا

ایک وقت مقرر ہے اسی طرح تمام جہان کے ختم ہونے کیلئے بھی ایک مدت مقرر ہے مگر افسوس کہ تم شک میں پڑے ہوئے ہو۔

انسان کی پیدائش کا حال "سورۂ مائدہ" کی تفسیر میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ذکر کے بعد گزر چکا ہے اس پر یہاں یہ اضافہ کیا گیا ہے کہ انسان کے مرنے کی طرح سارا جہان ایک دن ختم ہو جائیگا اور قیامت آ جائے گی کوئی وجہ نہیں کہ انسان ان باتوں میں شک کرے یا دنیا و آخرت کے نظام میں کسی کو اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرائے۔

اللہ تعالیٰ کی صفتیں

وَ هُوَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَ فِي الْاَرْضِ ۭ يَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَ

اور وہی اللہ ہے میں آسمانوں اور میں زمین جانتے ہیں پوشیدہ تمہارا اور

جَهْرَكُمْ وَ يَعْلَمُ مَا تَكْسِبُوْنَ ③ وَ مَا تَاْتِيْهِمْ مِّنْ

ظاہر تمہارا اور جانتے ہیں جو تم کرتے ہو (۳) اور جو آتی پاس انکے کوئی

اٰيَةٍ مِّنْ اٰيٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ ④

نشانی سے نشانیوں رب انکے کی مگر ہوتے ہیں وہ سے اس منہ پھیرنے والے (۴)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور آسمانوں میں اور زمین میں وہی اللہ ہے جو تمہاری چھپی اور کھلی باتوں کو جانتا ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو جانتا ہے۔ (۳) اور ان کے رب کی نشانیوں میں سے جو نشانی بھی ان کے پاس آتی ہے وہ اس سے منہ موڑتے ہیں۔ (۴)

تفسیر

ساری خوبیاں اللہ تعالیٰ ہی کیلئے ہیں اگر کہیں کسی چیز میں کوئی خوبی نظر آتی ہے تو وہ اس کی اپنی نہیں بلکہ

اللہ تعالیٰ ہی کی خوبی کی ایک جھلک ہے، اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کے سب سے غالب ہونے کا بیان کر کے بتلایا گیا ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے فیصلے کو بدل نہیں سکتا، ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں میں اور زمین میں ہر جگہ موجود ہیں اور ہر جگہ اسی کا حکم چلتا ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ آسمانوں میں ایک بالشت بھر بھی ایسی جگہ خالی نہیں جہاں کوئی فرشتہ عبادت نہ کر رہا ہو یعنی رکوع وسجدوں میں مشغول نہ ہو، البتہ زمین پر ایک گروہ ایسا ہے جو اللہ تعالیٰ کا نافرمان ہے ورنہ ساری زمین کے تمام جانور درخت وپتھر سب خدا کی عبادت کرتے رہتے ہیں، "سورۂ نحل" میں موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا لوگوں میں سے بہت سے ایسے ہیں جو اس کی عبادت کرنے کے بجائے شیطان کی پیروی کرتے ہیں، توحید کے بجائے شرک میں مبتلا ہیں اور ایمان کے بجائے کفر کا راستہ اختیار کر رکھا ہے، اسی لئے فرمایا آسمانوں اور زمین میں وہی حقیقی خدا ہیں۔

اللہ تعالیٰ کو تمہاری ذرا ذرا سی بھی چھپی ہوئی اور کھلی ہوئی باتیں معلوم ہیں اور جو تم کرتے ہو اسے اللہ تعالیٰ جانتے ہیں اس نے اپنی نشانیاں سارے جہان میں پھیلا رکھی ہیں اور اپنا کلام پاک بھی بھیج دیا ہے جو سب سے بڑی نشانی ہے، جو بھی عقل سے کام لے گا اور ان آیتوں پر غور کرے گا وہ اس کی قوت اور قدرت پہچانے بغیر نہیں رہ سکتا، پھر ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کی جو نشانی یا قرآن کریم کی جو آیت ان کے سامنے آتی ہے اس سے منہ موڑ لیتے ہیں اور ذرا نہیں سمجھتے کہ ان کا مطلب کیا ہے، اگر انسان غور کرے تو اس کے پیدا کرنے کا مقصد ہی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو پہچانے اور اسی کی عبادت کرے۔

حقیقت کا اظہار

فَقَدۡ كَذَّبُوۡا بِالۡحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمۡ ؕ فَسَوۡفَ يَاۡتِيۡهِمۡ اَنۡۢبٰٓؤُا

پس بیشک | جھٹلایا انہوں نے | حق کو | جب | آیا وہ ان تک | سو عنقریب | آئے گی انکے پاس | سچی خبریں

مَا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝۵

اسکی کہ تھے وہ ساتھ اسکے ٹھٹھا کرتے (۵)

بامحاورہ ترجمہ:۔ جب حق ان تک پہنچا سو بیشک انہوں نے اسے جھٹلایا، سو ان کے آگے اس بات کی حقیقت آنے والی ہے جس پر وہ ہنستے تھے۔(۵)

تفسیر

اس آیت میں ارشاد ہے کہ یوں تو آسمان اور زمین اور ان کے اندر جو حادثے ہوتے رہتے ہیں ان پر غور کرنے سے عقلمند ضرور ان کو مان لے گا لیکن ممکن ہے کہ غفلت کی وجہ سے ان پر غور کرنے کا موقعہ نہ ملے یا ملے تو کھیل کود میں مشغول ہونے کی وجہ سے حقیقت کے پتہ لگانے کا ارادہ ہی نہ کرے لیکن ایک نشانی تو ان کے پاس ایسی زبردست آچکی ہے کہ اس کے اندر شبہ کی گنجائش ہی نہیں کیونکہ اس کے ساتھ اس کو سمجھانے والا بھی موجود ہے اور اس کا کام ہی یہ ہے کہ تمام لوگوں کو اس کی طرف توجہ دلائے اور وہ نشانی انہیں صحیح طور پر سمجھا دے یہ نشانی قرآن مجید ہے اور اس کے لانے والے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، قرآن مجید کی ایک ایک آیت اللہ تعالیٰ کے برحق ہونے پر گواہ ہے اور سچائی اور حقیقت کو واضح کرتی ہے، اس کے بعد سب سے بڑی نشانی یعنی قرآن مجید سے منہ موڑنے کیلئے کوئی بہانہ ہی نہیں رہتا اور اگر کوئی منہ موڑتا ہے تو اس کی وجہ اس کی ہٹ دھرمی کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتی۔

اس کے بعد اس کے نہ ماننے والوں کو سزا سے ڈرایا گیا ہے، ارشاد ہے کہ ان لوگوں نے تو ضد سے ایک سچی کتاب کو جھٹلایا لیکن انہیں یاد رکھنا چاہئے کہ وہ دن دور نہیں کہ ان پر اس کا وبال پڑے گا، اس کتاب کی ایک ایک بات پوری ہو کر رہے گی اور جن باتوں کی یہ آج ہنسی اڑا رہے ہیں کل یہ باتیں ان کو رلا کر رہیں گی اور وہ اس گستاخی کا مزہ چکھیں گے۔

قرآن مجید میں اس کے نہ ماننے والوں کیلئے دو قسم کی سزاؤں کی پیش گوئی کی گئی ہے، دنیا کی سزا اور آخرت کی سزا، اس سے مراد قیامت، پل صراط، میزان (انصاف کے ترازو) اور آخرت کے مرحلوں سے تعلق رکھنے والی تمام چیزیں ہیں، دونوں سزاؤں کے یقینی ہونے کا اس قدر صاف اعلان کر دیا گیا تھا کہ سمجھداروں کیلئے اس کے سمجھنے میں کوئی دشواری نہ تھی لیکن کافروں نے نہ مانا، آگے چل کر دنیا میں ان کا برا حال ہوا جس سے انہیں ڈرایا گیا تھا، اس سے سمجھ لینا چاہئے کہ آخرت کی سزا بھی ایسی ہی یقینی ہے۔

پچھلوں سے عبرت

اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ مَّكَّنّٰهُمْ فِي

کیا نہیں دیکھا انہوں نے کتنی ہلاک کر دی ہم نے سے پہلے ان سے امتوں میں قوت دی ہم نے انکو میں

الْاَرْضِ مَا لَمْ نُمَكِّنْ لَّكُمْ وَ اَرْسَلْنَا السَّمَآءَ عَلَيْهِمْ مِّدْرَارًا

زمین اتنی کہ نہیں قوت دی ہم نے تم کو اور چھوڑا ہم نے آسمان کو پر ان خوب برستا ہوا

بامحاورہ ترجمہ:۔ کیا دیکھتے نہیں کہ ان سے پہلے ہم نے کتنی امتیں ہلاک کر دیں جن کو ہم نے زمین میں اتنا جما دیا تھا کہ جتنا تم کو نہیں جمایا اور ہم نے ان پر آسمانوں کو لگاتار برستا ہوا چھوڑ دیا۔

تفسیر

اس آیت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عرب کے مشرکوں کو خطاب کر کے پہلی قوموں کی بربادی کی طرف توجہ دلائی ہے کہ ہم نے تمہاری بہ نسبت پچھلی قوموں کو جن کی جسمانی اور دنیاوی طاقت بھی زیادہ تھی اور ان کو وسائل بھی زیادہ مہیا تھے مگر اس کے باوجود ہم نے نافرمانی کی وجہ سے انہیں ہلاک کر ڈالا۔

اس آیت کریمہ میں لفظ "قَرْنٌ" خاص طور پر توجہ کے قابل ہے، عربی زبان میں "قَرْنٌ" کے بہت

سے معنیٰ آئے ہیں، مثلاً: کنارا، سینگ، ایک صدی، قوم اور جماعت، اس آیت میں "قَرْنٌ" سے مراد قوم یا جماعت ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ہلاک ہونے والی قوموں میں سے بعض کا ذکر قرآن پاک میں کیا ہے جیسے قوم عاد، قوم ثمود، قوم فرعون، قوم تُبَّع، وغیرہ اور بعض قوموں کا ذکر نہیں فرمایا۔

سَمَآءٌ: کا معنیٰ آسمان بھی ہے بادل بھی ہے بارش بھی ہے، یہاں "سَمَآءٌ" سے مراد بارش ہے معنیٰ یہ ہوگا کہ ہم نے ان پر موسلا دھار لگاتار بارشیں بھیجیں، ان کی ضرورت کے مطابق آسمان سے بارش برستی تھی جس سے ان کی فصلیں خوب پیداوار دیتی تھیں اور انہیں خوشحالی نصیب ہوتی تھی۔

بدعملیوں کا نتیجہ

وَّ جَعَلْنَا الْاَنْهٰرَ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ

اور | بنائیں ہم نے | نہریں | بہتی ہوئی | سے | نیچے ان کے | پس ہلاک کیا ہم نے انکو | بوجہ گناہوں انکے کے

وَ اَنْشَاْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ ﴿٦﴾

اور | پیدا کیں ہم نے | سے | بعد ان کے | امتیں | دوسری (٦)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور ہم نے ان کے نیچے بہتی ہوئی نہریں بنائیں، پھر ان کے گناہوں کی بناء پر ہم نے انہیں ہلاک کر دیا اور ان کے بعد ہم نے اور امتوں کو پیدا کیا۔ (٦)

تفسیر

اس آیت میں اور اس پہلی آیت میں اس زمانہ سے پہلے کے لوگ مراد ہیں اس لئے ترجمہ امت کیا گیا ہے، پچھلی آیت میں کہا گیا تھا کہ تمہیں اپنے سے پہلی امتوں کے حال پر غور کرنا چاہئے جو اپنے اپنے زمانہ میں خوب

ترقی پر تھے، مال و دولت اور قوت سب کچھ حاصل تھا اور تمہارے اندر تو اتنا زور ہے بھی نہیں جتنا ہم نے انہیں عطا کیا تھا، پیداوار خوب ہوتی تھی، بارش عین وقت پر ہوتی تھی اور موسلا دھار اور لگاتار ہوتی تھی نتیجہ یہ تھا کہ کھیتیاں اور باغ ہرے بھرے تھے، اس آیت میں ہے کہ ان کے محلوں کے پاس زمین پر درختوں کے نیچے نہریں بہتی تھیں غلہ اور پھلوں کے پیداوار کی بہتات تھی، کام کی ساری چیزیں ان کو مہیا تھیں، اتنی بڑی نعمت اور ساز و سامان کے ہوتے ہوئے ہونا یہ چاہئے تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے انعاموں کی قدر کرتے اور شکر کرتے اور اس کی نافرمانی سے بچتے، اس کے پیغمبروں کا کہا مانتے اور نیک لوگوں کی سی زندگی بسر کرتے۔

وہ اپنے مال و دولت اور قوت پر گھمنڈ کر کے حیوانی خواہشوں کے پورا کرنے میں لگ گئے، اللہ تعالیٰ کے فرمان کو پیٹھ پیچھے پھینک دیا، پیغمبروں کے وعظ و نصیحت کی پرواہ نہ کی اور گناہوں میں پھنس گئے آخر نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے انہیں ان کی وجہ سے تباہ و برباد کر دیا، ان کا نام و نشان بھی آج باقی نہیں، پھر ہم نے ان کی جگہ دوسری قومیں پیدا کر دیں اور وہ وہیں بس گئیں جہاں کبھی وہ بسا کرتے تھے، پچھلے زمانہ کے لوگوں کی تاریخ اور حالات سے ہمیں اگر کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے تو یہی ہے کہ ان کے اچھے کاموں کو دیکھ کر ہم بھی اچھے کام کریں اور جو انہوں نے برے کام کیے تھے ان کاموں سے بچیں۔

ضد کی انتہا

وَ لَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِيْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ

اور اگر اتاریں ہم آپ پر لکھا ہوا میں کاغذ پھر چھولیں وہ اسکو ساتھ ہاتھوں اپنے کے

لَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝

البتہ کہیں گے وہ لوگ جو کافر ہوئے نہیں یہ مگر جادو کھلا ہوا (۷)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور اگر ہم آپ پر کاغذ میں لکھا ہوا اتاریں پھر وہ اپنے ہاتھوں سے چھو بھی لیں پھر بھی

کافر یہ کہیں گے کہ یہ کھلا ہوا جادو ہے۔ (۷)

تفسیر

مکہ والوں کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی باتیں ایک آنکھ نہ بھاتی تھیں وہ کسی طرح نہ چاہتے تھے کہ لوگ آپ کی باتیں سنیں اور آپ کے کہنے پر چلیں، آپ سے قسم قسم کی فرمائش کرتے تھے کہ کسی طرح آپ کو عاجز کر دیں اور پھر اپنے ہی جیسا پرانے رسم ورواج کا پابند کرلیں، اللہ تعالیٰ کو یہ منظور نہ تھا کہ لوگوں کو دین اسلام میں کرامتیں اور معجزے دکھادکھا کر یا ان کی فرمائش پوری کر کے داخل کیا جائے کیونکہ دین اسلام فطرت کے عین مطابق ہے اور انسان کی اپنی سمجھ اس کی خوبیاں دریافت کرنے کیلئے کافی ہے، ایک دفعہ انہوں نے فرمائش کی کہ ایک کاغذ پر لکھی ہوئی کتاب آسمان کے فرشتوں سے اٹھوا کر اتار لاؤ اور ہمارے سامنے رکھو تو ہم جانیں کہ تم اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ہو، اس آیت میں اس کا جواب دیا گیا ہے، ارشاد ہے کہ بالفرض اگر ہم ایک لکھی ہوئی کتاب فرشتوں کے ہاتھ بھیج دیں وہ اس کو اترتا ہوا دیکھ لیں اور جب وہ ان کے سامنے آئے تو اس کو ہاتھ سے چھو کر اپنا اطمینان بھی کرلیں کہ یہ سچ مچ کی کتاب ہے اور نری نظر بندی کا کھیل نہیں ہے تب بھی وہ لوگ ماننے والے نہیں کیونکہ یہ ایسی فرمائش اپنا شبہ دور کرنے کیلئے نہیں کرتے بلکہ ان کا مطلب یہ ہے کہ اگر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عاجز ہو جائیں تو وہ انکو ہرا دیں، ارشاد ہے کہ اگر آپ نے ان کا کہا ہوا کر دکھایا تو پھر بھی نہ ماننے کے سو بہانے ہیں کم سے کم یہ بہانہ تو کہیں نہیں گیا کہ یہ کھلا ہوا جادو ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دین اسلام کوئی وقتی دین نہیں تھا کہ وقت پر عادت کے خلاف معجزے دکھادکھا کر لوگوں کو اس میں داخل کیا جاتا بلکہ یہ دین انسان کو دنیا میں زندگی گزارنے کیلئے جتنے کام کرنے پڑتے ہیں ان سب میں قرآن مجید کے ذریعہ ہمیشہ کیلئے صاف صاف رہنمائی کرتا ہے اب جو اس کے خلاف چلے گا وہ پچھتائے گا۔

انوکھی فرمائشیں

وَ قَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ ؕ وَلَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ
اور کہا کیوں نہیں اتارا گیا پر اس کوئی فرشتہ اور اگر اتارتے ہم کوئی فرشتہ البتہ ختم ہو گیا ہوتا

الْاَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُوْنَ ﴿۸﴾
کام پھر نہ مہلت دیئے جاتے (۸)

با محاورہ ترجمہ:۔ اور کہتے ہیں اس پر کوئی فرشتہ کیوں نہیں اترتا اور اگر ہم فرشتہ اتاریں تو ان کا قصہ طے ہو جائے پھر ان کو مہلت بھی نہ ملے۔(۸)

تفسیر

اس آیت میں اور اس سے آگے کی آیت میں ان کی اس فرمائش کا جواب ہے کہ اللہ تعالیٰ کا پیغام فرشتہ لے کر آئے، اگر فرشتہ آیا اور پھر بھی انہوں نے بہانے بازیاں کر کے ماننے سے انکار کر دیا جیسا کہ ان کی ہٹ دھرمی سے واضح ہوتا ہے تو پھر ان کی خیر نہیں کیونکہ فرمائشی معجزے کے بعد پھر یہ نہیں ہوسکتا کہ یہ ایمان نہ لا کر بھی کچھ مدت تک صحیح سلامت رہیں، اُس وقت تو نہ ماننے پر عذاب بھیج کر ان کا کام تمام کر دیا جائے گا، مہلت ملنے کی کوئی صورت نہیں رہے گی اس لئے فرشتہ کا چھپ کر صرف پیغمبر کے پاس آنا اور ان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا پیغام لوگوں تک پہنچانا ایک نعمت ہے جس کی قدر یہ نہیں جانتے، یہ فرشتے کے کھلم کھلا نہ آنے کی بدولت ہی ہے کہ باوجود انکار کرنے کے یہ زندہ ہیں اور ان کو مہلت دی جارہی ہے ورنہ فرشتے کے ظاہر ہونے کے بعد تو قصہ ہی ختم ہے۔

اس آیت کی دوسری تفسیر یہ ہوسکتی ہے کہ اگر فرشتہ ان کے سامنے آجائے تو اسے دیکھنے کی طاقت نہ پا کر فوراً ہلاک ہو جائیں گے کیونکہ ان میں فرشتہ کو دیکھنے کی تاب نہیں، یعنی: ان کا معاملہ ہی صاف ہو جائے گا، پھر ان کو

مہلت نہیں ملے گی، یعنی: فوراً ہی ان کی موت واقع ہو جائے گی اور انہیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تصدیق کرنے اور ایمان لانے کی مہلت ہی نہیں ملے گی۔

پیغمبروں کی بے ادبی

وَ لَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّ لَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا
اور اگر بناتے ہم اسے فرشتہ البتہ بناتے ہم اسے آدمی اور البتہ ڈالتے ہم پر ان وہی جو

يَلْبِسُوْنَ ۝۹ وَ لَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ
شبہ کر رہے ہیں اب (۹) اور البتہ ضرور ہنسی کرتے رہے ہیں ساتھ پیغمبروں کے سے پہلے آپ پس گھیر لیا

ع ۱ / ۷

بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝۱۰
ان لوگوں کو جنہوں نے ہنسی کی سے اس اس چیز نے کہ تھے وہ ساتھ اسکے ہنسی کرتے (۱۰)

با محاورہ ترجمہ:۔ اور اگر کسی فرشتہ کو پیغمبر بنا کر بھیجتے تو وہ آدمی ہی کی صورت میں ہوتا اور ان کو اسی شبہ میں ڈالتے جس میں اب پڑے ہوئے ہیں۔ (۹) اور بیشک آپ سے پہلے پیغمبروں سے ہنسی کرتے رہے ہیں پھر ان سے ہنسی کرنے والوں کو اس چیز (عذاب) نے گھیر لیا کہ جس عذاب پر ہنسا کرتے تھے۔ (۱۰)

تفسیر

اس آیت میں فرشتے کا انسانی صورت میں ظاہر ہونے کا بیان ہے اور حقیقت میں یہی وہ صورت ہے کہ جس میں فرشتہ انہیں ہدایت کر سکتا ہے لیکن اس سے فائدہ کچھ نہیں کیونکہ وہ یہ کیسے سمجھیں گے کہ یہ فرشتہ ہے؟ اس کی ظاہری شکل تو آدمی ہی کی ہوگی پھر انہیں کیسے یقین ہوگا کہ یہ آدمی نہیں فرشتہ ہے؟ وہ تو اس وقت بھی یہی کہیں گے کہ فرشتہ آتا تو یقین کرتے جیسے اب کہہ رہے ہیں۔

ارشاد ہے کہ اگر ہم ان کو سمجھانے کیلئے فرشتہ ہی بھیج دیں تو بھی وہ اپنا کام اسی صورت میں کرسکتا ہے جب وہ ان کے اندر آدمی کی شکل میں آئے اور رہے اور اس وجہ سے ان کیلئے اس کے بعد بھی یہ کہنے کا موقعہ رہے گا کہ اگر یہ فرشتہ ہوتا تو ہم مان لیتے، نہ ماننے کا بہانہ جیسے اب کررہے ہیں ویسے ہی جب بھی کرتے۔

آگے ارشاد ہے کہ ان کو اصل میں پیغمبروں کا کہنا ماننا ہی منظور نہیں ہے، یہ تو ان کی ہنسی اڑاتے ہیں اور ان کی تعلیمات کو کوئی اہمیت نہیں دیتے، یہ کوئی نئی بات نہیں ہے اے پیغمبر! آپ سے پہلے بھی لوگوں نے اپنے وقت کے پیغمبروں کی ہنسی اڑائی تھی لیکن اس کا انجام کیا ہوا؟ وہی باتیں جن کی وہ ہنسی اڑاتے تھے سچی ثابت ہوئیں، ان کے نہ ماننے کا وبال ان کے اوپر پڑا اور نافرمانی کی آفتوں نے ان کو چاروں طرف سے گھیر لیا، یہ باتیں مکہ کے لوگوں کو سمجھائی جارہی ہیں افسوس! اس پر بھی وہ نہ مانے آخر کار وہ ناکام ہوئے اور اسلام کا بول بالا ہوا۔

سیاحت کا مقصد

قُلْ سِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ ثُمَّ انْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۱۱﴾

کہہ دیجئے چلو میں زمین پھر دیکھو کیسا ہوا انجام جھٹلانے والوں کا (۱۱)

بامحاورہ ترجمہ: ۔آپ کہہ دیجئے کہ زمین میں چلو، پھر دیکھو جھٹلانے والوں کا کیسا انجام ہوا۔(۱۱)

تفسیر

اس آیت میں ارشاد ہے کہ تم زمین میں چلو، یعنی: پچھلی قوموں کے تباہ شدہ نشانات کو دیکھ کر عبرت پکڑو اور اچھی طرح سمجھ لو کہ برے کاموں کا انجام بھی برا ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کے نہ ماننے والوں اور اس کے قانون اور پیغمبروں کے جھٹلانے والوں کا انجام دیکھ کر نصیحت حاصل کرو اس کے قانون پر خود چلنے اور دوسروں کو چلانے کی کوشش میں لگے رہو۔

دنیا کی قوموں پر جتنی مصیبتیں آئیں وہ ان کے برے عملوں کی وجہ سے آئیں، اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ جو آفت بھی آئی انہیں پر آئی ہے جو اپنی خواہشوں کے پیچھے دوڑ رہے تھے اور سمجھانے والے یا تو ان میں باقی ہی نہ تھے یا ان کو انہوں نے بری طرح دبا دیا تھا، ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ کوئی قوم اللہ تعالیٰ کو ایک ماننے والی ہو اور اس کے مقرر کئے ہوئے راستہ پر چل رہی ہو اور وہ کسی زمینی یا آسمانی آفت سے یک دم تباہ ہو گئی ہو۔

بنیادی قاعدہ

قُلْ لِّمَنْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ قُلْ لِّلّٰهِ ؕ كَتَبَ عَلٰى
کہدیجئے واسطے کس کے ہے جو کچھ میں آسمانوں اور زمین کہہ دے واسطے اللہ کے لکھ لی ہے اس نے اوپر

نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ؕ
نفس اپنے کے مہربانی

بامحاورہ ترجمہ:۔ پوچھئے کہ آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ کس کا ہے؟ کہہ دیجئے اللہ کا ہے اس نے اپنے ذمہ مہربانی لکھ لی ہے (یعنی اپنے اوپر لازم کر لی ہے)۔

تفسیر

اس آیت میں واقعوں سے صحیح نتیجہ نکالنے کا طریقہ بتایا گیا ہے کہ جو آدمی دنیا کے گزرے ہوئے اور موجودہ حالات پر غور کرنے بیٹھے گا اس کے دل میں سب سے پہلے یہی سوال آئے گا کہ اس کائنات کا مالک اور انتظام کرنے والا کون ہے؟ تاریخ میں وہ پائے گا کہ بعض سرپھروں نے اپنے زمانہ میں خود کو سب کا مالک ہونے کا دعویٰ کیا اور تھوڑی ہی مدت میں وہ ظلم کر کے ختم ہو گئے، ان کے جو آثار اور کھنڈرات رہ گئے ہیں دیکھنے والے انہیں دیکھ کر ان کا انجام معلوم کر سکتے ہیں۔

اس آیت میں ارشاد ہے کہ اے پیغمبر! آپ یہ سوال جو ہر سوچنے والے کے دل میں آتا ہے خود اٹھائیے کہ

دنیا کا مالک اور اس کا نظام چلانے والا کون ہے؟ اور پھر اس کا مختصر جواب دے دیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہیں، اس کے بعد اس جواب پر غور کرنے کیلئے ان کو چھوڑ دیں کہ وہ خود سوچ سمجھ کر اس کو صحیح قرار دیں۔

پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب سب کے مالک اللہ تعالیٰ ہیں تو برے کام کرنے والوں کو فوراً سزا کیوں نہیں دیتے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ قانون کا تقاضا تو یہ ہے کہ جرم کی سزا فوراً مل جائے لیکن خدا کی رحمت کا تقاضا یہ ہے کہ دنیا میں درگزر سے کام لیا جائے، قانون توڑنے کی پوری سزا قیامت کے دن دی جائے گی اگرچہ بعض اوقات کچھ سزا خاص وجہ سے دنیا میں بھی دے دی جاتی ہے۔

كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ: اللہ تعالیٰ نے اعلان فرمادیا ہے کہ اس کی رحمت بڑی وسیع ہے، حدیث شریف میں آتا ہے کہ کائنات کی پیدائش سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ نے عرش عظیم پر لکھ دیا کہ "اِنَّ رَحْمَتِيْ سَبَقَتْ عَلٰى غَضَبِيْ" یعنی: میری رحمت میرے غضب سے بڑھی ہوئی ہے، میں تو چاہتا ہوں کہ میری تمام مخلوق میری رحمت میں حصہ پائے مگر پھر بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو میرے غضب کا نشانہ بنتے ہیں اور یہ وہی لوگ ہیں جن کی سرکشی حد سے بڑھ جاتی ہے۔

قیامت ضرور واقع ہوگی

لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ؕ اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا

البتہ جمع کرے گا تم کو — طرف — دن کی — قیامت کے — نہیں — شک — میں اس — جو لوگ — نقصان میں ڈال چکے

اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ⑫

جانیں اپنی — وہ ہی — نہیں — ایمان لائیں گے (۱۲)

بامحاورہ ترجمہ:۔ البتہ تم کو قیامت کے دن تک جس میں کچھ شک نہیں اکٹھا کریں گے جو لوگ اپنی جانوں کو نقصان میں ڈال چکے ہیں وہی ایمان نہیں لائینگے۔ (۱۲)

تفسیر

اللہ تعالیٰ کے ایک ہونے کا اور آخرت کا عقیدہ دو بنیادی چیزیں ہیں، اللہ تعالیٰ کے ایک ہونے کا انکار کرنا بہت بڑا جرم ہے اسی طرح آخرت کا انکار کرنا بھی کفر ہے، یہ دونوں چیزیں ساتھ ساتھ چلتی ہیں، اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک ہونے کا عقیدہ پیش کرنے کے بعد فرمایا کہ وہ تمہیں ضرور قیامت کے دن اکٹھا فرمائیں گے جس کے آنے میں کوئی شک نہیں، اگر آخرت پر یقین آ جائے اور انسان جان لے کہ حساب کتاب کی منزل آنے والی ہے تو پھر وہ سرکشی پر نہیں اتر سکتا۔

اس آیت کی دوسری تفسیر یہ ہوسکتی ہے کہ قیامت کا دن آنا تو ضروری ہے اور جو مر جاتا ہے گویا وہ قیامت کے دن کیلئے جمع کرلیا گیا اسی طرح ہم تم سب کو قیامت کے دن تک جمع کرتے رہیں گے اور اس دن سب کو اس کے عملوں کے مطابق جزا سزا دیں گے۔

خواہشوں کے پیچھے لگے ہوئے لوگوں کا یہ سب سے بڑا خسارہ ہے کہ اسے ہمیشہ دوزخ میں رہنا پڑے گا اور یہ اس بات کی سزا ہوگی کہ آدمی اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کو نہ مانے اور اس کے مقرر کیے ہوئے راستہ پر نہ چلے اور خواہشوں کے پیچھے ہولے، اس بلا سے چھٹکارے کی سوا اس کے کوئی صورت نہیں کہ اپنی ناپاک خواہشوں کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے آگے کوئی حیثیت نہ دے اور اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق عمل کرے ایسے لوگ ہمیشہ آرام و راحت میں رہیں گے۔

اللہ تعالیٰ ہی سب کے مالک ہیں

وَ لَهٗ مَا سَكَنَ فِي الَّيْلِ وَ النَّهَارِ ؕ وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ⑬

اور لئے اسی کے ہے جو ٹھہرا میں رات کے اور دن کے اور وہی سننے والے جاننے والے (۱۳)

قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ هُوَ

کہہ دیجئے کیا سوا اللہ کے بناؤں مددگار جو بنانے والے آسمانوں کا اور زمین کا اور وہ

يُطْعِمُ وَ لَا يُطْعَمُ ؕ

کھلاتا ہے اور نہیں کھلایا جاتا

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ کہ رات اور دن میں آرام پکڑتا ہے اور وہی سب کچھ سننے والے جاننے والے ہیں۔ (۱۳) آپ کہہ دیجئے کیا اللہ کے سوا جو آسمانوں اور زمین کے بنانے والے ہیں کسی اور کو مددگار بناؤں اور وہ سب کو کھلاتا ہے اور وہ کھانے کا محتاج نہیں۔

تفسیر

اس آیت میں وہی بات زمانے کے بارے میں کہی گئی ہے کہ کوئی چیز رات میں یا دن میں کسی وقت موجود ہو وہ اللہ تعالیٰ ہی کی ہے، مطلب یہ ہوا کہ جگہ کے لحاظ سے اور زمانہ کے لحاظ سے جو چیز جہاں ہے ان سب کے مالک اللہ تعالیٰ ہیں، یعنی: وہ ہر جگہ اور ہر زمانے کے اور ہر چیز کے جو کسی جگہ یا کسی زمانے میں ہے سب کے اکیلے مالک ہیں کوئی اس کا اس کی ملکیت میں شریک نہیں اور نہ کسی کو کسی چیز کا کسی جگہ کا یا کسی زمانے میں مالک ہونے کا دعویٰ جچتا ہے، نہ جگہ کے بدل جانے سے کوئی چیز اس کے قبضہ سے نکلتی ہے اور نہ زمانے کے بدل جانے سے اس کے قبضہ اور اس کے مالک ہونے میں کوئی فرق آتا ہے۔

جب اللہ تعالیٰ ہی مالک ہیں تو وہی سب کی ضرورتوں کو پورا کرنے والے بھی ہیں کیونکہ مالک کے ذمہ اپنی چیزوں کی نگرانی اور دیکھ بھال ہوتی ہے اس کیلئے ضروری ہے کہ وہ سب کی حالت سے واقف ہوں، آیت میں اس کا صاف اعلان ہے کہ یقیناً وہ سب کی سننے والے اور سب کی حالتوں کے پورے طور پر جاننے والے ہیں، حدیث میں اس کی تشریح اس طرح کی گئی ہے کہ وہ اس چیونٹی کے پاؤں کی آواز بھی سنتے ہیں جو کسی گڑھے

میں نہایت ہی چکنے پتھر پر آہستہ آہستہ رینگ رہی ہو اور اس کے علم کا یہ حال ہے کہ اسے سمندروں کے سارے پانی کی ماپ، تمام پہاڑوں کے پتھروں کا وزن، بارش کے قطروں کا شمار اور درختوں کے پتوں کی گنتی سب کچھ پورے طور پر معلوم ہے، یہ سب بتا کر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ارشاد ہے کہ ان سے پوچھئے تو کہ کیا میں ایسے مالک، سب کی سننے والے اور سب کے جاننے والے کو چھوڑ کر کسی اور کو اپنا مددگار بنا سکتا ہوں جس نے آسمانوں کو اور زمین کو بنایا اور جو سب کو کھانا دیتا ہے اور خود کھانے پینے اور کسی اور چیز کا محتاج نہیں اور نہ کوئی اسے کچھ دیتا ہے اور نہ دے سکتا ہے۔

افسوس کا مقام ہے کہ غلط کام کرنے والے لوگ اللہ تعالیٰ کی مخلوق کو نفع ونقصان کا مالک سمجھنے لگتے ہیں اسی لئے ان کے نام کی دہائی دیتے ہیں، ان کو نذرانہ پیش کرتے ہیں اور مصیبت کے وقت ان کو پکارتے ہیں جو کہ کھلا شرک ہے، اللہ تعالیٰ کے سوا نہ کوئی قبر والا کسی کی مدد کر سکتا ہے اور نہ کوئی جن یا فرشتہ کسی کی مشکل کشائی کر سکتا ہے۔

بعض مشرک وسیلے کا غلط تصور رکھتے تھے اور ان کا یہ عقیدہ تھا کہ ہم پیغمبروں اور ولیوں کا وسیلہ پکڑتے ہیں جس طرح اس دنیا کے بادشاہ یا امیر تک پہنچنے کیلئے کسی وسیلہ کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کی بارگاہ تک پہنچنے کیلئے بھی پیغمبروں اور ولیوں کے وسیلے کی ضرورت ہے، مشرکوں نے اللہ تعالیٰ کو ہمیشہ دنیا کے بادشاہوں کی طرح سمجھا ہے جو کہ سراسر غلط ہے، اللہ تعالیٰ جو تمام مخلوق کے خالق اور مالک ہیں اس کا ہر مخلوق کے ساتھ تعلق بھی قائم ہے، ہاں ایک وسیلہ ضرور ہے اور وہ ہے اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر کی اطاعت کا وسیلہ، اطاعت بجالاؤ تو بلا روک ٹوک اللہ تعالیٰ کی بارگاہ تک پہنچ جاؤ، درمیان میں کسی مزید وسیلے کی ضرورت نہیں ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مدد صرف اسی سے مانگو کیونکہ وہی مدد کرنے والے مشکل کشا اور حاجت روا ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے سواری پر سوار تھا کہ آپ نے مجھ سے ارشاد فرمایا کہ تم اللہ تعالیٰ کے حقوق کی حفاظت کرو، یعنی: ان کا دھیان رکھو اللہ تعالیٰ تمہاری حفاظت فرمائیں گے، پھر فرمایا کہ: تو اللہ تعالیٰ کو حاضر ناظر جان تو اسے اپنے سامنے موجود پائے گا، جب تو سوال کرے تو

اللہ تعالیٰ سے سوال کر اور جب تو مدد طلب کرے تو اللہ تعالیٰ سے طلب کر، اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی قسمت میں جو کچھ لکھا ہے وہ شروع ہی میں لکھا جا چکا ہے اور اسے کوئی بدل نہیں سکتا ہے، ہر شخص کو جو فائدہ پہنچنا ہے وہ پہنچ کر رہے گا اور جو نقصان پہنچنا ہے وہ بھی پہنچ کر رہے گا پھر اگر تو اللہ تعالیٰ پر توکل رکھے اور یقین کے ساتھ معاملہ کر سکے تو وہ تجھے بہت بڑا بدلہ عطا فرمائیں گے، ہر مؤمن کا عقیدہ اور عمل اسی صورت میں صحیح رہ سکتا ہے جب کہ اس حدیث پر ہمیشہ عمل کرے تاکہ وہ دنیا و آخرت میں تمام آفتوں و مصیبتوں سے محفوظ رہ سکے، آپ کے ارشاد کا مقصد یہ ہے کہ انسان کو چاہئے کہ وہ اس حدیث شریف کو اپنی زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنالے اور ہمیشہ اس پر عمل پیرا رہے۔

اللہ تعالیٰ کی اطاعت

قُلْ اِنِّیْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَکُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ وَ لَا تَکُوْنَنَّ
کہہ دیجئے بیشک میں حکم کیا گیا ہوں کہ ہوں میں سب سے پہلا ان میں جو فرمانبردار ہوئے اور نہ ہو تو ہرگز

مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ﴿۱۴﴾ قُلْ اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ
سے شرک کرنے والوں میں (۱۴) کہہ دیجئے بیشک میں ڈرتا ہوں اگر نافرمانی کروں رب اپنے کی عذاب

یَوْمٍ عَظِیْمٍ ﴿۱۵﴾
ایک دن بڑے کے (۱۵)

بامحاورہ ترجمہ: ۔آپ کہہ دیجئے کہ مجھ کو حکم ہوا ہے کہ میں سب سے پہلے حکم ماننے والا ہوں اور آپ ہرگز شرک کرنے والے نہ ہوں۔(۱۴) آپ کہہ دیجئے اگر اپنے رب کی نافرمانی کروں تو میں ایک بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔(۱۵)

تفسیر

کیا ایسے خدا کو چھوڑ کر کہ جو سب کی ضرورتیں پوری کرتے ہیں اور خود کوئی ضرورت نہیں رکھتے، کسی اور کو مددگار سمجھا جا سکتا ہے؟ نہیں ہر گز نہیں۔

قُلْ اِنِّیْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ: اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: اے پیغمبر! آپ ان سے کہہ دیجئے کہ، مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکوں، چنانچہ اس کے حکم کے مطابق سب سے پہلے میں اس کے آگے جھکتا ہوں، اللہ تعالیٰ نے مجھ سے کہہ دیا ہے کہ آپ سب چیزوں کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکئے اور کسی کو اس کا شریک نہ مانئے تا کہ آپ کو دیکھ کر اور لوگ بھی جھکنے لگیں، اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کرتا ہوں تو ضرور مجھے ایک ہولناک دن کا سخت عذاب آ پکڑے گا، مجھے اس سے بہت ڈر لگتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہر حال میں قادر ہیں

مَنْ يُّصْرَفْ عَنْهُ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمَهٗ ؕ وَ ذٰلِكَ الْفَوْزُ
جو شخص | کہ پھیر دیا جائے | سے اس (عذاب) | اس دن | پس تحقیق | رحم کیا اللہ نے اس پر | اور | یہی | کامیابی ہے

الْمُبِيْنُ ﴿۱۶﴾ وَ اِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا
ظاہر | (۱۶) | اور | اگر | پہنچائے آپ کو | اللہ | کچھ سختی | پس نہیں | مٹانے والا | اسکو | مگر

هُوَ ؕ وَ اِنْ يَّمْسَسْكَ بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۷﴾
وہ | اور | اگر | پہنچائے آپ کو | بھلائی | پس وہ | اوپر | ہر | چیز کے | قادر ہے (۱۷)

بامحاورہ ترجمہ: جس سے اس دن عذاب ٹل گیا تو اس پر اللہ نے رحم کر دیا اور یہی بڑی کامیابی ہے۔ (۱۶) اور اگر اللہ آپ کو کچھ سختی پہنچا دے تو اس کے سوا کوئی اس کو دور کرنے والا نہیں اور اگر آپ کو بھلائی پہنچا دے تو وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ (۱۷)

تفسیر

اس آیت میں اس عذاب کی ہولناکی کا نقشہ کھینچا گیا ہے اور اس طریقے سے کھنچا گیا ہے کہ سوائے قرآن مجید کے اور کسی کتاب کی عبارت اتنے بہترین انداز سے اس کا نقشہ نہیں کھینچ سکتی اور یہ کہ خدا کے سوا مصیبت میں کوئی مددگار نہیں اس لئے جو مانگنا ہو اسی سے مانگو، جو ملے گا اسی کی رحمت سے ملے گا، ہر چیز اس کی قدرت میں ہے کسی اور میں ذرہ بھر بھی طاقت نہیں کہ کچھ کر سکے۔

ارشاد ہے کہ قیامت کے دن عذاب میں جو پھنس گیا وہ مشکل ہی سے اس سے نکلے گا، قیامت کے دن عذاب میں جسمانی دکھ، درد، بے چینی کے علاوہ بے کسی اور بے بسی کا احساس اور ہر طرف سے ناامیدی روح کو نیم مردہ کر دے گی، دکھ درد میں تسلی اور دلاسا دینے سے تکلیف میں بہت کمی ہو جاتی ہے لیکن جب کوئی مددگار ہی نہ ہو اور نہ کوئی ساتھی ہو کہ زبانی دلاسا ہی دے دے تو عذاب کی سختی کا اندازہ کر لینا چاہئے کہ کتنی ہوگی۔

اللہ تعالیٰ سب سے زبردست ہیں

وَ هُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ ؕ وَ هُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ﴿۱۸﴾ قُلْ

اور | وہی | زبردست ہے | اوپر | بندوں اپنے کے | اور | وہی | حکمت والا | خبر رکھنے والا ہے (۱۸) | کہہ دیجئے

اَيُّ شَيْءٍ اَكْبَرُ شَهَادَةً ؕ قُلِ اللّٰهُ ۙ شَهِيْدٌۢ بَيْنِيْ وَ بَيْنَكُمْ ۟

کونسی | چیز | سب سے بڑی | گواہی کیلئے | کہہ دیجئے | اللہ | گواہ ہے | بیچ میرے | اور | بیچ تمہارے

با محاورہ ترجمہ:۔ اور اسی کا اپنے بندوں پر زور ہے اور وہی بڑی حکمت والے اور سب کی خبر رکھنے والے ہیں۔ (۱۸) آپ پوچھئے سب سے بڑا کون ہے؟ کہہ دیجئے میرے اور تمہارے درمیان اللہ گواہ ہے۔

تفسیر

اس سورۃ کا مقصد ہی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اور اس کی صفتوں کو کھول کر بیان کیا جائے یعنی اللہ تعالیٰ ایک ہیں اس کا کوئی نہ شریک ہے نہ ساتھی، تمام مخلوق جانور، درندے، چرندے، جن، انسان، فرشتے، پیغمبر، ولی، پیر، پیغمبر وغیرہ سب اس کے بندے ہیں، اس کے حکم کے بغیر کوئی کچھ نہیں کر سکتا، اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، کسی سے مراد نہ مانگو، کسی سے مدد طلب نہ کرو، اس لحاظ سے یہ "سورۂ فاتحہ" اور "سورۂ اخلاص" کی تفسیر ہے، جو کچھ ان دونوں سورتوں میں مختصر طور پر بیان کیا گیا ہے اس سورۃ میں اس کو کھول کر واضح کر دیا گیا ہے، اس کے ہر ہر جملے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اللہ ایک ہے، ساری قدرت اور سارا اختیار اسی کا ہے اور سب چیزیں خواہ وہ کتنی ہی بڑی ہوں اس کی عظمت اور بڑائی کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتیں، شروع سے یہی مضمون چلا آ رہا ہے اور سورۃ کے ختم تک یہی مضمون چلے گا، اس آیت میں بھی جو کچھ کہا گیا ہے اسی کے بارے میں کہا گیا ہے، ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر زبردست اور غالب ہیں اور اسی کو سب پر برتری حاصل ہے، انسان خواہ کتنا ہی مرتبے والا ہو بہر حال اس کا بندہ ہے اور اس کے آگے بے بس ہے، حکم چلانا اسی کا کام ہے اور بندوں کا کام صرف یہ ہے کہ اس کا حکم بجالائیں، "سورۂ نساء" کے آخری رکوع میں کہا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو، فرشتوں کو اور ساری مخلوق کو اللہ تعالیٰ کی بندگی کا اقرار ہے وہ سب اسی میں اپنا فخر سمجھتے ہیں، کلمۂ شہادت میں اس کا صاف اقرار موجود ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے بندے اور اس کے پیغمبر ہیں، پھر آپ سے بڑھ کر کون ہو سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کا بندہ ہونے سے منہ موڑے؟ اگر کوئی کہے کہ تمہارے اس دعویٰ پر کون گواہ ہے؟ تو ان سے پوچھئے کہ تمہارے خیال میں بڑے سے بڑا گواہ کون ہو سکتا ہے؟ صحیح عقل تو یہ کہتی ہے کہ جو ہر چیز کی حقیقت سے واقف ہے اور ہر چیز کی خبر رکھنے والا ہے، وہی سب سے بڑا گواہ ہو سکتا ہے اور یہ صفت خدا تعالیٰ کے سوا کسی میں نہیں، اس لئے میرے اور تمہارے درمیان وہی گواہ ہیں۔

اللہ تعالیٰ ایک ہیں

وَ اُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ؕ اَئِنَّكُمْ

اور بھیجا گیا طرف میری یہ قرآن تاکہ ڈراؤں میں تم کو ساتھ اسکے اور جس کو یہ پہنچے کیا آج تم

لَتَشْهَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً اُخْرٰی ؕ قُلْ لَّاۤ اَشْهَدُ ۚ

ضرور گواہی دیتے ہو کہ ساتھ اللہ کے معبود ہیں دوسرے کہہ دیجئے نہیں گواہی دوں گا میں

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور مجھ پر یہ قرآن اترا ہے تاکہ تم کو اور جس کو یہ پہنچے اس سے خبردار کردوں کیا تم گواہی دیتے ہو کہ اللہ کیساتھ اور بھی معبود ہیں؟ آپ کہہ دیجئے میں تو گواہی نہ دوں گا۔

تفسیر

اس آیت میں ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: میرے گواہ اللہ تعالیٰ ہیں اور اللہ تعالیٰ کا ثبوت یہ قرآن مجید ہے، ارشاد ہے کہ میں بے دھڑک اللہ تعالیٰ کو اس لئے گواہ پیش کرتا ہوں کہ میرے پاس یہ قرآن کریم موجود ہے اور تم جانتے ہو کہ یہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کا کلام نہیں ہوسکتا کیونکہ سب لوگ اس جیسا کلام لانے سے عاجز ہو چکے ہیں، اب میرا کام یہ ہے کہ اس کلام کو جو اللہ تعالیٰ نے میری طرف بھیجا ہے لے کر اٹھوں اور تم کو اور ان سب کو جن کے پاس یہ کلام پہنچتا جائے خبردار کردوں کہ جو کچھ اس میں لکھا ہے وہ سچ ہے اور اس کے خلاف چلنے والا برباد ہو کر رہے گا۔

اتنی بڑی نشانی اور گواہی کے بعد کیا اب بھی تم یہی رٹ لگائے جاؤ گے کہ اللہ تعالیٰ ایک معبود نہیں بلکہ اس کے ساتھ اور معبود ہیں خیر تم جانو! نادانی کرتے رہو، میں تو ایسی بات کبھی نہیں کہہ سکتا۔

یہاں پر یہ بات قابل ذکر ہے کہ قرآن پاک نے سب سے پہلے عرب کو اپنی طرف متوجہ کیا جن کی زبان میں قرآن پاک اترا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ہم نے ہر پیغمبر کو اس کی قوم کی زبان میں بھیجا تاکہ عرب والوں

کوخبردار کرے اوران لوگوں کو بھی خبردار کرے جن تک یہ قرآن کریم پہنچے گویا پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیغمبری کے فرائض میں داخل ہے کہ قرآن پاک کا پیغام دنیا میں جہاں کہیں پہنچے ان سب کو خبردار کردیں، اس لحاظ سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیغمبری تمام قوموں کے انسانوں بلکہ جنات تک کیلئے ہے۔

دین کی تبلیغ کا کام پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی قوم سے شروع کیا، پھر آپ کے بعد یہ کام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کیا، پھر تابعین اور تبع تابعین یہ فرض انجام دیتے رہے اور جوں جوں اللہ تعالیٰ کو ایک ماننے والوں کا دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا قرآنی تعلیمات آگے پہنچانے کا کام ہوتا رہا، چنانچہ اب اس آخری امت کے ہر فرد پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ دین کے حکم دوسروں تک پہنچائے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے تمہیں امت وسطیٰ (افضل امت) بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ بن جاؤ کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کے حکم ان تک پہنچادیئے۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا کہ قرآن پاک کا پیغام جس شخص تک پہنچ جائے اس کا فرض ہوجاتا ہے کہ وہ اسے آگے دوسروں تک پہنچائے اس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تاکید فرمائی کہ جو کچھ آپ کے رب کی طرف سے اتارا گیا ہے اسے آگے پہنچادیں اور پھر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: مجھ سے لے کر دوسروں تک پہنچاؤ خواہ وہ ایک آیت ہی ہو، اور پھر حجۃ الوداع کے موقع پر تقریباً سوا لاکھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو خطاب فرماتے ہوئے آپ نے ارشاد فرمایا تھا سنو! جو لوگ یہاں موجود ہیں انہیں چاہیئے کہ یہ باتیں غیر حاضروں تک پہنچادیں کیونکہ ہوسکتا ہے کہ کوئی غیر موجود شخص تم سے زیادہ سمجھنے اور محفوظ رکھنے والا ہو، بہرحال فرمایا کہ یہ امانت تم تک پہنچادی ہے اس کو آگے پہنچانا اب تمہاری ذمہ داری ہے۔

سدھرنے اور سدھارنے کی ضرورت ہے

اللہ تعالیٰ کے پیغمبر نے فرمایا کہ تین باتیں ایسی ہیں کہ مؤمن کا دل کبھی ان سے حسد اور کینہ نہیں کرسکتا، پہلی بات اللہ تعالیٰ کی خاطر عمل میں اخلاص ہو اگر اخلاص میں خرابی آگئی تو عمل برباد ہوجائے گا، لہٰذا ایک مؤمن کی

ہمیشہ یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کا عمل اخلاص سے خالی نہ ہو، مؤمن اس بارے میں اپنے دل میں کبھی کھوٹ نہیں رکھے گا، **دوسری بات یہ** ہے کہ ہر مؤمن دوسرے مؤمن کی خیر خواہی چاہتا ہے اگر اس ضمن میں بھی اس کے دل میں کوئی میل آ گیا تو اس کے ایمان میں خرابی آ جائے گی گویا ہر مسلمان کے حق میں خیر خواہی ضروری ہے، اس کے متعلق حضرت جریر بن عبد اللہ بجلی رضی اللہ عنہ کی روایت بھی صحیحین "بخاری و مسلم" میں موجود ہے وہ فرماتے ہیں کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے اس بات کی بھی بیعت لی کہ میں ہر مسلمان کی خیر خواہی کروں بہر حال پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے **تیسری بات یہ** فرمائی کہ مسلمانوں کی جماعت کو مضبوط رکھنا، یعنی: اتفاق و اتحاد کی فضا کو برقرار رکھنا بھی مسلمان کیلئے ضروری ہے۔ کیونکہ جو جماعت سے الگ ہو گیا وہ علیحدہ فرقہ بن گیا، پھر گمراہی آئی اور مسلمانوں کی جماعت میں کمزوری آئی، اس تفریق کے نتیجے بھی برے نکلیں گے، الغرض! دین کی تبلیغ انسانی نسل کیساتھ خیر خواہی کی ایک صورت ہے جس کے متعلق سخت تاکید آئی ہے۔

اصل میں دو چیزیں بڑی ضروری ہیں، "سورۂ بلد" میں ہے کہ ہم نے انسان کی دو اونچی گھاٹیوں کی طرف رہنمائی کر دی ہے، عام تفسیر میں اسے اچھائی اور برائی کی گھاٹیاں کہا گیا ہے، یعنی: انسان کو اچھائی اور برائی کی تمیز سکھا دی گئی ہے تاہم دوسرے لفظوں میں اسے یوں کہا جا سکتا ہے کہ ہر انسان کیلئے دو باتیں بڑی ضروری ہیں ایک خود کو سدھارنا اور دوسرا تمام جہان والوں کا سدھار، انسان خود سدھر جائے تاکہ اس کا تعلق اللہ تعالیٰ کیساتھ درست ہو جائے، جب اپنی اصلاح مکمل ہو جائے تو پھر تمام عالم کی اصلاح کی ذمہ داری بھی اسی پر عائد ہوتی ہے کہ پوری انسانی نسل سے خیر خواہی کا سلوک کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا پیغام ان تک پہنچائے اور ان کی اصلاح کی کوشش کرے۔

اَئِنَّكُمْ لَتَشْهَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً اُخْرٰى: دین کی تبلیغ کی طرف توجہ دلانے کے بعد اللہ تعالیٰ کے ایک ہونے کے عقیدے کو ایک نئے انداز میں پیش کیا جا رہا ہے کہ کیا تم اس بات کی گواہی دیتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی دوسرے معبود بھی ہیں؟ فرمایا: اگر یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو خدا مانتے ہوں تو آپ

ان پر واضح کر دیں کہ میں ایسی گواہی نہیں دیتا۔

جانتے ہیں اور نہیں مانتے

قُلْ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّ اِنَّنِیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ﴿۱۹﴾ (وقف لازم بالخلاف)

کہہ دیجئے بات یہی ہے کہ وہی معبود اکیلا ہے اور بیشک میں دور ہوں اس سے کہ جو تم شریک ٹھہراتے ہو (۱۹)

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ۘ (وقف لازم)

وہ لوگ کہ دی ہم نے انکو کتاب پہنچانتے ہیں اسکو جیسے پہنچانتے ہیں بیٹوں اپنے کو

اَلَّذِیْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ﴿۲۰﴾ ع ۲ ۸

جو لوگ نقصان کر چکے جانوں اپنی کا پس وہی نہیں ایمان لاتے (۲۰)

بامحاورہ ترجمہ:۔ آپ کہہ دیجئے وہی ایک معبود ہے اور میں تمہارے شرک سے بیزار ہوں۔ (۱۹) جن کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اس کو پہچانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں جو لوگ اپنی جانوں کو نقصان میں ڈال چکے ہیں وہی ایمان نہیں لاتے۔ (۲۰)

تفسیر

ارشاد ہے کہ: ان سے صاف کہہ دیجئے کہ تم مانو یا نہ مانو واقعہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ عبادت کے لائق صرف ایک اللہ ہی ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہوسکتا اور یہ جو تم اللہ تعالیٰ کے شریک ٹھہراتے ہو اور اس کے ایک ہونے کا اقرار نہیں کرتے اس سے میں کچھ سروکار نہیں رکھتا میرا دل اس سے نفرت کرتا ہے اور میں اس سے کھلم کھلا اپنی بیزاری کا اظہار کرتا ہوں، مشرک پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کرتے تھے کہ اپنے پیغمبر ہونے پر کوئی گواہ پیش کرو، ہم نے ان لوگوں سے بھی پوچھ کر دیکھ لیا جنہیں کتاب مل چکی ہے وہ بھی تمہارے پیغمبر ہونے کی گواہی نہیں دیتے،

اس کے جواب میں آپ نے اپنی سچائی پر گواہ تو اللہ تعالیٰ کو پیش کیا جس کا ذکر گزر چکا، اس آیت میں یہودیوں اور عیسائیوں کے گواہی نہ دینے کی اصل حقیقت کا بیان ہے، ارشاد ہے کہ: ہم نے اس سے پہلے جن کے پاس آسمانی کتاب بھیجی ہے وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قدر یقینی طور پر جانتے ہیں جس قدر وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں، آپ کے آخری پیغمبر ہونے میں انہیں ذرا شک نہیں کیونکہ ان کی کتابوں میں آپ کے متعلق صاف صاف خوشخبریاں اور نشانیاں لکھی ہوئی ہیں اور وہ ان نشانیوں کو ان میں دیکھ کر انہیں خوب پہچان چکے ہیں لیکن ان کی ضد اور دنیاوی لالچ نے انہیں جان بوجھ کر انجان بنا کر رکھا ہے یہی ضد اور لالچ آگے چل کر انہیں تباہ و برباد کرے گا اس لئے وہ آپ کے سامنے آپ کے پیغمبر ہونے کی گواہی نہیں دیتے۔

سچ ہے! جو جان بوجھ کر اپنا نقصان کرنے پر تلے ہوں وہ کیسے ایمان لائیں گے؟

بہت بڑی بے انصافی

وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰیٰتِهٖ ؕ

اور کون زیادہ ظالم ہے اس سے جو باندھے اوپر اللہ کے جھوٹ یا جھٹلائے ساتھ آیتوں اسکی کے

اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَ یَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِیْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ

بیشک وہ نہیں فلاح پاتے ظالم لوگ (۲۱) اور جس دن ہم جمع کریں گے انکو سب کے سب کو پھر ہم کہیں گے

لِلَّذِیْنَ اَشْرَكُوْۤا اَیْنَ شُرَكَآؤُكُمُ الَّذِیْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴿۲۲﴾

واسطے انکے۔ جو مشرک ہوئے کہاں ہیں شریک تمہارے جن کا تھے تم دعویٰ کرتے (۲۲)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور اس سے زیادہ ظالم کون ہے جو اللہ پر بہتان باندھے یا اس کی آیتوں کو جھٹلائے بلاشبہ ظالموں کو بھلائی نصیب نہیں ہوتی۔ (۲۱) اور جس دن ہم ان سب کو جمع کریں گے، پھر ان لوگوں کو جنہوں نے شرک کیا تھا کہیں گے کہاں ہیں تمہارے شریک جن کے تم دعوے دار تھے۔ (۲۲)

تفسیر

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ محمد ﷺ اگر (نعوذ باللہ) نبوت کے دعویٰ میں جھوٹے ہیں تو اللہ تعالیٰ پر بہتان باندھتے ہیں دوسری طرف جو لوگ قرآن کریم کو نہیں مانتے اور شرک کرتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی اور صاف نشانی کو جھوٹا کہتے ہیں اس لئے وہ بڑے ظالم ہیں اور ظالموں کیلئے قاعدہ مقرر ہے کہ وہ آخر میں کامیاب نہیں ہونگے اب اس کا فیصلہ کہ نعوذ باللہ محمد ﷺ ظالم ہیں یا یہ مشرک لوگ، اس سے معلوم ہو جائے گا کہ آخر میں کون کامیاب ہوتا ہے؟ چنانچہ مخالفوں نے دیکھ لیا کہ ناکام کون رہا اور صاف ظاہر ہو گیا کہ محمد ﷺ جو کامیاب ہوئے ہیں وہ ظالم نہیں بلکہ سچے ہیں اور ان کے مخالف جو ناکام ہوئے وہ ہی ظالم تھے اور غلط کہتے تھے، یہ تو دنیا کا فیصلہ تھا، اصل فیصلہ کا دن ابھی آنے والا ہے اس دن ان سب ظالموں اور غلط کام کرنے والوں کو جمع کر کے اللہ تعالیٰ سوال فرمائیں گے کہ آج وہ تمہارے گھڑے ہوئے معبود کہاں ہیں؟ ارشاد ہے کہ دو شخص بڑے ظالم ہیں ایک تو وہ جو اللہ تعالیٰ کے سر ایسی بات لگائے جو اس نے نہیں کی، یعنی: پیغمبری کا غلط دعویٰ کرے اور ایک وہ جو اللہ تعالیٰ کی صاف نشانیوں کو جھوٹا کہے اور اس کا شریک ٹھہرائے، مشرکوں کو قیامت کے دن یہ کہہ کر اور شرمندہ کیا جائیگا کہ جنہیں تم اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہراتے تھے آج ان کو پکارو کہ تمہاری مدد کریں اور دیکھو کہ وہ تمہاری کتنی مدد کر سکتے ہیں؟ ورنہ اپنے ظالم ہونے کی سزا بھگتو۔

مشرکوں کی جھوٹی قسم

ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا وَ اللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا

پھر نہ ہوگی آزمائش ان کی مگر یہ کہ کہیں گے قسم ہے اللہ رب ہمارے کی نہ تھے ہم

مُشْرِكِيْنَ ﴿۲۳﴾ اُنْظُرْ كَيْفَ كَذَبُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَ ضَلَّ

شرک کرنے والے (۲۳) دیکھئے کیسا جھوٹ بولا انہوں نے اوپر جانوں اپنی کے اور نیست و نابود ہوا

عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۲۴﴾

سے ان جو تھے وہ تراشتے (۲۴)

بامحاورہ ترجمہ:۔ تو ان سے کچھ عذر نہ بن پڑے گا (اور) سوائے اسکے (کچھ چارہ نہ ہوگا) کہ کہیں گے ہمیں ہمارے رب، اللہ کی قسم ہم شرک کرنے والے نہ تھے۔(۲۳) دیکھوتو! اپنے رب کے اوپر کیسا جھوٹ بولا اور وہ باتیں جو وہ بنایا کرتے تھے ان سے کھو گئیں۔(۲۴)

تفسیر

اس آیت میں ہے کہ اس سوال سے ان کے حواس گم ہو جائیں گے اور کچھ جواب نہ بن پڑے گا۔ دنیا میں بڑے فریب، چالبازیاں، حیلے، بہانے نکال لیتے تھے اس دن نہ کوئی حیلہ یاد آئے گا نہ کوئی فریب، کہیں گے تو کیا کہیں گے کہ ہم اپنے رب کی قسم کھاتے ہیں کہ ہم تو کسی کو اللہ تعالیٰ کا شریک نہیں ٹھہراتے تھے ہم تو صرف اللہ تعالیٰ ہی کو اپنا معبود مانتے تھے اور کسی سے ہمارا تعلق نہ تھا ذرا دیکھو تو سہی! کیسے سٹ پٹا گئے کہ جھٹ پٹ جھوٹی قسم کھا گئے، اس کے سوا اور کوئی چال انہیں سوجھی ہی نہیں، وہاں دھوکے بازیاں، فریب اور چالبازیاں سب رکھی رہ جائیں گئیں اور جھوٹی قسم کے مجرم ہوئے سو الگ، ان کے مجرم ہونے میں تو کوئی شک ہی نہیں البتہ ان کی اس حرکت سے ان کے جرموں میں مزید اضافہ ہو گیا۔

بعض لوگوں کا طرزِ عمل

وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ ۚ وَ جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً

اور میں ان وہ ہیں جو کان لگاتے ہیں طرف آپکی اور ہم نے ڈالے اوپر دلوں انکے کے پردے

اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ؕ وَ اِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ

تاکہ نہ سمجھیں وہ اس کو اور میں کانوں انکے کے بوجھ اور اگر دیکھیں وہ ہر ایک نشانی

لَا يُؤْمِنُوْا بِهَا ؕ

نہ ایمان لائیں وہ پر اس

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور ان میں سے بعض آپ کی طرف کان لگائے رہتے ہیں اور ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال رکھے ہیں تاکہ اس کو نہ سمجھیں اور ان کے کانوں پر بوجھ رکھ دیا اور اگر تمام نشانیاں دیکھ لیں تو بھی ان پر ایمان نہ لائیں۔

تفسیر

قرآن مجید میں گزرے ہوئے لوگوں کے اور جو لوگ اس کے اترنے کے وقت موجود تھے ان کے حالات محفوظ کردیئے گئے ہیں لیکن ان کے جمع کرنے سے تفریح یا دل لگی مقصود نہیں بلکہ غرض یہ ہے کہ ہم ان سے سبق سیکھیں اور عبرت حاصل کریں اور اپنے عملوں کو درست کریں تاکہ ان آفتوں سے بچیں جو پہلے لوگوں پر ان کے برے کاموں کی وجہ سے آئیں۔

قرآن مجید میں گزرے ہوئے واقعوں کا صرف وہی حصہ لیا گیا ہے جن سے ہمارے لئے کوئی نصیحت نکلتی ہے، اس آیت میں مکہ کے بعض کافروں کا رد یہ بیان کیا گیا ہے، یہ وہاں کے بڑے بڑے لوگ تھے دوسروں پر اثر رکھتے تھے اور ان کی طبیعت میں اپنے پرانے غلط طریقہ کو قائم رکھنے کا جذبہ جم چکا تھا کیونکہ اگر وہ طریقہ بدل جاتا تو پھر ان کی وہ شان وشوکت باقی نہ رہنے کا خوف تھا جس کی بدولت وہ دوسروں کو دبا کر اپنی چلاتے تھے، اسلام اور اس کا نظام ان کو اپنے مفاد کے بالکل خلاف نظر آتا تھا اس لئے ان کو ایک آنکھ نہ بھاتا تھا وہ پیغمبر ﷺ کے پاس آتے اور قرآن کریم سنتے لیکن اپنے قائم کیے ہوئے طریقے کی محبت اور اپنے مرتبے کو باقی رکھنے کا پکا ارادہ ان کے دل میں اس کا اثر نہ ہونے دیتا تھا، اپنی عزت اور مرتبہ بنائے رکھنے کی تجویزوں کے سوا وہ اور باتیں نہ سن سکتے تھے چاہے ہزار نشانیاں دیکھیں ایمان لانے کو تیار نہ تھے، اس آیت میں ارشاد ہے کہ اے پیغمبر! کچھ

لوگ آپ کی باتیں کان لگا کر سنتے ہیں لیکن ان کے برے اعمال کی وجہ سے ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال رکھے ہیں، ان کے کانوں میں خوشامدیوں کے الفاظ ٹھسے ہوئے ہیں اور ان کی وجہ سے ہم نے انہیں بوجھل کر دیا ہے، ان کو کچھ بھی نشانیاں دکھاؤ ان کو ٹھیک اور درست باتوں کا یقین نہ آئے گا۔

اسلام کے مخالف اپنا نقصان کر رہے ہیں

حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْكَ يُجَادِلُوْنَكَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ

یہاں تک کہ جب آتے ہیں پاس آپ کے جھگڑا کرنے آپ سے کہتے ہیں وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا نہیں

هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۲۵﴾ وَ هُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَ يَنْـَٔوْنَ

یہ مگر کہانیاں پہلوں کی (۲۵) اور وہ روکتے ہیں سے اس اور دور بھاگتے ہیں

عَنْهُ ۚ وَ اِنْ يُّهْلِكُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَ مَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۲۶﴾

سے اس اور نہیں ہلاک کرتے مگر جانوں اپنی کو اور نہیں سمجھتے (انجام کو) (۲۶)

بامحاورہ ترجمہ:۔ یہاں تک کہ آپ کے پاس آپ سے جھگڑنے کو آتے ہیں تو وہ کافر کہتے ہیں یہ تو صرف پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔ (۲۵) اور یہ لوگ اس سے روکتے ہیں اور اس سے بھاگتے ہیں اور (اس طرز عمل سے) خود کو ہی ہلاک کر رہے ہیں اور انجام نہیں سمجھتے۔ (۲۶)

تفسیر

اس آیت کے پہلے حصہ میں مکہ کے مشرکوں کا حال بیان کیا جا رہا تھا اس کو یہاں مکمل کیا گیا ہے کہ ان کی چالبازیاں اس حد تک بڑھ گئی ہیں کہ وہ ظاہر میں تو مسلمانوں سے ملتے جلتے ہیں گویا یہ جتانا چاہتے ہیں کہ ہمیں مسلمانوں سے کوئی دشمنی نہیں ہے ہم ان سے ملتے ہیں اور ان کی باتیں غور سے سنتے ہیں لیکن وہ باتیں ماننے کے

قابل ہی نہیں ہیں صرف پرانے لوگوں کے قصے کہانیاں ہیں، ان کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آنے میں بھی ایک چال ہے تاکہ لوگ سمجھیں کہ یہ لوگ سمجھنے کی کوشش بہت کر رہے ہیں اگر ان کی باتیں ماننے کے قابل ہوتیں تو یہ ضرور مانتے حالانکہ ان کا مقصد ہرگز سمجھنا نہیں ہے بلکہ آپ سے جھگڑنا ہے، جب آپ سے مل کر باہر آتے ہیں تو لوگوں کو بتاتے ہیں کہ یہ باتیں مت سنو، یہ تو (معاذ اللہ) فضول باتیں ہیں اور اپنا طریقہ اسلام سے بالکل الگ اور اس کے خلاف رکھتے ہیں، نادان اتنا نہیں سمجھتے کہ اس سے اسلام کو تو وہ ذرا بھی نقصان نہیں پہنچا سکتے، ہاں! اپنی تباہی کا سامان ضرور کر رہے ہیں، ارشاد ہے کہ: ان کی گستاخی اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ آپ کے پاس جھگڑنے کیلئے آتے ہیں اور بڑے سمجھداروں کا سامنہ بنا کر یہ کافر لوگ اپنی رائے ظاہر کرتے ہیں کہ ہاں ہم نے سنا، کچھ بھی نہیں ہے ورنہ ہم بھلا اس کو کہیں چھوڑ سکتے تھے؟ یہ کہہ کر وہ ان لوگوں کو ان کی باتیں سننے سے روکتے ہیں اور خود بھی ان سے دور بھاگتے ہیں گویا اپنی باتوں اور اپنے عمل دونوں کے ذریعہ قرآن کریم کی تعلیم کو نیست و نابود کرنا چاہتے ہیں اور اسلام کو مٹانے کی کوشش میں مصروف ہیں لیکن اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ ہوگا کہ یہ نادان لوگ خود نیست و نابود ہو جائیں گے اور اسلام دنیا میں پھلے پھولے گا چنانچہ یہی ہوا اور ان کی نادانی اچھی طرح دنیا پر ظاہر ہوگئی۔

"اَسَاطِیْرُ" یونانی زبان کا لفظ ہے جس کا مفرد "اُسْطُوْرَۃٌ" ہے اور اسے انگریزی زبان میں کہتے ہیں، ولید بن مغیرہ جیسا متعصب (کٹر) مشرک کہتا کہ محمد تمہیں "عاد" اور "ثمود" کے قصے سناتا ہے آؤ میں تمہیں بہمن اور اسفندیار کے قصے سناتا ہوں اور اس طرح دوسرے لوگوں کی گمراہی کا سبب بھی بنتا، وہ لوگ کہتے کہ محمد ہمیں کہانیاں سناتا ہے حالانکہ قرآن پاک نے پرانی قوموں کے جو واقعے بیان کیے ہیں وہ تاریخی اعتبار سے نہایت عبرتناک ہیں جہاں کہیں ایسا واقعہ بیان کیا گیا ہے وہاں فرمایا گیا ہے اے عقلمندو! اس سے عبرت حاصل کرو اور نصیحت پکڑو، قرآن پاک نے صرف افسانے کے طور پر کوئی واقعہ بیان نہیں کیا بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا سچا کلام ہے ان واقعات کے بیان سے لوگوں کی اصلاح مقصود ہے۔

مشرکوں کو بھی قرآن پاک سننے سے روکتے تھے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں جانے سے بھی منع کرتے تھے اور اس کیلئے غلط پراپگینڈہ کرتے تھے چنانچہ "مسلم شریف" میں ضمار نامی کاہن اور حکیم کا ذکر آتا ہے کہ جب وہ مکہ آیا تو مشرکین نے اس سے کہا کہ یہاں ایک پاگل آدمی ہے (العیاذ باللہ) اس کے پاس نہ جانا اور نہ اس کی بات سننا، وہ خود بیان کرتا ہے کہ میرے دل میں خیال آیا میں طبیب (ڈاکٹر) ہوں اگر اس آدمی سے ملاقات ہوجائے تو اس کا علاج ہی کردوں گا، چنانچہ وہ بڑی مشکل سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا میں کئی قسم کی بیماریوں، آسیب اور جنات وجنون، یعنی: پاگل پن وغیرہ کا علاج کرتا ہوں اللہ تعالیٰ میرے ہاتھ پر بہت سے لوگوں کو شفا دیتے ہیں اگر آپ چاہیں تو میں آپ کا بھی علاج کروں، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اپنے پاس بٹھایا اور "الحمد للہ" سے شروع کرکے ایک خطبہ ارشاد فرمایا، آپ نے خطبے کی ابتداء میں اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کی اور پھر جب آپ نے "أَمَّا بعد!" کہہ کر اس کی توجہ آگے آنے والی بات کی طرف دلائی تو وہ خطبہ کے ابتدائی حصہ سے ہی متأثر ہوچکا تھا اس نے وہی خطبہ تین دفعہ سنا اور پھر کہنے لگا میں نے بڑے بڑے کاہنوں، شاعروں اور خطیبوں کا کلام سنا ہے مگر مجھے یہ بات کہیں نہیں ملی جو آپ کے خطبہ میں پائی گئی، عرض کیا آپ ہاتھ بڑھائیں میں ایمان لاتا ہوں۔

دوزخ کا ہولناک منظر

وَ لَوْ تَرٰۤى اِذْ وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ فَقَالُوْا یٰلَیْتَنَا نُرَدُّ وَ لَا

اور اگر آپ دیکھیں جب کھڑے کئے جائیں گے وہ اوپر دوزخ کے پس کہیں گے اے کاش! ہم واپس کئے جائیں اور نہ

نُكَذِّبَ بِاٰیٰتِ رَبِّنَا وَ نَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ۝۲۷

جھٹلائیں ساتھ آیتوں رب اپنے کی اور ہوجائیں سے ایمان والوں (۲۷)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور اگر آپ دیکھیں جس وقت وہ دوزخ پر کھڑے کئے جائیں گے پس کہیں گے اے

کاش! ہم پھر بھیج دیے جائیں اور اپنے رب کی آیتوں کو نہ جھٹلائیں اور ایمان والوں میں سے ہو جائیں۔ (۲۷)

تفسیر

پچھلی آیت میں جن لوگوں کا حال بیان ہوا ان کے بارے میں اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ ایک دن ان کو دوزخ کے اوپر کھڑا کیا جائے گا اس کی تیزی اور شدت دیکھ کر ان کے ہوش اڑ جائیں گے، یہ جو ابھی کہتے پھرتے ہیں کہ نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ کوئی چیز نہیں ہمارا کام انہی دنیا کی چیزوں سے جو بہت طاقتور ہیں، بن جاتا ہے ہمیں انہیں کا احسان ماننا چاہیے، یہ سب کچھ بھول جائیں گے اور یقین ہو جائے گا کہ یہ دوزخ ان کرتوتوں کی سزا ہے جنہیں ہم دنیا میں ٹھیک سمجھے ہوئے تھے اور بے اختیار ان کے منہ سے نکلے گا کہ کسی طرح ہم پھر دنیا میں واپس بھیج دیے جائیں تو پھر تو ہم کبھی اپنے رب کی آیتوں کو نہ جھٹلائیں گے اور ایمان والے بن کر رہیں گے۔

ارشاد ہے کہ اے محمد! اگر آپ وہ ہولناک منظر دیکھیں کہ قیامت کے دن دوزخ پر ان کو کھڑا کیا جائے گا اور خوف کے مارے ان کا دم نکلنے کے قریب ہو گا تو پھر آپ کو تعجب ہو گا کہ یہ وہی لوگ ہیں کہ جو دنیا میں فرعون، ہامان، قارون اور شداد بنے پھرتے تھے، آج جب قرآن شریف کی ساری باتیں سامنے آ گئیں تو سٹ پٹا گئے اور بولے کاش! ہم دنیا میں پھر بھیج دیے جاتے تو پورے فرمانبردار بن کر دکھاتے۔

قرآن مجید نے نافرمانوں کو دوزخ سے ڈرایا ہے اور بتایا ہے کہ وہ آگ کا ایک ڈھیر ہے جس کے اندر وہ لوگ جو دنیا میں قرآن مجید اور پیغمبر ﷺ کی بات کو کچھ اہمیت نہیں دیتے تھے بلکہ اس میں مین میخ نکالتے تھے اور اپنی من مانی کرتے تھے جھونک دیے جائیں گے۔

اسلام کے تین بنیادی اصول ہیں:

(۱)....توحید (۲)....رسالت (۳)....عقیدۂ آخرت

سارے عقیدے انہی تین عقیدوں کے تحت آئے ہیں اور یہ وہ عقیدے ہیں جو انسان کو اس کی اپنی

حقیقت اور زندگی کا مقصد سمجھا کر کے اس کی زندگی میں انقلاب پیدا کرتے ہیں اور اس کو ایک سیدھی اور صاف راہ پر کھڑا کر دیتے ہیں، ان میں بھی عملی طور پر آخرت کا عقیدہ اور اس میں جزاء اور سزا کے حساب کا عقیدہ ایک ایسا انقلابی عقیدہ ہے جو انسان کے ہر عمل کا رخ ایک خاص طرف پھیر دیتا ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم کے تمام مضامین انہی تین میں داخل ہیں۔

دوبارہ پھر وہی کریں گے

بَلْ بَدَا لَهُمْ مَّا كَانُوْا يُخْفُوْنَ مِنْ قَبْلُ ۭ وَ لَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا

بلکہ ظاہر ہوگیا لئے ان کے جو تھے وہ چھپاتے سے پہلے اور اگر لوٹائے جائیں وہ البتہ پھر کرنے لگیں

لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۲۸﴾

وہی روکے گئے سے جس اور تحقیق وہ بیشک جھوٹے ہیں (۲۸)

بامحاورہ ترجمہ:۔ بلکہ جو کوئی بات پہلے چھپاتے تھے وہ ظاہر ہوگیا اور اگر پھر بھیجے جائیں تو پھر وہی کام کرینگے جس سے منع کئے گئے تھے اور وہ بیشک جھوٹے ہیں۔ (۲۸)

تفسیر

اس آیت میں ان کی اس تمنا اور قول وقرار کی حقیقت کھولی گئی ہے کہ اس کی کوئی حیثیت نہیں، بات یہ ہے کہ دنیا میں یہ جن باتوں کے ماننے کیلئے تیار نہ تھے اور جن کو دبانے اور چھپانے کی تجویزیں سوچتے رہتے تھے آج وہ کھلم کھلا ان کے سامنے آ گئی ہیں اور جس دکھ درد اور عذاب سے ان کو ڈرایا جاتا تھا کہ دنیا میں تمہارے لئے موقع ہے کہ اس سے بچنے کا سامان کر و وہ آج سچ مچ ان کے سامنے آ ہی گیا ہے، غیب کی باتوں کو انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے اس لئے وہ صرف اس سے بچنے کیلئے ایسی باتیں کر رہے ہیں لیکن اگر ان کو دنیا میں پھر بھیج دیا گیا اور یہ عذاب ان کی نظر سے غائب ہوگیا تو بے فکر ہو کر پھر وہی کرنے لگیں گے جو پہلے کرتے تھے اس لئے کہ

یہ تو اس کے قائل ہیں کہ جو آنکھوں کے سامنے ہو اسی کو مانو اور غائب چیزوں کی پرواہ مت کرو اور یہی خیال ان کے دلوں میں بسا ہوا ہے اور اسی کے مطابق عمل کرنے کی انہیں عادت پڑ چکی ہے اس لئے دنیا میں واپس آتے ہی اس کی چہل پہل میں پھر پھنس جائیں گے اور وہی کرنے لگیں گے جو پہلے کرتے تھے۔

سچ کا اقرار

وَ قَالُوْٓا اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَ مَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ﴿۲۹﴾

اور کہتے ہیں نہیں ہے مگر زندگی ہماری دنیا کی اور نہیں ہم اٹھائے جانے والے (۲۹)

وَ لَوْ تَرٰٓى اِذْ وُقِفُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ ؕ قَالَ اَلَيْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ ؕ

اور اگر آپ دیکھیں جب کھڑے کئے جائینگے سامنے رب اپنے کے فرمائیگا کیا نہیں یہ سچ

ع ۱۰ قَالُوْا بَلٰى وَ رَبِّنَا ؕ قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۳۰﴾ ۳ ۹

کہیں گے کیوں نہیں قسم رب ہمارے کی فرمائیگا پس چکھو عذاب بوجہ اسکے کہ تھے تم کفر کرتے (۳۰)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور کہتے ہیں ہمارے لئے صرف دنیا ہی کی زندگی ہے اور ہم کو پھر زندہ نہیں ہونا۔ (۲۹)

اور کاش کہ آپ دیکھیں جب وہ اپنے رب کے سامنے کھڑے کئے جائیں گے، فرمائے گا کیا یہ سچ نہیں؟ کہیں گے کیوں نہیں، قسم ہے ہمارے رب کی (اللہ) فرمائیگا تو اپنے کفر کے بدلے میں عذاب چکھو۔ (۳۰)

تفسیر

ارشاد ہے کہ دنیا میں ان کی نگاہ دنیا کی بے حقیقت دنیاوی چیزوں سے اونچی نہیں اٹھتی اس لئے وہ انہی کی ادھیڑ بن میں پھنسے رہتے ہیں، وہ اس پر یقین نہیں رکھتے کہ مر جانے کے بعد وہ دوبارہ زندہ کیے جائیں گے اور ایک نئی زندگی شروع ہوگی جس کے بعد موت کبھی نہیں آئے گی، یہ ان کے خیال میں بھی کبھی نہیں گزر سکتا کہ دنیا کے

آرام کو اس لئے چھوڑ دیں کہ مرنے کے بعد اس سے کہیں زیادہ آرام اور فائدے ملیں گے۔

ارشاد ہے کہ ان کے نزدیک جو کچھ ہے بس اسی دنیا کی زندگی ہے، یہ اس بات کے قائل بلکہ دل سے ماننے والے ہیں کہ ہم مرنے کے بعد پھر زندہ نہیں ہو سکتے، ان کا حال اس وقت دیکھنے کے قابل ہوگا جب یہ اپنے رب کے سامنے لا کھڑے کیے جائیں گے اور وہ خود ان سے پوچھیں گے کہ بولو جو کچھ تم سے کہا گیا تھا وہ سچ ہے یا نہیں وہ کہیں گے کہ ہمیں اپنے رب کی قسم! سب بالکل سچ ہے، اس کے بعد اللہ تعالیٰ حکم سنائیں گے کہ تم دنیا میں مر کر دوبارہ جی اٹھنے کو ایک فضول گھڑی ہوئی بات سمجھتے تھے حالانکہ تم سے ہمارے پیغمبر نے صاف کہہ دیا تھا کہ دیکھو! اگر مرنے کے بعد پھر جی اٹھنے کو آج نہ مانا تو کل تمہاری بری گت بنے گی، اب جبکہ آنکھوں سے دیکھ لیا تو کہتے ہو کہ ہاں سچ ہے، دنیا میں جو نافرمانی کی تھی اب اس کی سزا بھگتو۔

کوتاہیوں پر پچھتاوا

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَتْهُمُ

تحقیق تباہ ہوئے وہ لوگ جنہوں نے جھوٹ جانا ملنا اللہ کا یہاں تک کہ جب آئے گی ان پر

السَّاعَةُ بَغْتَةً قَالُوْا يٰحَسْرَتَنَا عَلٰى مَا فَرَّطْنَا فِيْهَا ۙ وَ هُمْ

قیامت اچانک کہیں گے وائے حسرت ہماری اوپر اسکے کہ کمی کی ہم نے میں اس اس حال میں کہ وہ

يَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ عَلٰى ظُهُوْرِهِمْ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَزِرُوْنَ ﴿۳۱﴾

اٹھائے ہوں گے بوجھ اپنے اوپر پیٹھوں اپنی کے آگاہ رہو! برا ہے وہ جو وہ اٹھائیں گے (۳۱)

بامحاورہ ترجمہ: ۔ وہ لوگ تباہ ہوئے جنہوں نے اللہ کا ملنا جھوٹ جانا یہاں تک کہ جب ان پر قیامت اچانک آپہنچے گی تو کہیں گے اے افسوس! ہم نے اس میں کیسی کوتاہی کی اور وہ اپنی پیٹھوں پر اپنے بوجھ اٹھائیں گے خوب اچھی طرح سن لو کہ! برا بوجھ ہے جسے وہ اٹھائیں گے۔ (۳۱)

تفسیر

قَدْ خَسِرَ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ: "لِقَآءِ اللّٰهِ" سے مراد یہ ہے کہ قیامت کے دن دوبارہ اٹھ کر اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونا اور یہ چیز ایمان میں داخل ہے، حدیث شریف میں آتا ہے کہ دوبارہ اٹھنے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش ہوکر جواب دینے پر بھی ایمان لانا ضروری ہے، جو اس بارے میں شک کرتا ہے اس نے اپنے آپ کو نقصان میں ڈال لیا، ایمان سے اور اللہ کو ایک جاننے اور ماننے سے انکار کرنے والا اور آخرت کا انکار کرنے والا اپنی فطرت کو بھی بگاڑتا ہے اور صحیح عقل سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے، ان چیزوں پر ایمان لانا ہی عقل وفطرت کے عین مطابق ہے، دنیا میں تو ایسا انسان عقل وقدرتی صلاحیتوں کے نقصان میں مبتلا ہوتا ہے اور آخرت میں ہمیشہ ہمیشہ کی سزا کا مستحق ہوجائے گا، ایسے ہی لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے آخرت میں گھاٹا پانے والا فرمایا ہے، "سورۂ عصر" میں بھی فرمایا ہے کہ تمام انسان خسارے میں ہیں سوائے ان کے جو ایمان لائے اور نیک کام انجام دیئے، اسی طرح یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ تحقیق نقصان میں پڑے وہ لوگ جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو جھٹلایا ہے، یہ چیز صحیح عقل، پیغمبروں کی تعلیم اور وحی کے بھی خلاف ہے اور زندہ ضمیر بھی اسی بات کی گواہی دیتا ہے کہ آخرت کو جھٹلانا انسان کیلئے بہت بڑے نقصان کا باعث ہوگی۔

حَتّٰۤى اِذَا جَآءَتْهُمُ السَّاعَةُ: دنیا میں تو آخرت کا انکار کرتے رہے یہاں تک کہ جب وہ گھڑی اچانک آگئی یعنی قیامت واقع ہوگئی، "اَلسَّاعَةُ" سے مراد کائنات کی موت، یعنی: قیامت بھی ہے اور ہر انسان کی اپنی موت بھی، یہ دونوں موتیں اچانک آجاتی ہیں اور کسی شخص کو معلوم نہیں کہ اس کی موت کہاں اور کب واقع ہوگی، "سورۂ لقمان" میں موجود ہے کہ کوئی شخص نہیں جانتا کہ اس کی موت کہاں اور کس وقت آئے گی۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا اور اس کیلئے دو قسم کی مہلتیں مقرر کیں ایک تو وہ ہے جو ہر انسان کیلئے ایک مقررہ مدت ہے جس کے بعد اسے موت آنی ہے اس کا وقت کسی انسان کے علم میں نہیں البتہ اللہ تعالیٰ فرشتوں کو

بتلا دیتا ہے، جیسا کہ حدیث میں آتا ہے کہ حمل قرار پانے کے چوتھے مہینے میں فرشتے اللہ تعالیٰ سے پوچھتے ہیں کہ اے اللہ! پیدا ہونے والے اس انسان کی عمر کتنی ہوگی، اس کی روزی کس قدر ہے، یہ نیک بخت ہوگا یا بد بخت، اللہ تعالیٰ یہ سب چیزیں فرشتوں کے رجسٹروں میں نوٹ کرا دیتے ہیں اور پھر اس کے مطابق اس انسان کی زندگی گزرتی ہے اور آخر کار مقررہ وقت پر وہ مرجاتا ہے تاہم موت کی جگہ اور وقت کے متعلق خود انسان کو معلوم نہیں ہوتا اور پھر وہ اچانک آجاتی ہے اسی لئے ہر انسان کو تعلیم دی گئی ہے کہ وہ ہر وقت محتاط رہے، ایمان اور نیکی کو اختیار کیے رکھے کیونکہ کسی انسان کے علم میں نہیں کہ اس کی موت کب آئے گی۔

اور دوسری مدت یہ پوری کائنات کی موت، یعنی: قیامت ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کے واقع ہونے کا علم فرشتوں کو بھی نہیں دیا، صرف نشانیاں بتلائی ہیں مگر یہ بھی اچانک آجائے گی بہرحال اس آیت کریمہ میں ''اَلسَّاعَةُ'' سے مراد دونوں موتیں ہیں، یعنی: انسان کی اپنی موت بھی اور پوری کائنات کی موت بھی، پھر جب یہ آجاتی ہے تو ایک لمحہ بھی آگے پیچھے نہیں ہوتی اور انسان کی دنیاوی اور عملی زندگی ختم ہوجاتی ہے، جو کچھ انسان اس دنیا میں کرتا ہے اس کا اچھا یا برا بدلہ قیامت کے دن ملے گا جس کی ابتداء قبر سے ہی ہوجاتی ہے، یہ قبر کی زندگی ایسی ہی ہے جیسے کسی ملزم کو آخری فیصلہ ہونے تک حوالات میں رکھا جاتا ہے اور پھر فیصلہ ہونے پر اسے اصل سزا دی جاتی ہے یا بری کر دیا جاتا ہے، اسی طرح انسان کے لئے قبر کا آرام یا تکلیف وقتی ہوتا ہے پھر جب قیامت کے دن ان کے تمام عملوں کا فیصلہ سنا دیا جائے گا تو پھر یا تو مکمل آرام میں چلا جائے گا یا مقررہ سزا کا حقدار ہوگا، پیغمبر ﷺ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ جو شخص مرگیا اس کی قیامت قائم ہوگئی، ہر انسان کی اپنی قیامت تو اس کی موت کی گھڑی ہے اور تمام انسانوں کی قیامت قیامت کا دن ہوگی، جب وہ قیامت کی گھڑی آپہنچے گی تو انکار کرنے والے کہیں گے کہ ہائے افسوس! جو ہم نے اس بارے میں کوتاہی کی مگر اس وقت کی شرمندگی اور افسوس سے کچھ کام نہ بنے گا، وہاں تو ایمان ہی کام آنے والی چیز ہے قیامت کو جھٹلانے والوں کو اس وقت شرمندگی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔

وَ هُمْ يَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ عَلٰى ظُهُوْرِهِمْ: اور پھر جھٹلانے والوں کی حالت یہ ہوگی کہ وہ اپنے گناہوں کا بوجھ اپنی پیٹھوں پر اٹھائیں گے، بوجھ اٹھانے کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ انسان ہر برے عمل کو اپنی پیٹھ پر اٹھائے گا، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: اے لوگو! یاد رکھو! خیانت نہ کرنا، جو آدمی خیانت کرے گا تو خیانت کے ذریعے حاصل کی ہوئی ہر ایک چیز کو اپنی گردن پر اٹھا کر لائے گا، اگر کسی کی بکری، گائے، بھینس، وغیرہ چوری کی ہے تو قیامت والے دن اسے اپنی گردن پر اٹھا کر لائے گا، یا کوئی اور چیز غصب کی ہے تو ہر چیز اسے اپنی گردن پر اٹھانی ہوگی حتیٰ کہ اگر کسی کی ایک بالشت زمین بھی دبائی ہے تو ساتوں زمینوں تک کے اس ٹکڑے کو گلے کا طوق بنا کر ڈال دیا جائے گا اور وہ اسے کھینچ کر لائے گا۔

قیامت کے حالات کو دنیا کے حالات کی طرح نہیں سمجھنا چاہئے وہاں کے حالات بالکل مختلف ہوں گے، اللہ تعالیٰ انسان کے جسم میں اتنی طاقت پیدا کر دیں گے کہ بڑی سے بڑی چیز بھی اٹھانے کے قابل ہوگا، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو کچھ بتایا ہے وہ حق ہے، ہر برائی کو اپنی پیٹھ پر اٹھانا ہوگا، بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ نیک لوگوں کے نیک عمل ان کے لئے سواری کا کام دیں گے اس کے برخلاف برے لوگوں کے برے عمل خود ان لوگوں پر سواری کریں گے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: انسان کی نیکی جب اس کے قریب آئے گی تو اس کو خوشخبری دے گی اور جب برائی اس آدمی کے قریب آئے گی تو وہ شخص کہے گا کہ تو پیچھے رہ مگر وہ برائی اس کے ساتھ آ کر چمٹ جائے گی۔

یہ قیامت کے دن کا حال ہے اور قبر کے متعلق بھی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: آدمی کے نیک عمل خوبصورت انسانی شکل میں تبدیل ہو کر اس کے پاس قبر میں آئیں گے تو وہ تعجب سے پوچھے گا تم کون ہو؟ وہ جواب دے گا کہ میں تیرا نیک عمل ہوں جو تیرا دل بہلانے کیلئے آیا ہوں تا کہ تجھے قبر میں گھبراہٹ نہ ہو، انسان کے برے عمل نہایت بری شکل میں اس کے پاس آئیں گے جنہیں دیکھ کر وہ سخت خوفزدہ ہوگا۔

اصل زندگی

وَ مَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَعِبٌ وَّ لَهْوٌ ؕ وَ لَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ

اور نہیں زندگی دنیا کی مگر کھیل اور جی کا بہلاوا اور البتہ گھر آخرت کا

خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۳۲﴾

بہتر ہے لئے ان لوگوں کے جو ہر برائی سے بچتے ہیں کیا نہیں سمجھتے تم (۳۲)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور دنیا کی زندگی صرف کھیل اور دل کا بہلاوا ہے اور پرہیزگاروں کیلئے آخرت کا گھر بہتر ہے، کیا تم نہیں سمجھتے؟ (۳۲)

تفسیر

ان آیتوں میں پچھلی آیتوں کا خلاصہ دیا گیا ہے اور دنیا کی زندگی کی پوری حقیقت مختصر الفاظ میں بیان کر دی گئی ہے ارشاد ہے کہ دنیا کی زندگی کھیل کود اور دل بہلاوے کے سوا کچھ نہیں ہر شخص جو ذرا بھی عقل رکھتا ہے سمجھ سکتا ہے کہ کھیل کود صرف تھوڑی دیر کی تفریح کا نام ہے، یہ ناممکن ہے کہ ہمیشہ کھیلتا کودتا ہی رہے اسے سمجھ لینا چاہئے کہ دنیا چند دن کی چیز ہے ہمیشہ اس میں نہ کوئی رہا ہے اور نہ رہ سکتا ہے، جو شخص دنیا ہی کے دھندوں میں پھنسا رہتا ہے وہ ایسا ہے جیسے کوئی اپنا سارا وقت کھیل کود ہی میں گنوا دے، کوئی عقلمند اس کو کام کا آدمی نہیں کہہ سکتا اور پھر یہ بھی ضرور ہے کہ وہ کسی نہ کسی وقت اکتا جائے ایسا ہی حال اس شخص کا ہے جو دنیا میں پھنسا ہوا ہے اس کے دل میں بہت سی خواہشیں پیدا ہوتی ہیں وہ ہر ایک کے پیچھے دوڑتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کی خوشی پائیدار رہے لیکن تھوڑی ہی دیر میں وہ اس سے اکتا جاتا ہے یا خواہش کو پورا کر کے اس کا دل بھر جاتا ہے اور اپنے کئے پر شرمندہ ہوتا ہے، یہاں تک آخر کار اس کی قوت جواب دے جاتی ہے وہ تھک کر پڑ جاتا ہے اور اس قابل نہیں رہتا کہ اپنی خواہش پوری کر سکے، اس کا جی للچاتا رہتا ہے لیکن قوتیں جواب دے جاتی ہیں اس کے مقابلے میں آخرت کی زندگی میں

جو خواہش ہوگی اس کے پورا کرنے میں نہ تکان محسوس ہوگی اور نہ قوت ختم ہوگی اور نہ کمزوری، بیماری، غم ورنج، پریشانی اور موت جیسی کوئی چیز آئے گی، اس زندگی کو آدمی صرف اسی طرح حاصل کرسکتا ہے کہ اس دنیا میں تقویٰ اختیار کرے جس کے معنٰی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈر کے دنیا میں ان باتوں کو قطعاً چھوڑ دے جن سے اس نے منع فرمایا ہے، کیا تم میں اتنی عقل نہیں کہ عارضی چیز کو چھوڑ کر ہمیشہ کی چیز کو اختیار کرو۔

"لعب" اس چیز کو کہتے ہیں جو بے مقصد ہو جس کی کوئی صحیح غرض نہ ہو۔

اس آیت میں اور قرآن کریم کی دوسری بہت سی آیتوں میں دنیا کی زندگی کو لہو ولعب یعنی کھیل کود فرمایا ہے یا بہت سی حدیثوں میں دنیا کی جو برائی بیان کی گئی ہے اس سے مراد دنیا کی زندگی کے وہ لمحات ہیں جو اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس کی چاہت سے غفلت میں گزریں، ورنہ جو وقت اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری اور یاد میں گزرتا ہے اس کے برابر دنیا کی کوئی نعمت و دولت نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو زندگی جیسا قیمتی سرمایہ عطا کیا ہے، حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب کوئی شخص رات گزار کر صبح صحت وتندرستی کے ساتھ اٹھتا ہے تو اسے اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت نصیب ہوتی ہے اس لئے انسان کے تین سو ساٹھ جوڑوں میں سے ہر ہر جوڑ پر شکریہ واجب ہوجاتا ہے، لہٰذا ہر جوڑ کی طرف سے صدقہ دینا ضروری ہوجاتا ہے، صحابہ نے عرض کیا اے پیغمبر! اس کی تو کوئی طاقت نہیں رکھتا کہ ہر جوڑ کی طرف سے ہر روز صدقہ ادا کرے، فرمایا انسان کی ہر نیک بات اس کیلئے صدقہ بن جاتی ہے کسی کو نیکی کی بات بتلائے یا برائی سے منع کردے تو وہ بھی اس کیلئے صدقہ ہوتا ہے، راستے میں سے کانٹا یا پتھر ہٹادے کہ کسی کو تکلیف نہ ہو تو یہ بھی صدقہ بن جاتا ہے اور کچھ نہیں تو چاشت کے وقت دو رکعت نفل ہی تمام جوڑوں کی طرف سے صدقہ بن جائے گا، کوئی شخص صحیح عقیدے کیساتھ "سبحان اللہ" کہہ دے تو وہ بھی اس کیلئے صدقہ ہوگا۔

دنیا کی زندگی بہت بڑی نعمت اور قیمتی چیز ہے اسی لئے اسلام میں خودکشی حرام اور موت کی تمنا کرنا منع ہے اس میں خدا تعالیٰ کی ایک بڑی نعمت کی ناشکری ہے۔

پیغمبر ﷺ نے فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ نے انسان کو زندگی کا بڑا قیمتی سرمایہ عطا کیا ہے اس کے ساتھ اچھا سودا خریدو کیونکہ یہ سرمایہ قیمتی ہونے کے ساتھ ساتھ عارضی بھی ہے، انسان کی زندگی کی ناپائیداری کی مثال ایسی ہے جیسے برف کی ڈلی جو گرمی کی وجہ سے ہر گھڑی پگھلتی رہتی ہے، پیغمبر ﷺ نے فرمایا: اس قیمتی پونجی کو لگا کر بعض انسان واقعی اپنے نفس کو آزاد کردیتے ہیں وہ اسے ایمان، توحید اور نیکی جیسی قیمتی چیزیں خرید کر اپنے نفس کو دوزخ سے آزاد کرا لیتے ہیں مگر بعض ایسے بھی ہیں جو اسی پونجی سے کفر، شرک، نفاق اور بدعتیں خرید کر اپنے آپ کو ہلاک کر لیتے ہیں ایسی تجارت میں انہیں نفع کے بجائے سراسر نقصان ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے زندگی کے مقصد کو تجارت کی مثال دے کر سمجھایا ہے جسے تاجر لوگ بڑی آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ جس شخص کی اصل پونجی ہی ضائع ہو جائے وہ کس قدر نقصان میں ہوتا ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ان آیتوں میں فرمایا کہ: جن لوگوں نے قیامت کا انکار کر دیا وہ بڑے خسارے میں پڑ گئے، یہ دنیا کی زندگی ظاہر میں جلد ختم ہو جانے والی ہے مگر ہے بڑی قیمتی اس سے انسان اچھا سودا خرید کر ہمیشہ کے عیش و آرام کا مستحق بن سکتا ہے۔

جو لوگ کفر، شرک اور گناہوں سے بچتے ہیں اپنی قیمتی زندگی کو غلط کام میں نہیں لگاتے بلکہ اس سرمایہ کو اچھے کاموں پر لگاتے ہیں ان کیلئے آخرت کا گھر بہترین ٹھکانہ ہے، اللہ تعالیٰ نے تمہیں عقل جیسی قیمتی چیز عطا کی ہے تم اسے کام میں لا کر حقیقت کو سمجھتے کیوں نہیں؟ اب بھی وقت ہے سمجھ جاؤ! اس دنیا کی چند روزہ زندگی میں آخرت کو سنوارنے کا سامان پیدا کرو اور اس پیاری زندگی کو فضول کاموں پر نہ گنوا بیٹھو، بہر حال اللہ تعالیٰ نے ان آیتوں میں آخرت کا انکار کرنے والوں اور مشرکوں کی باتوں کو غلط قرار دیا ہے۔

لوگوں کی نافرمانی سے پیغمبر ﷺ کو دُکھ

قَدْ	نَعْلَمُ	اِنَّهٗ	لَيَحْزُنُكَ	الَّذِىْ	يَقُوْلُوْنَ	فَاِنَّهُمْ	لَا
بیشک	ہم جانتے ہیں	کہ	ضرور رنجیدہ کرتی ہیں آپ کو	یہ باتیں جو	وہ کہتے ہیں	سو وہ یقیناً	نہیں

يُكَذِّبُوْنَكَ وَ لٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ﴿۳۳﴾

جھٹلاتے آپ کو | اور | لیکن | ظالم لوگ | ساتھ نشانیوں کے | اللہ کی | انکار کرتے ہیں (۳۳)

بامحاورہ ترجمہ:۔ ہم کو معلوم ہے کہ ان کی باتیں آپ کو غم میں ڈالتی ہیں سو وہ آپ کو نہیں جھٹلاتے لیکن یہ ظالم تو اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں۔ (۳۳)

تفسیر

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو دنیا کی بے حقیقت چیزوں میں لگا دیکھ کر رنج میں مبتلا ہوتے، آپ کی مہربانی اور توجہ تمام انسانوں پر اس مہربانی اور توجہ سے کہیں زیادہ تھی جو باپ کے دل میں اپنی اولاد پر ہوتی ہے، آپ کے برابر انسان کا ہمدرد کوئی نہیں، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم جب دیکھتے کہ انسان نادان بچوں کی طرح فضول باتوں میں اپنا وقت گنوا رہا ہے حالانکہ اسے ایسے کام کرنے چاہئیں جو آگے چل کر دنیا میں اور آخرت میں اس کے کام آئیں۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے تسلی دی کہ اے پیغمبر! آپ غمگین نہ ہوں اور یقین کریں کہ آپ کی بات نہ مان کر یہ اللہ تعالیٰ کا سامنا کر رہے ہیں اور اس کی ان آیتوں اور نشانیوں کو جو اس نے آپ کو سچا ثابت کرنے کیلئے دنیا میں بھیجی ہیں فضول سمجھ رہے ہیں ان کا مقابلہ اللہ "وحدہ لاشریک لہٗ" سے ہے۔

ارشاد ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ آپ کو ان کی باتوں سے جو یہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں رنج و غم ہوتا ہے لیکن ان کی گستاخیاں اور نادانیاں تو ختم ہونے والی نہیں اس لئے ان پر رنج کرنا اپنے آپ کو تکلیف دینا ہے تو یہ سمجھ لیجئے کہ یہ نادان لوگ ظاہر میں تو آپ کو جھوٹا بتلا رہے ہیں لیکن اصل میں یہ اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی آیتوں ایمان، توحید، رسالت اور آخرت کا انکار کر رہے ہیں اس لئے ان کو اللہ تعالیٰ ضرور سزا دیں گے، ان کا معاملہ اللہ تعالیٰ پر ہی چھوڑ دینا چاہئے، انہوں نے دو طرح اپنے آپ کو قصوروار اور مجرم بنا لیا ہے ایک تو کھلم کھلا اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہے دوسرے اللہ تعالیٰ کے پیغمبر کو اپنے طرز عمل سے دکھ پہنچایا ہے، اے پیغمبر! آپ کو صبر سے کام لینا چاہئے، اگر یہ باز نہ آئے تو اللہ تعالیٰ ان کو سزا دے کر رہیں گے، اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جو قرآن مجید اور سنت کے

مطابق عمل نہیں کرتا پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تکلیف دے رہا ہے۔

یہاں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلی دی جارہی ہے کہ بیشک یہ لوگ آپ کو نہیں جھٹلاتے بلکہ جب مکہ کے مشرکوں سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں پوچھا جاتا ہے تو کہتے ہیں بڑے سچے ہیں، "سورہ یونس" میں ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: میں نے تمہارے درمیان عمر کا ایک بڑا حصہ، یعنی: چالیس سال کا عرصہ گزارا ہے کبھی میں نے جھوٹ بولا ہے یا کسی کو نقصان پہنچایا ہے؟ تو سب جواب دیتے کہ آپ صادق اور امین، یعنی: سچے اور امانتدار ہیں مگر جب آپ نے اللہ تعالیٰ کا پیغام سنایا تو جھوٹا قرار دے دیا، اللہ تعالیٰ کے ایک ہونے کا پیغام دینے کے ساتھ ہی ساری برائیاں پیدا ہوگئیں، ابوجہل اور دوسرے کافر آپ کی سچائی و امانت، شرافت اور نیک نیتی کے بارے میں تعریفیں کرتے تھے مگر اپنی سرداری کو قائم رکھنے کیلئے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت کرتے تھے، بدر کی لڑائی کے دوران اخنس بن شریق نامی مشرک نے ابوجہل سے پوچھا تھا کہ خدا کیلئے یہ تو بتاؤ کیا محمد واقعی جھوٹا ہے؟ تو ابوجہل کہنے لگا نہیں، وہ سچا ہے اس نے کہا پھر اس کی مخالفت پر کیوں تلے بیٹھے ہو تو کہنے لگا قصی بن کلاب کے خاندان میں پہلے سے پرچم موجود ہے، کعبہ کی دربانی بھی ان کے پاس ہے، حاجیوں کو پانی پلانے کی خدمت بھی ہے اور اب اگر پیغمبری بھی انہی کے پاس چلی گئی تو باقی قریش کہاں جائیں گے، معلوم ہوا کہ ان کی مخالفت صرف چوہدراہٹ کیلئے تھی ورنہ دل سے وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بالکل سچا سمجھتے تھے، قرآن پاک کے بیان کے مطابق بعض لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ ہم آپ کو جھوٹا نہیں کہتے بلکہ جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے قرآن کریم اور باقی نشانیاں آپ لائے ہیں وہ جھوٹ ہے ہم اس کو تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں۔ (نعوذ باللہ)

پیغمبروں کے مددگار اللہ تعالیٰ ہیں

وَ لَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا وَ

اور البتہ تحقیق جھٹلائے گئے بہت پیغمبر سے پہلے آپ سے پس انہوں نے صبر کیا اوپر جھٹلائے جانے کے اور

اُوْذُوْا حَتّٰۤى اَتٰىهُمْ نَصْرُنَا ۚ وَ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ وَ

تکلیف دیئے جانے کے یہاں تک کہ آئی ان کے پاس مدد ہماری اور نہیں کوئی بدلنے والا باتوں کو اللہ کی اور

لَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِی الْمُرْسَلِیْنَ ﴿۳۴﴾

البتہ تحقیق پہنچی ہے آپ کو کچھ خبر پیغمبروں کی (۳۴)

بامحاورہ ترجمہ:۔اور آپ سے پہلے بہت سے پیغمبر جھٹلائے گئے ہیں بس جھٹلانے پر اور تکلیف پر وہ صبر کرتے رہے یہاں تک کہ ان کو ہماری مدد پہنچی اور اللہ تعالیٰ کی باتیں کوئی نہیں بدل سکتا اور آپ کو پیغمبروں کے کچھ حالات پہنچ چکے ہیں۔(۳۴)

تفسیر

پچھلی آیت سے سمجھ میں آتا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اندر انسانی ہمدردی اور خیر خواہی بے حد تھی اور وہ لوگوں کو سیدھی راہ سے ہٹا ہوا دیکھ کر دل میں بہت کڑھتے اور رنج میں مبتلا ہوتے تھے بالکل جیسے ایک مہربان باپ اپنے بچوں کو فضول باتوں میں پھنسا ہوا دیکھ کر اور کام کی باتوں سے ہٹا ہوا دیکھ کر غمگین ہوتا ہے بلکہ اس سے بہت زیادہ، کیونکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اصلی کام کی باتوں کا جتنا علم تھا اتنا کسی باپ کو نہیں ہوسکتا، ظاہر ہے کہ جو کوئی حقیقت سے جتنا زیادہ واقف ہوگا اتنا ہی زیادہ اس کو دوسروں کی نادانیوں پر رنج وغم ہوگا، جتنے پیغمبر اس دنیا میں آئے ان میں سے اکثر اسی تکلیف اور غم میں مبتلا رہے کہ ان کی قوم نے اپنی نادانی کے باعث ان کو جھوٹا سمجھا، دلی رنج وغم تو ان کو جو ہوئی وہ ہوئی نادانوں نے اور بھی قسم قسم کی تکلیفیں انہیں پہنچائیں لیکن وہ صبر کرتے اور ان کی بدسلوکیوں کو برداشت کرتے رہے آخرکار اللہ تعالیٰ نے قاعدے کے مطابق ان شریروں کے مقابلے میں اپنے پیغمبروں کی مدد کی، قرآن مجید سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آخرکار پیغمبروں کے مقابلے میں بڑے بڑے ہیکڑی کرنے والوں کی کچھ نہ چل سکی، پیغمبروں کو ستانے والے اور ان کا کہنا نہ ماننے والے پیغمبروں سے دشمنی نہیں کررہے بلکہ

اللہ تعالیٰ سے دشمنی کر رہے ہیں، وہ خواہ کتنے ہی ظاہر میں کامیاب نظر آتے ہوں آخر کار ان کو اللہ تعالیٰ کا عذاب گھیر لے گا اور وہ بری طرح تباہ ہوں گے، ارشاد ہے کہ اے پیغمبر! آپ سے پہلے پیغمبروں کو جھٹلایا گیا اور وہ اس جھٹلانے پر جو دلی رنج وغم کا بڑا باعث ہے اور دوسری تکلیفوں پر جو انہیں پہنچائی گئیں صبر کرتے رہے یہاں تک کہ ہماری مدد ان کے پاس پہنچی اور پیغمبر جیتے اور ان کے دشمن ہارے، پچھلے پیغمبروں کی کچھ خبر آپ کے پاس آ چکی ہیں ان سے معلوم ہوگا کہ پیغمبر کے خلاف چلنے والوں کا کیا انجام ہوا، پیغمبر اپنے دشمنوں کے مقابلے میں کیسے ہمیشہ کامیاب ہوئے۔

"حدیث شریف" میں آتا ہے کہ کسی موقع پر ایک شخص نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بیہودہ بات کی تو آپ کو سخت صدمہ پہنچا، آپ نے فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ موسیٰ علیہ السلام پر اپنی رحمتیں اتاریں کہ انہیں اس سے بھی زیادہ تکلیفیں پہنچائی گئیں مگر انہوں نے صبر ہی کیا تو میں بھی ان کے طرز عمل کے مطابق صبر کا دامن ہی پکڑوں گا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس حد تک ذہنی تکلیف پہنچائی گئی کہ ایک بدکار عورت کو عام مجمع میں کھڑا کر کے اس سے کہلوایا گیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس سے برائی کی ہے (العیاذ باللہ) حضرت نوح علیہ السلام کے متعلق بھی قرآن مجید میں ارشادات موجود ہیں کہ انہیں کس کس طرح سے جسمانی، ذہنی اور مالی تکلیفیں پہنچائی گئیں، مشرک لوگ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کو تکلیفیں پہنچا کر آپ کی تکلیف کا باعث بنے مگر تمام پیغمبروں کی طرح آپ نے بھی صبر کا دامن نہ چھوڑا، صبر ملت ابراہیمی اور دین اسلام کا بہت بڑا اصول ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس اصول کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرمایا ہے کہ: اے ایمان والو! تمہیں یہودیوں، عیسائیوں اور مشرکوں کی طرف سے بڑی تکلیفیں پہنچائی جائیں گی، پھر اگر تم صبر کرو گے اور تقویٰ کا راستہ اختیار کرو گے تو پکی بات یہی ہے، کامیابی کا دارومدار صبر اور تقویٰ پر ہے یہ ہمارے دین کا بہت بڑا اصول ہے اسی لئے قرآن کریم میں اس کی جگہ جگہ تاکید کی گئی ہے، سورۂ بقرہ میں ہے کہ صبر اور نماز کے ذریعے مدد حاصل کرو، نماز کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کو قائم رکھو اور ہر تکلیف کو صبر و ثابت قدمی کے ساتھ برداشت کرو تو کامیابی پا جاؤ گے، صبر کی بھی مختلف صورتیں ہیں کبھی نیکی پر جم جانے کیلئے صبر

سے کام لینا پڑتا ہے اور کبھی نفسانی خواہش کو روک کر صبر کیا جاتا ہے اور ہر مصیبت کے وقت صبر اختیار کرنا تو بہرحال مقصودی کاموں میں سے ہے؛ اسی لئے فرمایا کہ جس طرح پہلے پیغمبروں نے تکلیفوں پر صبر کیا اسی طرح آپ بھی صبر کا دامن پکڑے رہیں۔

تمام پیغمبر صبر کرتے رہے حتیٰ کہ ہماری مدد ان کو پہنچ گئی اور یاد رکھو! اللہ تعالیٰ کے کلموں کو کوئی ہستی تبدیل نہیں کرسکتی، یہاں پر کلموں سے مراد اللہ تعالیٰ کے وعدے ہیں اور مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں سے جو وعدہ کررکھا ہے اسے کوئی بھی بدل نہیں سکتا، اس کا وعدہ ہے کہ میں اور میرے پیغمبر ہی غالب ہوں گے حالات چاہے کیسے بھی حوصلہ کو پست کردینے والے ہوں مگر بالآخر میرے پیغمبر کو ہی کامیابی ہوگی، اللہ تعالیٰ نے اپنی مدد کی خوشخبری تمام پیغمبروں اور ایمان والوں کو بھی دی ہے، بیشک ہم مدد کرتے ہیں اپنے پیغمبروں اور ایمان والوں کی دنیا میں بھی اور قیامت کے دن بھی، اللہ تعالیٰ کا یہی وعدہ ہے جسے کوئی تبدیل نہیں کرسکتا، وہ پورا ہوکر رہے گا مگر اس سے پہلے ہر قسم کی تکلیفوں کو برداشت کرنا ہوگا۔

زبردستی مقصود نہیں

وَ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ

اور　اگر　ہے　گراں گزرتا　پر آپ　منہ پھیر لینا ان کا　تو اگر　کرسکتے تو　یہ کہ　ڈھونڈھ لے

نَفَقًا فِي الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَآءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ ؕ وَ لَوْ شَآءَ

کوئی سرنگ　میں　زمین　یا　کوئی سیڑھی　میں　آسمان　پس آئے آپ انکے پاس　ایک نشانی لیکر　اور　اگر　چاہتا

اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۳۵﴾　النّصف

اللہ　تو اکٹھا کردیتا انکو　پر　سیدھی راہ　پس نہ　ہرگز ہوں آپ　میں سے　بے خبروں (۳۵)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور اگر ان کا منہ پھیرنا آپ پر بھاری ہے تو اگر آپ سے ہوسکے تو کوئی سرنگ زمین

میں یا کوئی سیڑھی آسمان میں ڈھونڈھ نکالیے اور پھر ان کے پاس ایک معجزہ لا ئیے اور اگر اللہ چاہتا تو سب کو سیدھی راہ پر جمع کر دیتا، سو آپ بے خبروں میں سے مت بنئے۔(۳۵)

تفسیر

ارشاد ہے کہ آپ کو ان کا منہ پھیرنا اور سچی بات نہ ماننا تکلیف دہ گزرتا ہے اور آپ ان کی ہدایت کیلئے زمین کے اندر سے یا آسمان سے کوئی ایسی چیز ڈھونڈ کر لانا چاہتے ہیں کہ جس کے آگے ان کے سر جھک جائیں اور سب ایمان لے آئیں، یہ تو ہوسکتا ہے لیکن یہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کیے ہوئے قانون کے خلاف ہے، اللہ تعالیٰ کو اگر منظور ہوتا تو سب کو ایسا ہی بناتے کہ سیدھے راستہ کے سوا کسی اور راستہ پر چل ہی نہ سکتے، اس لئے اے پیغمبر! اس قانون کو اپنے دل میں رکھیے اور اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ زبردستی سب کو ہدایت کرنا مقصود نہیں ہے، آپ کا کام سمجھا دینا ہے چاہے کوئی مانے یا نہ مانے، اس خیال میں مت پڑیئے کہ زمین میں سرنگ لگا کر یا آسمان پر سیڑھی کے ذریعہ چڑھ کر کوئی ایسی بات ڈھونڈ کر لائی جائے جس سے یہ انکار ہی نہ کرسکیں، ہمیں تو یہ دیکھنا ہے کہ اپنی عقل سے سیدھا راستہ کون اختیار کرتا ہے؟

وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ: اگرچہ ان کا حق کو قبول کرنے سے منہ موڑنا آپ کیلئے تکلیف دہ ہے، ظاہر ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں اس بات کی شدید خواہش تھی کہ آپ کی قوم کے سارے لوگ ایمان کو قبول کرلیں اور دوزخ سے بچ جائیں مگر وہ لوگ بعض اوقات سخت بیہودہ باتیں کرتے تھے، معجزوں کیلئے فرمائشیں کرتے تھے کہ فلاں نشانی آجائے تو ہم مان جائیں گے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی دلی خواہش بھی ہوتی تھی کہ اگر اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی مانگی ہوئی نشانی عطاء فرمادیں تو شاید وہ ایمان لے آئیں اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: اگرچہ آپ کی یہ خواہش اچھے کاموں کے متعلق ہے مگر یہ مخلوق کو پیدا کرنے کی حکمت کے خلاف ہے، اللہ تعالیٰ کے حکمت کے مطابق سب لوگوں کا ایمان لانا ضروری نہیں ہے، اس قسم کی خواہش خدائی حکمت کے خلاف ہے اس لئے آپ

ایسی تمنا نہ کیا کریں، "سورۂ کہف" میں ہے اے پیغمبر! آپ اس بات پر اپنے آپ کو غم سے ہلاک کرلیں گے کہ یہ لوگ اس دین پر ایمان نہیں لاتے، آپ اتنا غم نہ کیا کریں، آپ ان لوگوں پر کوئی دواروغہ تو نہیں ہیں کہ ان سے زبردستی ایمان قبول کرائیں اور پھر ان کا ایمان لانا ضروری بھی تو نہیں ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ کسی معجزہ یا نشانی کا ظاہر کرنا آپ کے اختیار میں نہیں ہے اور اگر بالفرض وہ نشانی جو انہوں نے مانگی ہے اللہ تعالیٰ ظاہر بھی فرمادیں تو اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ یہ ضرور ہی ایمان لے آئیں گے، ان کا پچھلا ریکارڈ تو ان کے حق میں نہیں جاتا، مثلاً: مکہ کے مشرکوں نے چاند کو دو ٹکڑے کردینے کا معجزہ مانگا جب اللہ تعالیٰ کی مرضی ہوئی تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے انگلی سے اشارہ فرمایا: اور چاند دو ٹکڑے ہو کر ایک حصہ پہاڑ کی ایک طرف اور دوسرا دوسری طرف چلا گیا، یہ واضح نشانی دیکھنے کے بعد کہنے لگے یہ تو چلتا ہوا جادو ہے، بعض لوگوں نے کہا کہ ہوسکتا ہے کہ ہماری نظر بندی کردی گئی ہو اور حقیقت میں چاند نہ پھٹا ہو، لہٰذا باہر دور دراز سے آنے والے لوگوں سے معلوم کرنا چاہئے، چنانچہ جب قافلے آئے تو ان سے پوچھا گیا، انہوں نے بھی تصدیق کی کہ فلاں دن فلاں مقام پر ہم نے چاند کو دو ٹکڑے ہوتے دیکھا مگر اس کے باوجود مکہ کے مشرک ایمان نہ لائے اور اپنی بات پر اڑے رہے۔

فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ: اللہ تعالیٰ نے محبت اور نصیحت کے طریقے پر فرمایا ہے کہ میری حکمت کے خلاف تمنا کر کے آپ نادان نہ بنیں، اس جملے میں محبت اور ناراضگی کا ملا جلا انداز بھی ہے اور نصیحت بھی کہ ان لوگوں کیلئے جس قدر ضروری ہے اسی قدر اللہ تعالیٰ سے مانگیں اور ان کی ہر خواہش کے پورا ہونے کی تمنا نہ کریں۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ آیت کے اس حصہ میں اگرچہ بات تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو کہی گئی ہے مگر حقیقت میں لوگوں کو سنانا اور بتانا ہے کہ بیشک تمام مسلمانوں کی خواہش ہے کہ سب لوگ ایمان لے آئیں مگر یہ چیز حکمت کے خلاف ہے، کسی کو ہدایت دینا اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کے اختیار میں نہیں ہے اس کیلئے دعا یا تمنا یا کوشش ہی کی جاسکتی ہے، وہ کرنی چاہئے اور نتیجہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دینا چاہئے کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے کہ کس شخص میں

ایمان قبول کرنے کی صلاحیت موجود ہے اور یہ خواہش رکھنا کہ تمام کے تمام لوگ ہی ایمان قبول کرلیں تو یہ نادانی کی بات ہے، اس کو اختیار نہیں کریں۔

ماننے کیلئے عقل کافی ہے

اِنَّمَا يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ يَسْمَعُوْنَ ۘ وَ الْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ

بات یہی ہے کہ مانتے وہ ہیں جو سنتے ہیں اور مردے اٹھائیگا ان کو اللہ

ثُمَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ﴿۳۶﴾

پھر طرف اسی کی لوٹائے جائیں گے (۳۶)

بامحاورہ ترجمہ:۔ مانتے وہی ہیں جو سنتے ہیں اور مردوں کو اللہ زندہ کریں گے پھر اسی کی طرف لوٹائے جائینگے۔(۳۶)

تفسیر

یہ آیت پچھلی آیت کی تشریح ہے کہ خواہش انسان کے کان بہرے کر دیتی ہے وہ اپنے مطلب کی بات کے سوا دوسری بات سنتا ہی نہیں، وہ اپنی غرض کا بندہ ہے اسی کیلئے جیتا ہے ایسے مردہ لوگوں کے کان قیامت ہی کے دن کھلیں گے مگر اس سے کچھ فائدہ نہ ہوگا، فائدہ تو اس میں ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اللہ تعالیٰ کا پیغام دنیا میں سنایا ہے اس کو اس دنیا ہی میں مان لیں، اگر دنیا میں نہ مانا تو مرنے کے بعد تو لازمی طور سے انہیں زندہ ہو کر اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہونا ہے اس دن ہر چیز ان پر واضح ہو جائے گی لیکن اس وقت کا ماننا کچھ کام نہ آئے گا، دنیا میں جو نافرمانیاں کی تھیں ان کی سزا یقیناً بھگتنی پڑے گی اس کو خیال میں لا کر آیت کے مضمون کی طرف توجہ کیجئے، ارشاد ہے کہ سب لوگوں سے یہ امید نہ رکھے کہ وہ آپ کی بات مان لیں گے کیونکہ مانیں گے صرف وہی لوگ جن کے کان

وقف منزل
وقف النبی ﷺ علی یسمعون ۲
وقف غفران

خواہشوں نے بند نہیں کر دیئے ہیں، جن لوگوں نے حق بات سننے سے کان بند کر لئے ہیں، آنکھیں بند کر لیں ہیں وہ اس زندگی میں بالکل گئے گزرے ہوئے، اس چیز کے سوا جس میں ان کا دل لگا ہوا ہے اور باتوں کی طرف سے گویا وہ مر گئے اور یہ اپنی ناپاک دنیا کی خواہشیں دل میں لے کر اس دنیا سے رخصت ہوں گے اور پھر دوبارہ زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے اور اللہ تعالیٰ کے آگے لا کھڑے کیے جائیں گے، اس وقت ان کے کان خوب اچھی طرح کھل جائیں گے، ان آیتوں میں کافروں کے اس بہانے کا جواب ہے کہ پیغمبر کے ساتھ ایسی صاف صاف نشانیاں ہونی چاہئیں کہ کوئی ان کا انکار نہ کر سکے، جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ ایمان لانا ہے تو انہی نشانیوں کو دیکھ کر لاؤ جو تمہارے سامنے موجود ہیں، ان میں سے قرآن مجید کی آیتیں سب سے روشن اور صاف نشانیاں ہیں اور انہی میں ان تمام نشانیوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جو سارے جہان میں پھیلی ہوئی ہیں، اس سے زیادہ صاف نشانیاں چاہتے ہو تو ان کے بعد ایمان لانا لازمی ہو جائے گا اور دنیا امتحان کی جگہ نہ رہے گی۔

وَ الْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ: "تفسیر کبیر" میں ہے کہ یہاں مردوں سے مراد ضدی قسم کے کافر ہیں اور مطلب یہ ہے کہ جس طرح مردوں کو سنانے کا کچھ فائدہ نہیں اسی طرح کافروں کا سننا اور نہ سننا برابر ہے کافروں کو متوجہ کرنا مردوں کو متوجہ کرنے کے برابر ہے، اگر قبرستان میں کوئی شخص وعظ کرنا شروع کر دے تو اس کا کیا فائدہ ہوگا، یہی حال کفر کرنے والوں کا ہے۔

قیامت والے دن اللہ تعالیٰ مردوں کو اٹھائیں گے تو پھر سنیں گے، آج کا سننا ان کیلئے فائدہ مند نہیں تو وہاں کا سننا بھی فائدہ مند نہیں ہوگا کیونکہ سن کر ایمان لانے کا وقت گزر چکا ہوگا، وہ مان جائیں گے دنیا میں ہمیں جو سنایا جاتا تھا وہ حق تھا مگر ہم ہی غلط راستے پر چلتے رہے مگر اس وقت کا پچھتانا کسی کام نہ آئے گا۔

ثُمَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ: پھر ان سب کو خدا تعالیٰ کی طرف لوٹا دیا جائے گا، پھر حساب کتاب ہوگا اور جیسا کسی کا عقیدہ یا عمل ہوگا اس کے مطابق اچھا یا برا بدلہ پائے گا، غرضیکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کو اللہ تعالیٰ نے تسلی دی ہے کہ اگر کافر آپ کی بات نہیں مانتے تو آپ ان کی خواہش کے مطابق نشانیاں دکھائے جانے

کی تمنا نہ کریں کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کے خلاف ہے، آپ اپنا فرض ادا کرتے رہیں کسی کو ہدایت دینا یا گمراہ رکھنا اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے، یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی عقل جیسی نعمت کو ٹھیک طور پر استعمال نہیں کرتے، اس بات کا انہیں قیامت کے روز پتہ چلے گا مگر اس وقت کی شرمندگی کسی کام نہیں آئے گی اور کافر اپنے انجام کو پہنچ جائیں گے۔

کافر کھلی نشانی مانگتے ہیں

وَ قَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ

اور انہوں نے کہا کیوں نہیں اتاری گئی پر اس کوئی نشانی طرف سے رب اسکے کی کہہ دیجئے بیشک اللہ قدرت والا ہے

عَلٰۤى اَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً وَّ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۷﴾

اس پر کہ اتارے کوئی نشانی اور لیکن بہت سے ان میں نہیں جانتے (۳۷)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور کہتے ہیں کہ ان پر کوئی نشانی ان کے رب کی طرف سے کیوں نہیں اتاری گئی؟ آپ کہہ دیجئے کہ اللہ کو اس بات پر قدرت ہے کہ نشانی اتاریں لیکن ان میں سے اکثر نہیں جانتے۔ (۳۷)

تفسیر

جس زمانے میں حضرت محمد ﷺ دنیا میں تشریف لائے تقریباً تمام دنیا کے انسان غلط راستہ پر پڑے ہوئے تھے اور انسانی طور طریقوں کو بھول کر درندوں کی طرح زندگی گزار رہے تھے زوردار لوگ درندے بن گئے تھے انہوں نے کمزوروں کو بالکل بھیڑ بکری بنا رکھا تھا، ہر ایک کی للچائی ہوئی آنکھ دنیا کی مزیدار اور آرام دینے والی چیزوں کی طرف اٹھتی، ہر شخص چاہتا تھا کہ یہ سب میرے اور میرے ماننے والوں کے قبضہ میں آجائیں اور باقی ماندہ سب لوگ ان کے خادم اور غلام بن کر رہیں، بیل، گھوڑوں، گدھوں کی طرح ان کی خدمت کریں، عرب میں

بھی یہی حالت تھی کچھ لوگ دولت منداور طاقتور بن گئے تھے لیکن دوسروں کو پورے طور پر غلام نہیں بنا سکے تھے اس لئے اسلام جو انسان میں برابری اور مساوات چاہتا ہے عرب ہی سے شروع کیا جاسکتا تھا کیونکہ وہاں کچھ آزادی کی جھلک دکھائی دیتی تھی، اسلام کی اس تعلیم نے کہ تمام انسان آپس میں برابر ہیں مکہ کے اثر ورسوخ والوں اور مالدار لوگوں کو چونکا دیا اوران کو اپنی عزت اور شان وشوکت کی موت صاف صاف نظر آئی اس لئے وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالف ہو گئے۔

اس سورۃ میں ان کے ہتھکنڈوں کو بیان کر کے اس کا جواب دیا گیا ہے کبھی تو وہ کہتے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیغمبر کوئی فرشتہ آنا چاہئے تھا، کبھی کہتے کہ اگر تم پیغمبر ہو تو کوئی نشانی لاؤ، جس کو دیکھ کر ہر ایک تمہیں فوراً پیغمبر مان لے، ارشاد ہے کہ کافر آپ سے کوئی انوکھی نشانی مانگتے ہیں ان سے کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ انوکھی سے انوکھی نشانی جو تم کہو بھیج سکتے ہیں لیکن یہ مطالبہ تمہاری نادانی کا ثبوت ہے، تم میں سے بہت سے ایسے ہیں جو ان اصولوں سے بالکل ناواقف ہیں جن کے مطابق دنیا بنائی گئی ہے انسان کو تمام حیوانوں سے زیادہ عقل ملی ہے اور تمام دنیا ایسی نشانیوں سے بھری ہوئی ہے جن کو انسانی عقل اگر ذرا بھی غور سے کام لے تو فوراً پہچان سکتی ہے، انسان ایسا نہیں جس کو صرف کوڑا اور ڈنڈا ہی سمجھا سکے اور اشاروں سے نہ سمجھے، تمہارا صاف نشانی کا مطالبہ انسانیت کے خلاف ہے۔

اگر ان کی مانگی ہوئی نشانی ظاہر کر دی جائے تو وہ ان کیلئے خطرناک ثابت ہو سکتی ہے کیونکہ اگر انہوں نے نشانی پا کر بھی انکار ہی کیا تو پھر وہ اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے بچ نہیں سکتے، پہلی قومیں اسی لئے عذاب میں مبتلا ہوئیں کہ انہوں نے خود معجزے مانگے مگر معجزے ملنے پر بھی ایمان نہ لائے۔

ہر مخلوق ایک اُمت ہے

وَ مَا مِنۡ دَآبَّةٍ فِي الۡاَرۡضِ وَ لَا طٰٓئِرٍ يَّطِيۡرُ بِجَنَاحَيۡهِ

اور نہیں کوئی چلنے والا میں زمین اور نہ کوئی پرندہ اڑتا ہے دو بازوؤں اپنے سے

اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ ؕ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ ثُمَّ
مگر امتیں ہیں طرح تمہاری نہیں چھوڑی ہم نے میں لکھنے کوئی چیز پھر

اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ ﴿۳۸﴾
طرف رب اپنے کی جمع کئے جائیں گے (۳۸)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور زمین میں چلنے والا اور جو پرندہ اپنے دونوں بازؤوں سے اڑتا ہے ہر ایک تمہاری طرح امت ہے ہم نے لکھنے میں کوئی چیز نہیں چھوڑی پھر سب اپنے رب کے سامنے جمع ہونگے۔ (۳۸)

تفسیر

مکہ کے کافروں کا نشانی مانگنے سے یہ مطلب **نہ تھا** کہ وہ واقعی ایمان لانے کے خواہشمند تھے بلکہ وہ یہ چاہتے تھے کہ ایسی انوکھی بات کا مطالبہ کیا جائے جس کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پورا نہ کرسکیں اور ہم جیت جائیں اور آپ دل ہار کر تبلیغ کرنا چھوڑ دیں، وہ خود اپنی اسی بیہودہ زندگی پر جس کے وہ عادی ہو چکے تھے جمے رہے، خوب مزے اڑائیں جو چاہیں کریں۔

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ : ارشاد ہے کہ دنیا میں خشکی اور تری میں چلنے پھرنے والی اور ہوا میں اڑنے والی سینکڑوں قسم کی مخلوق ہیں ان میں سے ہر ایک مخلوق ایک ایسی ہی امت ہے جیسے انسان ایک امت ہے، امت ہونے کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں موجود ہر جاندار و بے جان کا ایک طبقہ ہے جس طرح انسان ایک طبقہ سے تعلق رکھتا ہے اسی طرح تمام جانوروں وغیرہ کے الگ الگ طبقے ہیں، ہر ایک کیلئے اس دنیا میں رہنے سہنے کے الگ الگ طور طریقے مقرر ہیں اور ہم نے وہ طور طریقے مقرر کر کے کتاب (لوح محفوظ) میں لکھ دیئے ہیں اور ان میں سے ایک بات بھی بغیر لکھے نہیں چھوڑی، آخر کار سب کے سب اپنے پروردگار کے سامنے اکٹھے ہوں گے، اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ وہی سلوک کریں گے جو اللہ تعالیٰ

خود چاہیں گے، اس سے سمجھ میں آ سکتا ہے کہ مخلوق کی ہر طبقے کیلئے دنیا میں زندگی بسر کرنے کا ایک الگ راستہ مقرر ہے جس راستہ کو سمجھنے کیلئے اس کو جتنی عقل چاہئیے دے دی گئی وہ ان نشانیوں کو پہچاننے کیلئے کافی ہے اور اسی قاعدہ کے مطابق ایسی نشانیاں انسان کیلئے بھی مقرر کر دی گئی ہیں جن کو اس کی عقل پہچان سکتی ہے، جن کو دیکھ دیکھ کر سیدھے راستہ پر چل سکتی ہے، یہ لوگ انوکھی نشانیاں مانگتے ہیں جیسے زمین پھاڑ کر ہمارے سامنے ایک چشمہ بہادو یا آسمان پر ہماری آنکھوں کے سامنے چڑھو اور وہاں سے کتاب لاکر ہمارے سامنے رکھ دو وغیرہ وغیرہ۔

ان کے پہچاننے میں عقل بیکار ٹھہرتی ہے اور اس کا بیکار کرنا انسانیت کے خلاف ہے، ہر زمانے میں انسانی عقل کے مطابق نشانیاں ظاہر ہوتی ہیں۔

ان تمام جانوروں، پرندوں اور کیڑے مکوڑوں کی بھی جماعتیں اور گروہ ہیں، مشرکوں کو اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کی تلاش ہے تو ان جانوروں اور پرندوں کو ہی دیکھ لیں، یہ لاکھوں کی تعداد میں ہیں اور پھر ہر ایک کی الگ الگ قسم ہے ان میں ایسی حیرت انگیز باتیں پائی جاتی ہیں جو اللہ تعالیٰ کی قدرت کا نمونہ ہیں، چھوٹے چھوٹے کیڑوں مکوڑوں سے لے کر بڑے بڑے درندوں تک ہر قسم کیلئے الگ الگ کام مقرر ہیں، صرف زمین پر رہنے والے جانوروں کی قسمیں ہی انسان کے علم سے باہر ہیں جب کہ پانی کے جانور اور ہوا میں اڑنے والے پرندے ان کے علاوہ ہیں ہر ایک کا جینا مرنا، ان کا چلنا پھرنا، رہائش، خوراک کے ذریعے اور طور طریقے الگ الگ ہیں، یہ سب اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں ہی تو ہیں، اگر انسان ان میں تھوڑا سا غور و فکر کر لے تو اسے اللہ تعالیٰ کی پہچان حاصل ہونے میں مشکل پیش نہیں آئے گی۔

چھوٹے سے چھوٹے جاندار سے لے کر بڑی سے بڑی مخلوق تک ہر چیز کو اللہ تعالیٰ کی پہچان حاصل ہے، افسوس کا مقام ہے کہ مخلوقوں میں سب سے افضل ہونے کے باوجود بہت سارے انسان اس سے غافل ہیں، حضرت ابودرداؓ رضی اللہ عنہ کی روایت میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تمام جانور، چرند پرند مجھے پہچانتے ہیں، میرے ایک ہونے کو مانتے ہیں، میری تسبیح بیان کرتے ہیں اور میری تعریف بیان کرتے ہیں یہ سب قدرت کی

نشانیاں ہی تو ہیں، "سورۂ بنی اسرائیل" میں ہے کہ تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتی ہیں مگر تم ان کی زبان اور تسبیح کو سمجھ نہیں سکتے، حضرت ابو درداؓ کی روایت میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ یوں فرماتے ہیں کہ تمام جانور مجھے پہچانتے ہیں، میرے ایک ہونے کو بھی مانتے ہیں، شرک نہیں کرتے، خدا کی تعریف اور تسبیح بیان کرتے ہیں۔

سائنس دانوں نے اللہ تعالیٰ کی مخلوق پر تحقیق کر کے حیرت انگیز انکشاف کیے ہیں، بعض لوگوں نے چالیس چالیس سال تک ریزی کر کے چیونٹیوں جیسی معمولی مخلوق پر تحقیق کی ہے، معلوم ہوا کہ ان کا رہنے سہنے کا اپنا نظام ہے، رسم ورواج ہیں اور خوراک جمع کرنے کے طریقے ہیں حتیٰ کہ مردے کو دفن کرنے اور صلح و جنگ کے حکم بھی ان میں پائے جاتے ہیں، اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ ایک زندہ چیونٹی دوسری مردہ چیونٹی کو اٹھائے لے جارہی ہے اس کا کیا مقصد ہے؟ تحقیق کرنے والوں کی تحقیق کے مطابق چیونٹیوں کے قبرستان ہوتے ہیں جہاں وہ اپنے مردوں کو دفن کرتے ہیں، مرنے والی چیونٹیوں کو ویسے ہی نہیں چھوڑ دیا جاتا، چیونٹیوں کے خوراک جمع کرنے کا خاص موسم ہوتا ہے جس میں وہ اپنے مطلب کی خوراک ذخیرہ کرتی ہیں اس کام کیلئے چیونٹیوں کی ڈیوٹیاں لگائی جاتی ہیں، طنطاوی رحمۃ اللہ علیہ نے "نظام العالم و الامم" میں لکھا ہے کہ سائنس دانوں کی تحقیق کے مطابق چیونٹیوں کے درمیان جنگ بھی ہوتی ہے اگر کوئی چیونٹی دشمن ملک میں چلی جائے تو وہاں پاؤں پر نہیں چلتی بلکہ الٹی ہو جاتی ہے اپنی پیٹھ زمین پر لگا دیتی ہے پھر اس علاقے کی فوج آتی ہے جو اسے اٹھا کر اپنے علاقے سے باہر نکال دیتی ہے، ان کے ہاں یہ صلح و جنگ کے اصول رائج ہیں، تحقیق کرنے والے کہتے ہیں کہ ان چیونٹیوں میں دودھ دینے والے جانور بھی انہی کی نسل سے ہوتے ہیں جن سے یہ دودھ حاصل کرتی ہیں، یہ سب قدرت کے حیرت انگیز شاہکار ہیں؛ غور وفکر کرنے والوں کیلئے اللہ تعالیٰ کی قدرت کے بہت سی نشانیاں موجود ہیں۔

دوسرے جانداروں کی طرح شہد کی مکھیوں کا بھی ایک الگ جہان ہے جہاں ان کے قانون نافذ ہیں، ان کے اپنے رسم ورواج ہیں جس کے تحت وہ زندگی بسر کرتی ہیں اور کام کاج کرتی ہیں، ان مکھیوں میں ایک بڑی مکھی ملکہ کہلاتی ہے باقی سب مکھیاں اس کے ماتحت ہوتی ہیں اور اس کا ہر حکم مانتی ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان مکھیوں کے

ذریعے انسان کیلئے شہد تیار فرمایا ہے جو نہایت مزیدار اور پاکیزہ ہوتا ہے، "سورۂ نحل" میں ہے کہ آپ کے رب نے شہد کی مکھیوں کی فطرت میں یہ بات ڈال دی ہے کہ وہ پہاڑوں اور درختوں میں اپنا گھر بنائیں اور ہر قسم کے پھل کھائیں پھر ان کے پیٹوں سے شفا بخشنے والا شہد نکلتا ہے، اس پورے نظام میں غور وفکر کرنے والوں کیلئے نشانیاں ہیں، ان مکھیوں کی فطرت میں داخل ہے کہ وہ گندگی پر نہیں بیٹھیں گی بلکہ ان کے ہاں کا قانون یہ ہے کہ وہ ہمیشہ پاکیزہ چیزوں پر بیٹھیں۔

غرضیکہ تمہاری طرح جانوروں اور پرندوں کی بھی امتیں ہیں جن کے پورے حالات کو اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں، یہ سب کے سب اللہ تعالیٰ کی پہچان رکھتے ہیں اور اس کے ایک ہونے کو جانتے اور مانتے ہیں، ایک روایت میں آتا ہے کہ تمام جاندار اپنے معبود کو بھی پہچانتے ہیں اور اپنی روزی کے ذریعوں کو بھی جانتے ہیں، نر اور مادہ ایک دوسرے کو خوب پہچانتے ہیں اور آپس کے تعلقات کیلئے تیار رہتے ہیں، چڑیوں اور کبوتروں کی مثال لے لیں، تنکا تنکا اکٹھا کر کے خود ہی اپنا گھونسلہ بناتے ہیں پھر چڑی اور کبوتری اس میں انڈے دیتی ہے جنہیں نر اور مادہ باری باری سیتے ہیں جب بچے نکلتے ہیں تو دونوں ان کی پرورش کی ذمہ داری قبول کرتے ہیں، نر اور مادہ اپنے اپنے منہ میں خوراک لاتے ہیں اور بچوں کے منہ میں ڈالتے ہیں، یہ سب کچھ بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت کے حیرت انگیز کرشمے ہیں۔

مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ: ہم نے کتاب میں کوئی کمی نہیں رہنے دی، اس میں ہر چیز لکھی ہوئی ہے، مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ کتاب سے مراد لوح محفوظ بھی ہو سکتی ہے، قرآن پاک بھی اور اعمال نامہ بھی، ظاہر ہے کہ ہر چیز لوح محفوظ میں لکھی ہوئی ہے اور قرآن پاک کے متعلق خود اس کا کہنا ہے کہ ہر خشک وتر چیز کا بیان اصولی طور پر قرآن کریم میں موجود ہے، مزید یہ کہ ہر شخص کا اعمال نامہ بھی تیار ہو رہا ہے جو حساب کتاب کے وقت اس کے سامنے کر دیا جائے گا جب سب کو اپنے رب کی طرف اکٹھا کیا جائے گا، اس اعمال نامہ میں انسان کا ہر عمل شامل ہوگا۔

عقل سے کام لینا

وَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا صُمٌّ وَّ بُكْمٌ فِي الظُّلُمٰتِ ۭ مَنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يُضْلِلْهُ ۭ وَمَنْ يَّشَاْ يَجْعَلْهُ عَلٰي صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝۳۹

اور وہ لوگ جنہوں نے جھٹلایا ساتھ آیتوں ہماری کو وہ بہرے اور گونگے ہیں میں اندھیروں جسے چاہے اللہ گمراہ کرے اسے اور جسے چاہے کرے اسکو اوپر راستے سیدھے (۳۹)

بامحاورہ ترجمہ:- اور جو ہماری آیتوں کو جھٹلاتے ہیں وہ بہرے اور گونگے ہیں اندھیروں میں اللہ جس کو چاہیں گمراہ کریں اور جس کو چاہیں سیدھی راہ پر ڈال دیں۔ (۳۹)

تفسیر

اس آیت میں ان لوگوں کی حالت سمجھائی گئی ہے جو قرآن مجید کی آیتوں کو جھوٹا کہتے ہیں اور راستہ کی نشانیاں نہیں پہچانتے، ارشاد ہے کہ جو لوگ ہماری آیتوں کو جھٹلا دیتے ہیں انہوں نے اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی عقل سے کام نہیں لیا گویا وہ روشنی بجھا دی جس سے انہیں راستہ سوجھتا اور اس کے نشان دکھائی دیتے اور ان کیلئے ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہو گیا، اب انہیں چاہئے تھا کہ جب انہیں خود کچھ نہیں سوجھتا تو دوسروں کی باتیں سن کر راستہ معلوم کریں اور اگر وہ اونچا سننے لگے ہیں تو زبان ہلا کر خود راستہ پوچھیں، جب ان لوگوں نے اپنی عقل کی روشنی بھی بجھا دی اور دوسروں کی بھی نہیں سنتے اور کسی سے راستہ پوچھتے بھی نہیں تو ظاہر ہے کہ وہ اندھیروں میں گھرے ہوئے بہرے اور گونگے ہیں اب ان کیلئے ہدایت کی کوئی صورت ہی نہیں، ادھر اللہ تعالیٰ میں یہ قدرت ہے کہ چاہیں تو گمراہ کریں چاہیں تو ہدایت دیں، ان لوگوں نے جب ہدایت کے سارے دروازے اپنے اوپر بند کر لیے تو اب ان کیلئے سوا گمراہی کے اور کیا رہ گیا اس لئے اللہ تعالیٰ نے انہیں گمراہ کر دیا کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں قاعدہ مقرر ہے کہ جو کوئی اپنی حالت جیسی بنا لیتا ہے اس کے ساتھ اسی کے مطابق سلوک کیا جاتا ہے۔

جس نے اللہ تعالیٰ کی نشانیوں سے فائدہ نہ اٹھایا جس نے حق کی بات سنی ہی نہیں وہ بہرہ ہے اور جس نے اسلام کا کلمہ زبان سے ادا ہی نہیں کیا وہ گونگا ہے، ایسے بہرے اور گونگے لوگ اندھیروں میں بھٹک رہے ہیں، کفر، شرک، منافقت، بدعتیں سب اندھیرے ہیں جن میں انکار کرنے والے اور جھوٹ بولنے والے لگے پڑے ہیں اور انہیں روشنی کی کوئی کرن نظر نہیں آتی، قرآن کریم کے اتارنے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اس کے ذریعے لوگوں کو اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لائیں مگر بدقسمت ہیں وہ لوگ جو محروم رہتے ہیں۔

مَنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يُضْلِلْهُ: اللہ تعالیٰ جسے چاہتے ہیں گمراہ کردیتے ہیں اور اس کا اصول یہی ہے کہ جو شخص ضد اور دشمنی کو اختیار کرتا ہے، ہٹ دھرمی کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو ہدایت نہیں دیتے، قرآن پاک کا فیصلہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ظلم کرنے والوں کو ہدایت سے نہیں نوازتے، جب ظلم کو چھوڑ کر نیکی کو اختیار کرے گا کفر اور شرک کے بجائے ایمان اور توحید کو اپنالے گا، نیکی کی تڑپ اس میں پیدا ہو جائے گی تو پھر اللہ تعالیٰ اس کیلئے ہدایت کا راستہ بھی واضح کردیں گے، وہ ہر شخص کی صلاحیت اور طلب کو جانتے ہیں اس لئے جس کو چاہتے ہیں سیدھے راستے پر ڈال دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس راستے پر چلو کہ یہی سیدھا راستہ ہے؛ تم نشانیاں طلب کرتے ہو حالانکہ تمہارے اردگرد لاکھوں نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں اگر ذرا بھی غور کرتے تو اللہ تعالیٰ کے ایک ہونے کو سمجھ جاتے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ انسان یا تو اپنی عقل سے کام لے کر ٹھیک ٹھیک چلے یا وہ عقلمندوں کی باتیں سن کر ان پر عمل کرے اور پھر بھی اگر سمجھ میں نہ آئے تو خود پوچھ کر ٹھیک راستہ معلوم کرے ورنہ وہ اندھیروں میں پھنسا ہوا بہرا اور گونگا ہے۔

مصیبت میں اللہ تعالیٰ کی یاد

قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ اَوْ اَتَتْكُمُ السَّاعَةُ

آپ کہہ دیجئے | تم یہ تو بتاؤ | اگر | آئے تم پر | عذاب | اللہ کا | یا | آئے تم پر | قیامت

اَغَيْرَ اللّٰهِ تَدْعُوْنَ ۚ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۴۰﴾ بَلْ اِيَّاهُ تَدْعُوْنَ

سوا اللہ کے پکاروگےتم اگر تم ہو سچے (۴۰) کوئی نہیں اسی کو پکارتے ہوتم

فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ وَ تَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُوْنَ ﴿۴۱﴾

ع ۱۱ ۱۰

پس دور کردیتا ہے وہ کہ پکارتے ہو لیے جس کے اگر چاہے اور بھول جاتے ہو جو تم شریک کرتے ہو (۴۱)

بامحاورہ ترجمہ:۔ آپ کہہ دیجئے دیکھو تو! اگر تم پر اللہ کا عذاب یا تم پر قیامت آئے کیا اللہ کے سوا کسی اور کو پکارو گے؟ بتاؤ اگر تم سچے ہو۔ (۴۰) بلکہ اسی کو پکارتے ہو پھر جس مصیبت (کے دور کرنے) کیلئے اسے پکارتے ہو (اس مصیبت کو) دور کر دیتے ہیں اگر چاہتے ہیں اور تم بھول جاتے ہو جن کو تم شریک کرتے ہو۔ (۴۱)

تفسیر

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ انسان کے سر پر جب کوئی مصیبت آپڑتی ہے تو اس کے ہوش گم ہو جاتے ہیں اور یہ ان خواہشوں کو جنہیں اس نے اپنا خدا بنا رکھا تھا بالکل بھول جاتا ہے اور سوا اللہ تعالیٰ کے اسے کچھ نظر نہیں آتا، بے تحاشا اسی کو پکارتا ہے اور وہی اللہ اگر چاہیں تو اس کی مصیبت کو دور کر دیتے ہیں، مایوسی کی حالت میں یہی ہوتا ہے کہ جب کوئی مددگار نظر نہیں آتا یا سب مددگار جواب دے دیتے ہیں تو ظاہری طور پر تو اللہ تعالیٰ کو پکارتے ہیں منہ سے بھی اکثر انسان یا اللہ کہہ اٹھتے ہیں اور اپنی اپنی بولیوں میں سب اسی کو پکارنے لگتے ہیں۔

ارشاد ہے کہ اے پیغمبر! ان سے یہ پوچھئے کہ اگر آج تم پر کوئی عذاب آجائے یا قیامت جو سب سے بڑی مصیبت ہے آجائے تو سچ سچ بتاؤ کیا اس وقت بھی تم اپنے ان بناوٹی معبودوں کو پکارو گے؟ نہیں نہیں! اس وقت تمہاری آنکھیں کھل جائیں گی اور تم اسی حقیقی خدا کو پکارنے لگو گے جسے تم بھولے ہوئے تھے۔

دنیا کی چھوٹی چھوٹی مصیبتوں میں بھی اکثر یہی ہوتا ہے پھر بڑے عذاب اور قیامت کا تو کہنا ہی کیا ہے اس لئے عقلمند وہی ہے جو پہلے ہی اللہ تعالیٰ کو پہچان لے اور اس بات کو مان لے کہ سوا اس کے نہ کوئی مددگار ہے اور نہ

کوئی مصیبت سے چھڑانے والا ہے خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی، آخر کار ایسے ہی لوگوں کی ہر مصیبت اور رنج وغم سے نجات ہوگی۔

سخت دلی

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ

اور تحقیق بھیجے ہم نے پیغمبر طرف امتوں کی سے پہلے آپ پھر پکڑا ہم نے ان کو ساتھ سختی کے

وَ الضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ ﴿۴۲﴾ فَلَوْلَآ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَا

اور ساتھ دکھ کے تاکہ وہ عاجزی کریں (۴۲) پس کیوں نہیں جب آیا ان پر عذاب ہمارا

تَضَرَّعُوْا وَ لٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ

گڑگڑائے وہ اور لیکن سخت ہوگئے دل ان کے اور اچھا بنادیا لئے ان کے شیطان نے

مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۴۳﴾

جو تھے وہ کرتے (۴۳)

با محاورہ ترجمہ:۔ اور ہم نے بہت سی امتوں کی طرف آپ سے پہلے پیغمبر بھیجے تھے، پھر ان کو سختی میں اور تکلیف میں پکڑا تا کہ وہ گڑگڑائیں۔ (۴۲) پھر کیوں نہ گڑگڑائے جب ان پر ہمارا عذاب آیا لیکن ان کے دل سخت ہوگئے اور ان کو شیطان نے وہ کام خوبصورت کر دکھائے جو وہ کرتے تھے۔ (۴۳)

لفظی تحقیق: بَاْسَ: اس سے مراد معاشی تنگدستی ہے۔ ضَرَّآءِ: اس سے مراد جسمانی تکلیف یا بیماری ہے۔ بَاْسَ اور ضَرَّآءِ کا مفہوم یہ ہے کہ ہم نے ان پر جو محنت و مصیبت دنیا میں ڈالی اس کا مقصد حقیقت میں عذاب دینا نہ تھا بلکہ یہ تھا کہ مصیبت میں قدرتی طور پر ہر شخص کو خدا یاد آیا کرتا ہے اس لئے اس محنت میں ڈال کر اپنی طرف توجہ دلانا مقصود تھا۔

تفسیر

مکہ کے مشرکوں سے سوال کیا گیا کہ اگر تم پر آج کوئی مصیبت آپڑے مثلاً: اللہ تعالیٰ کا عذاب اسی دنیا میں تم پر آجائے یا موت یا قیامت کا ہولناک ہنگامہ برپا ہوجائے تو اپنے دلوں میں غور کر کے بتلاؤ کہ تم اس وقت اپنی مصیبت کو دور کرنے کیلئے کس کو پکارو گے اور کس سے امید رکھو گے کہ وہ تمہیں عذاب اور مصیبت سے نجات دلائے؟ کیا یہ پتھر کے بت یا مخلوق میں سے دوسرے لوگ جن کو تم نے معبود کی حیثیت دے رکھی ہے اس وقت تمہارے کچھ کام آئیں گے؟ اور تم ان سے فریاد کرو گے یا صرف ایک اللہ تعالیٰ کو ہی اس وقت پکارو گے؟ اس کا جواب کسی ہوش والے انسان کی طرف سے سوائے اس کے ہو ہی نہیں سکتا کہ جو خود حق تعالیٰ نے ان کی طرف سے ذکر فرمایا کہ اس عام مصیبت کے وقت بڑے سے بڑا مشرک بھی سب بتوں اور خود کے بنائے ہوئے معبودوں کو بھول جائے گا اور صرف خدا تعالیٰ کو پکارے گا۔

یہ مضمون پچھلی آیتوں کا خلاصہ ہے ان میں مثال کے طور پر یہ بتلایا گیا کہ تمہارے کفر اور نافرمانی کی سزا میں تم پر اسی دنیا کی زندگی میں بھی عذاب آسکتا ہے اور فرض کرلو زندگی میں عذاب نہ آیا تو قیامت کا آنا تو یقینی ہے جہاں انسان کے سب عملوں کا جائزہ لیا جائے گا۔

اس آیت میں پچھلے زمانہ کے لوگوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ ان کے حالات دیکھ کر سبق سیکھو کہ انسان کو سمجھانے کیلئے یہ قاعدہ مقرر ہے کہ اللہ تعالیٰ پہلے اپنے پیغمبر لوگوں کے پاس بھیجتے ہیں جب ان کی نہیں سنتے تو ان پر سختیاں اور مصیبتیں اترتی ہیں، ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ وہ ان تکلیفوں کے دیکھتے ہی اللہ تعالیٰ کے سامنے جھک جاتے اور اس کے آگے گڑگڑاتے لیکن ہوا یہ کہ ان کے دل سخت ہوگئے اور شیطان نے ان کے برے کام خوب سجا سجا کر ان کے سامنے پیش کیے کہ جو تم کر رہے ہو ٹھیک کر رہے ہو اور اس پر قائم رہو، یہ تکلیف اور مصیبت تو آتی رہتی ہیں ان کی کچھ پرواہ نہ کرو، اس طرح وہ ان میں پھنس کر اللہ تعالیٰ سے بالکل غافل ہوگئے۔

ان آیتوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ لوگ جب بری باتوں اور برے کاموں میں پھنس جاتے ہیں اور پیغمبر کے سمجھانے سے نہیں سمجھتے تو ان پر خشک سالی، وبا، طوفان، زلزلے وغیرہ بھیجے جاتے ہیں غرض یہ ہوتی ہے کہ ان کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ کے آگے جھکیں اور توبہ واستغفار کریں۔

ظلم کا انجام

فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ؕ

پس جب بھول گئے وہ کہ یاد دلائے گئے جس کی پس کھول دیئے ہم نے پر ان دروازے ہر چیز کے

حَتّٰۤى اِذَا فَرِحُوْا بِمَاۤ اُوْتُوْۤا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ

یہاں تک کہ جب خوش ہوگئے اس سے جو دیا گیا انہیں پکڑ لیا ہم نے ان کو اچانک پس اچانک وہ

مُّبْلِسُوْنَ ﴿۴۴﴾ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ؕ وَ الْحَمْدُ

مایوس ہوگئے (۴۴) پس کاٹ دی گئی جڑ اس قوم کی جنہوں نے ظلم کیا اور تعریفیں ساری

لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۵﴾

لئے اللہ کے پروردگار جہانوں کا (۴۵)

بامحاورہ ترجمہ:۔ پھر جب وہ اس نصیحت کو جو انہیں کی گئی تھی بھول گئے تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیئے یہاں تک کہ جب وہ ان چیزوں پر جو ان کو دی گئیں خوش ہوئے تو ہم نے ان کو اچانک پکڑ لیا پس اس وقت وہ ناامید ہو گئے۔ (۴۴) پھر ان ظالموں کی جڑ کٹ گئی اور سب تعریفیں اللہ کیلئے ہیں جو سارے جہان کے پالنے والے ہیں۔ (۴۵)

تفسیر

ارشاد ہے کہ جب انہوں نے مصیبتوں سے بھی سبق حاصل نہیں کیا تو ہم نے انہیں ڈھیل دی اور مال و

دولت، عزت و بادشاہت سب کی ان کے اوپر بوچھاڑ کردی اور انہوں نے دل کھول کر جیسے جی چاہا زندگی کا مزہ اٹھایا اور بالکل نڈر ہوگئے اور وہ اپنی گمراہی کو ٹھیک راستہ سمجھنے لگے، جب ان کی خوشی مکمل ہوگئی تو ہم نے انہیں اچانک پکڑ لیا اور وہ کچھ نہ کرسکے، چاروں طرف سے انہیں مایوسی نے گھیر لیا آخر تباہ و برباد ہوگئے اور وہ ان کی ضد، ہٹ دھرمی، ان کا اترانا اور شیخیاں بگھارنا سب کچھ رکھا رہ گیا غرض ظالم لوگوں کا منہ کالا ہوا۔

اللہ تعالیٰ نے انہیں اس بات کے سمجھنے کیلئے کافی مہلت دی کہ وہ اس جہان کے مالک اور اس کے پالنے والے کو سمجھیں اور اس کے سامنے اپنی عاجزی کا اقرار کریں لیکن وہ اپنی ہی اکڑ میں رہے اور کسی کی نہ سنی، آخر بری طرح منہ کی کھائی اور ان پر اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کا عذاب اترا اور ان کا ستیاناس ہوگیا، آخرت میں جو عذاب ہوگا وہ الگ رہا۔

وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ: آیت کے آخر میں فرمایا: جس میں اشارہ کیا گیا کہ مجرموں اور ظالموں پر جب کوئی عذاب و مصیبت آئے تو پورے عالم کیلئے ایک نعمت ہے جس پر لوگوں کو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔

توبہ میں دیر نہ کرے

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَ اَبْصَارَكُمْ وَ خَتَمَ

آپ کہہ دیجئے کیا دیکھتے ہو! اگر لے لے اللہ کان تمہارے اور آنکھیں تمہاری اور مہر لگادے

عَلٰى قُلُوْبِكُمْ مَّنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِهٖ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ

اوپر دلوں تمہارے کے کون معبود ہے سوا اللہ کے جو لائے پاس تمہارے یہ چیز دیکھئے! کس طرح

نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُوْنَ ﴿۴۶﴾ قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ

ادل بدل کرلاتے ہیں ہم آیتوں کو پھر وہ منہ پھیرتے ہیں (۴۶) آپ کہہ دیجئے دیکھو تو سہی! اگر

اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ بَغْتَةً اَوْ جَهْرَةً هَلْ يُهْلَكُ اِلَّا

آئے تم پر عذاب اللہ کا اچانک یا کھلے طور پر کیا ہلاک ہوگا کوئی سوا

اَلْقَوْمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۷﴾

قوم کے ظالموں کی (۴۷)

بامحاورہ ترجمہ:۔ آپ کہہ دیجئے دیکھوتو! اگر اللہ تمہارے کان اور آنکھیں چھین لیں اور تمہارے دلوں پر مہر کر دیں تو اللہ کے سوا کون ایسا رب ہے جو تم کو یہ چیزیں لا کر دے؟ دیکھو! ہم کیسے طرح طرح سے باتیں بیان کرتے ہیں پھر بھی وہ اس سے کنارہ کرتے ہیں۔ (۴۶) آپ کہہ دیجئے دیکھوتو! اگر تم پر اللہ کا عذاب آئے اچانک یا ظاہر ہو کر تو ظالم لوگوں کے سوا کون ہلاک ہو گا؟ (۴۷)

تفسیر

انسانی فطرت یہ ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ کی طرف جھکے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ جس وقت سخت مصیبت آتی ہے تو آدمی مجبوراً اللہ تعالیٰ ہی کو پکارتا ہے اور دوسری چیزوں کو بھول جاتا ہے اور فطری چیز وہی ہے جس پر انسان مصیبت کے وقت عمل کرے بشرطیکہ وہ شیطان نہ بن گیا ہو، اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے ایک معبود ہونے کی ایک اور دلیل دی ہے۔

ارشاد ہے کہ فرض کرو اللہ تعالیٰ تم سے تمہاری کام کی چیزیں چھین لیں تو ایسا کون ہے جو ان چیزوں کو تمہیں دے دے؟ تمہارے جسم میں سب سے زیادہ کام کی چیزیں یہی تین ہیں کان، آنکھ اور دل، اگر اللہ تعالیٰ کان بہرے اور آنکھیں اندھی کر دیں اور دل کو اس کے کاموں سے روک دیں اور انسان بہرہ، اندھا اور بے سمجھ ہو جائے تو یہ چیزیں کوئی نہیں دے سکتا۔

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں اس حقیقت کو بار بار سمجھاتے ہیں اور ہر بار سمجھانے کا نیا طریقہ اختیار کرتے ہیں لیکن لوگ ذرا توجہ نہیں کرتے اور منہ موڑے چلے جاتے ہیں، ان سے یہ بھی پوچھو کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب آیا تو ظالم لوگ تباہی سے کیسے بچیں گے؟ اس کا عذاب اچانک بھی آسکتا ہے اور مہلت دے کر خبر دار کرنے اور نشانیاں بھیجنے

کے بعد بھی آسکتا ہے، دونوں صورتوں میں ظالم لوگ خود ہی تباہ ہوں گے، اللہ تعالیٰ کا وہ کچھ نہیں بگاڑیں گے۔

اکثر اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ مجموعی طور پر عذاب آتا ہے تو اس میں اچھے و برے سب گرفتار ہوجاتے ہیں، جیسے: سیلاب آجائے، زلزلہ آجائے، آسمانی بجلی گرے، کوئی مہلک بیماری پھیل جائے تو اس کا نشانہ ہر قسم کے لوگ بن جاتے ہیں، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کا حل اس طرح فرمایا ہے کہ قبر اور آخرت میں سب لوگ اپنے عملوں اور نیت کے مطابق اٹھائے جائیں گے اگرچہ وہ دنیا میں کسی آفت کا شکار ہوچکے ہوں مگر ان کے ساتھ آخرت کا معاملہ ان کے عمل اور نیت کی بنیاد پر طے ہوگا، وہاں اچھے لوگ کسی سزا میں مبتلا نہیں ہوں گے برخلاف اس کے عذاب کے حقدار ظالم لوگ ہی ہوں گے۔

انسانی جسم میں ان تینوں چیزوں (کان، آنکھ اور دل) کو بڑی اہمیت حاصل ہے، آنکھیں اور کان انسان کے علم حاصل کرنے کے ذریعے ہیں ان کے بغیر انسان کی کوئی زندگی نہیں، آنکھوں کے ذریعے انسان دیکھتا ہے اور ظاہر ہے کہ جب تک کوئی چیز نظر نہیں آئے گی اس سے مکمل طور پر فائدہ حاصل نہیں کیا جاسکتا، حقیقت یہ ہے کہ آنکھ ہے تو جہاں ہے، زندگی کا مزہ آنکھوں کے ساتھ ہی ہے اگر آنکھیں نہیں ہیں تو پوری دنیا گھپ اندھیرا ہے، اسی طرح کانوں کی بھی بڑی اہمیت ہے کان کے ذریعے ہی انسان معلومات حاصل کرتا ہے اور پھر انہیں دل تک پہنچ ہوتی ہے، کان اور آنکھ کے بعد تیسری چیز دل ہے، دل ہی انسان کا مرکز ہے، اچھے یا برے تمام اخلاق دل ہی میں پیوست ہوتے ہیں کسی چیز پر عمل کرنے کا پکا ارادہ دل ہی سے پیدا ہوتا ہے اور پھر انسان وہ کام کرگزرتا ہے، غرضیکہ یہ تینوں چیزیں انسان کیلئے علم وعمل کے ذریعے ہیں اور ان کے بارے میں ہر شخص کو جواب دینا ہے۔

اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُوْنَ: اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اپنے "وحدہٗ لاشریک لہٗ" ہونے کی دلیلیں مختلف طریقوں سے پیش کی ہیں، کبھی نیکی کی طرف رغبت دلائی ہے اور کبھی برائی سے ڈرانے کے رنگ میں بات سمجھائی ہے، کبھی کوئی بات مثال کے ذریعے بیان کی ہے اور کبھی گزری ہوئی قوموں کا حال بیان کرکے ڈرایا ہے، مختلف انداز سے بات کرنے کا مقصد یہ ہے کہ انسان کسی نہ کسی طریقے سے حقیقت کو

پالے، "سورۂ حشر" میں ہے کہ یہ مثالیں ہیں جو ہم لوگوں کے سمجھانے کیلئے بیان کرتے ہیں تاہم سمجھتے وہی لوگ ہیں جوعقل سے کام لیتے ہیں وگرنہ اکثر لوگ منہ ہی موڑتے ہیں، تو یہاں پر اللہ تعالیٰ نے عقلی طور پر یہ بات سمجھائی ہے کہ دیکھو! اللہ تعالیٰ نے تمہیں کان، آنکھ اور دل جیسی عظیم نعمتیں دی ہیں، لہٰذا ان سے فائدہ اٹھاؤ، اگر خدا تعالیٰ ان کو چھین لیں گے تو پھر کوئی واپس لوٹانے والا نہیں ہوگا۔

خوشخبری اور ڈراوا

وَ مَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ ۚ فَمَنْ اٰمَنَ

اور نہیں بھیجتے ہم پیغمبر مگر خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے پس جو ایمان لائے

وَ اَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝۴۸ وَ الَّذِيْنَ

اور ٹھیک چلے پس نہیں خوف پران اور نہ وہ غمگین ہوں گے (۴۸) اور جن لوگوں نے

كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا يَمَسُّهُمُ الْعَذَابُ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۝۴۹

جھٹلایا آیتوں ہماری کو پہنچے گا ان کو عذاب بوجہ اسکے کہ وہ تھے نافرمانی کرتے (۴۹)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور ہم پیغمبروں کو خوشی اور ڈر سنانے ہی کیلئے بھیجتے ہیں، پھر جو کوئی ایمان لایا اور سنور گیا تو ان پر نہ ڈر ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ (۴۸) اور جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا ان کو عذاب پہنچے گا اس لئے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے۔ (۴۹)

تفسیر

اس آیت میں ارشاد ہے کہ ہمارا پیغمبروں کو بھیجنے سے سوا اس کے اور کوئی مقصد نہیں کہ تمام لوگوں کو خوشخبری اور ڈراوا دے دیں، جو لوگ ان کی بات مان کر ایمان لے آئیں گے اور نیک کاموں میں مشغول ہو جائیں گے ان کو خوشخبری دے دیں کہ ان کو نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ رنج و غم سے پالا پڑے گا اور جو لوگ

قرآن کریم کی آیتوں کو اور ان نشانیوں کو جھٹلائیں اور ٹالنے کیلئے کوئی خاص نشانی طلب کریں ان کو ڈرائیں کہ تمہیں عذاب ہوگا۔

یہاں سے یہ بات صاف سمجھ میں آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر اللہ تعالیٰ کی طرف سے لوگوں کو ایک پیغام پہنچانے آتے ہیں اور وہ پیغام یہ ہے کہ اس دنیا کی زندگی میں وہی کام کرنے چاہئیں جس کے کرنے کی اللہ تعالیٰ نے اجازت دی ہے اور جن کاموں سے اس نے روکا ہے رک جانا چاہئے، یہی وہ طریقہ ہے جس سے انسان خوف اور غم سے چھٹکارا پاسکتا ہے جس نے اس قانون کی پرواہ نہ کی وہ نافرمان لکھا جائے گا اور اس کو اس کی نافرمانی کی سخت سزا ملے گی۔

جو شخص ایمان لے آیا اس نے اللہ تعالیٰ کی ذات اس کی صفتوں اس کے پیغمبروں، کتابوں اور آخرت کے دن کو دل سے مان لیا اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو سنوار لیا، نیک کاموں کو اختیار کرلیا اور برے کاموں سے بچ گیا، اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کیا، دوسروں کے حقوق کو پہچان لیا، اگر کسی کا حق ضائع کیا ہے تو اس کو ادا کیا یا معاف کرالیا ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہ تو پوچھ گچھ اور پکڑ کا خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے، ظاہر ہے کہ جو شخص ایمان قبول کرنے کے بعد خود کو سنوار لے گا اسے اطمینان حاصل ہوجائے گا اور وہ اپنے پچھلے کاموں پر شرمندہ نہیں ہوگا۔

پیغمبر کی حیثیت

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِىْ خَزَآىِٕنُ اللّٰهِ وَ لَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ

آپ کہہ دیجئے نہیں کہتا میں سے تم پاس میرے خزانے ہیں اللہ کے اور نہ جانتا ہوں میں غیب

وَ لَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّىْ مَلَكٌ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَىَّ ؕ

اور نہیں کہتا ہوں میں سے تم بیشک میں فرشتہ ہوں نہیں پیروی کرتا میں مگر جو وحی کیا جاتا ہے طرف میری

ع ۹ قُلْ هَلْ يَسْتَوِى الْاَعْمٰى وَ الْبَصِيْرُ ۗ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ ۝۵۰

آپ کہہ دیجئے کیا برابر ہوتا ہے اندھا اور آنکھوں والا کیا پس نہیں سوچتے تم (۵۰)

بامحاورہ ترجمہ:۔ آپ کہہ دیجئے کہ میں تم سے نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب کی بات جانتا ہوں اور نہ میں تم سے کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں میں تو اسی پر چلتا ہوں جو میرے پاس اللہ کا حکم آتا ہے، آپ کہہ دیجئے اندھا اور دیکھنے والا کب برابر ہو سکتا ہے سو کیا تم غور نہیں کرتے؟ (۵۰)

تفسیر

ارشاد ہے کہ اے پیغمبر! ان سے کہہ دیجئے کہ میں نے یہ دعویٰ کبھی نہیں کیا نہ اب کرتا ہوں کہ میں اللہ تعالیٰ کے خزانوں کا مالک ہوں جو تم مانگو گے وہ تم کو دے دوں گا، نہ میں غیب کی باتیں جانتا ہوں نہ کبھی میں نے یہ کہا کہ میں کوئی فرشتہ ہوں اور دنیا کی ضرورتوں سے آزاد ہوں، میں تو تمہاری طرح ایک آدمی ہوں بس اتنا فرق ہے کہ میری طرف وحی آتی ہے اس میں مجھے بتلایا جاتا ہے کہ مجھے کیا کرنا چاہئے، چنانچہ میں وہی کرتا ہوں جو مجھ سے کرنے کیلئے کہا جاتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں آدمی نہیں رہا کچھ اور ہو گیا ہوں، بات صرف اتنی ہے کہ آدمی آدمی میں بھی فرق ہوتا ہے اور تم دیکھتے ہو کہ کوئی آدمی زیادہ سمجھدار ہوتا ہے کوئی کم، کوئی دور تک کی بات دیکھ لیتا ہے کوئی قریب کی بھی نہیں دیکھ سکتا، کوئی اندھا ہے کوئی آنکھوں والا ہے بس مجھ میں اور تم میں اتنا ہی فرق ہے کہ مجھے وہ باتیں سمجھادی گئی ہیں جن کو اور لوگ نہیں سمجھتے، اس میں غور کرو یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جس کا سمجھنا مشکل ہو بات اتنی ہے کہ تم غور اور فکر سے کام نہیں لیتے۔

اس آیت میں ان لوگوں کے سوالوں اور مطالبوں کا جواب ایک خاص انداز سے دیا گیا ہے، مکہ کے کافروں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مختلف وقتوں میں تین مطالبے کئے تھے، پہلا یہ کہ اگر آپ واقعی اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ہیں تو معجزہ کے ذریعہ ہمارے لئے ساری دنیا کے خزانے جمع کردیجئے، دوسرے یہ کہ اگر آپ واقعی سچے پیغمبر ہیں تو

ہمارے مستقبل میں پیش آنے والے تمام فائدہ مند یا نقصان دہ حالات و واقعات بتا دیجئے تا کہ ہم فائدہ مند چیزوں کے حاصل کرنے اور نقصان دہ صورتوں سے بچنے کا انتظام پہلے ہی کرلیا کریں، تیسرے یہ کہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہماری ہی قوم کا ایک انسان جو ہماری ہی طرح ماں باپ سے پیدا ہوا اور تمام انسانی ضرورتیں کھانے پینے بازاروں میں چلنے پھرنے وغیرہ میں ہمارے ساتھ شریک ہے وہ اللہ تعالیٰ کا پیغمبر بن جائے، کوئی فرشتہ ہوتا جس کی پیدائش اور رہن سہن طور طریقے ہم سب سے اعلیٰ ہوتے تو ہم اس کو خدا تعالیٰ کا پیغمبر اور اپنا رہنما مان لیتے۔

ان تینوں سوالوں کے جواب میں "قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَ لَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَ لَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ" اتری یعنی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت دی گئی کہ ان لوگوں کے بے فائدہ سوالوں کے جواب میں آپ ان سے صاف کہہ دیں کہ تم جو مجھ سے دنیا کے خزانوں کا مطالبہ کرتے ہو تو میں نے کب یہ دعویٰ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سب خزانے میرے ہاتھ میں ہیں؟ اور تم جو یہ مطالبہ کرتے ہو کہ مستقبل میں پیش آنے والے فائدہ مند یا نقصان دہ معاملہ اور واقعہ کو میں تمہیں بتلا دوں تو میں نے کب یہ دعویٰ کیا ہے کہ میں غیب کی چیزوں کو جانتا ہوں؟ اور تم جو مجھ میں فرشتوں کی مخصوص صفتیں دیکھنا چاہتے ہو تو میں نے کب کہا ہے کہ میں فرشتہ ہوں؟ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کا خلاصہ یہ ہے کہ مجھ سے دلیل اس چیز کی مانگی جاسکتی ہے جس کا میں نے دعویٰ کیا ہو، یعنی یہ کہ میں اللہ تعالیٰ کا پیغمبر ہوں اس کی بھیجی ہوئی ہدایت انسانوں کو پہنچاتا ہوں اور خود بھی ان کی پیروی کرتا ہوں اور دوسروں کو بھی اس کی تاکید کرتا ہوں، چنانچہ اس کیلئے ایک دو نہیں بیشمار دلیلیں پیش کی جاچکی ہیں۔

پیغمبر ہونے کے دعویٰ کیلئے نہ یہ ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کا پیغمبر اللہ تعالیٰ کے سب خزانوں کا مالک ہو جائے اور نہ یہ ضروری ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی طرح غیب کی ہر چھوٹی بڑی چیز سے واقف ہو اور نہ یہ ضروری ہے کہ وہ انسان ہونے کے بجائے کوئی فرشتہ ہو بلکہ پیغمبر کا کام صرف اتنا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجی ہوئی وحی کی

پیروی کرے جس میں خود اس پر عمل کرنا بھی داخل ہے اور دوسروں کو اس پر عمل کرنے کی دعوت دینا بھی داخل ہے۔

اس ہدایت نامہ سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقام کی حقیقت کو بھی واضح فرما دیا گیا اور پیغمبر کے بارے میں جو غلط تصورات ان لوگوں نے قائم کر رکھے تھے ان کو دور بھی کر دیا گیا اور اس کے ضمن میں مسلمانوں کو بھی ہدایت کر دی گئی کہ وہ عیسائیوں کی طرح اپنے پیغمبر کو خدا نہ بنائیں، ان کی عظمت و محبت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ان کے متعلق یہودیوں اور عیسائیوں کی طرح کمی بیشی میں نہ پڑ جائیں کہ یہودیوں نے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شان میں اس طرح گستاخی کی کہ ان کے درجے کو گھٹا دیا اور ناجائز بچہ قرار دیا اور عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شان میں گستاخی اس طرح کی کہ ان کے درجے کو حد سے آگے بڑھا دیا یہاں تک کہ ان کو خدا کا بیٹا قرار دیا۔

اس آیت کے پہلے جملے میں جو یہ ارشاد فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے خزانے میرے ہاتھ میں نہیں، ان خزانوں سے کیا مراد ہے؟ مفسرین نے بہت سی چیزوں کے نام لئے ہیں مگر خود قرآن کریم نے جہاں اللہ تعالیٰ کے خزانوں کا ذکر کیا ہے تو اس میں فرمایا ہے کوئی چیز دنیا کی ایسی نہیں جس کے خزانے ہمارے پاس نہ ہوں، اس سے معلوم ہوا کہ "خزائن اللہ / اللہ تعالیٰ کے خزانے" کا مفہوم دنیا کی تمام چیزوں کو شامل ہے کچھ خاص چیزوں کو متعین نہیں کیا جا سکتا اور جن مفسرین نے مخصوص چیزوں کے نام لئے ہیں وہ بھی بطور مثال کے ہے، اس لئے اختلاف کچھ نہیں اور جب اس آیت نے بتلا دیا کہ خدائی کے سارے خزانے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ میں بھی نہیں ہیں تو پھر امت کے کسی بزرگ یا ولی کے متعلق یہ خیال کرنا کہ وہ جو چاہیں کر سکتے ہیں جس کو چاہیں دے سکتے ہیں کھلی ہوئی جہالت ہے۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غیب جاننے کی حقیقت

یہاں یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اس معاملہ میں کسی مسلمان کو اعتراض نہیں ہو سکتا کہ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو غیب کی بہت ساری چیزوں کا علم عطا فرمایا تھا بلکہ تمام فرشتوں اور پہلوں اور پچھلوں کو جتنا علم دیا

گیا ہے ان سب سے زیادہ پیغمبر ﷺ کو علم عطا فرمایا گیا تھا یہی پوری امت کا عقیدہ ہے ہاں اس کے ساتھ ہی قرآن وسنت کی بیشمار وضاحت کے مطابق تمام علماء کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ تمام کائنات کی تمام چیزوں کا مکمل علم صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے جس طرح اس کے خالق ورازق اور قادر ہونے میں کوئی فرشتہ یا پیغمبر اس کے برابر نہیں ہوسکتا اسی طرح اس کے علم میں بھی کوئی اس کے برابر نہیں ہوسکتا اسی لئے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی فرشتہ یا پیغمبر کو غیب کی بہت سی چیزیں معلوم ہونے کے باوجود عالم الغیب نہیں کہا جاسکتا، خلاصہ یہ ہے کہ محمد مصطفی ﷺ کے کمالات کے بارے میں بڑا اور مختصر جملہ یہ ہے کہ: بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر۔

علمی کمالات میں بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بعد تمام فرشتوں اور پیغمبروں سے آپ کا علم بڑھا ہوا ہے مگر اللہ تعالیٰ کے برابر نہیں، برابری کا دعویٰ کرنا اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرانا ہے۔

آخر آیت میں یہ ارشاد فرمایا کہ اندھا اور آنکھوں والا برابر نہیں ہوسکتے، مطلب یہ ہے کہ نفسانی جذبات اور ضد کو چھوڑ کر حقیقت کو دیکھو تا کہ تمہارا شمار اندھوں میں نہ رہے تم آنکھوں والے ہو جاؤ۔

قرآن کریم سے فائدہ کون اٹھائیگا؟

وَ اَنْذِرْ بِهِ الَّذِیْنَ یَخَافُوْنَ اَنْ یُّحْشَرُوْۤا اِلٰی رَبِّهِمْ لَیْسَ

اور ڈرایئے ساتھ اسکے ان کو جو ڈرتے ہیں کہ اکٹھے کئے جائیں گے طرف رب اپنے کے نہ ہوگا

لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِیٌّ وَّ لَا شَفِیْعٌ لَّعَلَّهُمْ یَتَّقُوْنَ ﴿۵۱﴾

لئے ان کے اس کے سوا کوئی حمایتی اور نہ سفارش کرنے والا تاکہ وہ بچتے رہیں (۵۱)

بامحاورہ ترجمہ: ۔اور اس سے ان لوگوں کو خبردار کردیجئے جن کو اس کا ڈر ہے کہ وہ اپنے رب کے سامنے جمع ہوں گے اس طرح کے اللہ کے سوا نہ کوئی ان کا حمایتی ہوگا اور نہ سفارش کرنے والا تاکہ وہ بچتے رہیں۔ (۵۱)

تفسیر

ارشاد ہے کہ جن لوگوں کو یہ خوف ہے کہ ایک دن وہ اپنے رب کے سامنے حاضر کیے جائیں گے اور اس وقت ان کا حمایتی اور سفارشی کوئی نہ ہوگا سب کو اپنی اپنی پڑی ہوگی ہر ایک کا معاملہ پرودگار کے ساتھ ہوگا سوا اس کے کوئی کسی کا ساتھی ہوگا نہ مددگار، یہ لوگ قرآن مجید کی ہدایتوں سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، قرآن مجید ان کو سمجھائے گا کہ اپنے رب کے سامنے سرخرو ہونا ہے تو آج اس دنیا میں اس کے حکموں کو پورا کرو اور جو اس نے حدیں مقرر کیں ہیں ان کے اندر رہ کر اپنی زندگی بسر کرو اور جو کام کرو اس کی رضامندی کیلئے کرو اور جس چیز سے وہ منع کرے اسے بالکل چھوڑ دو، اسی کا نام تقویٰ ہے اور یہی لوگ تقویٰ حاصل کر کے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، ان میں صلاحیت موجود ہے، "سورۂ بقرہ" کی ابتدائی آیت میں کہا گیا تھا کہ یہ قرآن متقیوں کیلئے ہدایت کا ذریعہ بن سکتا ہے، اس آیت میں اس کی مزید تشریح کر دی گئی ہے کہ متقی بننے کی صلاحیت اس میں ہوتی ہے جو ڈرتا ہو اور بے باکی سے کوئی کام نہ کرتا ہو، پہلے یہ سوچتا ہو کہ یہ کام صحیح ہے یا غلط پھر کام کو سرانجام دیتا ہو، ایسے لوگوں کیلئے قرآن کریم رہبر و رہنما ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ قیامت کے متعلق تین طرح کے آدمی ہیں: **ایک** وہ جو یقینی طور پر اس کا عقیدہ رکھتے ہیں، **دوسرے** وہ جو شک میں پڑے ہوئے ہیں، **تیسرے** وہ جو بالکل نہیں ماننے والے ہیں، اور تبلیغ کا حکم پیغمبروں کو اگرچہ ان تینوں طبقوں کیلئے عام ہے جیسا کہ بہت سے قرآنی ارشادات سے واضح ہے لیکن پہلے دو طبقوں میں چونکہ اثر قبول کرنے کی توقع زیادہ ہے اس لئے اس آیت میں خاص طور پر ان کی طرف توجہ کرنے کی ہدایت فرمائی گئی۔

خلوص والوں کو دور مت کیجئے

وَ لَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ

اور نہ | نکالئے | ان کو جو | پکارتے ہیں | رب اپنے کو | صبح | اور | شام | چاہتے ہیں

وَجْهَهٗ ؕ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّ مَا مِنْ حِسَابِكَ

توجہ اس کی نہیں پر آپ میں حساب ان کے سے کچھ اور نہ میں سے حساب آپکے

عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۲﴾

پر ان سے کچھ تا کہ دور کردیں آپ ان کو پس ہوجایں آپ سے ظالموں (۵۲)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اوران لوگوں کو جو اپنے رب کو صبح و شام پکارتے ہیں اس کی رضا چاہتے ہیں دور مت کیجئے، آپ پر ان کے حساب میں سے کچھ نہیں ہے اور نہ آپ کے حساب میں سے ان پر کچھ ہے کہ آپ ان کو دور کرنے لگیں پس آپ بے انصافوں میں ہوں گے۔ (۵۲)

تفسیر

پیغمبر ﷺ کو ارشاد ہے کہ ان کا خیال چھوڑ دیں جو آپ کی بات سننے کیلئے تیار نہیں، آپ کا کام پیغام پہنچادینا تھا آپ پہنچا چکے یہ نہیں سنتے تو نہ سنیں اب آپ ان کو سنایئے جو سننے کیلئے تیار ہیں اور یہ وہ غریب اور نادار لوگ تھے جو آپ پر ایمان لائے تھے اور قرآن کریم کا حکم پورا کرنے کیلئے ہر وقت تیار تھے جیسے حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ، حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ اور حضرت سالم مولیٰ ابی حذیفہ رضی اللہ عنہ، صبیح مولیٰ اسید رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، مقداد بن عمرو رضی اللہ عنہ، مسعود بن القاری رضی اللہ عنہ، ذوالشمالین رضی اللہ عنہ وغیرہ صحابہ کرام تھے جن کی عزت وشرافت کا پروانہ آسمان سے اترا، مکہ کے معزز لوگوں کے پاس ایک بہانہ یہ تھا کہ وہ پیغمبر ﷺ سے کہتے تھے کہ ہم آپ کے پاس آکر ایسے بے حیثیت لوگوں کے ساتھ مل کر نہیں بیٹھ سکتے، بڑے و چھوٹے، امیر و غریب اور آقا و غلام میں فرق کرنا عرب کے مشرکوں میں ہی نہیں بلکہ پہلے پیغمبروں کے زمانہ کے لوگوں میں بھی موجود تھا، چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے لوگ بھی آپ سے یہی کہتے تھے کہ آپ کی پیروی کرنے والے ہم میں سے کمتر لوگ ہیں حقیر اور معمولی حیثیت کے مالک ہیں اور ان کی رائے کی بھی کوئی حیثیت نہیں، لہٰذا ہم ان کیساتھ اٹھ بیٹھ نہیں سکتے، ہم تو ان لوگوں کے ساتھ مل کر بیٹھنے کو تیار ہیں جو بڑی حیثیت والے ہوں اور اپنی قوم کے سردار ہوں۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے ایمان لانے کی خاطر یہاں تک تیار تھے کہ ان غریب لوگوں کو ان مغرور لوگوں کے آنے کے وقت اپنے پاس آنے سے منع کردیں تاکہ ان لوگوں کے پاس یہ بہانہ نہ رہے اور وہ شاید آکر کچھ سنیں اور مانیں، اس بات سے آپ کو اس آیت میں منع کیا گیا ہے۔

ارشاد ہے کہ جو لوگ قرآن کریم کی ہدایت کے مطابق صبح وشام اللہ تعالیٰ کو پکارتے ہیں اور اس کی رضامندی حاصل کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں ان کو اے پیغمبر! اپنے پاس آنے سے ہرگز منع نہ کیجئے، آپ کو کسی کے دل کے اندر کی حالت کا علم نہیں کہ یہ غریب لوگ اچھے ہیں یا یہ مغرور لوگ ایمان لاکر اچھے ہوں گے کیونکہ کسی کے دل کی بات کا ذمہ دار کوئی اور نہیں ہوسکتا، اسلئے آپ کو ظاہری حالت کے مطابق ان سے سلوک کرنا چاہئے، جو سنے اور مانے اس کو سنایئے اور جو اپنی اکڑ میں رہے اس سے کوئی سروکار نہ رکھیئے، نہ آپ کو ان کی طرف سے حساب دینا ہے اور نہ انہیں آپ کی طرف سے حساب دینا ہے۔

خوشحال مشرک لوگ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خواہش رکھتے تھے کہ آپ کے اردگرد غریب اور کمتر حیثیت کے لوگ جمع رہتے ہیں اس لئے ہم آپ کی مجلس میں شریک نہیں ہوتے ان کے مطابق ایسی مجلس میں جانا ان کی توہین کے برابر تھا، لہٰذا ان کا مطالبہ یہ تھا کہ ہم آپ کی بات سننے کیلئے اس وقت آپ کے پاس آسکتے ہیں جب آپ ان نادار صحابہ کو اپنی مجلس سے اٹھا دیا کریں۔

مکہ کے مشرکوں میں سے عتبہ، شیبہ، ابن ربیعہ، مطعم بن عدی اور حارث بن نوفل نے جب یہ مطالبہ کیا تو چونکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو زیادہ سے زیادہ لوگوں کے ایمان لانے کی بہت تمنا تھی اس لئے کسی وقت آپ کے دل میں یہ خیال بھی آیا کہ اپنے تو اپنے ہی ہیں اگر دوسرے لوگوں کو تبلیغ کرنے کی خاطر ان کو تھوڑی دیر کیلئے مجلس سے علیحدہ بھی کردیا جائے تو ہوسکتا ہے کہ بڑے بڑے رئیس ایمان لے آئیں اور ان کے پیچھے اور بھی بہت سے لوگ آجائیں اور اس طرح دین کو قوت حاصل ہوجائے مگر اللہ تعالیٰ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایسا کرنے سے منع فرمادیا کہ آپ لوگوں کو نہ دھکیلیں، یعنی: اپنے آپ سے دور نہ کریں جو صبح وشام اپنے رب کو پکارتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے ایک ہونے پر ان کا پختہ ایمان ہے اور وہ نہایت خلوص کے ساتھ اپنے رب کی عبادت کرتے ہیں، ان کا مقصد ایک

ہی ہے کہ وہ اپنے رب کی رضا چاہتے ہیں، صبح شام پکارنے سے ان کی یہی مراد ہوتی، بعض مفسرین نے "یُرِیْدُوْنَ وَجْهَهٗ" کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے دیدار کے طلب گار ہیں جو کہ سب سے اعلیٰ درجے کی بات ہے، لہٰذا آپ ایسے لوگوں کو اپنی مجلس سے محروم نہ کریں۔

اللہ تعالیٰ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا کہ آپ اپنے سچے ساتھیوں کو دور ہٹانے کا نہ سوچیں کیونکہ آپ پر ان کافروں کے حساب کے متعلق کوئی ذمہ داری نہیں ہے ان کا حساب تو خود اللہ تعالیٰ لیں گے، اگر یہ ذمہ داری آپ پر ہوتی، یعنی: ان کے مسلمان نہ ہونے پر آپ سے پوچھ گچھ ہوتی تو اس صورت میں آپ ان رئیس مشرکوں کی خاطر غریب مسلمانوں کو مجلس سے ہٹا سکتے تھے، نہ ہی آپ کا حساب ان سے لیا جائے گا، ہر نفس کو اپنا حساب خود پیش کرنا ہوگا یہ کسی دوسرے کی ذمہ داری نہیں ہوگی، یہ تو اللہ تعالیٰ خود فیصلہ فرمائیں گے کہ کون کس قدر مکمل ایمان والا ہے، لہٰذا آپ ان کو علیحدہ نہ کریں اور اگر آپ نے ایسا کیا کہ ان غریب مسلمانوں کو ہٹادیا تو یقیناً آپ ناانصافوں میں سے ہوں گے، گویا اللہ تعالیٰ نے سختی سے منع فرمادیا کہ بڑے لوگ ایمان لائیں یا نہ لائیں آپ ان کم تر لوگوں کو اپنی مجلس سے دور نہ کریں۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو غریبوں اور مسکینوں سے بڑی محبت تھی آپ نے کبھی ان کو خود سے علیحدہ نہیں فرمایا بلکہ ہمیشہ ان کے درمیان رہنے کو پسند فرمایا، چنانچہ آپ دعا فرماتے تھے: اے اللہ! مجھے زندہ رکھیئے تو مسکینی کی حالت میں اور جب موت دیجئے تو بھی مسکینی کی حالت میں اور میرا حشر بھی انہی کیساتھ کیجئے، آپ نے یہ بھی دعا فرمائی کہ اے اللہ! مجھے مسکینوں کی محبت عطا کیجئے۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی دعوت کیلئے ہرقل قیصرِ روم کو بھی خط لکھا تھا جب یہ خط قیصر کے سامنے پیش ہوا تو اس نے حکم دیا کہ اگر عرب کا کوئی شخص مل جائے تو حاضر کیا جائے، ان دنوں غزہ میں ابوسفیان کی سربراہی میں مکہ کے قریشیوں کا ایک تجارتی قافلہ ٹھہرا ہوا تھا، چنانچہ ابوسفیان کو ہرقل کے سامنے پیش کیا گیا اور ہرقل نے ان سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق مختلف سوال کیے جن میں ایک سوال یہ بھی تھا کہ جس پیغمبری کے دعویٰ کرنے والے کا خط مجھے پہنچا ہے اس کے اول اول ماننے والے کمزور لوگ ہیں یا بااثر شخصیتیں، تو ابوسفیان نے کہا کہ نادار اور کمزور

لوگ ہیں اس پر ہرقل پکار اٹھا کہ ابتداء میں پیغمبروں کے پیروکار ہمیشہ ضعیف لوگ ہی ہوتے ہیں بڑے لوگ اس وقت ایمان لاتے ہیں جب ان کیلئے کوئی دوسرا راستہ نہیں رہتا، ہرقل کا یہ جملہ پچھلی کتابوں کی تعلیم سے بھی معلوم ہوتا ہے بہرحال اللہ تعالیٰ نے یہاں پر یہ بات سمجھا دی ہے کہ مال ودولت یا عزت ومرتبے پر اترانا غلط بات ہے، اصل میں عزت کا دارومدار ایمان پر ہے نہ کہ دنیا کی شان وشوکت پر، اللہ تعالیٰ کے ہاں باعزت وہ شخص ہے جو زیادہ متقی ہے جس کے اخلاق اچھے ہیں، نیکی اور پرہیزگاری اختیار کرنا جس کا کام ہے اور یہ صفتیں غریبوں میں پائی جاتی ہیں مگر مالدار اور بڑے قسم کے لوگ ان کو حقیر سمجھ رہے ہیں۔

مرتبوں کا فرق آزمائش ہے

وَ كَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ

اور | اسی طرح | آزمایا ہم نے | بعض ان کے کو | سے بعض | تاکہ وہ کہیں | کیا یہی ہیں کہ | فضل کیا | اللہ نے

عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا ؕ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ ﴿۵۳﴾

پر ان | سے | درمیان ہمارے | کیا نہیں | اللہ | جاننے والا | شکرگزاروں کا | (۵۳)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور اسی طرح ہم نے بعض لوگوں کو بعض سے آزمایا ہے تاکہ کہیں کیا یہی لوگ ہیں جن پر ہم سب میں اللہ نے فضل کیا، کیا اللہ شکر کرنے والوں کو خوب جاننے والے نہیں ہیں؟ (۵۳)

تفسیر

وَ كَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ: اللہ تعالیٰ نے کافروں کو مال ودولت دے کر آزمایا کہ یہ اپنے ماتحت لوگوں یا کمتر لوگوں کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں ان کو حقیر سمجھ کر ذلت کا سلوک کرتے ہیں یا انکا احترام کرتے ہیں اور خوشدلی سے پیش آتے ہیں، اسی طرح ایمان والوں کو تنگی میں مبتلا کرکے آزمایا ہے، "سورۂ فرقان" میں موجود ہے کہ ہم نے تمہارے بعض کو بعض کیلئے آزمائش بنایا ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ کیا تم صبر

کرتے ہو؟ ایمان والے غریبوں کو غربت میں مبتلا کر کے آزمایا ہے کہ آیا یہ کافر امیروں کی امیری دیکھنے کے باوجود صبر کرتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ کافر امیروں کو دولت دے کر آزماتے ہیں کہ یہ ایمان والے مسکینوں کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں اور ایمان والے غریبوں کو غربت دے کر آزماتے ہیں کہ یہ کس حد تک صبر کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے کافروں کو دولت دے کر آزمایا ہے تاکہ وہ غرور میں آکر ایمان والوں کے متعلق کہیں کہ کیا یہی وہ لوگ ہیں جن کا دعویٰ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر احسان کیا ہے کیا یہی بدحال ایمان والے جنت کے مالک ہیں جن کے پاس نہ رہنے کو مکان ہے نہ کھانے کو روٹی اور نہ پہننے کو کپڑا ہے؟ ایمان والوں کی غریبی کی وجہ سے ہنسی اڑاتے تھے کہ دیکھو! یہ حوروں کے خاوند جارہے ہیں وہ مال و دولت پر مغرور تھے، لہٰذا ایمان والے غریبوں کے ساتھ ذلت والا سلوک کرتے تھے، ادھر غریبوں، مسکینوں کی طرف اشارہ فرمایا کہ کیا اللہ تعالیٰ شکر گزاروں کو نہیں جانتے؟ بیشک وہ جانتے ہیں کہ ایک شخص ایمان والا ہو کر غریب اور نادار ہونے کے باوجود صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا بلکہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے اور دوسری طرف کافر بڑا سرمایہ دار اور جاگیردار ہے مگر پھر بھی شکر ادا نہیں کرتا بلکہ اس کی حرص بڑھتی چلی جارہی ہے، اللہ تعالیٰ مالک الملک ہیں ہر ایک کے ظاہر اور پوشیدہ حال اور نیت اور ارادے سے واقف ہیں۔

”تفسیر کشاف“ وغیرہ کی تحقیق کے مطابق ان کا یہ قول اس آزمائش و امتحان کا نتیجہ ہے جو ان کا کمزور اور غریب مسلمانوں کے ذریعے لیا گیا تھا وہ اس امتحان میں ناکام ہوئے، بجائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت پر غور کر کے اس نتیجہ پر پہنچتے کہ آدمی کا بڑھیا ہونا یا گھٹیا ہونا مال و دولت وغیرہ پر موقوف نہیں بلکہ اس کا دارومدار اخلاق و اعمال پر ہے، کافر الٹا اللہ تعالیٰ پر یہ الزام لگانے لگے عزت افزائی کے مستحق تو ہم تھے ہمیں چھوڑ کر کمزور مسلمان غریبوں کی عزت افزائی کیوں کی گئی؟ حق تعالیٰ نے اس کے جواب میں پھر ان کو اصل حقیقت کی طرف اس جملہ سے متوجہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں کہ کون لوگ حق پہچاننے والے اور شکر گزار ہیں مطلب یہ ہے کہ حقیقت کے اعتبار سے شریف و معزز وہ شخص ہے جو اپنے محسن کا حق پہچانے اور شکر گزار ہو اور وہی انعام و اکرام کا مستحق ہے نہ

کہ وہ جو رات دن اپنے اوپر انعام واحسان کرنے والے کی نعمتوں میں کھیلنے کے باوجود اس کی نافرمانی کرتا ہے۔

اس آیت سے چند باتیں معلوم ہوئیں

اول: یہ کہ کسی کے پھٹے کپڑے یا ظاہری کٹی پھٹی حالت دیکھ کر اس کو حقیر وذلیل سمجھنے کا کسی کو حق نہیں، بسا اوقات ایسے لباس میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک نہایت عزت والے ہیں، ایک حدیث میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ بہت سے برے حال والے غبار آلود لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ایسے مقبول بندے ہیں کہ اگر وہ کسی کام کیلئے اللہ تعالیٰ کے بھروسہ پر قسم کھا بیٹھیں کہ ایسا ہوگا تو اللہ تعالیٰ ان کی قسم کو ضرور پورا فرماتے ہیں۔

دوسرے: یہ کہ شریف یا گھٹیا ہونے کا معیار صرف دنیا کی مال ودولت کو سمجھنا انسانیت کی توہین ہے، اس کا اصل مدار اخلاق ونیک اعمال پر ہے۔

تیسرے: یہ کہ کسی قوم کے مصلح (اصلاح کرنے والے) اور (مبلغ) کیلئے اگرچہ عام تبلیغ بھی ضروری ہے جس میں موافق، مخالف، ماننے والے اور نہ ماننے والے سب مخاطب ہوں لیکن ان لوگوں کے حق کو ترجیح دی جائے گی جو اس کی تعلیمات کو اپنا کر اس پر چل رہے ہوں، دوسروں کی خاطر ان کو پیچھے ہٹانا یا نظر انداز کرنا جائز نہیں، مثلاً: غیر مسلموں کی تبلیغ کیلئے ناواقف مسلمانوں کی تعلیم واصلاح کے معاملے کو پیچھے نہیں کیا جائے گا۔

چوتھے: یہ کہ اللہ تعالیٰ کے انعامات شکرگزاری سے بڑھتے ہیں جو شخص اللہ تعالیٰ کے انعامات کے بڑھنے کو چاہتا ہے اس پر لازم ہے کہ قول وعمل سے شکرگزاری کرتا رہے۔

مسلمانوں کی دل جوئی کرو

وَ اِذَا جَآءَكَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِاٰیٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ

اور جب آئیں آپ کے پاس وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں پر آیتوں ہماری تو آپ کہہ دیجئے سلام ہے پر تم

كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۙ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًا

لکھ لیا ہے رب تمہارے نے اوپر اپنے رحمت کو کہ جو کرے میں سے تم برا کام

بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَ اَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۵۴﴾

نادانی سے پھر توبہ کرے سے بعد اور نیک ہوجائے پس بیشک وہ بخشنے والا مہربان ہے (۵۴)

وَ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَ لِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۵۵﴾

اور اسی طرح کھولتے ہیں ہم آیتوں کو اور تاکہ ظاہر ہوجائے راستہ گناہگاروں کا (۵۵)

ع ۶ ۵ ۱۲

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور جب آپ کے پاس میری آیتوں کے ماننے والے آئیں تو آپ کہئے تم پر سلام ہے تمہارے رب نے اپنے اوپر رحمت کو لکھ لیا ہے کہ جو کوئی تم میں سے ناواقفیت سے برائی کرے پھر اس کے بعد توبہ کرے اور نیک ہوجائے تو بات یہ ہے کہ وہ بخشنے والے مہربان ہیں۔ (۵۴) اور اسی طرح ہم آیتوں کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں تاکہ گناہگاروں کا طریقہ کھل جائے۔ (۵۵)

تفسیر

اس آیت میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خاص طور پر ہدایت کی گئی ہے کہ ان کو تسلی اور دلاسہ دیں اور خوشخبری سنا دیں کہ وہ اسلام لا کر اللہ تعالیٰ کی رحمت کے مستحق ہوچکے ہیں، یہاں تک کہ اگر نادانی کی وجہ سے ان سے کوئی قصور بھی ہوجائے تو وہ توبہ سے معاف ہوجائے گا، اللہ تعالیٰ ان کی نیت اور دل کی حالت کو جانتے ہیں کہ وہ جان بوجھ کر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کرتے اس لئے ان کی بھول چوک معاف ہے اور ان کی توبہ قبول ہے، اب اس آیت کے خلاصہ پر غور کیجئے، ارشاد ہے کہ: اے پیغمبر! جب آپ کے پاس ہماری آیتوں پر ایمان رکھنے والے آئیں تو ان کا استقبال اچھی دعا سے کیجئے اور کھلے کے ساتھ ان سے السلام علیکم کہئے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تم کو تمام آفتوں اور مصیبتوں سے بچائے اور خوش وخرم رکھے، اور پھر ان کو خوشخبری سنایئے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے اوپر

رحمت کرنے کا ذمہ لیا ہے، "حدیث شریف" میں آتا ہے کہ: کائنات کو پیدا کرنے سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ نے عرش پر لکھ رکھا ہے کہ بیشک میری رحمت میرے غصہ سے بڑھ جانے والی ہے، میرا غصہ اسی پر وارد ہوتا ہے جو بالکل ہی سرکش ہو جائے ورنہ میری رحمت عام ہے، تم میں سے اگر کسی سے کوئی خطا یا قصور بھی ہو جائے کیونکہ مؤمن جان بوجھ کر گناہ نہیں کرتا تو اللہ تعالیٰ اسے توبہ کرنے پر معاف فرما دیں گے اور تم اللہ تعالیٰ کو معافی مانگنے پر اور آئندہ گناہ نہ کرنے کا اقرار کرنے پر بخشنے والے اور مہربان پاؤ گے، آگے ارشاد ہے کہ: جیسا کہ تم دیکھتے ہو ہم ان آیتوں میں باتوں کو خوب کھول کر صاف صاف بیان کرتے ہیں یہ ہماری رحمت اور ہدایت کا تقاضہ ہے اور اس سے ایک غرض یہ ہے کہ گنہگاروں اور مجرموں کا راستہ نیک لوگوں کا راستہ بالکل جدا ہو جائے اور کسی کو ان دونوں راستوں کے الگ الگ ہونے میں ذرا شبہ نہ رہے۔

حضرت سلمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نے "تورات" میں لکھا دیکھا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آسمان، زمین اور ان کی ساری مخلوق کو پیدا فرمایا تو اپنی رحمت کے سو حصے کر کے اس میں سے ایک حصہ ساری مخلوق کو تقسیم فرما دیا اور آدمی اور جانور اور دوسری مخلوق میں جہاں بھی رحمت کا اثر پایا جاتا ہے وہ اسی تقسیم شدہ ایک حصہ کا اثر ہے، ماں باپ اور اولاد میں، بھائی بہنوں میں، شوہر بیوی میں، عام رشتہ داروں میں، پڑوسیوں اور دوسرے دوستوں میں جو آپس میں ہمدردی اور محبت کے تعلقات دیکھنے میں آتے ہیں وہ سب رحمت کے اسی ایک حصہ کا نتیجہ ہیں باقی ننانوے (۹۹) حصے رحمت کے اللہ تعالیٰ نے خود اپنے پاس رکھے ہیں جس کا اظہار قیامت کے دن ہوگا۔

اس جگہ یہ بات خاص طور پر غور کے قابل ہے کہ اس آیت میں گنہگاروں سے بخشش اور رحمت کا جو وعدہ فرمایا گیا ہے وہ دو چیزوں سے حاصل ہوگا، ایک توبہ، دوسرے اپنے عملوں کی اصلاح ہے۔ توبہ کے معنیٰ ہیں گناہ پر شرمندگی، "حدیث شریف" میں ارشاد ہے کہ توبہ نام ہے شرمندگی کا، دوسرے آئندہ کیلئے اپنے عمل کی اصلاح کرنے کا، اس اصلاح میں یہ بھی داخل ہے کہ آئندہ اس گناہ کے پاس نہ جانے کا پکا ارادہ اور پورا اہتمام کرے اور یہ بھی شامل ہے کہ پچھلے گناہ سے جو حقوق ضائع ہوئے ہیں پوری ممکن کوشش کر کے ان کو ادا کرے، خواہ وہ

اللہ تعالیٰ کے حقوق ہوں یا بندوں کے حقوق، اللہ تعالیٰ کے حقوق کی مثال نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج دوسرے فرائض وغیرہ میں کوتاہی کرنا ہے اور بندوں کے حقوق کی مثال کسی کے مال پر ناجائز قبضہ وغیرہ کرنا، کسی کی آبرو پر حملہ کرنا، کسی کو گالی گلوچ کے ذریعہ یا کسی دوسری صورت سے تکلیف پہنچانا ہے؛ اس لئے توبہ کے مکمل ہونے کیلئے ضروری ہے کہ گزرے ہوئے گناہوں پر ندامت کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے بخشش مانگے اور آئندہ کیلئے اپنے عمل کو درست رکھے، اس گناہ کے پاس نہ جائے اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ جو نمازیں یا روزے غفلت سے چھوٹ گئے ان کی قضاء کرے، جو زکوٰۃ نہیں دی گئی وہ اب ادا کرے، قربانی، صدقۂ فطر وغیرہ میں کوتاہی ہوئی ہے تو ان کو ادا کرے، حج فرض ہونے کے باوجود ادا نہیں کیا تو اب ادا کرے اور خود نہ کر سکے تو حج بدل کرائے اور اگر اپنے سامنے حجِ بدل اور دوسری قضاؤں کا موقع پورا نہ ملے تو وصیت کرے کہ اس کے وارث اس کے ذمہ فرائض وغیرہ کا فدیہ یا حجِ بدل کا انتظام کرلیں، خلاصہ یہ ہے کہ عمل کی اصلاح کیلئے صرف آئندہ کا عمل درست کرلینا کافی نہیں، پچھلے فرائض وواجبات کو ادا کرنا بھی ضروری ہے۔

اسی طرح بندوں کے حقوق میں اگر کسی کا مال ناجائز طور پر لیا ہے تو اس کو واپس کرے یا اس سے معاف کرائے اور کسی کو ہاتھ یا زبان سے تکلیف پہنچائی ہے تو اس سے معاف کرائے اور اگر اس سے معاف کرانا اختیار میں نہ ہو، مثلاً: وہ مر جائے یا ایسی جگہ چلا جائے جس کا اس کو پتہ معلوم نہیں تو اس کی تدبیر یہ ہے کہ اس شخص کیلئے اللہ تعالیٰ سے بخشش کی دعا کرے اور اس کیلئے حسب توفیق کوئی صدقہ وخیرات بھی کر دے، اس سے امید ہے کہ حق والا راضی ہو جائے گا اور یہ شخص اپنے ذمہ سے بری ہو جائے گا۔

وَ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَ لِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ: اسی طرح ہم آیتوں کو کھول کر بیان کرتے ہیں، توحید کی دلیلیں اور پیغمبر کے مقام کی تفصیل وغیرہ سب کچھ وضاحت کے ساتھ بیان کرتے ہیں تاکہ مجرموں کا راستہ بالکل واضح ہو جائے کیونکہ جب ایمان والوں کے راستے کی سمجھ آجائے گی تو اس کا مخالف ہر راستہ مجرموں کا راستہ ہوگا اور یہ راستہ کفر، شرک اور بدعتوں کا راستہ ہے، مال ومرتبہ کی محبت کا راستہ ہے، غریبوں کو

حقیر جاننے اور انسانیت کے خلاف کرنے والا راستہ ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: ہم نے اس راستے کو واضح فرما دیا ہے اب اس سے بچنا ہر شخص کی اپنی ذمہ داری ہے۔

پیغمبر کسی بھی انسان کے پیروکار نہیں

قُلْ اِنِّیْ نُهِیْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ

آپ کہہ دیجئے بیشک میں میں روکا گیا ہوں کہ میں بندگی کروں ان کی جنہیں تم پکارتے ہو سوا اللہ کے

قُلْ لَّاۤ اَتَّبِعُ اَهْوَآءَكُمْ ۙ قَدْ ضَلَلْتُ اِذًا وَّ مَاۤ اَنَا

آپ کہہ دیجئے نہیں میں پیروی کرتا خواہشوں تمہاری کی بیشک میں بہک جاؤں گا اس وقت اور نہ رہوں گا میں

مِنَ الْمُهْتَدِیْنَ ﴿۵۶﴾

ہدایت پانے والوں میں (۵۶)

بامحاورہ ترجمہ:۔ آپ کہہ دیجئے! مجھ کو اس سے روکا گیا ہے کہ ان کی بندگی کروں جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو، آپ کہہ دیجئے! میں تمہاری خواہشوں پر نہیں چلتا، پھر تو میں بیشک بہک جاؤں گا اور ہدایت پانے والوں میں نہ رہوں گا۔ (۵۶)

تفسیر

ارشاد ہے کہ ان نادانوں سے جو آپ کی بات نہیں سنتے کہہ دیں کہ میری عقل اور روشنی جو اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں وحی کے ذریعے پیدا کی ہے مجھے بالکل اجازت نہیں دیتی کہ میں اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر تمہارے معبودوں کو تمہاری طرح پکارنے لگوں، ان کی عبادت کروں اور ان سے اپنی مرادیں مانگوں، یہ تو تمہاری اپنی گھڑی ہوئی غلط اور گمراہ کرنے والی باتیں ہیں ان کے ماننے پر تمہاری بیہودہ خواہشوں نے تمہیں مجبور کر رکھا ہے

مجھے تو تمہاری خواہشوں پر نہیں چلنا، اگر میں بھی وحی کی ہدایتوں کو چھوڑ کر تمہارے کہنے پر چلنے لگوں تو پھر دنیا میں سیدھے راستہ کا تو نام و نشان نہ رہے گا اور میں بھی تمہاری طرح گمراہ ہو جاؤں گا۔

اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہدایت کرنے والوں کو مالدار اور بااثر طبقے کی خوشامد ہر گز نہیں کرنی چاہئے بلکہ سچی بات صاف صاف بے لاگ اور بغیر کسی رورعایت کے بے دھڑک کہنی چاہئے، جو ان باتوں کو مانیں ان کی عاجزی اور مفلسی کی طرف نہ دیکھنا چاہئے بلکہ ان کی ہمت بڑھانی چاہئے اور ان کو دین کی باتیں سمجھانی چاہئیں، سب کو ہر ایک چیز دینے والے اللہ تعالیٰ ہی ہیں اور سب اسی کے محتاج ہیں تو پھر کیوں نہ ہر چیز اللہ تعالیٰ سے ہی مانگی جائے اور اسی کی تابعداری اور رضا حاصل کرنے کی کوشش کی جائے اور کسی دوسرے پر نظر رکھ کر اس کی اطاعت اور رضامندی کے کوئی معنیٰ نہیں۔

انسان کیلئے ہر چیز میں نشانیاں ہیں جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ ایک ہیں، اس کا کوئی شریک نہیں، عقلمند آدمی درختوں کے پتے دیکھ کر بھی اللہ تعالیٰ کے ایک ہونے کا اقرار کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے، امام اعظم امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ فرض کرو کوئی شخص کسی اونچے پہاڑ کی چوٹی پر اکیلا آباد ہے کوئی دوسرا انسان اس تک نہیں پہنچتا، اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچانے کیلئے اس کے پاس نہ کوئی پیغمبر آتا ہے اور نہ ہی کوئی تبلیغ کرنے والا تو ایسے شخص کیلئے حکم یہ ہوگا کہ دین میں جو چیزیں فرض ہیں، یعنی: نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ کیلئے تو اس سے پوچھ گچھ نہیں ہوگی کیونکہ یہ چیزیں پیغمبروں اور پھر ان کے پیروکاروں کے ذریعے معلوم ہوتی ہیں، البتہ اگر اس نے اللہ تعالیٰ کے ایک ہونے کا اقرار نہیں کیا بلکہ شرک کیا ہے تو پکڑا جائے گا، اللہ تعالیٰ نے اسے عقل جیسی عظیم نعمت عطا فرمائی ہے اس کے اردگرد اپنی قدرت کی ہزاروں نشانیاں بکھیر دیں ہیں جنہیں دیکھ کر اسے اللہ تعالیٰ کی پہچان حاصل ہو جانی چاہئے تھی اگر پھر بھی اس نے شرک کیا ہے تو اس کا یہ جرم ناقابل معافی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ انسان کا دل و دماغ بھی شرک کے خلاف ہیں، یہ تمام چیزیں انسان کو شرک کرنے سے روکتی ہیں اسی لئے یہاں پر فرمایا کہ مجھے روک دیا گیا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی دوسرے کی عبادت کروں، قرآن پاک تو اللہ تعالیٰ کی

وحی ہے یہ تو بہرحال شرک سے منع کرتی ہے مگر اس کے علاوہ بیشمار چیزیں اور دلیلیں ہیں جو انسان کو شرک سے روکتی ہیں؛ ”تَدْعُوْنَ“ کا معنیٰ ہے جن کو تم پکارتے ہو اور مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا جن کو تم مصیبت میں پکارتے ہو، ان سے حاجتیں طلب کرتے ہو، انہیں مشکل کشا سمجھتے ہو، میں ان کی پوجا کرنے کیلئے ہرگز تیار نہیں کیونکہ ہر چیز کے عطا کرنے والے اور ہر مصیبت کو دور کرنے والے صرف اللہ تعالیٰ ہیں، لہٰذا اس کے علاوہ میں کسی ہستی کی پوجا کرنے کیلئے تیار نہیں، مجھے منع کر دیا گیا ہے۔

مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ: اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو سب سے بڑا خدا ماننے کے باوجود بعض چھوٹے چھوٹے خداؤں کی پوجا بھی کی جاتی ہے اور مشرک لوگ پرانے زمانے سے ایسا کرتے چلے آئے ہیں، ان کا عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ اصل خدا تعالیٰ تو وہی ہے مگر یہ چھوٹے چھوٹے خدا بھی کچھ نہ کچھ کام بناتے ہیں بڑے خدا نے ان چھوٹوں کو بھی بعض اختیار دے رکھے ہیں، لہٰذا ان کی پوجا بھی کی جاتی ہے، اللہ تعالیٰ نے سختی سے ان کے اس عقیدے کی غلطی کو واضح کیا ہے۔

قُلْ لَّآ اَتَّبِعُ اَهْوَآءَكُمْ: اللہ تعالیٰ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے کہلوا دیا کہ میں تمہاری بیہودہ خواہشوں کے پیچھے نہیں لگ سکتا، ”سورۂ فرقان“ میں موجود ہے کہ کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا ہے جس نے اپنی خواہشوں کو معبود بنا رکھا ہے، کسی نے حضرت مسیح علیہ السلام کو معبود بنالیا، کسی نے پتھر کو مان لیا، کسی نے کسی قبر والے کو اور کسی نے فرشتوں کو اپنا معبود بنالیا، اللہ تعالیٰ کے ایک ہونے کی بنیاد صحیح عقل اور اللہ تعالیٰ کی وحی پر ہے جبکہ شرک کی بنیاد نفسانی خواہشوں پر ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: آپ کہہ دیں کہ میں تمہاری خواہشوں کی پیروی نہیں کرسکتا۔

منکروں کا فیصلہ اللہ تعالیٰ پر ہے

قُلْ اِنِّیْ عَلٰی بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَ كَذَّبْتُمْ بِهٖ ؕ مَا عِنْدِیْ

آپ کہہ دیجئے بیشک میں ہوں پر دلیل طرف سے رب اپنے کی اور جھٹلاتے ہو تم اس کو نہیں پاس میرے

مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ يَقُصُّ الْحَقَّ وَ

وہ چیز جلدی کرتے ہوتم جس کی نہیں حکم مگر لئے اللہ کے بیان کرتا ہے وہ سچ اور

هُوَ خَيْرُ الْفٰصِلِيْنَ ﴿۵۷﴾

وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے (۵۷)

بامحاورہ ترجمہ:۔ آپ کہہ دیجئے! مجھ کو میرے رب کی دلیل پہنچی اور تم نے اس کو جھٹلایا میرے پاس وہ چیز (یعنی عذاب) نہیں ہے جس کی تم جلدی مچا رہے ہو اللہ کے سوا کسی کا حکم نہیں چلتا وہ حق بات بیان کرتا ہے اور وہ سب سے اچھا فیصلہ کرنے والا ہے۔ (۵۷)

تفسیر

اس آیت میں پیغمبر ﷺ کو ہدایت کی گئی ہے کہ ان سے کہہ دیجئے کہ میرے پاس بالکل صاف صاف دلیلیں موجود ہیں کہ سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی معبود نہیں، اور میرے رب نے میرے پاس قرآن کریم بھیجا ہے جس میں اس بات کی گواہی موجود ہے کہ اللہ ایک ہے اور کوئی اس کا کسی بات میں شریک نہیں ہے، یہ دلیلیں اور آیتیں تمہارے سامنے بھی رکھی گئی ہیں اور میرے سامنے بھی میں ان کو سچا مانتا ہوں اور تم ان کو جھوٹا کہتے ہو، میں ان پر ایمان لایا ہوں اس کا مجھے انعام ملے گا تم ان کا انکار کرتے ہو اس کی تمہیں سزا ملے گی، تم کہتے ہو کہ ہم تو نہیں مانتے اگر تو سچا ہے تو اللہ تعالیٰ سے کہہ کہ ہم پر عذاب اتارے، میرا جواب یہ ہے کہ یہ میرے اختیار میں نہیں کہ میں فوراً تم پر عذاب اتروادوں یا اپنی طرف سے تمہیں کچھ سزا دوں، اس کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، وہ سچی اور حق باتیں کھول کر بیان کر دیتے ہیں اور نہ ماننے والوں پر عذاب بھیجنے کا فیصلہ اپنے اختیار میں رکھتے ہیں، ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ سے بہتر فیصلہ کرنے والا کوئی نہیں وہ جب چاہیں گے تمہیں عذاب میں مبتلا کر دیں گے ہاں! یہ ضرور ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے کہنے کے مطابق عذاب سے ایمان لائے بغیر بچ نہیں سکتے، اب اس کا فیصلہ کہ کیسا عذاب ہوگا

اور کب آئے گا؟ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

سزا دینا صرف اللہ تعالیٰ کا کام ہے

قُلْ لَّوْ اَنَّ عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ لَقُضِیَ الْاَمْرُ بَیْنِیْ

آپ کہہ دیجئے اگر ہوتا پاس میرے وہ جلدی کرتے ہو تم جسکی البتہ ہو چکا ہوتا جھگڑا درمیان میرے

وَ بَیْنَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِالظّٰلِمِیْنَ ۝۵۸

اور درمیان تمہارے اور اللہ سب سے زیادہ جانتا ہے ظالموں کو (۵۸)

بامحاورہ ترجمہ:۔ آپ کہہ دیجئے! کہ اگر میرے پاس وہ چیز ہوتی جس کی تم جلدی مچا رہے ہو (یعنی عذاب) تو میرے اور تمہارے درمیان جھگڑا طے ہو چکا ہوتا، اور اللہ ظالموں کو خوب جانتے ہیں۔ (۵۸)

تفسیر

اس آیت میں ایک بھید بیان کیا گیا ہے کہ اگر عذاب بھیجنے کا اختیار اللہ تعالیٰ کے سوائے کسی اور کے ہاتھ میں ہوتا تو دنیا کی کیا گت ہوتی؟ انسان میں علم اور برداشت دونوں ایک حد تک ہیں اگر اس کے اختیار میں نافرمانی کی سزا دینی آجائے تو وہ اس کی سزا میں دیر نہیں لگائے گا، برخلاف اس کے کہ اللہ تعالیٰ کو تمام حالات کا علم ہے وہ ہر کام کے نتیجوں سے پورے طور پر واقف ہیں، پھر اس کی صفت حکیم ہے وہ ہر کام کا موقع محل اور اس کے مناسب وقت اور اس کی مصلحتوں کا پورا پورا علم رکھتے ہیں وہ حلیم بھی ہیں خطا کرنے والے کو ڈھیل بھی دیتے ہیں اس کے ساتھ ہی وہ مجرم کی حالت پوری پوری طرح جانتے ہیں اور جرم کی نوعیت اور مقدار سب اس کے اوپر واضح ہے۔

اگر انسان کے ہاتھ میں عذاب بھیجنے کا اختیار دیدیا جاتا تو نہ جانے دنیا کب کی نیست و نابود ہو گئی ہوتی، اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں میں حوصلہ اور صبر سب سے زیادہ ہوتا ہے، جب پیغمبر ہی سے فرمادیا کہ کہہ دیجئے کہ میرے

ہاتھ میں اگر عذاب ہوتا تو کام کبھی کا ختم ہو چکا ہوتا تو اور کسی کا تو ذکر ہی کیا ہے، ارشاد ہے اے پیغمبر! کہہ دیجئے! تم جس بات کی جلدی مچا رہے ہو وہ اگر میرے اختیار میں ہوتا تو تمہاری خواہش کو پورا کرنے کیلئے جھگڑا کب کا چکا دیا جاتا، لیکن معاملہ تو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے وہی جب مناسب سمجھیں گے عذاب بھیج دیں گے، ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کا مقام واضح کر دیا ہے کہ ان کا کام کسی کی رعایت، خوشامد کرنا یا کسی سے ناراض ہونا اور اسے سزا دینا نہیں اور نہ وہ کسی کو ایمان لانے پر مجبور کر سکتے ہیں، ان کا کام تو صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کے ذریعے ان کے پاس جو حکم آئے وہ اس کے بندوں تک پہنچا دیں اور عمل کرنے کی تاکید کریں۔

وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِالظّٰلِمِيْنَ: اللہ تعالیٰ ظالموں کو خوب جانتے ہیں اگر انہیں مہلت مل رہی ہے تو یہ نہ سمجھیں کہ وہ عذاب سے ہمیشہ بچتے رہیں گے اور ان کی پکڑ نہیں ہوگی بلکہ اللہ تعالیٰ ان کو جانتے ہیں اور اپنی مرضی کے مطابق مقرر وقت پر ضرور ان کو پکڑ لیں گے اور پھر وہ ہمیشہ کی لعنت میں گرفتار ہو جائیں گے، جن لوگوں نے کفر اور شرک کیا، اللہ تعالیٰ کے حق اور بندوں کے حق کو ضائع کئے، فرضوں کو ضائع کیا وہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ہیں، ان سے ان کے عقیدے اور عمل کے مطابق سلوک ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کو ذرّہ ذرّہ کا علم ہے

وَ عِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَاۤ اِلَّا هُوَ ؕ وَ يَعْلَمُ مَا فِي

اور پاس اسکے خزانے ہیں غیب کے نہیں جانتا ان کو مگر وہ اور جانتا ہے جو میں

الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ ؕ وَ مَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَ لَا

خشکی اور تری میں ہے اور نہیں گرتا کوئی پتا مگر وہ جانتا ہے اسکو اور نہ

حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَ لَا رَطْبٍ وَّ لَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ

کوئی دانہ میں اندھیرے زمین کے اور نہ ہری چیز اور نہ خشک مگر میں

کِتٰبٍ مُّبِیْنٍ ﴿۵۹﴾
کتاب واضح (۵۹)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور اسی کے پاس غیب کے خزانے ہیں کہ جن کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا اور اسے جنگلوں اور دریاؤں کی سب چیزوں کا علم ہے اور جو کوئی پتا بھی جھڑتا ہے تو وہ اس کو بھی جانتے ہیں اور زمین کے اندھیروں میں جو کوئی دانہ یا تَر یا خشک چیز بھی ہے سب کتاب مبین (یعنی لوح محفوظ) میں لکھی ہوئی ہے۔ (۵۹)

لفظی تحقیق: **مَفَاتِحُ:** ''م'' کے زبر کیساتھ ''مَفْتَحٌ'' کی جمع بھی ہوسکتی ہے ''مَفْتَح'' خزانے کو کہتے ہیں اور ''مَفَاتِحُ'' کے معنیٰ اس صورت میں خزانے ہیں اور یہ ''م'' کے زیر کیساتھ ''مِفْتَحٌ'' کی جمع بھی ہوسکتی ہے، ''مِفْتَحٌ'' کنجی کو کہتے ہیں اور ''مَفَاتِحُ'' کے معنیٰ اس صورت میں کنجیاں ہیں۔ **غَیْبٌ:** یہ لفظ ''سورۂ بقرہ'' کے شروع میں آچکا ہے، ہر وہ چیز جو انسان کی آنکھ سے اوجھل اور حواس سے بالاتر ہو۔ **کِتٰبٍ مُّبِیْنٍ:** اس سے مراد لوح محفوظ ہے جس میں کائنات سے متعلق ہر چیز درج ہے۔

تفسیر

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے علم کا صحیح تصور کرنے کیلئے اصول بیان کردیئے گئے ہیں تاکہ معلوم ہوجائے کہ واقعی اس سے زیادہ علم کوئی نہیں رکھتا اور اسی لئے اسی کو فیصلہ کرنے اور انعام وسزا دینے کا مکمل اختیار ہونا چاہئے۔

ارشاد ہے کہ جو چیزیں تم نہیں جانتے کیونکہ تمہاری عقل، فکر اور ذہن ایک حد تک کام کرتی ہیں اور اسی لئے تمہارے لئے بہت سی چیزیں غیب ہیں وہ سب اللہ تعالیٰ جانتے ہیں، سارے غیب کے خزانے بھی اس کے پاس ہیں اور اس کے کھولنے کی کنجیاں بھی اسی کے قبضہ میں ہیں اس لئے ان خزانوں کو کوئی چھیڑ نہیں سکتا نہ ان میں سے کوئی چیز نکال سکتا ہے، جب یہ خزانے صرف اسی کے پاس ہیں تو ظاہر ہے کہ خشکی تری کی ساری چیزیں وہ جانتے ہیں، درختوں کے پتوں کی گنتی، زمین کے اندھیروں میں چھوٹے سے چھوٹا دانہ غرض جو تَر یا خشک

اس جہان میں ہے سب اس کے رجسٹر اور دفتر میں ہے جس کا نام "لوح محفوظ" ہے جو تفصیل کیساتھ صاف صاف لکھی ہوئی ہے۔

"غیب" کا معنیٰ

لفظ "غیب" سے مراد وہ چیزیں ہیں جو ابھی پیدا نہیں ہوئی یا پیدا تو ہو چکی ہیں مگر اللہ تعالیٰ نے ان پر کسی کو خبر نہیں دی، پہلی قسم کی مثال وہ تمام حالات و واقعات ہیں جو قیامت سے متعلق ہیں یا کائنات میں آئندہ پیش آنے والے واقعات سے تعلق رکھتے ہیں، مثلاً: یہ کہ کون کب اور کہاں پیدا ہوگا، کیا کیا کام کرے گا، کتنی عمر ہوگی، عمر میں کتنے سانس لے گا، کتنے قدم اٹھائے گا، کہاں مرے گا، کہاں دفن ہوگا، رزق کس کو کتنا اور کس وقت ملے گا، بارش کس وقت کہاں اور کتنی ہوگی؟

اور دوسری قسم کی مثال وہ حمل ہے جو عورت کے رحم میں تو ہے مگر یہ کسی کو معلوم نہیں کہ لڑکا ہے یا لڑکی، خوبصورت ہے یا بدصورت، نیک طبیعت ہے یا بد خصلت، اسی طرح اور ایسی چیزیں جو پیدا ہو جانے کے باوجود مخلوق کی نظروں سے غائب ہیں۔

یہ اصول بیان کرنے کے بعد کہ غیب کی کنجیاں اسی کے پاس ہیں جنہیں اس کے سوا کوئی نہیں جانتا، اللہ تعالیٰ نے علم غیب کی بعض چیزوں کا ذکر بھی فرمایا ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ خشکی اور تری میں پائی جانے والی تمام چیزوں کو جانتے ہیں، اس کا علم خشکی کے تمام خطوں یعنی میدانوں، پہاڑوں، صحراؤں اور جنگلوں کی ہر چیز کا علم اس کے پاس ہے، اللہ تعالیٰ کی زمین پر اس کی کتنی مخلوق آباد ہے اس میں کیا کیا چیزیں پائی جاتی ہیں حیوانات، درندوں، چرندوں اور پرندوں کی کتنی قسمیں اور کتنی تعداد ہے، جنگلات میں کس کس قسم کے کتنے درخت موجود ہیں ان پر کتنا پھل لگتا ہے کتنے کانٹے اور کتنے پھول ہیں ان کی کیا تاثیر ہے، جڑی بوٹیاں کہاں کہاں اور کون کون سی پائی جاتی ہیں، ان میں لوگوں کیلئے کس قدر فائدے اور کس قدر نقصانات ہیں، پھر پہاڑوں میں کتنے پتھر ہیں، کتنے ہیرے، کتنا لوہا، کوئلہ اور دیگر معدنیات ہیں، تیل کے کتنے ذخیرے زمین کے اندر چھپے ہوئی ہیں، کون کون سی

گیس ہے جس سے زلزلے آتے ہیں اور جس سے لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں، یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے اسی طرح دریاؤں، سمندروں اور جھیلوں میں کون کون سے جانور موجود ہیں، ان کی کتنی تعداد ہے، مچھلیاں کتنی ہیں اور باقی جاندار کتنے ہیں، سمندروں میں کتنے سیپ ہیں، ان میں کتنے موتی ہیں؟ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے، خشکی اور تری کی ہر چیز کو جاننے والے صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہیں۔

درختوں سے گرنے والے پتوں کو وہی جانتے ہیں، کوئی حکیم، سائنس دان یا دانشور یہ نہیں بتاسکتا کے فلاں پتہ درخت سے کب گرے گا، یہ کب خشک ہو جائے گا اور پھر خود بخود گر پڑے گا، گر کر کتنی دور تک جائے گا اور کس مقام پر جا کر رکے گا، کوئی نہیں جانتا، زمین کی تاریکیوں میں کوئی دانہ ایسا نہیں ہے اور نہ کوئی تر یا خشک چیز ہے جو لوح محفوظ میں درج نہ ہو، اللہ تعالیٰ کے سوا کون جانتا ہے کہ پوری زمین میں کس کس جگہ پر کون کون سا دانہ گرا پڑا ہے اور پھر اس سے کب اور کیا پیدا ہوگا اس سے کتنے دانے اُگیں گے اور یہ سلسلہ کہاں تک پہنچے گا؟

لَا یَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ: پیغمبر کو اسی قدر معلوم ہوتا ہے جس قدر اللہ تعالیٰ بتادیتے ہیں وہ خواہ وحی کے ذریعے بتائیں یا الہام کے ذریعے، مخلوق کو علم اتنا ہی ہوتا ہے جس کو وہ ظاہر فرمادیتے ہیں، جو شخص یہ عقیدہ رکھے کہ فلاں پیغمبر یا ولی یا بزرگ ہمارے سب حالات سے واقف ہیں اس نے شرک کیا، مخلوق کے تمام حالات اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا، کس کو کونسی تکلیف ہے اندرونی بیماری ہے یا بیرونی اس کے مجموعی حالات کیسے ہیں سب کچھ وہی جانتے ہیں جو خالق ہیں، اللہ تعالیٰ کے سوا نہ کوئی کسی کی تکلیف کو جانتا ہے اور نہ اسے دور کرنے پر قدرت رکھتا ہے، یہ تو اللہ تعالیٰ کا انعام ہے کہ اس نے مخلوق کو غیب دان نہیں بنایا ورنہ سارا نظام ہی درھم برہم ہو جاتا، مقصد یہ کہ جب تک کوئی شخص اپنے حالات کا اظہار نہیں کرتا دوسرے کو معلوم نہیں ہوتا، سوائے اللہ تعالیٰ کے کہ اسے ذرے ذرے کی خبر ہے۔

انسان کو اپنا بھی ہوش نہیں

وَ هُوَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّیْلِ وَ یَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ

اور وہی ہے | جو | لے لیتا ہے تم کو | رات کے وقت | اور | جانتا ہے | جو | کیا تم نے | دن کے وقت

ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيْهِ لِيُقْضٰٓى اَجَلٌ مُّسَمًّى ۚ ثُمَّ اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ

پھر بھیج دیتا ہے تم کو دن میں تا کہ پورا کیا جائے وقت مقرر پھر طرف اسی کی لوٹنا ہے تمہارا

ع ۵ ۱۳

ثُمَّ يُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿٦٠﴾

پھر جتا دے گا تم کو جو کچھ تھے تم کرتے (۶۰)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور وہی ہے جو رات میں تمہیں قبضہ میں لے لیتا ہے اور جانتا ہے جو کچھ تم دن میں کر چکے ہو، پھر تم کو اس میں اٹھا دیتا ہے تا کہ وہ وقت جو مقرر ہو چکا ہے پورا ہو، پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے پھر تم کو اس کی جو کچھ تم کرتے ہو خبر دے گا۔(۶۰)

تفسیر

اس آیت میں اس طرح سمجھایا گیا ہے کہ انسان سوچے کہ رات کو جب سو جاتا ہے تو اس کے کام کرنے کی طاقتیں کہاں چلی جاتی ہیں اس کے بس میں نہ سوچنا رہتا ہے، نہ کام کرنا، پچھلی آیت سے معلوم ہوا تھا کہ انسان آئندہ کی بات نہیں جان سکتا، اس آیت میں کہا گیا ہے کہ اسے اپنے پچھلے دن کے کاموں کا بھی رات کو سوتے وقت کچھ ہوش نہیں رہتا، دونوں چیزوں کا علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے کیونکہ اسے نہ تکان ستاتی ہے نہ نیند کی ضرورت ہے وہ ہر وقت ہر بات کی خبر رکھتا ہے، پھر انسان کو یہ بھی اختیار نہیں کہ سونے کے بعد خود سے کھڑا ہو، اللہ تعالیٰ ہی اسے اٹھاتے ہیں اور موت آنے تک اسی طرح رات کو سلاتے اور دن کو اٹھاتے رہیں گے موت کے بعد جسے ایک لمبی نیند سمجھنا چاہئے وہ ایک دن پھر اٹھائیں گے اور جو کچھ اس نے کیا ہوگا وہ سب اس کے سامنے رکھ دیں گے۔

ارشاد ہے کہ رات کو جب تم سو جاتے ہو تو اللہ تعالیٰ تمہاری سدھ بدھ سب کچھ تم سے لے لیتے ہیں تمہیں ان باتوں کی خبر بھی نہیں رہتی جو تم دن بھر کرتے رہے تھے مگر اللہ تعالیٰ سب کچھ جانتے ہیں پھر جب دن ہوتا ہے وہ تمہیں پھر اٹھا بٹھاتے ہیں تا کہ اپنی مقررہ عمر پوری کرو، آخر کار عمر ختم ہو جاتی ہے اور انسان ایسا سوتا ہے کہ پھر نہیں اٹھتا لیکن اللہ تعالیٰ اسے پھر اٹھائیں گے اور گزری ہوئی عمر کی ساری کارستانیاں اس کے

سامنے رکھ دیں گے۔

اس آیت میں انسانی زندگی کا عجیب نقشہ کھینچا گیا ہے، انسان کی عمر ایک مقررہ وقت کے اندر گھری ہوئی ہے اس میں وہ دن کو کام کرتا ہے اور رات کو تھک کر سو جاتا ہے اور دن بھر جو کام کیے تھے ان کا کچھ ہوش نہیں رہتا اور ایک وقت ایسا آئے گا کہ وہ بالکل سو جائے گا اور لمبی نیند کے بعد ایک دن اٹھے گا اور دنیا کے سارے کام اس کے سامنے آجائیں گے اور وہ اس کا نتیجہ بھگتے گا اور ہمیشہ زندہ رہے گا۔

ایک "حدیث شریف" میں نیند کو موت کی بہن فرمایا گیا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ نیند انسان کی تمام قوتوں اور صلاحیتوں کو ایسے ہی ناکارہ کر دیتی ہے جیسے موت، اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نیند اور پھر اس کے بعد جاگنے کی مثال پیش فرما کر انسان کو اس پر خبردار فرمایا ہے کہ جس طرح ہر رات اور ہر صبح میں ہر شخص ذاتی طور پر مر کر جینے کی ایک مثال کا مشاہدہ کرتا ہے اسی طرح پورے عالم کی اجتماعی موت اور پھر اجتماعی زندگی کو سمجھ لو جس کو قیامت کہا جاتا ہے جو ذات اس پر قادر ہے اس کی قدرت سے وہ بھی دور نہیں، اسی لئے آخر آیت میں فرمایا کہ پھر تم کو اللہ تعالیٰ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے پھر وہ تم کو بتلائیں گے جو تم عمل کیا کرتے تھے، مراد یہ ہے کہ عملوں کا حساب ہوگا پھر اس کا اچھا یا برا بدلہ ملے گا۔

انسانی زندگی کا مکمّل نقشہ

وَ هُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَ يُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً ؕ حَتّٰۤى

اور وہی غالب ہے اوپر بندوں اپنے کے اور بھیجتا ہے پر تم نگہبان یہاں تک کہ

اِذَا جَآءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَ هُمْ لَا يُفَرِّطُوْنَ ﴿۶۱﴾

جب آتی ہے کسی کو تم میں سے موت تو قبضہ کرتے ہیں اس پر فرشتے ہمارے اور وہ نہیں کمی کرتے (۶۱)

ثُمَّ رُدُّوْۤا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ ؕ اَلَا لَهُ الْحُكْمُ ۫ وَ هُوَ

پھر لوٹائے جائینگے طرف اللہ کی مالک ان کا سچا ہے خبردار! اسی کا حکم چلے گا اور وہ

اَسۡرَعُ الۡحٰسِبِيۡنَ ﴿۶۲﴾

سب سے جلدی حساب لینے والا ہے(۶۱)

بامحاورہ ترجمہ:۔اور وہی اپنے بندوں پر غالب ہے اور بھیجتا ہے تم پر نگہبان (فرشتے) یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کو موت آ پہنچے تو اس کو ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے قبضہ میں لے لیتے ہیں اور وہ کوتاہی نہیں کرتے۔(۶۱) پھر اللہ کی طرف جو ان کا سچا مالک ہے پہنچائے جائیں گے سن رکھو! حکم اسی کا چلتا ہے اور وہ بہت جلد حساب لینے والا ہے۔(۶۲)

تفسیر

اس آیت میں ارشاد ہے کہ انسان دنیا میں اپنی عمر کچھ سو کر اور کچھ جاگ کر بسر کر دیتا ہے اسے سوچنا چاہئے کہ اس میں نہ سونا اس کے بس کا ہے اور نہ جاگنا، اللہ تعالیٰ ہی اسے سلاتے ہیں اور پھر وہی اسے جگاتے ہیں اور پھر روز اسے اس کے کام یاد دلاتے ہیں اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر طرح اپنے بندوں پر غالب ہیں اور ان کے کاموں کی نگہبانی کرنے والے فرشتے روزانہ ان کے پاس بھیجتے ہیں، ایک وقت ایسا آئے گا کہ ان عملوں کے نگہبان فرشتوں کے بدلے موت کے فرشتے آ جائیں گے اور اپنا کام پورے طور پر بغیر کسی رو رعایت یا کوتاہی کے انجام دیں گے اور انسان قیامت تک کیلئے سو جائے گا، جب اس نیند کی مدت ختم ہو جائے گی تو پھر اللہ تعالیٰ انسان کو جگائیں گے اور وہ اپنے اس اصلی اور سچے مالک کے روبرو جا کر کھڑا ہوگا اس وقت اسے پورا پورا پتہ چل جائے گا کہ اس کی قسمت کا فیصلہ صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، اللہ تعالیٰ کے ہاں اس دن دیر کا کام نہیں، انسان کی دنیا کی ساری زندگی کا اعمال نامہ پلک جھپکنے میں اس کے ہاتھ میں دے دیا جائے گا اور پھر جب اس کو یقین دلایا جائے گا کہ یہ تیرے ہی کام ہیں اور ترازو میں تول تول کر اس کے اچھے اور برے کام الگ الگ کر دیئے جائیں گے تو اس کے مطابق اسے برے کاموں کی سزا بھگتنے اور اچھے کاموں پر انعام لینے کیلئے مناسب

جگہوں پر بھیج دیا جائے گا۔

وَ هُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ: "قَهْرٌ" کا معنیٰ دبانا یا مغلوب کردینا ہوتا ہے، "قَهَّارٌ" اللہ تعالیٰ کی صفت ہے، وہ جس کو چاہیں مغلوب کردیں اس کے سامنے کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں، بندے ظاہری اسباب اور سامان سے کتنے بھی لیس ہوں وہ کتنی بھی قوت رکھتے ہوں، انجینئر یا سائنس دان ہوں اللہ تعالیٰ سب پر غالب ہیں کیونکہ اس کی صفت "قَهَّارٌ" ہے، "سورۂ یوسف" میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے حکم میں غالب ہیں مگر اکثر لوگ نہیں سمجھتے جس کی وجہ سے طرح طرح کے غلط عقیدے پیدا ہوتے ہیں، وہی غالب ہیں جب چاہیں بڑے بڑے سرکشوں کو دبادیں اور انہیں ذلیل وخوار کردیں کیونکہ عزت ساری کی ساری اسی کے قبضہ میں ہے، بہرحال قاہر کا معنیٰ غالب اور دبانے والا ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے کہ وہ تم پر نگرانی کرنے والے فرشتے بھیجتے ہیں، قرآن کریم کے مختلف مقامات سے یہ بات حاصل ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تین قسم کے فرشتوں کی ڈیوٹیاں ہر انسان کے ساتھ لگا رکھی ہیں، پہلا گروہ "کراماً کاتبین" کا ہے، ان کا ذکر "سورۂ انفطار" میں موجود ہے، ہر انسان کا اعمال نامہ تیار کرنے والے یہ بزرگ فرشتے ہیں جو انسانوں کے کیے ہوئے کاموں کو جانتے ہیں اور انہیں اپنے رجسٹروں میں لکھ کر محفوظ کرلیتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا یہ بھی فرمان ہے کہ انسان اپنی زبان سے جو کچھ نکالتا ہے وہ نگران فرشتے ہر بات کا ریکارڈ محفوظ کرلیتے ہیں اور اس طرح ہر انسان کا اعمال نامہ تیار ہوتا رہتا ہے، یہ بات قابل ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ تو ساری باتوں کے جاننے والے ہیں وہ اگر کسی چیز کو نہ بھی لکھوائیں تو کوئی بات نہیں وہ ہر انسان کے ہر کام سے واقف ہیں مگر اس نے فرشتوں کے ذریعے انسانی کاموں کے لکھنے کا ایک نظام قائم کردیا ہے، قیامت کے روز یہ اعمال نامے انسانوں کے سامنے رکھ دیئے جائیں گے پھر وہ اپنے کیے ہوئے عملوں کا انکار نہیں کرسکیں گے۔

جو اعمال نامے "کراماً کاتبین" تیار کرتے ہیں وہ تو ہر انسان کو قیامت کے دن ملیں گے البتہ بعض فرشتے ایسے بھی ہیں جو ہر انسان کی کارکردگی کی رپورٹ صبح وشام اللہ تعالیٰ کے پاس پیش کرتے ہیں، صحیح حدیث میں

آتا ہے کہ پیغمبر ﷺ کا فرمان ہے کہ: لوگوں کے عمل ہر صبح شام پیش کیے جاتے ہیں اس کام کیلئے ہر انسان کے ساتھ فرشتے مقرر ہیں، رات کی ڈیوٹی والے فرشتے صبح کی نماز کے وقت تک اس کے ساتھ رہتے ہیں پھر وہ چارج دن کی ڈیوٹی والے فرشتوں کو دے کر اوپر چلے جاتے ہیں اور انسان کے عمل اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کرتے ہیں، دن کے فرشتے عصر کی نماز کے وقت اپنا چارج رات کے فرشتوں کو دے کر دن کے عمل لے جاتے ہیں اسی لئے پیغمبر ﷺ نے فرمایا کہ فجر اور عصر کی نمازوں کا خاص خیال رکھا کرو کیونکہ یہ عملوں کی پیشی کے وقت ہیں، اگرچہ اس رپورٹ کی بھی اللہ تعالیٰ کو ضرورت نہیں ہے تاہم یہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک انتظام موجود ہے۔

انسانی عملوں کے متعلق ہفتہ وار رپورٹ بھی اللہ تعالیٰ کو پیش کی جاتی ہے اس کام کیلئے الگ فرشتے مقرر ہیں جو جمعرات کے دن ہر آدمی کی رپورٹ پیش کرتے ہیں اس کے علاوہ سالانہ رپورٹ کا ایک دن بھی مقرر ہے، شب برأت کے موقع پر فرشتے ہر انسان کی پورے سال کی کارکردگی پیش کرتے ہیں، "سورۂ رعد" میں موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کیلئے ایسے فرشتے مقرر کر رکھے ہیں جو آگے پیچھے ہر طرف اس کی حفاظت کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے ساتھ نگران فرشتوں کی جماعت مقرر کر رکھی ہے یہ فرشتے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق ہر انسان کو مختلف حادثوں سے بچاتے ہیں اور جب اللہ تعالیٰ کسی شخص کو تکلیف میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں تو فرشتوں کی نگرانی اٹھالیتے ہیں اور ایسے شخص کے ساتھ وہ حادثہ پیش آجاتا ہے جو اس کیلئے مقرر ہوتا ہے، ایسے فرشتوں کی صحیح تعداد تو اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں تاہم بعض مفسرین کے مطابق ہر انسان کے ساتھ ساٹھ (۶۰) حفاظت کرنے والے فرشتے ہوتے ہیں جو ہر وقت انسان کے ساتھ رہتے ہیں جس طرح اس دنیا میں پولیس یا فوج کے سپاہیوں کے ڈیوٹیاں تبدیل ہوتی رہتی ہیں اسی طرح فرشتوں کی جماعتیں بھی وقفے وقفے سے بدلتی رہتی ہیں، فرشتوں کا یہ دوسرا گروہ ہے۔

تیسری قسم کے فرشتے وہ ہیں جن کا ذکر آیت کے اگلے حصہ میں ہے اور جو انسانوں کی روحیں قبض کرنے پر مقرر ہیں، چنانچہ ارشاد ہے کہ: جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آجاتا ہے تو ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے اس کو وفات دیتے ہیں یعنی اس کی روح قبض کر لیتے ہیں اور پھر اسے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اولاً یا تو "جنتیوں

کے مقام علیّین میں" لے جاتے ہیں یا "دوزخیوں کے مقام سجّین میں لے جاتے ہیں"، پھر جہاں اللہ تعالیٰ کی مرضی ہوتی ہے وہاں لے جاتے ہیں اور وہ اس معاملے میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کرتے۔

جب فرشتے روح قبض کر لیتے ہیں پھر انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹا دیا جاتا ہے جو کہ ان کا سچا آقا ہے، حکم تو اسی کا ہے تو پھر تم غیروں کی پوجا کیوں کرتے ہو؟ ان کو حاجت روا اور مشکل کشا کیوں سمجھتے ہو؟ خدا کی صفتوں کو مخلوق کی طرف کیوں منسوب کرتے ہو؟ یاد رکھو! مشکل کشا صرف اللہ تعالیٰ ہی ہیں، ہر ذرے ذرے سے واقف وہی ہیں، وہ اللہ ہی ہیں جو اپنے ارادے سے جو چاہیں کریں، تمام مخلوق اس کے حکموں کی پابند ہے حتیٰ کہ پیغمبر علیہم السلام بھی سب اللہ تعالیٰ کے حکم کے پابند ہیں، ایک موقع پر تیز ہوا چلنے لگی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس موجود ایک شخص نے ہوا کو برا بھلا کہا تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ہوا کو برا بھلا مت کہو یہ تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے کام کرتی ہے جیسا اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے ویسے ہی چلتی ہے، مقصد یہ کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کے حکم کی پابند ہے، حکم اسی کا ہے اور وہ جلد حساب لینے والے ہیں، جب وہ حساب لینے پر آئیں گے حساب کتاب کا عمل شروع فرمائیں گے تو انسان کی زندگی کے تمام عمل ایک دم سامنے آجائیں گے، نیکی اور بدی کا پتہ چل جائے گا پھر وہاں کوئی دیر نہیں لگے گی کیونکہ اللہ تعالیٰ حساب کتاب کے معاملے میں دیر نہیں لگائیں گے۔

ہر مشکل میں اللہ تعالیٰ ہی مددگار ہیں

قُلْ مَنْ يُّنَجِّيْكُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ تَدْعُوْنَهٗ

آپ کہہ دیجئے کون بچاتا ہے تم کو سے اندھیروں زمین کے اور سمندر کے پکارتے ہو تم اسکو

تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً ۚ لَئِنْ اَنْجٰنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ

عاجزی سے اور چپکے چپکے البتہ اگر بچالے ہم کو سے بلا اس تو ہوں ہم میں سے

الشّٰكِرِيْنَ ﴿٦٣﴾ قُلِ اللّٰهُ يُنَجِّيْكُمْ مِّنْهَا وَ مِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ

شکر گزاروں (۶۳) آپ کہہ دیجئے اللہ بچاتا ہے تم کو سے اس اور سے ہر سختی پھر بھی

اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ۝۶۴

تم شرک کرتے ہو (۶۴)

بامحاورہ ترجمہ:۔ آپ کہہ دیجئے تم کو زمین کے اندھیروں سے اور دریا کے اندھیروں سے کون بچاتا ہے اس وقت کہ تم اس کو پکارتے ہو گڑگڑا کر اور چپکے (سے کہتے ہیں) سے کہ اگر ہم کو وہ اس بلا سے بچالے تو البتہ ہم ضرور احسان مانیں گے۔(۶۳) آپ کہہ دیجئے! اللہ تم کو اس سے اور ہر سختی سے بچاتا ہے پھر بھی تم شرک کرتے ہو۔(۶۴)

تفسیر

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کو دنیا میں پہچاننے کا طریقہ بتایا گیا ہے کیونکہ انسان کے دل میں یہ خیال بڑے زور سے اٹھتا ہے کہ ہر کام دنیا میں میری اپنی کوششوں سے پورا ہوتا جارہا ہے پھر مجھے اللہ تعالیٰ کے ماننے کی کیا ضرورت ہے، یہ خیال انسان کی تباہی کا باعث ہے اور اس کو اس طرح دور کرنا چاہئے کہ یقیناً بعض موقعے ایسے آتے ہیں کہ انسان کے ہوش وحواس جواب دے دیتے ہیں اور وہ نہیں جانتا کہ کیا کرے اس کی سوچ سمجھ پر اندھیرا چھا جاتا ہے، اس قسم کے موقعے کسی آفت میں اچانک مبتلا ہونے کے وقت پیش آتے ہیں، مثلاً: آندھی، طوفان، زمین کے اوپر یا سمندر میں کسی درندے کا حملہ یا زبردست دشمن سے مقابلہ جس میں آدمی بے بس ہوجائے، جب اپنے بس کا کچھ نہیں رہتا تو اسے اپنی عاجزی کا احساس ہوتا ہے اور یہ بے ساختہ اپنے دل میں ایک زبردست طاقت والے کا دھیان کرتا ہے اور اس کے سامنے چپکے چپکے گڑگڑاتا ہے اور پکا ارادہ کرتا ہے کہ اس آفت سے بچ گیا تو ساری عمر شکر گزار رہوں گا، یہ زبردست طاقت والے ہی اللہ تعالیٰ ہیں اور ہر سختی کے وقت ہی بچانے والے ہیں اس کو ماننا چاہئے اور کسی کو اس کا شریک نہیں کرنا چاہئے، ارشاد ہے کہ ان سے پوچھئے کہ سخت مصیبت کے وقت جب تمہارا کچھ بس نہیں چلتا تو تمہارا دل کدھر متوجہ ہوتا ہے اور کس کو عاجزی سے گڑگڑا کر پکارتے ہو اور

کہتے ہو کہ ہمیں اس آفت سے بچالے ہم ہمیشہ شکر گزار اور احسان مند رہیں گے، یہی اللہ تعالیٰ ہیں جو تم کو ہر مصیبت اور آفت سے بچانے والے ہیں لیکن جب مصیبت جاتی رہتی ہے تو تم اللہ تعالیٰ کو بھول جاتے ہو اور چیزوں کو یا اپنی کوششوں کو اپنا مددگار اور کارساز سمجھنے لگتے ہو۔

پرانے مشرکوں کا کام یہ تھا کہ جب وہ طوفان میں گھر جاتے تھے یا کوئی سخت مشکل پیش آجاتی ہے تو خالص اللہ تعالیٰ ہی کو پکارتے تھے، وہ جانتے تھے کہ ایسے حالات میں "اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ" ہی کام آسکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہر طرح کا عذاب بھیج سکتے ہیں

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰۤى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ

آپ کہہ دیجئے وہی قادر ہے اس پر کہ بھیج دے پر تم عذاب سے اوپر تمہارے

اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ

یا سے نیچے پاؤں تمہارے کے یا بھڑادے تم کو فرقے بنا کر اور چکھادے تم میں سے ایک کو

بَاْسَ بَعْضٍ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ ۝۶۵

لڑائی دوسرے کی دیکھیے کس طرح بدل بدل کر لاتے ہیں ہم آیتوں کو تا کہ وہ سمجھ جائیں (۶۵)

بامحاورہ ترجمہ:۔ آپ کہہ دیجئے اسی کو اس پر قدرت ہے کہ تم پر عذاب بھیجے اوپر سے یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے یا تم کو مختلف فرقے کر کے بھڑادے اور ایک کو دوسرے کی لڑائی کا مزہ چکھادے، دیکھیے ہم کس طرح انداز بدل بدل کر آیتوں کو بیان کرتے ہیں تا کہ وہ سمجھ جائیں۔ (۶۵)

تفسیر

اس آیت میں کہا گیا ہے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ کو اس کی مدد کے ذریعے سے نہیں پہچانو گے تو، یاد رکھو! وہ تم پر عذاب بھی بھیج سکتے ہیں، پھر وہ یا تو تم کو بالکل جڑ سے ہی ختم کردیں گے۔ مثلاً: آسمان سے آندھی، پتھروں کی

بارش، کڑک وغیرہ یا زمین سے زلزلے، سیلاب وغیرہ بھیج کر جن سے پہلے امتوں کو ختم کیا گیا، فرقوں میں بانٹ کر ایک دوسرے کی دشمنی اور آپس کی لڑائی کا مزہ چکھا دیں گے اور تمہارا چین و آرام کھو دیں گے۔

حضرات مفسرین نے فرمایا کہ اوپر سے عذاب آنے کی مثالیں پچھلی امتوں میں بہت سی گزر چکی ہیں جیسے حضرت نوح علیہ السلام کی قوم پر بارش کا سخت سیلاب آیا اور قوم عاد پر ہوا کا طوفان مسلط ہوا اور حضرت لوط علیہ السلام کی قوم پر اوپر سے پتھر برسائے گئے، بنی اسرائیل پر خون اور مینڈک وغیرہ برسائے گئے، اصحاب فیل نے جب مکہ پر چڑھائی کی تو پرندوں کے ذریعہ ان پر ایسی کنکریاں برسائی گئیں جن سے وہ سب کے سب کھائے ہوئے بھس کی طرح ہو کر رہ گئے، اسی طرح نیچے سے آنے والے عذاب کی بھی پچھلی قوموں میں مختلف صورتیں گزر چکی ہیں، حضرت نوح علیہ السلام کی قوم پر تو اوپر کا عذاب طوفان، بارش کے ساتھ اور نیچے کا عذاب زمین کا پانی ابلنا شروع ہو گیا، غرض اوپر اور نیچے کے دونوں عذاب میں ایک ہی وقت میں گرفتار ہو گئے اور فرعون کی قوم پاؤں تلے کے عذاب میں غرق کی گئی، قارون بھی اپنے خزانوں کے ساتھ اسی عذاب میں گرفتار ہوا اور زمین کے اندر دھنسا دیا گیا۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے وہ انسان کو سیدھے راستے پر چلانے کیلئے ہوتا ہے، انسان کے فائدے کیلئے اللہ تعالیٰ نے ہوا، پانی، بارش، گرمی، سردی، رات اور دن سب کچھ بنایا ہے اور ان سے اسے بے انتہاء فائدے پہنچتے ہیں، انہی کو دیکھ کر اسے اللہ تعالیٰ کو سمجھ لینا چاہئے، اس کے بعد اپنے پیغمبروں کو انہی چیزوں کی طرف انسان کی توجہ دلانے اور ان پر غور کر کے اللہ تعالیٰ کو پہچان لینے کیلئے بھیجا اور انہیں کتابیں دیں جن میں انہیں سب باتیں سمجھائی گئیں، مفسرین نے لکھا ہے کہ پہلی امتوں کو آندھی، کڑک، طوفان، سیلاب، زلزلہ وغیرہ سے ہلاک کیا گیا، ہاں! اس امت کو ایسے عذاب میں گرفتار نہیں کیا جائے گا، البتہ آپس کی ناچاقی اور فرقہ بندیوں کی وجہ سے بے چینی اور پریشانیوں میں مبتلا کیا جائے گا اور سوچ سوچ کر درست ہونے کا موقع دیا جائے گا۔

"حدیث شریف" میں آتا ہے کہ اس آیت کے یہ الفاظ جب اترے "عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ" تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی "اَعُوْذُ بِوَجْهِكَ" اے اللہ! میں تیری ذات کے ساتھ اس عذاب سے پناہ مانگتا ہوں، پھر جب الفاظ "اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ" اترے تب بھی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے نیچے والے عذاب

سے پناہ مانگی، آیت کا تیسرا ٹکڑا "اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا" آیا تو آپ نے فرمایا یہ نسبتاً آسان ہے، ایک روایت میں آتا ہے کہ ان تین دعاؤں میں سے پہلی دو کو اللہ تعالیٰ نے منظور فرمالیا اور وعدہ فرمایا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی امت پر نہ تو حضرت نوح علیہ السلام کی قوم جیسا بارش یا پتھروں کا عذاب آئے گا کہ پوری قوم ہی ہلاک ہوجائے اور نہ نیچے سے زلزلے اور سیلاب وغیرہ ہی پوری امت کیلئے تباہ کن ہوں گے، البتہ آپس کی فرقہ بندی سے متعلق اللہ تعالیٰ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا قبول نہیں فرمائی، چنانچہ فرقہ بازی اس امت میں قیامت تک قائم رہے گی، حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی روایت میں آتا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا بھی فرمائی: اے اللہ! میری امت پر کسی دشمن کو مسلط نہ فرمانا، اللہ تعالیٰ نے یہ دعا بھی قبول فرمائی کہ دشمن تو مکمل طور پر مسلط نہ ہوگا مگر آپس کی لڑائی بھڑائی جاری رہے گی۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جارہے تھے کہ ہمارا گزر مسجد بنی معاویہ پر ہوا تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لے گئے اور دو رکعت نماز پڑھی، ہم نے بھی دو رکعت ادا کی اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم دعا میں مشغول ہوگئے اور بہت دیر تک دعا کرتے رہے اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ: میں نے اپنے رب سے تین چیزوں کا سوال کیا: **ایک یہ کہ** میری امت کو غرق کر کے ہلاک نہ کیا جائے، اللہ تعالیٰ نے یہ دعا قبول فرمالی، **دوسری یہ کہ** میری امت کو قحط اور بھوک کے ذریعہ ہلاک نہ کیا جائے، یہ بھی قبول فرمالی، **تیسری دعا یہ کی کہ** میری امت آپس کی لڑائیوں سے تباہ نہ ہو، مجھے اس سے روک دیا گیا؛ اسی مضمون کی ایک اور حدیث حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے منقول ہے جس میں تین دعاؤں میں سے ایک دعا یہ ہے کہ میری امت پر کسی دشمن کو مسلط نہ فرمادے جو سب کو تباہ و برباد کردے، یہ دعا قبول ہوئی اور آپس میں نہ بھڑ جائیں، اس دعا کو منع کردیا گیا۔

ان روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی امت پر اس قسم کے عذاب تو نہ آئیں گے جیسے پچھلی امتوں پر آسمان یا زمین سے آئے جس سے ان کی پوری قوم تباہ و برباد ہوگئی، لیکن ایک عذاب دنیا میں اس امت پر بھی آتا رہے گا، وہ عذاب آپس کی لڑائیوں اور فرقوں اور پارٹیوں کی آپس میں ٹکر ہے، اس لئے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو فرقوں اور پارٹیوں میں تقسیم ہوکر آپس کی لڑائی سے منع کرنے میں انتہائی تاکید سے کام لیا ہے اور ہر موقع پر اس سے ڈرایا ہے کہ تم پر اللہ تعالیٰ کا عذاب اس دنیا میں اگر آئے گا تو آپس ہی کی لڑائی کے ذریعہ آئے گا۔

اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ: اللہ تعالیٰ مختلف طریقوں سے شرک سے منع فرماتے ہیں، ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت اور حکمت بھی بیان فرمائی ہے، "اللہ تعالیٰ وحدہٗ لاشریک لہٗ" ہیں، مشکلوں سے نکالنے والی ذات اس کے سوا کوئی نہیں، لہٰذا اسی کو پکارو، اس کو ایک مانو ایک جانو، اس کے سامنے عاجزی کا اظہار کرو اور اسی کی عبادت کرو۔

ہر چیز کا ایک وقت مقرر ہے

وَ كَذَّبَ بِهٖ قَوْمُكَ وَ هُوَ الْحَقُّ ؕ قُلْ لَّسْتُ عَلَيْكُمْ

اور | جھٹلایا | اسکو | قوم آپکی نے | حالانکہ | وہ | حق ہے | آپ کہہ دیجئے | نہیں میں | پر تم

بِوَكِيْلٍ ؕ﴿۶۶﴾ لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ ؗ وَّ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۷﴾

ذمہ دار (۶۶) | واسطے ہر | چیز کے | ایک ٹھکانہ ہے | اور | عنقریب | تم جان لوگے (۶۷)

بامحاورہ ترجمہ: ۔اور اس کو آپ کی قوم نے جھٹلایا حالانکہ وہ حق ہے، کہہ دیجئے! میں تم پر ذمہ دار نہیں ہوں۔(۶۶) ہر ایک چیز کا ایک وقت مقرر ہے اور عنقریب تم جان لوگے۔(۶۷)

تفسیر

ارشاد ہے کہ اے پیغمبر! آپ کی قوم، یعنی: مکہ کے قریشیوں نے اس قرآن کریم کو جھوٹ جانا حالانکہ وہ سچ ہے اب وہ اس کی آیتوں پر کان دھرنے سے کتراتے ہیں اور بات ٹالنے کیلئے عجیب وغریب نشانیوں کا مطالبہ کرتے ہیں، ان سے کہہ دیجئے کہ میں تمہیں ہدایت کرنے کیلئے تم پر ذمہ دار مقرر نہیں کیا گیا ہوں، میں تو تمہیں صرف قرآن مجید سنانے اور سمجھانے آیا ہوں اس میں تمہارے لئے بڑے بڑے انعام کے وعدے ہیں اور عذاب کی دھمکیاں بھی ہیں، اب تمہیں اختیار ہے مانو یا نہ مانو اتنی بات اور کہہ دیتا ہوں کہ جو کچھ اس میں جزا وسزا

کے کا ذکر ہے پورے ہو کر رہیں گے صرف اتنی بات ہے کہ ہر چیز کا وقت مقرر ہے جب وقت آ جائے گا وہ چیز ہو کر رہے گی، یہ سمجھ لو کہ جو چیز ہونے والی ہے اور اس کے واقع ہونے کا فیصلہ کر دیا گیا ہے اور اس کی خبر قرآن کریم میں دیدی گئی ہے وہ دیر ہو یا سویر ہونے والی ضرور ہے، اس وقت نہیں سمجھتے تو وقت آنے پر سب کچھ جان لو گے، لیکن اس وقت کا جاننا کچھ کام نہ آئیگا۔

ان آیتوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں کیلئے قرآن مجید کے بتائے ہوئے راستہ پر چلنا اس کی بھلائی کیلئے ضروری ہے، قرآن مجید میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جس میں شک یا شبہ کی گنجائش ہو اور نہ کوئی ایسی بات ہے جو کسی سلجھے ہوئے شخص کی عقل کے خلاف ہو، اس لئے اس کو ہر شخص بے دھڑک مان سکتا ہے، یہ ناممکن ہے کہ ان باتوں کو خالص اور سچے دل سے ماننے والے کا انجام خراب ہو، اور نہ ماننے والے کو آخر میں حسرت، رنج اور افسوس کے سوا کچھ حاصل نہیں ہو سکتا، ماننے کا موقع یہی اس دنیا کی زندگی ہے ورنہ اس کے بعد ماننے کا وقت ہی نہیں ہوگا۔

قرآن کریم کیساتھ مذاق

وَ اِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ

اور | جب | دیکھیں آپ | ان کو جو | لعن طعن کرتے ہیں | میں | آیتوں ہماری | تو کنارہ کیجئے | سے ان

حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ ؕ وَاِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطٰنُ

یہاں تک کہ | مشغول ہو جائیں | میں | بات | کسی اور میں | اسکے سوا | اور اگر بھلا دے آپ کو | شیطان

فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝۶۸

پس نہ | بیٹھیے | بعد | یاد آنے کے | ساتھ | قوم کے | ظالموں (۶۸)

با محاورہ ترجمہ:۔ اور جب آپ ان لوگوں کو دیکھیں جو ہماری آیتوں میں جھگڑتے ہیں تو ان سے کنارہ

کیجئے یہاں تک کہ وہ اور کسی بات میں مشغول ہو جائیں اور اگر شیطان آپ کو بھلا دے تو یاد آ جانے کے بعد ظالموں کے پاس مت بیٹھئے۔ (۶۸)

لفظی تحقیق: **یَخُوْضُوْنَ:** ''خَوْضٌ'' سے بنا ہے، اس کے اصل معنٰی ہیں پانی کے اندر گھس جانا، اس سے مراد ہوتی ہے کوئی بات شروع کر کے اسی میں لگ جانا، یہاں ''یَخُوْضُوْنَ'' کے معنٰی ہیں قرآن کریم کی آیتوں کے بارے میں بیہودہ بحث میں پڑ جائیں، کافروں کی یہ بات چیت ہمیشہ مذاق کیلئے ہوتی تھی اور وہ قرآن مجید کی آیتوں کی ہنسی اڑاتے تھے، دوسری جگہ ''یَخُوْضُوْا'' کا معنٰی مشغول ہو جانے کے ہیں۔ **یَخُوْضُوْنَ فِیْٓ اٰیٰتِنَا:** اس جگہ اس کا ترجمہ عیب جوئی یا جھگڑنے کا کیا گیا ہے، یعنی: جب آپ ان لوگوں دیکھیں جو اللہ تعالٰی کی آیتوں میں صرف ہنسی مذاق کرتے ہیں اور عیب جوئی کرتے ہیں تو آپ ان سے اپنا رخ پھیر لیں۔

تفسیر

اس آیت میں ہدایت دی گئی ہے کہ جب یہ لوگ قرآن کریم کی آیتوں کے ساتھ بے ادبی کریں، ان کو منہ بگاڑ کر پڑھیں یا ان کے ایسے معنٰی کریں کہ دوسرے شک میں پڑ جائیں اور سمجھانے کے باوجود اس سے باز نہ آئیں تو تم ان کے پاس سے اٹھ جاؤ۔

ارشاد ہے کہ اے پیغمبر! جب آپ دیکھیں کہ یہ لوگ قرآن کریم کے ساتھ ہنسی مذاق کر رہے ہیں تو ان کے پاس سے اٹھ کر چلے جایئے، ہاں! جب وہ جھک جھک چھوڑ دیں اور کوئی اور کام کی بات کرنے لگیں تو پھر ان کے پاس بیٹھنے میں کوئی حرج نہیں، اگر کسی وقت شیطان آپ کو ان سے کنارہ کشی کرنا بھلا دے تو یاد آتے ہی فوراً اٹھ جانا چاہئے کیونکہ یہ لوگ ظالم ہیں اور قرآن کریم کے ساتھ مسخرہ پن کر کے اپنا خود کا نقصان کر رہے ہیں، ایسے جاہل اور نادان لوگوں سے کوئی سروکار نہ رکھنا چاہئے، یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کے وقار و عظمت کو یاد رکھنا اور اس کا ادب کرنا ہمارا فرض ہے، جو لوگ اس کے ساتھ حقارت کا برتاؤ کرتے ہوں اور اس کے معنٰی توڑ موڑ

کر پیش کرتے ہوں اور اپنی خواہشوں کے مطابق جو چاہیں کریں ان لوگوں سے بیزاری کا اظہار کرنا اور ان سے علیحدہ رہنا چاہئے۔

اس آیت میں مسلمانوں کو ایک اہم بنیادی ہدایت دی گئی ہے کہ جس کام کا خود کرنا گناہ ہے اس کے کرنے والوں کی مجلس میں شریک رہنا بھی گناہ ہے، اس سے بچنا چاہئے۔

اس آیت کا یہ حکم سب کیلئے ہے جس میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم بھی داخل ہیں اور امت کے دوسرے افراد بھی، اور درحقیقت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دینا بھی عام مسلمانوں کو سنانے کیلئے ہے ورنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو بچپن میں بھی کبھی ایسی مجلسوں میں شریک نہیں ہوئے اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو منع کرنے کی ضرورت نہ تھی۔

باطل پرستوں کی مجلس سے رُخ پھیرنے کی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں: **ایک یہ کہ** اس مجلس سے اٹھ جائیں، **دوسرے یہ کہ** وہاں رہتے ہوئے کسی دوسرے کام میں لگ جائیں، ان کی طرف توجہ نہ کریں لیکن آخر آیت میں بتلادیا گیا کہ مراد پہلی صورت ہے کہ ان کی مجلس میں بیٹھے نہ رہیں وہاں سے اٹھ جائیں۔

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے "تفسیر کبیر" میں فرمایا ہے کہ اس آیت کا اصل مقصد گناہ کی مجلس اور مجلس والوں سے کنارہ کشی ہے جس کی بہتر صورت تو یہی ہے کہ وہاں سے اٹھ جائے، لیکن اگر وہاں سے اٹھنے میں اپنی جان یا مال یا آبرو کا خطرہ ہو تو عام آدمی کیلئے یہ بھی جائز ہے کہ کنارہ کشی کی دوسری صورت اختیار کرلے، مثلاً: کسی دوسرے کام میں لگ جائے اور ان لوگوں کی طرف توجہ نہ کرے، مگر خاص لوگ جو دین میں پیشوا کی حیثیت رکھتے ہیں ان کیلئے وہاں سے بہرحال اٹھ جانا ہی ضروری ہے۔

احکام و مسائل

مسئلہ (۱):..... امام جصاص رحمۃ اللہ علیہ نے "احکام القرآن" میں فرمایا کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو ہر ایسی مجلس سے کنارہ کشی اختیار کرنا چاہئے جس میں اللہ تعالیٰ یا اس کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم یا اسلام کے خلاف باتیں ہو رہی ہوں اور اس کا بند کرنا یا کرانا یا کم از کم حق بات کا اظہار کرنا اس کے قبضہ و اختیار میں نہ ہو،

ہاں! اگر ایسی مجلس میں اصلاح کی نیت سے شریک ہو اور ان لوگوں کو حق بات کی تلقین کرے تو کوئی حرج نہیں۔

مسئلہ (۲):.... آخر آیت میں جو یہ ارشاد ہے کہ یاد آ جانے کے بعد ظالم قوم کے ساتھ نہ بیٹھو، اس سے امام جصاص رحمۃ اللہ علیہ نے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ ایسے ظالم، بے دین اور منہ پھٹ لوگوں کی مجلس میں شرکت کرنا ہر صورت میں گناہ ہے خواہ وہ اس وقت کسی ناجائز گفتگو میں مشغول ہوں یا نہ ہوں کیونکہ ایسے لوگوں کو ایسی بیہودہ گفتگو شروع کرتے ہوئے دیر نہیں لگتی۔

نیک لوگوں کی ذمّہ داری

وَ مَا عَلَى الَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّ لٰكِنْ

اور نہیں پر ان کے جو بچتے ہیں سے حساب ان کے کوئی چیز اور لیکن

ذِكْرٰى لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿٦٩﴾

نصیحت ہے تاکہ وہ باز آ جائیں (۶۹)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور پرہیز گاروں پر ان لوگوں کے حساب کی کچھ بھی جواب دہی نہیں، ہاں! نصیحت (ضروری ہے) تاکہ وہ بھی پرہیز گار ہوں۔ (۶۹)

لفظی تحقیق: يَتَّقُوْنَ: اس کا مصدر ''اِتِّقَاءٌ'' ہے اور ''وَقْيٌ'' سے بنا ہے جس کے معنٰی ہیں بچانا، حفاظت کرنا، ''اِتِّقَاءٌ'' کے معنٰی ہیں خود بچنا، پرہیز کرنا۔ حِسَابِ: شمار، گنتی، یہاں اس سے مراد ان کے کام اور عمل ہیں۔ ذِكْرٰى: اس کے معنٰی وہی ہیں جو ذکر کے ہیں اور یہ اس کی دوسری شکل ہے اس کا معنٰی ہے یاددھانی۔

تفسیر

اس آیت میں یہ بتا گیا ہے کہ جو کعبہ کا طواف اور عبادت کی نیت سے مسجد حرام میں جائے ان کی باتوں سے کوئی سروکار نہ رکھے اور ان کی حرکتوں کو برا سمجھے اور ان کے ستانے پر صبر کرے تو ان کے کاموں کی برائی اس

کے سر نہ پڑے گی کیونکہ وہاں اپنے کام سے گیا ہے اور اس کی غرض کعبہ کا طواف اور عبادت ہے، لیکن ہاں! وعظ و نصیحت ان کے کانوں تک کسی طرح پہنچاتے رہنا چاہئے جس کی قسمت میں ہوگا وہ سنور جائے گا۔

ارشاد ہے کہ جو لوگ ان لوگوں سے بچتے ہیں اور ان کے ساتھ نہیں اٹھتے بیٹھتے، وہ ان لوگوں کے گناہوں کے ذمہ دار نہیں ٹھہرائے جائیں گے، اگر کسی کو اپنے کسی کام سے ایسے لوگوں میں ان کی شرارت بھری باتوں کے درمیان جانا پڑے تو ان کا شریک نہیں ٹھہرایا جائے گا اور ان کے گناہوں کا وبال اس پر نہیں پڑے گا اور نہ اس وقت وہ انہیں سمجھا سکتا ہے، ہاں! جب بھی مناسب موقع اور محل ہو ان کو سمجھانے کی کوشش کرتے رہنا چاہئے تاکہ ان میں سے جسے سیدھے راستے پر آنا ہو وہ آ جائے۔

"مسلم شریف" کی روایت میں آتا ہے کہ مسلمان کو ہمیشہ پُر اُمید رہنا چاہئے اور خیر خواہی کی بات کرتے رہنا چاہئے، دین نام ہی خیر خواہی کا ہے، لوگ کتنے بھی غلط کام کرنے والے اور ہٹ دھرم ہوں تبلیغ کا کام جاری رہنا چاہئے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ کے پیغمبر مکمل درجے کے اطاعت گزار ہوتے ہیں اور وہ تبلیغ دین کا کام پورے خلوص کے ساتھ انجام دیتے ہیں اس کے باوجود قیامت کے دن حال یہ ہوگا کہ کسی پیغمبر کے پیچھے صرف ایک ہی امتی ہوگا اور بعض پیغمبر ایسے بھی ہوں گے جن کے ساتھ کوئی بھی امتی نہیں ہوگا، تاہم اس میں پیغمبر کا کوئی قصور نہیں ہے کیونکہ پیغمبر نے تبلیغ کا حق ادا کر دیا، اب کوئی مانتا ہے یا نہیں مانتا، یہ پیغمبر کی ذمہ داری نہیں ہے مقصد یہ ہے کہ جب پیغمبر کی بات کا بھی بعض اوقات اثر نہیں ہوتا تو ہم گنہگار کس کھاتے میں ہیں، اگر کوئی نصیحت سے فائدہ نہیں اٹھاتا تو مایوس نہیں ہونا چاہئے بلکہ اپنا کام کرتے رہنا چاہئے، ہماری ذمہ داری اتنی ہی ہے۔

شریروں سے بچو

وَ ذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّ لَهْوًا وَّ غَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ

اور چھوڑ دے ان کو جو بناتے ہیں دین اپنے کو کھیل اور تماشہ اور دھوکا دیا ان کو زندگی نے

الدُّنْيَا وَ ذَكِّرْ بِهٖٓ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌۢ بِمَا كَسَبَتْ ۖ لَيْسَ
دنیا کی اور نصیحت کیجئے قرآن کیساتھ تاکہ گرفتار نہ ہوجائے کوئی جی بہ سبب عملوں اپنے کے نہیں

لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيٌّ وَّ لَا شَفِيْعٌ ۚ
لئے اس کے سے سوا اللہ کے کوئی حمایتی اور نہ سفارش کرنے والا

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور چھوڑ دیجئے ان لوگوں کو جنہوں نے اپنے دین کو کھیل اور تماشہ بنا رکھا ہے اور ان کو دنیا کی زندگی نے دھوکہ دے رکھا ہے اور ان کو قرآن سے نصیحت کیجئے تاکہ اپنے کئے میں کوئی گرفتار نہ ہوجائے اور اس کیلئے اللہ کے سوا کوئی حمایتی اور سفارش کرنے والا نہیں ہوگا۔

لفظی تحقیق: **لَعِبًا وَّلَهْوًا:** کھیل کود، اس کے دو معنیٰ ہوسکتے ہیں، ایک یہ کہ جو دین حق یعنی اسلام ان کیلئے بھیجا گیا ہے اس کو کھیل کود بنا رکھا ہے، اس کا مذاق اڑاتے ہیں، دوسرے یہ کہ انہوں نے اصلی دین کو چھوڑ کر اپنا دین و مذہب ہی کھیل کود کو بنالیا ہے۔ **غَرَّتْ:** "غُرُوْرٌ" سے بنا ہے، "غُرُوْرٌ" کے معنیٰ ہیں دھوکا دینا، مغرور اس شخص کو کہتے ہیں جو دھوکے اور غلط فہمی میں مبتلا ہو۔ **تُبْسَلَ:** "بَسْلٌ" سے ہے جس کے معنیٰ ہیں پکڑ لینا، گرفتار کرنا۔

تفسیر

پہلے لوگوں نے اپنے دین کو اتنا بگاڑ لیا کہ ناچ، گانا اور کھیل تماشے بھی اپنے دینی کاموں میں داخل کرلیے اور بعد میں یہی جی بہلانے والی چیزیں سارا دین بن گئیں اور ان رسموں کے سامنے اصل دین یعنی عبادتیں اور معاملات بالکل مٹ گئے گویا دین فنا ہوگیا اور اس کے بگاڑنے والی وہ قومیں بھی باقی نہ رہیں، اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ان کی پیروی سے منع فرمایا ہے تاکہ دین بھی اپنی اصلی صحیح شکل میں قائم رہے اور اس کے ماننے والے مسلمان بھی اچھی حالت میں رہیں، فرمایا کہ ان سے بول چال چھوڑ دو البتہ قرآن کریم کا پیغام ان کو پہنچادو

اور مناسب طریقے سے ان کو سمجھا دو کہ ایک وقت ایسا آنے والا ہے کہ تم اپنے عملوں کی وجہ سے گرفتار ہو گے اور تمہارا کوئی دوست اور مددگار نہ ہوگا، حالت یہ ہوگی کہ تمہارے عملوں جن میں اللہ تعالیٰ کے حکموں کا اور اس کے بنائے ہوئے قاعدوں اور قانون کا کوئی خیال نہیں کیا گیا بلکہ ان کو خواہشوں کے پیچھے لگ کر توڑا گیا، تمہاری تباہی کی وجہ بنیں گے، دوست تم سے کترائیں گے، سفارش کرنے والے تم سے بھاگیں گے، اللہ تعالیٰ کے سوا جس سے تم دنیا میں سارے تعلقات توڑ چکے تھے اور کوئی تمہیں نظر نہ آئے گا اور تمہیں یقین ہو جائے گا کہ اب تمہاری خیر نہیں وہ خدا جس کے سامنے پیش ہونا تھا اس کو دنیا میں تم نے چھوڑ دیا اور اپنے سے ناراض کر لیا اور اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر جن سے تم نے رشتے جوڑے تھے وہ آج تمہیں چھوڑ گئے، آج تمہارا معاملہ صرف اللہ تعالیٰ سے ہے اور وہ تم سے ویسے ہی پیش آئیں گے جیسے اس نے ایسی حالت پیش آنے سے پہلے ہی دنیا میں قرآن مجید کے ذریعے خوب کھول کھول کر جتا دیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا نہ کوئی یار ہے نہ کوئی مددگار گو یا وہ لوگ اپنے برے عملوں کی سزا میں پھنس جائیں گے، اس لئے دنیا ہی میں اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

وَ ذَرِ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا دِیْنَهُمْ لَعِبًا وَّ لَهْوًا: مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس جملے کا یہ معنیٰ بھی ہوسکتا ہے کہ آپ ان لوگوں کو چھوڑ دیں جنہوں نے کھیل تماشے کو ہی اپنا دین بنالیا ہے، اس وقت دنیا کی کئی قومیں ایسی ہیں جن کے دین کی حیثیت کھیل تماشہ ہی رہ گئی ہے، عیسائی اپنا مذہبی تہوار کرسمس ڈے کس طرح مناتے ہیں؟ اربوں روپے کی شراب پی جاتی ہے، جوا کھیلا جاتا ہے، بدکاری ہوتی ہے اور طرح طرح کے کھیل کود اختیار کیے جاتے ہیں، کیا مقدس دن منانے کا یہی طریقہ ہے؟ کیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنا دین ایسے ہی منانے کا حکم دیا تھا؟ دراصل ان لوگوں نے دین کو کھیل تماشہ بنالیا ہے، جشن نوروز بھی اپنے ساتھ اسی قسم کی قباحتیں لاتا ہے، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیر کے مطابق اللہ تعالیٰ نے ہر قوم کیلئے ایک عید کا دن مقرر کیا ہے تاکہ اس دن لوگ اس کا ذکر کریں، اس کی عبادت میں مشغول ہوں اور سچی خوشی کا اظہار کریں مگر برے لوگوں نے اسے کھیل تماشہ بنالیا۔

چونکہ انسان دنیا میں اس کا عادی ہے کہ اگر کبھی کوئی غلطی یا ظلم کر بیٹھتا ہے اور اس کی سزا اس کے سامنے

آ گئی تو سزا سے بچنے کیلئے تین قسم کے ذریعے اختیار کرتا ہے، کبھی اپنی جماعت اور جتھے کا زور اس کے خلاف استعمال کر کے اپنے ظلم کے انجام سے بچنے کی کوشش کرتا ہے اور اگر اس سے عاجز ہو گیا تو بڑے لوگوں کی سفارش سے کام لیتا ہے اور یہ بھی نہ چلی تو پھر یہ کوشش کرتا ہے کہ اپنے آپ کو سزا سے بچانے کیلئے کچھ مال رشوت کے طور پر خرچ کرتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بتلا دیا ہے کہ خدا کے مجرم کیلئے سزا سے بچانے والا نہ کوئی دوست عزیز ہو سکتا ہے، نہ کسی کی سفارش بغیر اللہ تعالیٰ کی اجازت کے چل سکتی ہے اور نہ کوئی مال رشوت کے طور پر قبول کیا جا سکتا ہے بلکہ اگر سارے جہان کا مال بھی اس کے قبضہ میں ہو اور وہ سارے کا سارا مال دے کر چھوٹنا چاہے تب بھی اسے قبول نہ کیا جائے گا۔

بدلہ قبول نہ کیا جائیگا

وَ اِنْ تَعْدِلْ كُلَّ عَدْلٍ لَّا يُؤْخَذْ مِنْهَا ۚ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ

اور اگر بدلہ دے سارا بدلا نہ لیا جائے گا سے اس وہی ہیں جو

اُبْسِلُوْا بِمَا كَسَبُوْا ۚ لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّ عَذَابٌ

پکڑے گئے میں اس جو کمایا انہوں نے لئے انکے پینا ہے میں سے کھولتے ہوئے پانی اور عذاب

اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ﴿٧٠﴾

دردناک سے اس کہ تھے وہ کفر کرتے (۷۰)

ع ۱۰ ۸ ۱۴

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور اگر بدلے میں ہر چیز دیدے تو بھی اس سے قبول نہیں ہوں یہی لوگ جو اپنے کئے میں گرفتار ہوئے ان کو گرم پانی پینا ہے اور ان کیلئے کفر کے سبب دردناک عذاب ہے۔ (۷۰)

لفظی تحقیق: تَعْدِلْ: بدلہ دے: ''عَدْلٌ'' سے ہے، ''عَدْلٌ'' کے معنٰی عربی میں برابری کے ہیں، جو کسی کے برابر ہو وہی اس کا بدلہ ہو سکتا ہے اس لئے یہاں اس کے معنٰی بدلے کے ہیں۔ شَرَابٌ: پینا۔ عربی میں

ہر پینے کی چیز کو شراب کہتے ہیں، جیسے: ہر کھانے کی چیز کو طعام کہتے ہیں، شراب کیلئے عربی میں ''خمر'' وغیرہ دوسرے الفاظ ہیں۔

تفسیر

اس آیت کے ذریعے پچھلی آیت کا مضمون مکمل ہوتا ہے، پہلے حصہ میں تھا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا ان کا کوئی حمائتی اور مددگار نہ ملے گا، اس آیت میں ہے کہ اگر وہ بدلے میں سب کچھ جو ان کے پاس ہے دیکر بھی جان چھڑانی چاہیں گے تو ممکن نہ ہوگا، دنیا بھر کے سارے معاوضے وہاں بیکار ہوں گے، اگر بالفرض ان کے پاس ساری دنیا ہو اور وہ اسے دیکر خود بچنا چاہیں تو بھی نہ بچ سکیں گے، وہاں تو صرف نیک عملوں کی پوچھ ہے جب ان کے عملوں ہی ان کی گرفتاری کا سبب بن گئے تو اب ان کے چھوٹنے کا کوئی ذریعہ نہیں۔

ارشاد ہے کہ بڑے سے بڑا بدلہ بھی وہاں قبول نہ ہوگا، قیامت میں ایسے لوگوں کی حالت یہ ہوگی کہ گناہوں کی شامت نے انہیں چاروں طرف سے گھیر رکھا ہوگا اور وہ اپنے کیے کی سزا بھگتنے کیلئے مجرموں کی طرح اللہ تعالیٰ کے دربار میں قیدی بنے کھڑے ہوں گے، ان کے عملوں ہتھکڑیاں اور بیڑیاں بن کر ان کے ہاتھ پاؤں باندھ دیں گے، دنیا میں بڑے بڑے ٹھنڈے پانی کے گلاس پیئے ہوں گے، برف میں دبی ہوئی بوتلوں کے سوا بات ہی نہ کی ہوگی، نرم نرم گدوں اور کرسیوں پر آرام سے بیٹھتے رہے ہوں گے لیکن وہاں تو ان کے کفر ہی کو سامنے رکھا جائے گا، اور یہ کہ یہ دنیا کے معزز کھاتے پیتے لوگ ہیں، ان کی رعایت چاہئے، دنیا کی شان وشوکت وہاں کچھ کام نہ آئے گی، پینے کو کھولتا ہوا پانی ملے گا اور دکھ، درد، بے چینی اور ہر قسم کا جسم وجان کا عذاب بھگتنا ہوگا اور وہ صرف اس لئے کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کو نہ پہچانا اور اس کے حکموں سے منہ موڑا۔

''سورۂ محمد'' میں ہے کہ ان کے پینے کیلئے کھولتا ہوا پانی ہوگا، گرم پانی کا گھونٹ منہ میں ڈالیں گے تو وہ آنتوں کو کاٹ کر نیچے پھینک دے گا، وہ پانی پگھلے ہوئے فولاد سے بھی زیادہ گرم ہوگا، دوزخ کی آگ دنیا کی آگ سے ستر گنا زیادہ گرم ہوگی، اور طرح طرح کا دردناک عذاب دیا جائے گا، اس دنیا میں کی گئی تمام برائیاں

خوفناک شکلوں میں ان کے سامنے آئیں گی، مثلاً: بخل سانپ کی شکل بن کر ڈسے گا، بداخلاقی درندوں کی شکل اختیار کر کے حملہ آور ہوگی اور کفر وشرک جہنم کی آگ بن کر لپیٹے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ کی آیتوں کیساتھ کفر کرنا بہت بڑا جرم ہے، جگہ جگہ فرمایا ہے کہ کفر کرنے والے ہی ظالم ہیں جو مختلف سزاؤں میں مبتلا ہوں گے، فرمایا کہ ان کیلئے دردناک عذاب ہوگا کیونکہ یہ لوگ دنیا میں کفر کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے دین میں طعنہ زنی کرنے والوں کے انجام سے آگاہ کر دیا ہے اور نصیحت والی بات بھی سمجھا دی ہے۔

پچھلی تینوں آیتوں کا حاصل مسلمان کو برے ماحول اور بری صحبت سے بچانا ہے جو انسان کیلئے زہر کی طرح ہے، قرآن کریم کی آیتوں اور بیشمار حدیثوں کے علاوہ مشاہدہ اور تجربہ اس کا گواہ ہے کہ انسان کو تمام برائیوں اور جرموں میں مبتلا کرنے والی چیزیں اس کی بری سوسائٹی اور برا ماحول ہے جس میں پھنسنے کے بعد انسان اول تو ضمیر کے خلاف اور طبیعت کے خلاف برائیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے اور پھر جب عادت پڑ جاتی ہے تو یہ برائی کا احساس بھی ختم ہو جاتا ہے بلکہ برائی کو بھلائی اور بھلائی کو برائی سمجھنے لگتا ہے جیسا کہ ایک حدیث میں پیغمبر ﷺ کا ارشاد ہے کہ جب کوئی شخص پہلے پہل گناہ میں مبتلا ہوتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ لگ جاتا ہے اور جیسے سفید کپڑے میں ایک سیاہ نقطہ ہر شخص کو ناگوار ہوتا ہے اس کو بھی گناہ سے دل میں ناگواری پیدا ہوتی ہے لیکن جب ایک کے بعد دوسرا اور تیسرا گناہ کرتا چلا جاتا ہے اور پچھلے گناہ سے توبہ نہیں کرتا تو ایک ایک کر کے سیاہ نقطے لگتے چلے جاتے ہیں یہاں تک دل کی نورانی تختی بالکل سیاہ ہو جاتی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کو بھلے برے کی تمیز نہیں رہتی۔

اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر دوسروں کو پکارنا

قُلْ اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُنَا وَ لَا يَضُرُّنَا وَ نُرَدُّ

آپ کہہ دیجئے کیا پکاریں ہم سے چھوڑ کر اللہ کو اسے جو نہ نفع دے اور نہ نقصان دے ہم کو اور لوٹ جائیں

عَلٰٓى اَعْقَابِنَا بَعْدَ اِذْ هَدٰىنَا اللّٰهُ كَالَّذِى اسْتَهْوَتْهُ الشَّيٰطِيْنُ

اوپر ایڑیوں اپنی کے اسکے بعد کہ راہ دکھائی ہم کو اللہ نے مانند اسکے کہ بہکا دیا اس کو شیطانوں نے

فِي الْاَرْضِ حَيْرَانَ ۖ لَهٗۤ اَصْحٰبٌ يَّدْعُوْنَهٗۤ اِلَى الْهُدَى ائْتِنَا ؕ

میں زمین حیران لئے اس کے ساتھی ہیں کہ بلاتے ہیں اسکو طرف راستہ کی ہمارے پاس آ

بامحاورہ ترجمہ:۔ آپ کہہ دیجئے! کیا ہم اللہ کے سوا ان کو پکاریں جو ہم کو نہ نفع پہنچا سکیں اور نہ نقصان اور کیا ہم الٹے پاؤں پھر جائیں بعد (یعنی مرتد ہو جائیں) اس کے کہ اللہ ہم کو سیدھی راہ دکھا چکا اس آدمی کی طرح کہ جس کو رستے میں جنوں نے جنگل میں راستہ بھلا دیا ہو جبکہ وہ حیران ہے اس کے ساتھی اسے راستہ کی طرف بلاتے ہیں کہ ہمارے پاس چلا آ۔

لفظی تحقیق: اَعْقَابٌ: ''عَقِبٌ'' کی جمع ہے جس کے معنیٰ ایڑی کے ہیں۔ اِسْتَهْوَتْ: ''اِسْتَهْوَاءٌ'' سے بنا ہے اور ''اِسْتَهْوَاءٌ'' کے معنیٰ ہیں بہکانہ۔ الشَّيٰطِيْنُ: ''شَيْطَانٌ'' کی جمع ہے، یہ لفظ بہت دفعہ آ چکا ہے، یہاں اس سے مراد وہ خبیث روحیں ہیں جنہیں چھلاوہ، بھوت وغیرہ کہتے ہیں، او پر اس کا ترجمہ جن کیا ہے۔

تفسیر

ارشاد ہے کہ ان سے کہہ دیجئے کہ کیا تم ہم سے یہ چاہتے ہو کہ ہم اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر پتھروں، درختوں وغیرہ کو پکاریں اور ان کی پوجا کریں، تمہیں معلوم ہے کہ یہ نہ ہمیں کچھ فائدہ پہنچا سکتے ہیں اور نہ ہمارا کچھ بگاڑ سکتے ہیں، کیا تمہارا مقصد یہ ہے کہ ہم سیدھے راستہ پر پڑ جانے کے بعد پھر اس سے الٹے پاؤں پھر جائیں، اللہ تعالیٰ نے تو ہمیں ہدایت کی اور ہم پھر اس ہدایت سے منہ موڑ لیں، ان سے پوچھو کہ تم اس شخص کو کیسا سمجھو گے جو اپنے خیر خواہ دوستوں کے ساتھ سیدھی سڑک پر چل رہا ہے، شریر، خود غرض، ستانے والے شیطان اسے اشارے کر کر کے اس کے ساتھیوں سے چھڑا دیتے ہیں اور اسے پھر جنگل میں بھٹکتا ہوا چھوڑ دیتے ہیں، اب وہ اِدھر اُدھر بھٹکتا ہے، خبیث روحوں کے اثر سے ہوش وحواس غائب ہیں، کبھی اُس چیز کی طرف دوڑتا ہے کبھی اِس چیز کی طرف دوڑتا ہے، اس کے ساتھی اسے ہمدردی سے آواز دے رہے ہیں کہ اِدھر آؤ کہاں بھٹکتے پھرتے ہو، ہمارے پاس آ جاؤ،

ان پریشانیوں سے چھوٹ جاؤ گے مگر وہ گمراہ شیطانوں کے قبضہ میں ہے اور ان کی نہیں سنتا، ہم اگر اب اسلام چھوڑ دیں تو ہماری حالت بالکل ایسے ہی شخص کی ہوگی۔

اس آیت سے ہمیں یہ سبق سیکھنا چاہئے کہ بری خواہشوں کے بہکاوے میں آ کر سچے مسلمانوں کے راستہ سے الگ نہ ہونا چاہئے، ورنہ اگر خواہشوں کا اثر جم گیا تو پریشانی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا اور خیر خواہ دوستوں کی آواز بھی کانوں تک نہ پہنچے گی کیونکہ خواہشیں اندھا بہرہ کر دیتی ہیں اور پھر تنہا چھوڑ کر چل دیتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی صفتیں

قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَ اُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ

آپ کہدیجئے بیشک راہ اللہ کی وہی ہے ٹھیک راہ اور حکم دیا گیا ہمیں کہ فرمانبردار رہیں ہم پروردگار کے

الْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۱﴾ وَ اَنْ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اتَّقُوْهُ ؕ وَ هُوَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ

جہانوں کے (۷۱) اور یہ کہ قائم کرو نماز کو اور ڈرتے رہو اس سے اور وہی ہے جس کی طرف

تُحْشَرُوْنَ ﴿۷۲﴾ وَ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ

اکٹھے کئے جاؤ گے تم (۷۲) اور وہی ہے جس نے پیدا کیا آسمانوں کو اور زمین کو جیسا چاہئے

وَ يَوْمَ يَقُوْلُ كُنْ فَيَكُوْنُ ؕ۬ قَوْلُهُ الْحَقُّ ؕ وَ لَهُ الْمُلْكُ الثلثة

اور جس دن کہے گا ہو جا پس ہو جائیگا اسی کا کہنا سچ ہے اور اسی کی بادشاہت ہے

يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ ؕ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ ؕ وَ هُوَ

جس دن پھونکا جائیگا میں صور جاننے والا ہے چھپے اور کھلے کا اور وہی

الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ﴿۷۳﴾

حکمت والا خبر رکھنے والا (۷۳)

بامحاورہ ترجمہ: آپ کہہ دیجئے! کہ اللہ تعالیٰ نے جو راہ بتائی ہے وہی سیدھی راہ ہے اور ہم کو حکم ہے کہ جہانوں کے رب کے فرمانبردار رہیں۔(۷۱) اور یہ کہ نماز قائم رکھو اور اللہ سے ڈرتے رہو اور وہی ہے جس کے سامنے تم سب اکٹھے ہو گے۔(۷۲) اور وہی ہے جس نے آسمان اور زمین کو ٹھیک طور پر پیدا کیا اور جس دن کہے گا کہ ہو جا تو وہ ہو جائیگا اس کی بات سچی ہے اور جس دن صور پھونکا جائیگا اسی کی بادشاہت ہوگی، چھپی اور کھلی باتوں کے جاننے والے، حکمت والے خبر رکھنے والے وہی ہیں۔(۷۳)

لفظی تحقیق: صُوْرٌ: عربی زبان میں نرسنگے کو کہتے ہیں جو سینگ کو کھوکھلا کر کے بنتا ہے اور اس کے پہلے سرے کو منہ میں لے کر پھونک مارنے سے بڑے زور کی آواز نکلتی ہے، ایسی ہی ایک چیز ہے جس میں حضرت اسرافیل علیہ السلام وقت آنے پر اللہ تعالیٰ کے حکم سے پھونک ماریں گے اور اس کی ڈراؤنی آواز سے ہر چیز ختم ہو جائے گی پھر جب خدا کو منظور ہوگا تو وہ دوبارہ پھونک ماریں گے جس سے پھر سب لوگ زندہ ہو جائیں گے اور اللہ تعالیٰ کے سامنے پیشی ہوگی، ہمارے سمجھانے کیلئے اسے صور کہا ہے ورنہ اس کی حقیقت اس وقت سمجھنی مشکل ہے۔

تفسیر

پچھلی آیت میں کہا گیا تھا کہ مشرکوں سے کہہ دیجئے کہ ہم بت پرست نہیں ہو سکتے کیونکہ ہمیں حقیقی معبود کی پہچان ہو گئی ہے، اس آیت میں اسی اصلی معبود کی صفتیں بیان کی گئی ہیں۔

(۱)....وہ تمام جہان کے پالنے والے ہیں۔

(۲).... قیامت کے دن سب اس کے سامنے حساب کتاب کیلئے جمع ہوں گے۔

(۳)....اس نے آسمان زمین بنائے۔

(۴)....وہ "کُنْ" (ہو جا) کہہ کر پیدا کرنے والے ہیں۔

(۵)…. جو وہ کہتے ہیں وہ ہو کر رہتا ہے۔

(۶)…. قیامت کے دن بادشاہت اسی کی ہوگی۔

(۷)…. وہ کھلی اور چھپی سب باتوں سے واقف ہیں۔

ہمیں یہ بھی حکم ملا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ہر وقت ڈرتے رہیں کہ اس کی نافرمانی کر کے کہیں اللہ تعالیٰ کی ناراضگی میں نہ آ جائیں، تقویٰ سے مراد حق راستہ اور شریعت کی حدوں کی حفاظت کرنا اور دل میں اللہ تعالیٰ کا ڈر رکھنا ہے کہ کہیں گناہ میں گرفتار نہ ہو جائیں کیونکہ وہی اللہ تعالیٰ ہیں جس کی طرف تم سب اکٹھے کیے جاؤ گے، آخر کار اسی کے سامنے پیش ہونا ہے، عملوں کا حساب کتاب ہوگا، لہٰذا اس کیلئے ابھی سے تیاری کی ضرورت ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو زندگی جیسا قیمتی سرمایہ دے کر اس دنیا میں بھیجا ہے کہ اس کم وقت میں نیکی کی تجارت کر لے یہی کام آنے والی ہے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ ہر شخص جو صبح کرتا ہے اپنے نفس کو بیچتا ہے یا پھر اس کے بدلے ہلاکت خریدتا ہے یا پھر نفس کو نجات دلا دیتا ہے، اگر اس نے ایمان اور تقویٰ خرید لیا اس قیمتی سرمایہ کو اچھے کام میں لگا دیا تو اپنے آپ کو دوزخ سے آزاد کرا لیا اور اگر کفر، شرک اور برائی خریدی تو اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال لیا، انسان کی زندگی بڑا قیمتی سرمایہ ہے، زندگی کی پونجی ہمیشہ گھٹتی رہتی ہے، لہٰذا عقلمندی کا تقاضہ یہ ہے کہ اسے نیکی کے کام میں لائے اور اگر کفر و شرک ہی خریدا تو اپنے آپ کو تباہ و برباد کر لیا۔

اگلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ کی بعض صفتیں بیان کی گئی ہیں، وہی اللہ ہیں جس نے آسمانوں اور زمینوں کو حق کے ساتھ پیدا کیا، اس مقام پر جہان کی چیزوں کی پیدائش کا ذکر کر کے اللہ تعالیٰ نے یہ بات سمجھائی ہے کہ جہان کا یہ پورا نظام بے فائدہ ہی پیدا نہیں کر دیا گیا بلکہ اس کا کوئی نتیجہ بھی سامنے آنے والا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی حکمت کے ساتھ بنایا ہے، پھر جب یہ نظام مدت پوری کر لے گا تو پھر وہ دن بھی آ جائے گا جس دن اللہ تعالیٰ فرمائیں گے ہو جا تو ہو جائے گا جس طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کو بنایا، جہان کی ہر چیز کو پیدا کیا اسی طرح جب قیامت کا مقررہ دن آئے گا تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہر چیز ختم ہو جائے گی پھر جب اللہ تعالیٰ دوبارہ زندہ کر کے اٹھائیں گے تو حساب کتاب کی منزل آئے گی اور جزا و سزا کا فیصلہ ہوگا، مقصد یہ کہ وہ مالک الملک با اختیار ہیں

اسے ہر چیز پر قدرت حاصل ہے وہ جو کچھ کرنا چاہتے ہیں بغیر کسی مددگار کے کرگزرتے ہیں، اس کی بات بالکل سچی ہے اور بادشاہی بھی اسی کی ہے، تمام جہان میں اسی کا حکم چلتا ہے، اللہ تعالیٰ انسانوں کو زمین پر جو عارضی اختیار دیتے ہیں اسے پا کر انسان بگڑ جاتے ہیں، کوئی ڈکٹیٹر بن جاتا ہے اور کوئی شہنشاہ بننے کی کوشش کرتا ہے اور ملک الملوک کی کرسی سنبھالنا چاہتا ہے، انسان اقتدار کے نشہ میں آ کر اپنے انجام کو بھول جاتا ہے۔

جب بادشاہی اسی کی ہے تو پھر وہ جب چاہیں اقتدار چھین بھی سکتے ہیں، جس دن صور پھونکا جائے گا، یعنی: جب قیامت کا بگل بج جائے گا تو سب فنا ہو جائیں گے حتیٰ کہ آخر میں ملک الموت کو بھی موت آ جائے گی، تمام قریبی فرشتے اور عرش کو تھامنے والے ختم ہو جائیں گے اس دن اللہ تعالیٰ فرمائیں گے آج بادشاہی کس کی ہے مگر کوئی جواب دینے والا نہیں ہوگا پھر اللہ تعالیٰ خود ہی فرمائیں گے، بادشاہی اللہ تعالیٰ ہی کی ہے وہ ایک اکیلے ہیں اور غالب ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مثال

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهِیْمُ لِاَبِیْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً ۚ اِنِّیْۤ

اور جب کہا ابراہیم نے سے باپ اپنے آزر کو کیا بناتا ہے تو بتوں کو معبود بیشک

اَرٰىكَ وَ قَوْمَكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ﴿۷۴﴾ وَ كَذٰلِكَ نُرِیْۤ اِبْرٰهِیْمَ

میں دیکھتا ہوں تجھے اور قوم تیری کو میں گمراہی ظاہر کے (۷۴) اور اسی طرح دکھائیں ہم نے ابراہیم کو

مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لِیَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِیْنَ ﴿۷۵﴾

چیزیں آسمانوں کی اور زمین کی اور تاکہ ہو جائے وہ میں یقین کرنے والوں (۷۵)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور یاد کیجیے جب ابراہیم نے اپنے باپ آزر کو کہا آپ کیا بتوں کو اپنا معبود مانتے ہیں، میں آپ کو اور آپ کی قوم کو کھلی گمراہی میں دیکھتا ہوں۔ (۷۴) اور اسی طرح ہم ابراہیم کو آسمانوں کے اور زمین کے عجائبات دکھانے لگے تا کہ اس کو یقین آ جائے۔ (۷۵)

لفظی تحقیق: اٰزَرَ: حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام ہے جو بت پرست تھا اور اس کی قوم ساری ہی بت پرست تھی۔ اَصْنَامًا: ''صَنَمٌ'' کی جمع ہے، ''صَنَمٌ'' بت کو کہتے ہیں۔ اٰلِهَةً: ''اِلٰهٌ'' کی جمع ہے، ''اِلٰهٌ'' کے لفظی معنٰی معبود کے ہیں۔

تفسیر

دیکھئے! حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والد سے کیسی عقلمندی کی بات کہی کہ کیا تم ان پتھر، مٹی کی گھڑی ہوئی اور بنائی ہوئی مورتیوں کو پوجتے ہو اور ان کو اپنا معبود قرار دیتے ہو، میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ تم اور تمہاری قوم سب ایک نہایت کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے ہو، بھلا اس سے زیادہ نادانی کیا ہوگی کہ اپنے ہاتھ سے ایک مورت گھڑی اور اس کی پوجا کرنے لگے، آگے ارشاد ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب بتوں سے لاتعلقی ظاہر کی تو ہم نے ان پر آسمانوں اور زمینوں کے بھید ظاہر کرنے شروع کر دیئے اور بتایا کہ جس چیز کو دیکھو وہ ایک الگ اپنا نظام رکھتی ہے، سارے نظام ایک عظیم الشان نظام کے تحت چل رہے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی قدرت سے قائم ہے۔

پچھلی آیتوں میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا عرب کے مشرکوں کو خطاب اور بت پرستی چھوڑ کر صرف خدا پرستی کی دعوت کا بیان تھا۔

ان آیتوں میں اسی دعوت کی تائید ایک خاص انداز میں فرمائی گئی ہے جو فطری طور پر عرب والوں کیلئے دلنشین ہوسکتی ہے، وہ یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تمام عرب کے جدامجد (دادا) ہیں اور اسی لئے سارا عرب ان کی تعظیم پر ہمیشہ سے متفق چلا آیا ہے، ان آیتوں میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس مناظرہ کا ذکر کیا گیا ہے جو انہوں نے بت پرستی اور ستارہ پرستی کے خلاف اپنی قوم کے ساتھ کیا تھا اور پھر سب کو اللہ تعالیٰ کے ایک ہونے کا سبق دیا تھا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ آزر سے کہا کہ تم نے اپنے ہاتھوں کے بنائے ہوئے بتوں کو اپنا معبود بنالیا ہے، میں تم کو اور تمہاری ساری قوم کو گمراہی میں دیکھتا ہوں۔

عقائد اور عملوں کی اصلاح کی دعوت

اپنے گھر اور اپنے خاندان سے شروع کرنی چاہئے

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کے دین کی دعوت اپنے گھر سے شروع فرمائی جیسا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس کا حکم ہوا ہے کہ اپنے قریبی رشتہ داروں کو خدا کے عذاب سے ڈرایئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ترتیب کے مطابق سب سے پہلے اپنے خاندان ہی کو صفا پہاڑ پر چڑھ کر اللہ تعالیٰ کے دین کی دعوت کیلئے جمع فرمایا۔

"تفسیر بحر محیط" میں ہے کہ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر خاندان کے کوئی واجب الاحترام بزرگ دین کے صحیح راستہ پر نہ ہوں تو ان کو صحیح راستہ کی طرف دعوت دینا احترام کے خلاف نہیں بلکہ ہمدردی و خیر خواہی کا تقاضہ ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے دین کی دعوت اور اصلاح کا کام اپنے قریبی لوگوں سے شروع کرنا پیغمبروں کا طریقہ ہے۔

عقل کا کام

فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ

پھر جب اندھیرا کرلیا پر اس رات نے دیکھا اس نے ایک ستارا کہا یہ ہے رب میرا پھر جب غائب ہوگیا

قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ﴿٧٦﴾ فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا

کہا نہیں میں پسند کرتا غائب ہوجانے والے کو (۷۶) پھر جب دیکھا اس نے چاند چمکتا ہوا کہا یہ ہے

رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ

رب میرا پھر جب غائب ہوگیا کہا البتہ اگر نہ ہدایت کی مجھ کو رب میرے نے البتہ ضرور ہوجاؤں گا میں منجملہ

الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ ﴿۷۷﴾
قوم گمراہوں کے (۷۷)

بامحاورہ ترجمہ:۔ پھر جب اندھیرا کر لیا ان پر رات نے انہوں نے ایک ستارا دیکھا کہا یہ میرا رب ہے پھر جب غائب ہو گیا کہا میں پسند نہیں کرتا غائب ہو جانے والوں کو۔ (۷۶) پھر جب انہوں نے چاند کو چمکتا ہوا دیکھا کہا یہ میرا رب ہے، پھر جب وہ غائب ہو گیا کہا اگر مجھ کو میرا رب ہدایت نہ کرے تو بیشک میں گمراہ لوگوں میں سے ہو جاؤں گا۔ (۷۷)

لفظی تحقیق: جَنَّ: ڈھانپ لیا: اس کا مصدر ''جِنٌّ'' ہے اس کے معنیٰ ہیں ڈھانپ لینا، چھپا لینا۔
اَفَلَ: غائب ہو گیا: اس کا مصدر ''اُفُوْلٌ'' ہے، غائب ہو جانا، غروب ہو جانا، چھپ جانا۔

تفسیر

تبلیغ و دعوت میں حکمت و تدبیر سے کام لینا پیغمبروں کی سنت ہے

ایک رات جب تاریکی چھا گئی اور ایک ستارہ پر نظر پڑی تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کو سنا کر فرمایا کہ یہ ستارہ میرا رب ہے مطلب یہ تھا کہ تمہارے خیالوں و عقیدوں کی رو سے یہی میرا رب ہے یعنی پالنے والا ہے، اب تھوڑی دیر میں اس کی حقیقت دیکھ لینا، چنانچہ کچھ دیر کے بعد وہ غروب ہو گیا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو قوم پر دلیل قائم کرنے کا واضح موقع ہاتھ آیا اور فرمایا کہ: میں غروب ہو جانے والی چیزوں سے محبت نہیں رکھتا اور جس کو خدا یا معبود بنایا جائے ظاہر ہے کہ وہ سب سے زیادہ محبت و عظمت کا مستحق ہونا چاہئے، اس کے بعد پھر کسی دوسری رات میں چاند چمکتا ہوا نظر آیا تو پھر اپنی قوم کو سنا کر وہی طریقہ اختیار فرمایا اور کہا کہ (تمہارے عقیدے کے مطابق) یہ میرا رب ہے مگر اس کی حقیقت بھی کچھ دیر کے بعد سامنے آ جائے گی، چنانچہ جب چاند غروب ہو گیا تو فرمایا، اگر میرا رب مجھے ہدایت نہ کرتا تو میں بھی تمہاری طرح گمراہوں میں داخل ہو جاتا اور چاند

ہی کو اپنا رب اور معبود سمجھ بیٹھتا لیکن اس کے طلوع و غروب کے بدلنے والے حالات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ بھی عبادت کے قابل نہیں۔

اس آیت میں اس کی طرف بھی اشارہ کر دیا کہ میرا رب کوئی دوسری شے ہے جس کی طرف سے مجھے ہدایت ہوتی رہتی ہے۔

اس کے بعد ایک روز سورج کو نکلتے ہوئے دیکھا تو پھر قوم کو سنا کر اسی طریقہ پر فرمایا کہ (تمہارے خیال کے مطابق) یہ میرا رب ہے اور یہ تو سب سے بڑا ہے مگر اس کی حقیقت و حیثیت بھی عنقریب تمہارے سامنے آ جائے گی، چنانچہ سورج بھی اپنے وقت پر غروب ہو گیا تو قوم پر آخری دلیل قائم کرنے کے بعد اب اصل حقیقت کو واضح طور پر بیان فرمادیا کہ اے میری قوم! میں تمہارے ان مشرکانہ خیالات سے بیزار ہوں کہ تم نے اللہ تعالیٰ کی مخلوقات کو ہی خدائی کا شریک بنا رکھا ہے۔

اس کے بعد اس حقیقت کو بتلا دیا کہ میرا اور تمہارا رب (پالنے والا) ان تمام مخلوقوں میں سے کوئی نہیں ہو سکتا جو خود اپنے آپ کو قائم رکھنے میں دوسرے کے محتاج ہیں اور ہر وقت گھٹنے اور بڑھنے اور طلوع و غروب کی تبدیلی میں گھرے ہوئے ہیں بلکہ ہمارا سب کا رب وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمینوں اور ان میں پیدا ہونے والی تمام مخلوقوں کو پیدا کیا ہے اس لئے میں نے اپنا رخ تمہارے سب خود کے بنائے ہوئے معبودوں سے پھیر کر صرف ایک خدائے "وحدہٗ لاشریک لہٗ" کی طرف کر لیا ہے اور میں تمہاری طرح مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔

اس مناظرہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پیغمبرانہ حکمت سے کام لے کر ان کی ستارہ پرستی کو غلط یا گمراہی نہیں فرمایا بلکہ ایک ایسا انداز اپنایا جس سے ہر عقل والے انسان کا دل و دماغ خود متاثر ہو کر حقیقت کو پہچان لے، ہاں! بت پرستی کے خلاف بات کرنے میں پہلے ہی شدت اختیار فرمائی اور اپنے باپ اور پوری قوم کا گمراہی پر ہونا صاف طور پر بیان کر دیا وجہ یہ تھی کہ بت پرستی کا گمراہی ہونا بالکل واضح اور کھلا ہوا تھا بخلاف ستارہ پرستی کے کہ اس کی گمراہی اتنی واضح اور ظاہر نہیں تھی۔

یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ستارہ پرستی کے خلاف اپنی قوم کے سامنے جو

دلیلیں بیان فرمائیں ہیں اس کا حاصل یہ ہے کہ جس چیز کے حالات ادل بدل ہوتے رہتے ہوں وہ ہرگز اس لائق نہیں کہ اس کو رب قرار دیں۔

اسلام کے مبلغین کیلئے چند ہدایتیں

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس مناظرہ کے اس طرز سے عالموں اور مبلغوں کیلئے چند اہم ہدایتیں حاصل ہوئیں۔ پہلی یہ کہ: قوموں کی تبلیغ و اصلاح میں نہ ہر جگہ سختی مناسب ہے نہ ہر جگہ نرمی بلکہ ہر ایک کا ایک موقع اور ایک حد ہے، چنانچہ بت پرستی کے معاملہ میں خلیل اللہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سخت الفاظ استعمال فرمائے ہیں کیونکہ اس کی گمراہی کھلم کھلا دکھائی دینے والی ہے اور ستارہ پرستی کے معاملہ میں ایسے سخت الفاظ استعمال نہیں فرمائے بلکہ ایک خاص تدبیر سے معاملہ کی حقیقت کو قوم کے ذہن میں بٹھایا کیونکہ سیاروں اور ستاروں کا بے بس اور بے اختیار ہونا اتنا واضح اور کھلا ہوا نہیں تھا جتنا خود بنائے ہوئے بتوں کا، اس سے معلوم ہوا کہ عوام اگر کسی ایسی غلطی میں مبتلا ہوں جس کا غلطی اور گمراہی ہونا عام نظروں میں واضح نہ ہو تو عالم اور مبلغ کو چاہئے کہ تشدد کے بجائے ان کے شبہات کو دور کرنے کی تدبیر کرے۔

دوسری ہدایت اس میں یہ ہے کہ حق و حقیقت کو ظاہر کرنے کیلئے اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قوم کو یوں خطاب نہیں فرمایا کہ تم ایسا کرو بلکہ اپنا حال بتلا دیا کہ میں تو ان طلوع و غروب کے چکر میں رہنے والی چیزوں کو معبود قرار نہیں دے سکتا، اس لئے میں نے اپنا رُخ ایک ایسی ہستی کی طرف کرلیا ہے جو ان سب چیزوں کو پیدا کرنے والی اور پالنے والی ہے، مقصد تو یہی تھا کہ تم کو بھی ایسا ہی کرنا چاہئے مگر حکیمانہ انداز میں کھلے انداز میں حکم دینے سے پرہیز فرمایا تاکہ وہ ضد پر نہ آجائیں، اس سے معلوم ہوا کہ مصلح اور مبلغ کا صرف یہ کام نہیں کہ حق بات کو جس طرح چاہے کہہ ڈالے بلکہ اس پر لازم ہے کہ ایسے انداز سے کہے جو لوگوں کے لئے مؤثر ہو۔

عقل کا فیصلہ

فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ اَكْبَرُ ۚ فَلَمَّآ
پھر جب دیکھا سورج دمکتا ہوا کہا یہ ہے رب میرا یہ سب سے بڑا ہے پھر جب

اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ﴿۷۸﴾ اِنِّيْ وَجَّهْتُ
وہ چھپ گیا کہا اے قوم میری بیشک میں بیزار ہوں سے ان جنہیں تم شریک ٹھہراتے ہو (۷۸) بیشک میں نے موڑلیا

وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّ مَآ اَنَا
چہرہ اپنا طرف اسکی جس نے بنائے آسمان اور زمین سب سے الگ ہوکر اور نہیں میں

مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۷۹﴾
میں سے مشرکوں (۷۹)

بامحاورہ ترجمہ:۔ پھر جب سورج کو جگمگاتے دیکھا تو کہا یہ میرا رب ہے یہ سب سے بڑا ہے پھر جب وہ غائب ہو گیا کہا اے میری قوم جن کو تم شریک ٹھہراتے ہو میں ان سے بیزار ہوں۔(۷۸) میں نے اپنے چہرہ کو یک سو ہو کر اس کی طرف متوجہ کر لیا جس نے آسمان اور زمین بنائے اور میں شریک کرنے والا نہیں ہوں۔(۷۹)

تفسیر

جب سورج طلوع ہوا اور در و دیوار روشن ہو گئے اس کی چمک دمک سے آنکھیں چکا چوند ہونے لگی، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان لوگوں سے کہا کہ شاید یہ میرا رب ہونے کے قابل ہے، یہ سب سے زیادہ بڑا اور شاندار نظر آتا ہے، آخر دن ڈھلنے پر وہ ماند پڑ گیا اور رفتہ رفتہ نظروں سے بالکل غائب ہو گیا، جب ستارے، چاند، سورج سب کے سب مجبور ہیں تو ان میں سے کوئی بھی میرا خدا نہیں ہو سکتا، اس لئے میں ان تمام چیزوں سے بری ہوں، اور اے لوگو! سن رکھو کہ جب اتنی بلند اور روشن چیزیں خدا نہیں ہو سکتیں تو یہ تمہارے بت کس گنتی میں ہیں، میں

تمہارے ان سب خداؤں کا انکار کرتا ہوں اور اپنے اللہ کے آگے سر جھکاتا ہوں اور تم جو چیزیں اس کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہو ان سب سے بیزاری کا اعلان کرتا ہوں۔

بے جا حجّت کا جواب

وَ حَآجَّهٗ قَوْمُهٗ ؕ قَالَ اَتُحَآجُّوْٓنِّیْ فِی اللّٰهِ وَ قَدْ هَدٰىنِ ؕ وَ لَآ
اور جھگڑا کیا اس سے　قوم اسکی نے　کہا　کیا جھگڑتے ہو تم مجھ سے بارے میں　اللہ کے　وہ　تحقیق　ہدایت کر چکا مجھ کو　اور نہیں

اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ رَبِّیْ شَيْـًٔا ؕ وَسِعَ رَبِّیْ
میں ڈرتا　اس سے　کہ شریک کرتے ہو تم　ساتھ اسکے　مگر　یہ کہ　چاہے　رب میرا　کچھ　گھیر لیا　رب میرا

كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا ؕ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۸۰﴾
ہر　چیز کو　علم میں　کیا پس نہیں　سوچتے تم　(۸۰)

با محاورہ ترجمہ:۔ اور ان کی قوم نے ان سے جھگڑا کیا کہا کیا تم مجھ سے اللہ کے ایک ہونے میں جھگڑا کرتے ہو حالانکہ وہ مجھ کو سمجھا چکا اور میں ان سے نہیں ڈرتا جن کو تم اس کا شریک ٹھہراتے ہو مگر یہ کہ میرا رب ہی کوئی تکلیف پہنچانی چاہے، میرے رب کے علم نے سب چیزوں کا احاطہ کر لیا ہے کیا تم سوچتے نہیں۔ (۸۰)

لفظی تحقیق: حَآجَّهٗ: اس سے جھگڑا کیا۔ "مُحَاجَّةٌ" کے معنٰی ہیں دوسرے کی دلیل کو توڑنا اور اپنی دلیل زور سے بیان کرنا جس کا نتیجہ جھگڑے کے سوا کچھ نہیں ہوتا، اس لئے اس سے مراد جھگڑا کرنا ہی ہوتا ہے۔

تفسیر

انسان کی عادت ہے کہ اپنے جیسے اور انسانوں سے مل کر ایک بستی بسا لیتا ہے اور تھوڑے ہی دن میں اس

بستی کے لوگ اپنے رہنے سہنے کا ایک طریقہ مقرر کر لیتے ہیں، رفتہ رفتہ اس کے ایسے عادی ہوجاتے ہیں کہ اس سے ہٹنے کا نام نہیں لیتے، اسی کا نام رسم ورواج ہے، رسم ورواج میں کچھ باتیں صحیح اور کچھ غلط ہوتی ہیں ان غلط باتوں کے درست کرنے کیلئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیغمبر بھیجے جاتے ہیں ان کو مشکل یہ پیش آتی ہے کہ لوگ پرانی رسموں سے ہٹنا نہیں چاہتے ان کو اپنے غلط رسم ورواج ہی اچھے معلوم ہوتے ہیں وہ پیغمبر کی اصلاح کو رد کردیتے ہیں اور پیغمبران کو سمجھانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے پیغمبر تھے انہوں نے دیکھا کہ لوگوں میں غلط خداؤں کے ماننے کا رواج پڑ گیا ہے اور اس کی اصلاح ضروری ہے، پچھلی آیتوں میں بیان ہوا کہ انہوں نے بتوں، ستاروں، چاند، سورج سب کو خدا ہونے کے نااہل قرار دیا اور لوگوں سے کہا کہ انہیں چھوڑ دو اور ایک خدا کو مانو مگر وہ بہت سے خداؤں کی پوجا کرنے کے عادی ہو چکے تھے اس لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جھگڑنے لگے کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟

اس آیت میں اس کا بیان ہے، ارشاد ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم نے ان کی بات نہ مانی اور بے جا حجت کرنے لگے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ تم چاہتے ہو کہ میں بھی تمہاری طرح اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر جھوٹے خداؤں کو ماننے لگوں، یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ جبکہ اللہ تعالیٰ نے تو مجھ کو اپنی صاف صاف نشانیاں دکھا کر اپنی پہچان کا سیدھا راستہ دکھایا ہے چنانچہ میں اللہ تعالیٰ کے سامنے ہر چیز کو بے بس پاتا ہوں پھر میں اسے چھوڑ کر ان کو اپنا معبود کیسے مان سکتا ہوں؟ تمہارا یہ کہنا کہ ہمارے خداؤں کو نہ مانے گا تو ہم ناراض ہو کر تجھے سزا دیں گے، میں نہیں مانتا، مجھے یقین ہو چکا ہے کہ یہ میرا بال بھی بیکا نہیں کر سکتے، یہ نہ میرا کچھ بگاڑ سکتے نہ سنوار سکتے ہیں، ہاں! اللہ جو چاہیں کر سکتے ہیں وہ میرے رب ہیں اور وہ ہر ایک کی حالت سے اچھی طرح واقف ہیں۔

مشرک خطرے میں ہیں

وَ كَيْفَ اَخَافُ مَآ اَشْرَكْتُمْ وَ لَا تَخَافُوْنَ اَنَّكُمْ اَشْرَكْتُمْ

اور | کیونکر | ڈروں میں اس سے جسے تم شریک کرتے ہو | اور | نہیں | ڈرتے تم | اس سے کہ | تم شریک کرتے ہو

بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا ؕ فَاَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ

ساتھ اللہ کے وہ کہ نہیں اتاری اس نے جس کی پر تم کوئی دلیل پس کون دونوں فریقوں میں

اَحَقُّ بِالْاَمْنِ ۚ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿٨١﴾

زیادہ حق دار ہے چین کا اگر ہو تم سمجھ رکھتے (تو بولو) (۸۱)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور میں تمہارے شریکوں سے کیونکر ڈروں جبکہ تم اس بات سے نہیں ڈرتے کہ ان کو اللہ کا شریک کرتے ہو جس کی اس نے تم پر کوئی دلیل نہیں اتاری اب دونوں فریقوں میں دل جمعی کا کون مستحق ہے؟ بولو! اگر تم سمجھ رکھتے ہو۔ (۸۱)

لفظی تحقیق: سُلْطٰنٌ: دلیل: "سُلْطٰنٌ" کے معنیٰ غلبہ، قوت اور اقتدار کے ہیں، جس کے پاس کسی بات کے کرنے کی مضبوط دلیل یا سند ہوتی ہے اس کی بات مضبوط ہوتی ہے، اس لئے اس کا ترجمہ دلیل یا سند کیا گیا ہے، اس کے معنیٰ اجازت، اختیار، حکمرانی کے بھی ہیں۔

تفسیر

اس آیت میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد ہے کہ ان سے کہہ دیجئے تمہارے ان حقیر اور بے بس معبودوں سے میں کیا خوف کر سکتا ہوں جن میں کچھ بھی طاقت نہیں اور تم خود جانتے ہو کہ یہ تمہیں نہ کچھ دے سکتے ہیں نہ تم سے کچھ چھین سکتے ہیں پھر عقل کیسے اجازت دے سکتی ہے کہ بے جان اور بے طاقت چیزوں سے خواہ مخواہ ڈرا جائے، اب تم اپنی طرف دیکھو کہ تم اللہ تعالیٰ سے نہیں ڈرتے حالانکہ اس میں تمہیں سزا دینے کی پوری قوت اور طاقت ہے اور وہ تمہارے پورے مالک اور تمہیں پالنے والے ہیں اور تم اس سے بچ کر کہیں نہیں جا سکتے، وہ تمہارے حاکم ہیں اس نے تمہیں کہیں اجازت نہیں دی کہ تم اس کے سوا دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلاؤ اور بیکار چیزوں کو اس کے برابر سمجھو اور غلطی سے خیال کرنے لگو کہ اسے مددگاروں کی ضرورت ہے، تم مجھے بے جان اور بے طاقت چیزوں

سے جنہیں تم نے اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرا رکھا ہے ڈراتے ہو اور میں تم کو ایک بڑی قدرت اور طاقت والے سے ڈراتا ہوں، اب سوچو! کہ تم جن سے ڈرنے کیلئے مجھے کہتے ہو وہ بالکل بے طاقت، بے جان ہیں اور میں جس سے ڈرنے کیلئے تمہیں کہتا ہوں وہ سب سے زیادہ طاقتور ہیں، اب ہم دونوں میں کس کو بے فکری اور دل کا چین حاصل ہوگا، تم تو علم کا اور سمجھ کا دعویٰ کرتے ہو اگر علم رکھتے ہو تو بولو! کہ اپنے گھڑے ہوئے معبودوں سے ڈرنے والے دنیا اور آخرت میں چین و آرام سے رہیں گے یا سب کو چھوڑ کر ایک سب سے زیادہ قدرت اور طاقت رکھنے والے اللہ تعالیٰ کو معبود ماننے والے دونوں جہاں کا آرام اور اطمینان حاصل کریں گے۔

فَاَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ ۚ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ: دونوں فریقوں میں سے کون سا فریق امن یعنی نجات کا زیادہ مستحق ہے؟ ایک فرقہ ہمارا ہے جو اللہ تعالیٰ کو ایک جانتا اور مانتا ہے اور شرک سے بیزار ہے اور دوسرا فرقہ وہ ہے جس نے بیشمار معبود بنا رکھے ہیں، انہیں اللہ تعالیٰ کی صفتوں میں شریک کرتے ہیں، ان کو حاجت روا اور مشکل کشا سمجھتے ہیں، ان کے نام کی دہائی دیتے ہیں، ان کو نذر و نیاز پیش کرتے ہیں، مصیبت کے وقت انہیں پکارتے ہیں، تو بتاؤ! ان دونوں فرقوں میں سے اللہ تعالیٰ کی ہمیشہ کی رحمت کا مستحق کون ہے؟ اگر تمہیں کچھ علم اور سمجھ ہے تو خود ہی فیصلہ کرو کہ اللہ تعالیٰ کے انعاموں کا کون زیادہ حقدار ہے؟

مطمئن کون ہیں؟

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ لَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ

جو لوگ ایمان لائے اور نہ ملایا ایمان اپنے کو ساتھ ظلم کے یہی ہیں لئے ان کے

ع ۹ ۱۲ ۱۵ الْاَمْنُ وَ هُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۸۲﴾

چین ہے اور وہی راہ پانے والے ہیں (۸۲)

با محاورہ ترجمہ:۔ جن لوگوں نے یقین کر لیا اور اپنے ایمان کو ظلم (یعنی شرک) کیساتھ نہیں ملایا انہی کیلئے امن ہے اور وہی سیدھی راہ پر ہیں۔ (۸۲)

لفظی تحقیق: لَمْ يَلْبِسُوْٓا: نہیں ملایا: یہ ''لُبْسٌ'' سے بنا ہے، جس کے معنٰی خلط ملط کر دینے، ملا دینے کے ہیں۔ مُهْتَدُوْنَ: ہدایت یافتہ: ہدایت کے معنٰی ہیں راستہ دکھانا، اور ''هْتَدُوْن اِهْتِدَاءٌ'' کا معنٰی ہے راستہ پالینا۔

تفسیر

ارشاد ہے کہ جنہوں نے اللہ تعالیٰ کو مان لیا اور دل سے یقین کر لیا کہ اس کے سوا کوئی معبود ہونے کے لائق نہیں ہے اور پھر اس بات پر جم گئے اور ایمان لے آئے اور پھر ایسی کوئی بات نہ کی جس سے ایمان میں خلل آئے، ان لوگوں کیلئے چین ہی چین ہے کیونکہ جس کے اللہ تعالیٰ حمایتی ہو گئے اس کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا اور یہی وہ لوگ ہیں جو سیدھے راستے پر ہیں اور سیدھے راستہ پر چلنے والا راستہ کی پریشانیوں سے بھی بچتا ہے اور منزل مقصود پر پہنچ کر بھی اسے چین اور آرام ملتا ہے۔

اس آیت سے یہ صاف سمجھ میں آتا ہے کہ دنیا کی بناوٹی چیزوں میں پریشانی ہی پریشانی ہے، جو شخص پریشانیوں سے چھٹنا اور ایسی جگہ پہنچنا چاہتا ہے جہاں اس کیلئے آرام و راحت کے سارے سامان مہیا ہیں تو اس کو چاہئے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی بات مانے اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آئے اور پھر قرآن مجید کے مطابق زندگی اختیار کرے، اگر کوئی اپنا ایمان مرتے دم تک بچا لے گیا تو وہ یقیناً آرام و اطمینان کی جگہ پہنچ جائے گا اور اس دنیا میں بھی اس کو بیکار پریشانیوں سے نجات مل جائے گی۔

اس آیت کریمہ کی تفسیر میں "مسند احمد" کی ایک لمبی حدیث بھی آتی ہے جو حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے، آپ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کسی کام سے مدینہ سے باہر نکلے تھوڑی دور گئے تھے کہ ایک سوار کو دیکھا جو اپنی سواری کو دوڑاتا ہوا ہماری طرف آ رہا تھا اسے دیکھ کر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ سوار تمہارے پاس ہی آنا چاہتا ہے جب وہ ہمارے پاس پہنچا تو اس نے سلام کیا ہم نے جواب دیا پھر

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے دریافت فرمایا کہ تم کہاں سے آئے ہو؟ عرض کیا اپنے پیچھے اہل وعیال، بال بچے اور خاندان چھوڑ کر آرہا ہوں، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دریافت کیا کہاں جانے کا خیال ہے؟ وہ شخص کہنے لگا میں تو اللہ تعالیٰ کے پیغمبر کی خدمت میں حاضر ہونے کیلئے آیا ہوں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اس تک تم پہنچ گئے ہو پھر اس شخص نے عرض کیا، اے اللہ کے پیغمبر! ایمان کیا ہے؟ مجھے سکھا دیجئے، آپ نے فرمایا: ایمان یہ ہے کہ تو دل کی گہرائی سے گواہی دے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ہیں اور نماز قائم کرو، مال ہے تو سالانہ زکوٰۃ ادا کرو، رمضان کے روزے رکھو، اگر استطاعت ہے تو بیت اللہ کا حج کرو۔

جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ باتیں بتائیں تو وہ شخص کہنے لگا میں نے مان لیا، آپ کے فرمان پر اسی طرح عمل کروں گا، پھر جب واپس ہوا تو اس کے اونٹ کا پاؤں جنگلی چوہے کے بل میں پھنس گیا جس سے اونٹ گر پڑا ساتھ ہی وہ شخص بھی سر کے بل زمین پر گرا اور جاں بحق ہو گیا، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیکھ کر فرمایا: اسے جلدی اٹھا کر لے آؤ، حضرت عمار رضی اللہ عنہ اور حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ دوڑے، جب اس کے پاس پہنچے تو دیکھا کہ اس کی روح پرواز کر چکی تھی، انہوں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا یہ آدمی تو مر چکا ہے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہاں سے ذرا ہٹ گئے، پھر حضرت عمار رضی اللہ عنہ اور حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ میں وہاں سے کیوں ہٹ گیا تھا؟ پھر خود ہی فرمایا: میں نے دیکھا کہ دو فرشتے جنت کے پھل اس شخص کے منہ میں ڈال رہے تھے جس سے میں سمجھ گیا کہ اس شخص کی موت بھوک کی حالت میں واقع ہوئی ہے، دوسری روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ جب اس شخص سے پوچھا گیا کہ تم کہاں سے آئے ہو؟ تو اس نے یہ بھی کہا تھا کہ راستے میں مجھے کھانے کیلئے کوئی چیز نہیں ملی، لہٰذا میں درختوں کے پتوں اور گھاس پھونس پر گزارا کرتا رہا ہوں، الغرض! اس واقعہ کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف مخاطب ہوئے اور فرمایا: دیکھو! یہ شخص ان لوگوں میں سے ہے جنہوں نے اپنے ایمان کو ظلم یعنی شرک کے ساتھ نہیں ملایا، یہ شخص ایمان لایا، اللہ تعالیٰ کے ایک ہونے کا اقرار کیا پھر اس نے اپنے ایمان کو شرک کی گندگی سے پاک رکھا، یہاں تک کہ اس کی موت واقع ہو گئی، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس موقع پر یہی آیت تلاوت فرمائی۔

اس کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''یہ تمہارا بھائی ہے اس کو اٹھا لو پھر اس کو غسل دیا گیا، خوشبو لگائی گئی،

کفن پہنایا گیا، اس کی قبر کھودنے لگے تو آپ وہاں تشریف لے گئے اور فرمایا اس کیلئے لحد، یعنی: بغلی قبر تیار کرو‘‘ آپ نے اس موقع پر یہ بھی ارشاد فرمایا: کہ یہ شخص ان لوگوں میں سے ہے جنہوں نے عمل تو تھوڑا کیا مگر اجر بہت زیادہ پا گیا، ظاہر ہے کہ اس شخص نے ابھی تک نہ نماز پڑھی تھی، نہ روزہ رکھا تھا، نہ حج کیا، نہ زکوٰۃ ادا کی، ایمان لانے کے فوراً بعد ہی اس کو حادثہ پیش آ گیا اور وہ فوت ہو گیا، بہر حال وہ صحیح اور شرک سے پاک ایمان لے کر گیا اور اسے ایک طرح کی شہادت کا درجہ بھی مل گیا کیونکہ جو مؤمن کسی حادثے کا شکار ہو جائے وہ ایک درجے میں شہید ہوتا ہے بہر حال امام ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے ’’مسند احمد‘‘ کی یہ روایت بیان کر کے اس بات کی وضاحت کر دی ہے کہ جو لوگ ایمان کی حفاظت کریں گے اسے شرک میں ملوث نہیں کریں گے ان کی کامیابی انشاء اللہ یقینی ہے، انہیں امن نصیب ہوگا، اس کے برخلاف شرک میں ملوث اور اعتقادی منافق پکڑے جائیں گے۔

اس سے پہلی آیت میں یہ مضمون ارشاد فرمایا کہ عذاب سے محفوظ و مطمئن صرف وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لائیں اور پھر اپنے ایمان میں کسی ظلم کی ملاوٹ نہ کریں، حدیث میں ہے کہ جب یہ آیت اتری تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سہم گئے اور عرض کیا یا پیغمبر! ہم میں سے کون ایسا ہے جس نے کوئی ظلم اپنی جان پر گناہ کے ذریعے نہیں کیا؟ اور اس آیت میں عذاب سے محفوظ ہونے کی یہ شرط ہے کہ ایمان کے ساتھ کوئی ظلم نہ کیا ہو، تو پھر ہماری نجات کا کیا راستہ ہے؟ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: تم آیت کا صحیح مفہوم نہیں سمجھے، آیت میں ظلم سے مراد شرک ہے جیسا کہ ایک دوسری آیت میں ارشاد ہے ’’اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ‘‘ اس لئے مراد آیت کی یہ ہے کہ جو شخص ایمان لائے اور پھر اس میں اللہ تعالیٰ کی ذات وصفتوں میں کسی کو شریک نہ ٹھہرائے وہ عذاب سے محفوظ اور ہدایت پر ہے۔

اس آیت میں ظلم سے مراد شرک ہے، عام ظلم مراد نہیں، آیت کی مراد یہ ہے کہ جو شخص اپنے ایمان میں کسی قسم کا شرک، یعنی: اللہ تعالیٰ کو تمام صفتوں کا مالک ماننے کے باوجود غیر اللہ کو بھی ان میں سے بعض صفتوں کا مالک سمجھے تو اس کیلئے نجات کا کوئی راستہ نہیں۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ شرک صرف یہی نہیں کہ کھلے طور پر مشرک و بت پرست ہو جائے بلکہ وہ آدمی

بھی مشرک ہے جو اگرچہ کسی بت کی پوجا پاٹ نہیں کرتا اور اسلام کا کلمہ پڑھتا ہے مگر کسی فرشتہ یا پیغمبر یا کسی ولی اللہ کو اللہ تعالیٰ کی بعض خاص صفتوں میں شریک ٹھہرائے۔ (نعوذ باللہ منہ)

پیغمبروں کی جماعت

وَ تِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ ؕ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ

اور یہ ہے دلیل ہماری دیا ہم نے اسکو ابراہیم کو اوپر قوم اس کی کے ہم بلند کرتے ہیں درجے

مَّنْ نَّشَآءُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۸۳﴾ وَ وَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ

جسکے چاہیں ہم بیشک رب تیرا حکمت والا جاننے والا ہے (۸۳) اور دیا ہم نے اس کو اسحاق

وَ يَعْقُوْبَ ؕ كُلًّا هَدَيْنَا ۚ وَ نُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَ مِنْ

اور یعقوب سب کو ہدایت کی ہم نے اور نوح کو ہدایت کی ہم نے ان سے پہلے اور میں سے

ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَ سُلَيْمٰنَ وَ اَيُّوْبَ وَ يُوْسُفَ وَ مُوْسٰى وَ هٰرُوْنَ ؕ

اولاد نوح کی داؤد اور سلیمان اور ایوب اور یوسف اور موسیٰ اور ہارون کو

وَ كَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۸۴﴾ وَ زَكَرِيَّا وَ يَحْيٰى وَ عِيْسٰى

اور اسی طرح بدلا دیتے ہیں ہم نیک کام کرنے والوں کو (۸۴) اور زکریا اور یحییٰ اور عیسیٰ

وَ اِلْيَاسَ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۸۵﴾ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ الْيَسَعَ وَ

اور الیاس کو سب ہیں میں سے نیک بختوں (۸۵) اور اسماعیل اور الیسع کو اور

يُوْنُسَ وَ لُوْطًا ؕ وَ كُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۸۶﴾ وَ مِنْ

یونس اور لوط کو اور سب کو بزرگی دی ہم نے پر جہان والوں (۸۶) اور میں سے

اٰبَآئِهِمْ وَ ذُرِّيّٰتِهِمْ وَ اِخْوَانِهِمْ ۚ وَ اجْتَبَيْنٰهُمْ وَ هَدَيْنٰهُمْ

باپ دادا ان کے اور اولاد ان کی اور بھائیوں ان کے اور چنا ہم نے ان کو اور ہدایت کی ہم نے انکو

اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۸۷﴾

طرف راستے سیدھے کے (۸۷)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور یہ ہماری دلیل تھی کہ ہم نے ابراہیم کو ان کی قوم کے مقابلہ میں دی تھی ہم جس کے چاہیں درجے بلند کرتے ہیں بیشک آپ کا رب حکمت والا اور جاننے والا ہے۔(۸۳) اور ہم نے ان کو اسحاق اور یعقوب بخشا ہم نے سب کو ہدایت دی اور ان سب سے پہلے نوح کو ہدایت دی اور ان کی اولاد میں سے داود اور سلیمان کو اور ایوب اور یوسف اور موسیٰ اور ہارون کو اور نیک کام کرنے والوں کو ہم اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں۔(۸۴) اور زکریا اور یحییٰ اور عیسیٰ اور الیاس کو سب نیک بختوں میں ہیں۔(۸۵) اور اسماعیل اور الیسع کو اور یونس اور لوط اور ہم نے سب کو سارے جہان والوں پر فضیلت بخشی۔(۸۶) اور ہم نے بعضوں کو ان کے باپ دادوں میں سے اور ان کی اولاد اور بھائیوں میں سے ہدایت کی اور ہم نے ان کو پسند کیا اور سیدھی راہ پر چلایا۔(۸۷)

تفسیر

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دنیا کی چیزوں اور واقعوں سے بالکل ٹھیک نتیجہ نکالنے کی سمجھ عنایت کی تھی اس غیر معمولی قابلیت کی بدولت اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پیغمبروں کی جماعت میں ممتاز کیا اور ان کی نسل سے باقی پیغمبروں کو بھیجا، اس آیت میں آٹھ پیغمبروں کے نام ذکر کیے گئے ہیں جن کے جدامجد (دادا) حضرت نوح علیہ السلام تھے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو شروع ہی سے ہدایت سے نوازا تھا، چنانچہ انہوں نے شرک کے خلاف واضح دلیل پیش فرمائی مگر آپ کی قوم کے لوگ آپ کی بات ماننے پر تیار نہ ہوئے بلکہ آپ سے جھگڑا کرنے لگے، ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے اسی دلیل کی طرف اشارہ فرمایا ہے، یہی ہماری دلیل ہے جو ہم نے

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ان کی قوم کے مقابلے میں دی مگر قوم نے اس کو نہ مانا، پھر فرمایا کہ ہم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو توحید پرستی اور شرک سے دوری اور بے تعلقی کی وجہ سے بلند درجہ عطا فرمایا اور ہم جس کے چاہیں درجے بلند کر دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ ہر شخص کی ظاہری اور وباطنی صلاحتیں اور دلوں کی کیفیتوں سے واقف ہیں وہ اپنی حکمت کے مطابق جس کو اس قابل سمجھتے ہیں اس کے درجے بلند فرمادیتے ہیں چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ نے خاص مہربانی فرمائی اور ان کے درجے بلند کر دیئے۔

اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ: آپ کا رب حکیم ہے اس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں، وہ علیم بھی ہیں، اس کو ذرے ذرے کا علم ہے اور وہ ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہیں بہر حال مشرک لوگ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دلیل کا جواب تو نہ دے سکے مگر وہ اپنی شرمندگی مٹانے کیلئے آپ کو طرح طرح کی تکلیفیں دینے لگے، دوسری سورتوں سے معلوم ہوتا ہے دلیلوں سے ناکامی کے بعد انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کئی قسم کی تکلیفیں پہنچائیں یہاں تک کہ آپ کے قتل کے درپے ہوئے مگر اللہ تعالیٰ کی مدد ہمیشہ آپ کے ساتھ رہی، دشمن آپ کو کوئی تکلیف نہ پہنچا سکے یہاں تک کہ ان کی طرف سے آپ کو زندہ جلا ڈالنے کا منصوبہ بھی بری طرح ناکام ہو گیا اور بالآخر آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہجرت کا حکم آ گیا۔

اللہ تعالیٰ جس انسان پر بہت بڑا احسان فرماتے ہیں اسے پیغمبری کے مرتبے سے نوازتے ہیں، چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر سب سے بڑا احسان تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں عظیم الشان پیغمبر بنایا اور پھر دوسرا بڑا احسان یہ کہ آپ کی نسل میں بہت سے پیغمبر بھیجے، اب اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اسی احسان کا ذکر فرمایا ہے ارشاد ہوتا ہے کہ ہم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حضرت اسحاق علیہ السلام جیسا عظیم بیٹا اور حضرت یعقوب علیہ السلام جیسا پوتا عطا فرمایا، حضرت یعقوب علیہ السلام کو اسرائیل بھی کہا جاتا ہے اسی لئے آپ کی اولاد بنی اسرائیل کہلاتی ہے، تفسیری روایتوں کے مطابق آپ کی اولاد میں سے اللہ تعالیٰ نے چار ہزار پیغمبر پیدا فرمائے اور یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان ہے۔

حضرت یونس علیہ السلام اور حضرت یسع علیہ السلام کے متعلق آتا ہے کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے نہیں

اور خود حضرت نوح علیہ السلام تو سب کے بزرگ تھے، لہٰذا آپ بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد نہیں، اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق ہم نیکی کرنے والوں کو اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں، یہ سب اللہ تعالیٰ کے نیک بندے تھے، لہٰذا انہوں نے بہتر بدلہ پایا، اور ہم نے حضرت زکریا علیہ السلام، حضرت یحییٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت الیاس علیہ السلام کو بھی ہدایت سے نوازا، یہ سب نیکوکاروں میں سے تھے، صلاحیت اور نیکی والے لوگ تھے، "صالح" اس شخص کو کہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے حقوق بھی ادا کرتا ہے اور بندوں کے حق بھی ادا کرتا ہے، یہ سب حضرات ایسے ہی تھے، آگے فرمایا حضرت اسماعیل علیہ السلام، حضرت یسع علیہ السلام، حضرت یونس علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام بھی اللہ تعالیٰ کے پیغمبر تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو بھی ہدایت دی، بہر حال یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ہونے والے احسان کا ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی اولاد میں بہت سے عظیم الشان پیغمبروں کو پیدا فرمایا۔

ان پیغمبروں کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا کہ ان سب کو ہم نے جہان والوں پر فضیلت بخشی، یہ دوسرا بڑا احسان ہے، انہیں پیغمبر بنایا، ہدایت دی، اللہ تعالیٰ نے ان کو علم اور حکمت عطا فرمائی اور بعض کو حکومت اور سلطنت بھی دی، یہ بھی فضیلت کی بات ہے اور آخرت میں تو اس فضیلت کا بہت بہتر نتیجہ ظاہر ہوگا، اللہ تعالیٰ وہاں بھی مرتبوں کے اعتبار سے عملوں اور آزمائشوں کی وجہ سے بلند درجے عطا فرمائیں گے، بنیادی طور پر تو اللہ تعالیٰ کے سارے ہی پیغمبر عابد، زاہد اور کامل ہوتے ہیں، پھر بھی بعض کو حالات کی بناء پر بعض پر فوقیت حاصل ہے، ان پیغمبروں کا ذکر کر کے یہ بات سمجھائی گئی ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی وہی کام ہے جو تمام پچھلے پیغمبروں کا تھا، لہٰذا ان کی بات کو خوشی خوشی مان لینا چاہئے۔

اللہ تعالیٰ کی ہدایت

ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۭ وَ لَوْ

یہ | رہنمائی ہے | اللہ کی | راہ سمجھاتا ہے ذریعہ اسکے | جس کو | چاہے | سے | بندوں اپنے | اور | اگر

اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿٨٨﴾

یہ شرک کرتے تو ضائع ہو جاتا سے ان جو تھے وہ کرتے (۸۸)

بامحاورہ ترجمہ:۔ یہ اللہ کی ہدایت ہے اپنے بندوں میں جس کو چاہیں اس پر چلاتے ہیں اور اگر یہ لوگ شرک کرتے تو جو کچھ انہوں نے کیا تھا تو وہ سب ضائع ہو جاتا۔(۸۸)

لفظی تحقیق: هُدَى: رہنمائی، ہدایت۔ اس کے معنیٰ ہیں راستہ دکھانا، راستہ پر ڈال دینا اور چلانا۔

حَبِطَ: ضائع ہونا، نیست و نابود اور ملیا میٹ ہونا۔

تفسیر

اس آیت میں ارشاد ہے کہ اگر کوئی اللہ تعالیٰ کی ہدایت کا نمونہ دنیا میں واضح طور پر دیکھنا چاہے تو ان لوگوں کو دیکھ لے اسے معلوم ہو جائے گا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جسے چاہیں سیدھے راستے پر ڈال دیتے ہیں، اب تم اچھی طرح سن لو کہ سیدھا راستہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ایک اور سب قدرتوں کا مالک دل سے مانا جائے، اسی کا نام توحید ہے اور جو توحید کو نہ مانے تو خواہ بظاہر اس کا رکھ رکھاؤ کتنا ہی بھڑکیلا اور شاندار ہو وہ مشرک ہے اور شرک کرنے والوں کا کوئی عمل قبول نہیں، اگر یہ لوگ جن کا ذکر ہوا معاذ اللہ شرک کرتے تو وہ چاہے جتنے نیک کام کرتے ان کے کچھ کام نہ آتے اور ان کا شمار اچھے لوگوں میں نہ ہوتا، قرآن مجید کا یہ فیصلہ حق ہے کہ اللہ تعالیٰ کو نہ مان کر یا اس کے سوا دوسری چیزوں کو کام بنانے والا مان کر کوئی شخص یا کوئی قوم کامیابی کو نہیں پہنچ سکتی، کامیابی انہی لوگوں کیلئے ہے جو صرف اللہ تعالیٰ کو اپنا معبود اور کارساز مانتے ہیں اس کو چھوڑ کر جو لوگ اوروں کی طرف جھکتے ہیں خواہ یہ بت ہوں، بڑے لوگ ہوں، ستارے، چاند وغیرہ ہوں ضرور کچھ دن بعد دنیا ہی میں یا مرنے کے بعد انہیں معلوم ہو جائے گا کہ وہ بالکل کورے اور خالی ہاتھ ہیں اور انہیں اپنی کامیابی کا احساس اور پچھتاوا کہیں کا نہ چھوڑے گا، جو لوگ اللہ تعالیٰ کو بھول گئے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہمارا کام یونہی چل جائے گا وہ بالکل

نادان ہیں آخر میں پہنچنا اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہے اور اگر اس دنیا میں آنکھیں بند رکھیں تو اس وقت ضرور کھل جائیں گی جب گھنگرو بولنے لگے گا اور دنیا کی سب چیزیں جواب دے جائیں گی اس وقت سے لے کر ہمیشہ ہمیشہ تک ان کا سوائے ندامت اور افسوس کے کوئی ساتھی نہ ہوگا۔

شرک بہت بری چیز ہے سو سال کی عبادت ایک لمحہ میں غرق ہو جاتی ہے ہاں! اگر معافی مانگ لے تو بات بن جائے گی، اللہ تعالیٰ بخشنے والے ہیں، موت سے پہلے پہلے توبہ قابل قبول ہے لیکن اگر شرک سے باز نہیں آئے گا تو کسی نیکی کا کچھ فائدہ نہیں ہوگا سب نیکیاں ضائع ہو جائیں گی، "سورۂ رعد" میں آتا ہے کہ لوگ نیکیوں کے بڑے بڑے پہاڑ لے کر آئیں گے مگر جب کفر شرک سامنے آئے گا تو وہ پہاڑ ایسے اڑ جائیں گے جیسے ہوا میں راکھ اڑ جاتی ہے ایسے عملوں کا کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا کیونکہ نیکی کی قبولیت کیلئے ایمان اور عقیدے کی درستگی لازمی ہے، نجات اس شخص کیلئے ہے جو نیک اعمال کرے گا بشرطیکہ اس کا ایمان صحیح ہو، ایمان کی درستگی اللہ تعالیٰ کے ایک جاننے ماننے اور شرک سے دور رہنے کے ذریعے ہوتی ہے۔

انبیاء علیہم السلام بلاشبہ شرک سے پاک ہوتے ہیں مگر اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: بالفرض اگر یہ بھی شرک کرتے تو ان کے سارے عمل ضائع ہو جاتے، یہ بات سب لوگوں کو اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ جب پیغمبر بھی اس سے بری نہیں تو پھر شرک سے ہمیشہ بچنا چاہئے ورنہ خطرہ ہے کہ تمام عمل ضائع ہو جائیں گے۔

زبردست پیشنگوئی

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ۚ فَاِنْ

یہی ہیں وہ لوگ جن کو ہم نے دی کتاب اور شریعت اور پیغمبری پھر اگر

يَّكْفُرْ بِهَا هٰٓؤُلَآءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِيْنَ ﴿٨٩﴾

کفر کریں ساتھ اسکے یہ لوگ پس تحقیق سونپ دی ہم نے یہ باتیں ایک ایسی قوم کو جو نہیں ہیں ساتھ اسکے کفر کرنے والے (۸۹)

بامحاورہ ترجمہ:۔ یہی لوگ تھے جن کو ہم نے کتاب اور شریعت اور پیغمبری دی پھر اگر ان باتوں کو یہ لوگ نہ مانیں تو ہم نے ان باتوں کیلئے ایسے لوگ مقرر کردیئے ہیں جو ان سے انکاری نہیں۔(۸۹)

لفظی تحقیق: کِتٰبٌ: ہر لکھی ہوئی چیز کو کتاب کہتے ہیں، خواہ بڑی ہو یا چھوٹی، اس لئے اس کے معنٰی رسالہ، خط، مقالہ وغیرہ سب کچھ ہو سکتے ہیں، یہاں اس سے مراد آسمانی کتابیں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کو دی ہیں۔ حُكْمَ: حکم: اس لفظ کے تین معنٰی ہیں: فیصلہ کرنا، فیصلہ، وہ چیز جس کی بناء پر فیصلہ کیا جائے یعنی قانون، قانون ہی کا دوسرا نام شریعت ہے۔ وَكَّلْنَا: ہم نے مقرر کردیئے: وکالت کے معنٰی ہیں اپنا کام دوسرے کے ذمہ لگانا۔

تفسیر

ارشاد ہے کہ: اے محمد! ان لوگوں میں سے بعض کو ہم نے اپنی کتاب دی اور نئی شریعت عطا کی اور ان سب کو پیغمبر بنایا، انہی کی طرح آپ بھی ان کے پاس کتاب اور شریعت لے کر آئے ہیں، اگر یہ مکہ والے آپ کی ان باتوں کو نہیں مانتے تو کوئی حرج نہیں ہم نے اور لوگوں کو پہلے ہی مقرر کردیا ہے، وہ آپ کی کتاب اور شریعت کو دل وجان سے قبول کریں گے اور آپ کو سچا پیغمبر مانیں گے۔

یہ آیت مکہ مکرمہ میں ہجرت سے پہلے اتری اس میں زبردست پیش گوئی ہے جو آپ کے مدینہ تشریف لے جانے پر ہو بہو پوری ہوئی۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے پیغمبر علیہم السلام کی فضیلت بیان فرمائی ہے کہ ان پر وحی اترتی رہی اور ان میں سے بعض کو مکمل کتاب عطا فرمائی اور بعض پر صحیفے اتارے، پیغمبروں کو اس بات کا پابند بنایا کہ وہ پچھلی کتابوں اور صحیفوں کی ہی نشر و اشاعت کریں، ان کو علیحدہ شریعت نہیں دی گئی، بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ حکم سے مراد شریعت ہے یعنی کچھ پیغمبروں کو خاص شریعت دی گئی، بعض اس سے حکومت بھی مراد لیتے ہیں تاہم حکومت بھی تمام پیغمبروں کو تو

نہیں ملی، البتہ بعض کو ملی ہے جیسے: حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام، بعض فرماتے ہیں کہ حکم سے مراد فہم (سمجھ) ہے جس سے انسان صحیح فیصلے پر پہنچتا ہے اور یہ تمام پیغمبروں کو دیا گیا، چونکہ پیغمبر پوری امت کے معاملوں میں حکم (یعنی فیصلہ کرنے والے) ہوتے ہیں اس لئے ان میں سمجھنے اور فیصلہ کرنے کی قدرت مکمل طور پر ہوتی ہے باقی رہی پیغمبری تو یہ کائنات میں سب سے بلند امرتبہ ہے، اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کا پیغمبر قریب ترین بندہ ہوتا ہے، پیغمبر ہونا بجائے خود بلند ترین ہستی ہونے کی نشانی ہے وہ اللہ تعالیٰ کے معصوم بندے ہوتے ہیں، انہیں اس بات کی گارنٹی حاصل ہوتی ہے کہ ان سے گناہ نہیں ہوتا، وہ امت کیلئے نمونہ ہوتے ہیں، ان کا قول اور عمل امت کیلئے دلیل ہوتا ہے۔

فَاِنْ يَّكْفُرْ بِهَا هٰٓؤُلَآءِ: اس آیت میں انکار کرنے والوں سے مراد مکہ کے لوگ ہیں، اس آیت سے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے کہ اگر یہ لوگ پیغمبر، کتاب اور شریعت کا انکار کریں گے تو اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو مقرر کردیں گے جو اس کا انکار نہیں کریں گے، مقصد یہ کہ اگر پہلے پہل مخاطب اللہ تعالیٰ کے دین پر اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں لائیں گے تو اللہ تعالیٰ ان کی جگہ دوسرے لوگوں کو کھڑا کردیں گے جو ایمان لاکر دین کے مددگار ثابت ہوں گے چنانچہ ایسا ہی ہوا جب مکہ کے مشرکوں نے مخالفت کی تو مدینے والوں نے خوشی خوشی دین کو قبول کرلیا اور ان کی حمایت کا یقین دلایا، جب آپ ہجرت کرکے مدینہ طیبہ تشریف لے گئے تو ارد گرد کے سارے قبیلے آپ کے جانثار بن گئے چنانچہ یہی وہ پہلے لوگ ہیں جو اسلام کا جھنڈا لے کر دنیا میں پھیل گئے، انہیں کی بدولت اسلام بڑھا اور پھلا پھولا، "حدیث شریف" میں آتا ہے کہ مدینہ کے انصار کے ساتھ محبت رکھنا ایمان کی نشانی ہے اور ان کے ساتھ بغض رکھنا منافقت کی علامت ہے، یہی وہ لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کا ساتھ دینے کیلئے چنا، اسی بات کو اللہ تعالیٰ نے "سورۂ محمد" میں اس طرح بیان فرمایا ہے کہ: اگر تم روگردانی کروگے تو اللہ تعالیٰ تمہارے بجائے دوسرے لوگوں کو لے آئیں گے جو تمہاری طرح نہیں ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ کا قاعدہ آج بھی وہی ہے اگر آج کا مسلمان دین سے غفلت کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی جگہ دوسرے کو کھڑا کردیں گے جو اس کے دین کو آگے بڑھا سکے اس طرح دین تو قائم و دائم رہے گا مگر یہ ان لوگوں کی

بدقسمتی ہوگی کہ وہ دین کی خدمت میں بڑھ چڑھ کر حصہ نہ لے سکیں۔

تمام پیغمبر سیدھی راہ پر ہیں

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ؕ قُلْ لَّاۤ اَسْـَٔلُكُمْ

یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ہدایت کی اللہ نے پس طریقے انکے پر چل آپ کہہ دیجئے نہیں مانگتا میں تم سے

ع ۱۰ / ۸ / ۱۶

عَلَيْهِ اَجْرًا ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۰﴾

پر اس اجرت نہیں وہ مگر نصیحت لئے جہان والوں کے (۹۰)

بامحاورہ ترجمہ:۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت کی سو ان کے طریقے پر چلئے آپ کہہ دیجئے میں تم سے اس پر کچھ اجرت نہیں مانگتا یہ تو جہان کے لوگوں کو صرف نصیحت ہے۔ (۹۰)

تفسیر

اس آیت میں اسی مضمون کو صاف صاف بیان کیا گیا ہے جس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ انسان کے اس دنیا میں آنے کے وقت سے ان کے پاس ہر زمانے اور ہر امت میں پیغمبر آتے رہے ہیں وہ انسان کو وہی ایک طریقہ بتاتے رہے جو ان کیلئے ان کے پیدا کرنے والے اور پالنے والے، یعنی: خالق اور رب نے مقرر کردیا اور جس پر اس کے ہر فرد کو چلنا چاہئے، اس کے اصول ہر زمانے میں ایک ہی رہے اور وہ تین ہیں:

(۱)....اپنے خالق اور مالک کو پہچاننا۔

(۲)....اللہ تعالیٰ کے پیغمبر کو پہچاننا۔

(۳)....پیغمبر جو رب کے حکم ان کو پہنچاتے ہیں ان کو بے چون و چرا ماننا۔

ارشاد ہے کہ اے ہمارے پیغمبر! جتنے رسول اور نبی دنیا میں آپ سے پہلے آئے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف

سے سیدھے اور صاف راستے پر چلنے والے تھے، آپ کو بھی انہی کے راستہ پر چلنا ہے اور انہی کے طریقہ پر کام کرنا ہے اور وہ طریقہ قرآن مجید میں پورے طور پر بیان کر دیا گیا ہے، ان سے کہہ دیجئے کہ میں تمہیں سیدھا راستہ بتانے کا کام اللہ تعالیٰ کے حکم سے کر رہا ہوں اس کیلئے میں تم سے کوئی صلہ، انعام، فیس طلب نہیں کرتا، یہ تو تمام جہان والوں کیلئے اللہ تعالیٰ نے نصیحت کرنے اور سبق سکھانے کا ایک طریقہ مقرر کیا ہے تا کہ وہ اِدھر اُدھر نہ بھٹکتے پھریں اور آسانی سے اس راستہ پر ہولیں جو انہیں اطمینان، آرام اور راحت سے منزل تک پہنچانے والا ہے۔

یہاں ایک سوال ہوتا ہے کہ جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم تمام پیغمبروں کے سردار تھے تو آپ کو پیغمبروں کے طریقے پر چلنے کا حکم کیوں دیا گیا؟ جواب اس کا یہ ہے کہ یہاں پہلے پیغمبروں کی شریعت پر چلنے کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ اصول دین یعنی توحید، پیغمبری، آخرت میں ان کا طریقہ اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے جو کسی پیغمبر کی شریعت میں ادل بدل نہیں ہوئے۔

اللہ تعالیٰ کی کتاب

وَ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖۤ اِذْ قَالُوْا مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ

اور نہیں　قدر کی انہوں نے　اللہ کی　ٹھیک جیسی قدر کرنی چاہئے　جب انہوں نے کہا　نہیں　اتاری　اللہ نے　پر　کسی آدمی

مِّنْ شَيْءٍ ؕ قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِيْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰى

کوئی　چیز　آپ کہہ دیجئے　کس نے　اتاری　کتاب　وہ جو　لائے　اس کو　موسیٰ

نُوْرًا وَّ هُدًى لِّلنَّاسِ تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِيْسَ تُبْدُوْنَهَا وَ

روشنی　اور　ہدایت　لئے لوگوں کے　کر دیا تم نے اس کو　ورق ورق　ظاہر کرتے ہوئے اسکو　اور

تُخْفُوْنَ كَثِيْرًا ۚ

چھپاتے ہوئے　بہت کچھ

بامحاورہ ترجمہ:۔اور انہوں نے اللہ کو نہیں پہچانا جس طرح اس کے پہچاننے کا حق ہے، جب کہنے لگے اللہ نے کسی انسان پر کوئی چیز نہیں اتاری پوچھئے کہ وہ کتاب کس نے اتاری جو موسیٰ لیکر آئے تھے، جو کہ لوگوں کیلئے روشنی اور ہدایت تھی جس کو تم نے ورق ورق کر کے لوگوں کو دکھلایا اور بہت سی باتوں کو تم نے چھپا رکھا تھا۔

لفظی تحقیق: قَدَرُوا: قدر کی۔ "قَدْرٌ" کے معنیٰ ہیں جانچنا، اندازہ لگانا، کسی چیز کی قیمت مقرر کرنا، یہاں اس سے مراد پہچاننا ہے۔ قَرَاطِیْسَ: ورق: "قِرْطَاسٌ" کی جمع ہے جس کے معنیٰ کاغذ کے ہیں۔

تفسیر

ارشاد ہے کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی صفتوں کا پورا پورا اندازہ نہیں کر سکتے اور اس کی قدرت اور حکمت کا انکار کرتے ہیں اس لئے ان کے منہ سے یہ بات نکلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کبھی کوئی کتاب اتاری ہی نہیں، ان سے کہو کہ تم "تورات" کو مانتے ہو تو بتاؤ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وہ کتاب کس نے دی جو کسی زمانے میں لوگوں کیلئے چراغِ ہدایت تھی؟ اب اگرچہ وہ اس کے کچھ الگ الگ ورقے دکھاتے پھرتے ہیں لیکن بہت سے کونوں کھدروں میں چھپا کر ڈال رکھے ہیں کیونکہ وہ یا تو اس کے ظاہر کرنے میں مصلحت نہیں دیکھتے اور یا ان سے اتنے غافل ہیں کہ ان کا ہوش ہی نہیں ہے۔

تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِیْسَ تُبْدُوْنَهَا وَ تُخْفُوْنَ كَثِیْرًا: اللہ تعالیٰ کی کتاب تو وہ ہدایت کا نور ہے جو دل میں روشنی پیدا کرتی ہے اور زندگی کے ہر موڑ پر انسان کی رہنمائی کرتی ہے، اس دنیا میں انسان کو جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ ہدایت ہے، اسی لئے ہم ہر نماز میں کئی کئی بار اللہ رب العزت سے درخواست کرتے ہیں کہ ہمیں سیدھے راستے کی طرف رہنمائی فرمانا تاکہ ہم بھٹک کر اپنے علم، عقیدے، عمل اور اخلاق کو خراب نہ کر بیٹھیں اور پھر یہ بھی عرض کرتے ہیں کہ ہمیں اپنے انعام یافتہ لوگوں کے راستے پر چلایئے کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں تو لوگوں کیلئے واضح ہدایت ہے مگر تمہارا حال یہ ہے کہ تم اسے ورق ورق کرتے ہو، یعنی: تم نے اس

کتاب کو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا ہے اور پھر کرتے یہ ہو کہ اس کے بعض حصے کو ظاہر کرتے ہو جو چیزیں تمہاری خواہش کے مطابق ہوتی ہیں ان کو تو لوگوں کے سامنے پیش کر دیتے ہو اور اس طرح اپنی سرداری کو تحفظ دینے کی کوشش کرتے ہو اور جو چیزیں تمہاری من کی چاہت کے خلاف ہوتی ہیں تو ان ورقوں کو چھپا دیتے ہو، یہاں پر "کَثِیْرًا" کا لفظ لا کر واضح کر دیا کہ کتاب الٰہی کے زیادہ حصے کو چھپا دیتے ہو اور تھوڑے حصے کو ظاہر کرتے ہو، یہودی اور عیسائی یہی کچھ کرتے تھے، جن آیتوں سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تصدیق ہوتی تھی ان کو چھپا جاتے تھے حالانکہ وہ آپ کو اسی طرح پہچانتے تھے جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے تھے مگر جان بوجھ کر انکار کر دیتے تھے جس کی وجہ خود قرآن مجید کے بیان کے مطابق یہ تھی کہ وہ حسد، بغض، دشمنی اور اپنے مالی فائدوں کی خاطر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پیغمبر تسلیم نہیں کرتے تھے۔

یہ آیت ان لوگوں کے جواب میں اتری جنہوں نے یہ کہہ دیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے کبھی کسی بشر (انسان) پر کوئی کتاب اتاری ہی نہیں، یہ کتابوں اور پیغمبروں کی بات ہی سرے سے غلط ہے، اس کے کہنے والے اگر مکہ کے بت پرست ہیں جیسا کہ علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تو معاملہ ظاہر ہے کہ وہ کسی کتاب اور پیغمبر کو نہیں مانتے تھے اور اگر یہودی ہیں جیسا کہ دوسرے مفسرین نے اختیار فرمایا اور آیت سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے تو پھر ان کا ایسا کہنا صرف غصہ اور جھنجھلاہٹ کا نتیجہ تھا جو خود ان کے مذہب کے بھی خلاف تھا، امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک روایت میں ہے کہ اسی وجہ سے یہودی اس شخص سے ناراض ہو گئے جس نے یہ بات کہی تھی اور اس کی اس غلطی کی وجہ سے اس کو مذہبی پیشوائی کے عہدہ سے ہٹا دیا تھا۔

اُن سے اللہ سمجھے

وَعُلِّمْتُمْ مَّا لَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنْتُمْ وَلَآ اٰبَآؤُكُمْ ۭ قُلِ اللّٰهُ ۙ ثُمَّ

اور | سکھایا گیا تم کو | جو | نہ | جانتے تھے تم | تم (تاکید) | اور نہ | باپ تمہارے | آپ کہہ دیجئے | اللہ نے | پھر

ذَرْهُمْ فِيْ خَوْضِهِمْ يَلْعَبُوْنَ ﴿٩١﴾

چھوڑان کو میں بیہودہ شغل ان کے کہ کھیلتے رہیں (۹۱)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور تم کو سکھلا دیا جو نہ تم جانتے تھے اور نہ تمہارے باپ، کہہ دیجئے کہ اللہ نے اتاری پھر ان کو ان کی خرافات میں چھوڑ دیجئے کہ کھیلتے رہیں۔(۹۱)

لفظی تحقیق: ذَرْهُمْ: چھوڑ دیجئے ان کو۔ خَوْضِهِمْ: شغل۔ "خَوْضٌ" کے معنیٰ ہیں پانی کے اندر گھس جانا پھر اس کے معنیٰ یہ ہوئے کہ کسی شغل میں ایسا لگ جانا کہ کسی اور چیز کا ہوش نہ رہے، یہاں اس سے مراد وہ بیہودہ خیالات ہیں جن کے اندر وہ گم ہیں۔ يَلْعَبُوْنَ: کھیلتے رہیں۔ "لَعْبٌ" کے معنیٰ کھیل کود کے ہیں۔

تفسیر

ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کو "تورات" کے ذریعے ایسی باتیں سکھائیں جن کو وہ نہ جانتے تھے اور وہ تو کیا ان کے بڑے بوڑھے بھی ان سے بے خبر تھے اور پھر یہودیوں نے ان باتوں کو عرب میں بھی پھیلایا اور تمہیں بھی اس کی بدولت وہ باتیں معلوم ہوئیں جن سے تم اور تمہارے بڑے بوڑھے بالکل بے خبر تھے۔

یہ واقعہ ہے کہ اس وقت عرب میں یہودی ہی پڑھے لکھے تھے یہاں تک کہ قرآن مجید اور محمد ﷺ کے بارے میں "تورات" میں جو کچھ لکھا تھا وہ بھی آپ کے آنے سے پہلے ہی بتا دیا گیا تھا لیکن آپ کے تشریف لانے کے بعد غرور اور ضد کی وجہ سے آپ کی پیغمبری کو ماننے سے انکار کر دیا، مدینہ کے قبیلوں اوس اور خزرج کے لوگ جب مکہ میں آئے تو انہوں نے حضرت محمد ﷺ کو یہودیوں ہی کی بتائی ہوئی نشانیوں سے پہچانا اور آپ کو اللہ تعالیٰ کا پیغمبر مان لیا اور خود یہودی ایمان سے محروم رہ گئے بلکہ انہی کی وجہ سے عرب کے مشرکوں کو انکار کی جرأت اور بھی زیادہ ہوگئی اور وہ یہاں تک کہہ بیٹھے کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی کتاب کبھی اتاری ہی نہیں، اس کے بعد اشارہ ہے کہ ان سے تو توقع نہیں کہ یہ سوال کا ٹھیک جواب دیں گے، آپ خود ہی ان سے کہہ دیجئے کہ "تورات" بھی اللہ تعالیٰ ہی نے اتاری تھی اس کے بعد "انجیل" اتاری اور ان سب کو "قرآن مجید" اتار کر مکمل فرما دیا، اس کے

بعد اگر وہ نہ سنیں تو ان کو اپنے بیہودہ خیالوں اور غرور اور تکبر میں مست رہنے دیجئے، دور بیکار کی باتوں اور کھیل کود میں وقت ضائع کرنے دیجئے، عنقریب سب کی سزا انہیں مل جائے گی، دنیا میں بھی تباہ ہوں گے اور آخرت میں بھی اپنے کیے کی سزا بھگتیں گے۔

اللہ تعالیٰ کی کتاب

وَ هٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ وَ
اور یہ کتاب ہے اتارا ہم نے اسکو برکت والی سچا کہنے والی ان کتابوں کو اس کے پہلے آئیں اور

لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَ مَنْ حَوْلَهَا ؕ وَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ
تاکہ ڈرائیں آپ مکہ والوں کو اور ان کو جو اردگرد ہیں اسکے اور جو لوگ یقین کرتے ہیں آخرت کا

یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ ﴿۹۲﴾
ایمان لاتے ہیں وہ پر اس اور وہ پر نمازوں اپنی حفاظت کرتے ہیں (۹۲)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور یہ قرآن برکت والی کتاب ہے جو ہم نے اتاری اور ان کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے جو کہ اس سے پہلی ہیں اور تاکہ آپ مکہ والوں کو اور اس کے آس پاس والوں کو ڈرائیں اور جو لوگ آخرت پر یقین رکھتے ہیں وہ اس کتاب پر بھی ایمان رکھتے ہیں اور وہ اپنی نمازوں کی (پوری) حفاظت کرتے ہیں۔ (۹۲)

لفظی تحقیق: مُبٰرَكٌ: برکت والا۔ برکت کے معنیٰ خود بخود بڑھنے اور زیادہ ہونے کے ہیں، اس کا استعمال اس معنیٰ میں اچھی چیزوں کے اندر ہوتا ہے بری چیزوں میں برکت نہیں ہوتی۔ اُمَّ الْقُرٰى: سب بستیوں کی ماں۔ یہ مکہ مکرمہ کا لقب ہے کیونکہ یہ آبادی کی جڑ ہے اور یہیں سے سب جگہ ہدایت پھیلی۔

تفسیر

ارشاد ہے کہ یہ قرآن کریم جو تمہارے سامنے ہے ایک کتاب ہے جو ہم نے اتاری ہے، اس کی خوبیاں

ان گنت ہیں اور انسان کیلئے اس کے فائدے بیشمار ہیں جو کبھی ختم نہیں ہو سکتے، اس میں سب کتابوں کو جو اس سے پہلے انسان کی ہدایت اور فائدے کیلئے اتریں سچا اور برحق تسلیم کیا گیا ہے اور ان کی ساری اچھی باتوں کا خلاصہ اس میں دے دیا گیا ہے، یہ ہمارا رحم و کرم ہے کہ انسان کیلئے اتنا ہدایت کا سامان مہیا کر دیا اور پھر ایسا سامان جو کبھی ختم نہیں ہو سکتا، انسان کی بہتری کیلئے اب کوئی نئی بات نہیں کہی جا سکتی جو اس سے باہر ہو اس لئے اس کے بعد کسی پیغمبر اور کتاب کی ضرورت نہیں ہے ہر ایک کو اسی میں سے اپنی بساط کے موافق خود فائدہ اٹھانا اور دوسروں کو فائدہ پہنچانا ہے، اے پیغمبر! آپ اس سے فائدہ اٹھانے کی بنیاد اس طرح ڈالیئے کہ مکہ والوں کو اور جو اس کے پاس پڑوس میں بستیاں ہیں ان کو سمجھانا اور برے انجام سے ڈرانا اور اس سے بچنے کا طریقہ بتانا شروع کیجئے، جو لوگ مرنے کے بعد اپنے کئے کا پھل پانے پر ایمان رکھتے ہیں وہ اس کتاب کو دل سے سچا مانیں گے اور پھر اس کے حکموں کے مطابق چلیں گے اور یہ لوگ اپنی نماز پابندی کے ساتھ ادا کریں گے کیونکہ نماز کی پابندی اس بات کی نشانی ہے کہ یہ فرمانبردار بندے ہیں، یہاں سے معلوم ہوا کہ قرآن مجید سے اصلی فائدہ اٹھانے والے وہ لوگ ہیں جو آخرت کو مانتے ہیں اور نماز پابندی سے ادا کرتے ہیں۔

جس طرح کہ "تورات" کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے اترنا انہیں بھی تسلیم ہے اسی طرح یہ قرآن بھی ہم نے اتارا ہے اور اس کے حق اور سچا ہونے کیلئے یہ گواہی کافی ہے کہ "قرآن کریم" ان سب چیزوں کی تصدیق کرتا ہے جو "تورات" و "انجیل" میں اتری ہیں اور "تورات" و "انجیل" کے بعد اس کے اتارنے کی ضرورت اس لئے ہوئی کہ یہ دونوں کتابیں تو بنی اسرائیل کیلئے بھیجی گئی تھیں، ان کی دوسری شاخ بنی اسماعیل جو عرب کہلاتے تھے اور ام القریٰ یعنی مکہ مکرمہ اور اس کے اردگرد بستے ہیں، ان کی ہدایت کیلئے کوئی خاص پیغمبر اور کتاب اب تک نہ آئی تھی، اب یہ "قرآن کریم" ان کیلئے خصوصاً اور پورے جہاں کیلئے عموماً اتارا گیا ہے، مکہ معظمہ کو قرآن کریم نے ام القریٰ فرمایا ہے یعنی تمام شہروں اور بستیوں کی جڑ اور بنیاد اس کی وجہ یہ ہے کہ تاریخی روایتوں کے مطابق شروع میں زمین کی پیدائش یہیں سے نمودار ہوئی، نیز: یہ کہ سارے عالم کا قبلہ اور عبادت میں توجہ کا مرکز یہی ہے۔

"اُمَّ الْقُرٰی" کے ساتھ "وَ مَنْ حَوْلَهَا" فرمایا، یعنی: مکہ کے تمام اطراف جس میں پورا عالم مشرق ومغرب اور شمال وجنوب داخل ہے۔

جو لوگ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہ قرآن مجید پر بھی ایمان لاتے ہیں اور اپنی نمازوں کی پابندی کرتے ہیں، اس میں یہودیوں اور مشرکوں کی ایک مشترکہ بیماری پر تنبیہ کی گئی ہے کہ یہ بے فکری کہ جس کو چاہا مانا جس کو چاہا رد کر دیا اور اس کے خلاف محاذ بنالیا، یہ اس مرض کا اثر ہے کہ وہ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے جس شخص کو آخرت اور حساب کے دن پر ایمان ہوگا اس کو خدا کا خوف ضرور اس طرف متوجہ کرے گا کہ دلیلوں میں غور کرے اور حق بات کو قبول کرنے میں باپ دادا کی کفریہ رسموں کی پرواہ نہ کرے۔

اگر غور کیا جائے تو آخرت سے بے فکری ہی تمام بیماریوں کی جڑ ہے، کفر وشرک بھی اسی کا نتیجہ ہوتے ہیں اور سارے گناہ بھی اسی کا نتیجہ ہوتے ہیں، آخرت پر یقین رکھنے والے سے اگر کبھی کوئی غلطی بھی ہو جاتی ہے تو اس کا دل تڑپ اٹھتا ہے اور بالآخر توبہ کرکے آگے کیلئے گناہ سے بچنے کا عزم کرتا ہے اور درحقیقت خدا کا خوف اور آخرت کی فکر ہی وہ چیز ہے جو انسان کو انسان بناتی ہے اور جرموں سے باز رکھتی ہے اسی لئے قرآن کریم کی کوئی سورۃ بلکہ کوئی رکوع بھی شاید اس سے خالی نہیں کہ جس میں آخرت کی فکر کی طرف متوجہ نہ کیا گیا ہو۔ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ جُمْلَةَ هُمُوْمِنَا هَمًّا وَّاحِدًا هَمَّ الْاٰخِرَةِ۔

اللہ تعالیٰ کی بے ادبی

وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ قَالَ اُوْحِيَ

اور کون زیادہ ظالم ہے اس سے جو گھڑے پر اللہ جھوٹ یا کہے وحی کی گئی

اِلَيَّ وَ لَمْ يُوْحَ اِلَيْهِ شَيْءٌ وَّ مَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَاۤ

طرف میری حالانکہ نہیں وحی کی گئی طرف اسکی کچھ اور جو کہے میں بھی اتار سکتا ہوں ویسا ہی جیسا

اَنْزَلَ اللّٰهُ ؕ

اتارا اللہ نے

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور اس سے زیادہ ظالم کون ہے جو اللہ پر بہتان باندھے یا کہے مجھ پر وحی اتری حالانکہ اس پر کچھ بھی وحی نہیں اتری اور اس شخص سے کون زیادہ ظالم ہے جو کہے میں بھی اتار سکتا ہوں اس کے جیسا جو اللہ نے اتارا۔

لفظی تحقیق: اِفْتَرٰی: جھوٹ گھڑنا۔ "فَرْیٌ" جھوٹ اور بے اصل بات کو کہتے ہیں، "اِفْتِرَاءٌ" کے معنٰی ہیں کسی کے سر جھوٹی بات لگانا یا ایسی بری بات کسی میں بتانا جو اس میں نہ ہو۔ اُوْحِیَ: وحی کی گئی۔ "وَحْیٌ" کے معنٰی ہیں اللہ تعالٰی کا وہ پیغام جو فرشتہ کے ذریعے کسی پیغمبر کے پاس آئے۔

تفسیر

جو شخص یہ کہے کہ اللہ تعالٰی نے کوئی کتاب نہیں اتاری، انسان آزاد ہے جو چاہے کرے، وہ کافر ہے، اسی طرح جو یہ دعوٰی کرے کہ میں پیغمبر ہوں اور میرے اوپر وحی آتی ہے وہ بھی کافر ہے، حالانکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نہ کوئی پیغمبر ہو سکتا ہے اور نہ کسی پر وحی آسکتی ہے، آئندہ کیلئے پیغمبر اور وحی اس لئے روک دیئے گئے کہ قرآن مجید میں سب کچھ موجود ہے اور کسی نئی بات کی نہ ضرورت ہے اور نہ کوئی انسان کی بہتری کی راہ اس سے اچھی نکال سکتا ہے، وحی بے ضرورت نہیں آتی، جب وحی کی ضرورت نہیں تو ظاہر ہے کہ پیغمبر کی بھی ضرورت نہیں، اب جو یہ کہے کہ میں پیغمبر ہوں اور مجھ پر وحی آتی ہے وہ اس آیت کے مطابق جھوٹا ہے اور سب سے بڑا ظالم ہے۔

مفسر قرآن حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں جھوٹے پیغمبری کے دعوے داروں کی طرف اشارہ ہے جنہوں نے خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہی پیغمبری کا دعوٰی کر دیا تھا ان میں سے ایک شخص مسیلمہ کذاب تھا، جو قبیلہ بنی حنیفہ کا سردار تھا، یہ قبیلہ عربوں کا لمبا چوڑا قبیلہ تھا جس کے افراد کی تعداد بہت زیادہ تھی ان کا

سردار مسیلمہ اگرچہ بڑی عمر کا آدمی تھا مگر سخت شر پسند تھا، دوسرا پیغمبری کا دعوے دار اسود عنسی تھا جو یمن کے شہر صنعا کا رہنے والا سیاہ رنگ اور موٹے نقش ونگار کا آدمی تھا وہ ہمیشہ سر پر اوڑھنی ڈالے رکھتا تھا، اس لئے اسے ذوالخمار بھی کہتے تھے، "صحاح ستہ" میں یہ حدیث موجود ہے کہ ایک بار پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب دیکھا کہ آپ کے ہاتھ میں دو کنگن پہنائے گئے، فرمایا کہ مجھے انہوں نے پریشان کر دیا پھر مجھے اشارہ ہوا کہ ان پر پھونک دیں تو میں نے ایسا ہی کیا، اس خواب کی تعبیر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ہی بیان فرمائی کہ دو جھوٹے ہیں جو میرے دنیا میں آنے کے بعد ظاہر ہوئے ہیں اور میں ان کے درمیان ہوں، ان میں سے ایک صنعا میں رہتا ہے اور دوسرا بنی حنیفہ کا سردار ہے (جو یمامہ میں رہتا ہے) ان دونوں نے پیغمبری کا جھوٹا دعویٰ کیا ہے۔

مسیلمہ کا یہ بھی دعویٰ تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے پیغمبر ہیں اور میں بنی حنیفہ کا پیغمبر ہوں، اس نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں وفد بھی بھیجا تھا، مسیلمہ خود بھی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تھا، آپ نے اس کے ساتھ مختصر سی گفتگو کے بعد ہی اس کی موجودگی میں اسے جھوٹا کہہ دیا تھا، مسیلمہ کا مطالبہ تھا کہ اگر آپ اپنے بعد مجھے اپنا نائب بنا دیں تو میں ایمان لانے کیلئے تیار ہوں، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں کھجور کی ایک چھڑی تھی آپ نے چھڑی کے ایک تنکے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ میں اس تنکے کے برابر بھی تمہیں کوئی چیز دینے کیلئے تیار نہیں، بہر حال مختصر گفتگو کے بعد آپ تشریف لے گئے اور اس کی بات کا مزید کوئی جواب دینے کیلئے حضرت ثابت بن قیس انصاری رضی اللہ عنہ کو مقرر کر گئے۔

اسود عنسی بھی بڑا شر پسند آدمی تھا، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے دو دن پہلے حضرت فیروز دیلمی رضی اللہ عنہ نے اسے قتل کر دیا، آپ کو وحی کے ذریعے خبر ہوئی تو آپ نے لوگوں کو خوشخبری سنائی کہ آج رات اسود عنسی کو ختم کر دیا گیا ہے، مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ آیت کے اس حصہ کا مفہوم نہ صرف اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھنا ہے بلکہ اس کی طرف غلط بات منسوب کرنا بھی ہے، اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اولاد ہے یا شرک کی کوئی بات اس کی طرف منسوب کرتا ہے تو وہ بھی اس آیت کی رو سے جھوٹا ہے، اللہ تعالیٰ کی ذات، صفات یا عبادت میں کسی کو شریک کرنا اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھنے کے مترادف ہے اور ایسا شخص بہت بڑا ظالم ہوگا، اسی لئے فرمایا کہ اس شخص

سے بڑھ کر کون ظالم ہوگا جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھے؟

اس شخص سے بڑا ظالم بھی کوئی نہیں جو کہتا ہے کہ میں بھی اس قسم کی چیز اتار سکتا ہوں جیسی اللہ تعالیٰ نے اتاری ہے، قریش میں ایک شخص نضر ابن حارث تھا جو ایسا دعویٰ کرتا ہے کہ میں بھی قرآن پاک جیسا قرآن پیش کر سکتا ہوں، کہتا تھا کہ محمد عاد و ثمود کے قصے کہانیاں بیان کرتا ہے (نعوذ باللہ) میں بھی تمہارے پاس بہمن اور اسفند یار کے واقعات پیش کر سکتا ہوں، یہ کون سی بات ہے جس طرح یہ پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں اسی طرح میں بھی کہانیاں گھڑ سکتاں ہوں، قرآن پاک ایک ایسا اعلیٰ کلام ہے جس کی مثال پیش نہیں کی جا سکتی، قرآن پاک نے خود چیلنج کیا ہے کہ اس جیسی ایک سورۃ ہی لا کر پیش کر دو مگر یہ چیلنج آج تک کوئی بھی پورا نہیں کر سکا، قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے علم سے اسے اتارا ہے، "سورۂ بنی اسرائیل" میں موجود ہے اگر تمام انسان اور جن مل کر بھی کوشش کریں کہ اس جیسا قرآن لے آئیں تو وہ ہرگز ایسا نہیں کر سکیں گے بھلا یہ مسیلمہ کذاب کہاں سے قرآن کریم جیسا قرآن پیش کرتا، اس نے کچھ عربی عبارتیں بنائی تھیں مگر لوگوں نے اس کے منہ پر تھوک دیا کہ یہ اس کے مقابلے کی چیز لائے ہو؟ پوری دنیا کے زبان دان، شاعر، ادیب، خطیب اور فصیح و بلیغ لوگ قرآن کریم کے سامنے ہتھیار ڈال چکے ہیں، لہٰذا قرآن کریم کی نظیر پیش کرنے کا دعویٰ بیہودہ ہے، ایسا دعویٰ کرنے والا بھی سب سے بڑا ظالم ہے۔

ظالموں کی سزا

وَ لَوْ تَرٰۤی اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِیْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْۤا

اور | اگر | آپ دیکھیں | جب | ظالم لوگ | میں | ہوں سختیاں | موت کی | اور | فرشتے | پھیلائے ہوں

اَیْدِیْهِمْ ۚ اَخْرِجُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ اَلْیَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ

ہاتھ اپنے | نکالو | جانیں اپنی | آج | بدلہ دیئے جاؤ گے تم | عذاب | ذلت کا

بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَ كُنْتُمْ عَنْ
بوجہ اسکے کہ تم تھے کہتے پر اللہ علاوہ حق کے اور تھے تم اس کی

اٰيٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۹۳﴾
آیتوں کو تکبر کرتے (۹۳)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور اگر آپ دیکھیں جس وقت کے ظالم موت کی سختیوں میں ہونگے اور فرشتے اپنے ہاتھ بڑھا رہے ہونگے کہ اپنی جانیں نکالو آج تم کو ذلّت کا عذاب بدلے میں ملے گا اس وجہ سے کہ تم اللہ پر جھوٹی باتیں کہتے تھے اور اس کی آیتوں کو ماننے سے تکبر کرتے تھے۔ (۹۳)

لفظی تحقیق: غَمَرٰتِ: سختیاں۔ اس کے اصل معنٰی پانی کے گہرے ڈباؤ کے ہیں، جو شخص گہرے پانی میں گر پڑے وہ مشکل اور سختی میں پھنس جاتا ہے اس لئے اس کے معنٰی سختی ہو گئے۔ غَيْرَالْحَقِّ: ''غَيْرَ'' کے معنٰی مخالف اور حق کے معنٰی ٹھیک اور سچی بات ''غَيْرَالْحَقِّ'' سچی بات کے مخالف بات جسے ایک لفظ میں جھوٹ کہتے ہیں۔

تفسیر

ظلم کئی طرح کا ہوتا ہے، جو شخص بدخیالی سے زبان سے، ہاتھ پاؤں سے، آنکھوں کے اشاروں یا کسی حرکت سے اپنے آپ یا دوسروں کو نقصان پہنچائے وہ ظالم ہے، قرآن مجید میں جا بجا ظلم کی حقیقت واضح کی گئی ہے، اس کی برائی دکھائی ہے اور اس سے بچنے کا طریقہ بیان کیا گیا ہے۔

ارشاد ہے کہ اے محمد! اگر آپ ظالموں کی موت کی حالت دیکھیں تو خوف سے کانپ اٹھیں، جب موت آئے گی تو دنیا کی کوئی چیز ان کے کام نہ آئے گی، دنیا کو بھول جائیں گے، ظاہری آنکھیں بند ہوں گی مگر آخرت کا ہولناک منظر ان کے سامنے ہوگا، جان نکلنے کے وقت کی سختیاں ان کو گھیرے ہوئے ہوں گی، ان کے برے عمل

ڈراؤنی شکل کے فرشتے بن کر ان کے سامنے کھڑے ہوں گے، وہ اپنے لمبے لمبے ہاتھ پھیلا کر غیظ وغضب میں ڈراؤنی آواز سے کہیں گے اپنی جانیں نکالو، دنیا کے غرور اور عزت کے بدلے آج تجھے ذلت اور رسوائی ملے گی، تو نے دنیا میں اللہ تعالیٰ کے بارے میں غلط بیانی کی اور ایسی باتیں کہیں جو سراسر جھوٹی تھیں، آج تجھے تیرے غرور اور تکبر کی سزا ملے گی۔

اللہ تعالیٰ نے تین قسم کے آدمیوں کے متعلق فرمایا کہ اس سے بڑھ کر کون ظالم ہوگا۔ **پہلا شخص وہ ہے** جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھے۔ **دوسرا وہ ہے** جو کہے کہ مجھ پر وحی آتی ہے، حالانکہ اس کی طرف کوئی وحی نہ آتی ہو اور **تیسرا ظالم شخص وہ ہے** جو کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی وحی کے مقابلے میں میں بھی ایسی چیز لاسکتا ہوں، اب اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کے انجام کا ذکر فرمایا ہے، اے پیغمبر! اگر آپ دیکھیں ایسے ظالم لوگوں کو جب وہ موت کی سختیوں میں مبتلا ہوں گے اور فرشتے اپنے ہاتھ ان کی طرف پھیلائے ہوئے ہوں گے اور ان سے کہیں گے نکالو اپنی جانوں کو، صحیح معنوں میں کوئی شخص اپنی جان خود تو نہیں نکال سکتا مگر یہ مجرموں کو دھمکی سنائی جا رہی ہے، ان کو ڈرایا جا رہا ہے کہ اپنی جانوں کو خود نکالو، "حدیث شریف" میں آتا ہے کہ نکلو اب خدا کے غضب کی طرف اور پھر فرشتے اس کی جان نکال لیتے ہیں اور اسے دوزخ کی طرف لے جاتے ہیں۔

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ اور بعض دوسرے مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ فرشتے بدبخت انسانوں سے کہتے ہیں کہ لاؤ اپنی جان نکالو اور اس سختی سے بچ جاؤ مگر وہ اس دن کی سختی سے بچ نہیں سکتے۔

مرتے وقت انسان تنہا ہوگا

وَ لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّ تَرَكْتُمْ

اور | البتہ | آ گئے تم ہمارے پاس | ایک ایک کر کے | جیسے کہ | پیدا کیا تھا ہم نے تم کو | پہلی | بار | اور | چھوڑ آئے تم

مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ ۚ وَ مَا نَرٰی مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ
جو دیا ہم نے تم کو پیچھے پیٹھوں اپنی کے اور نہیں دیکھتے ہم ساتھ تمہارے سفارش کرنے والے تمہارے
الَّذِیْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِیْكُمْ شُرَكٰٓؤُا ؕ لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَیْنَكُمْ
جن کو تم کہا کرتے تھے کہ وہ میں تم ساتھی ہیں البتہ کٹ گیا علاقہ تمہارا
وَ ضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴿۹۴﴾ ع ۱۱/۱۷
اور گم ہو گیا سے تم جو تھے تم دعویٰ کرتے (۹۴)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور البتہ تم ہمارے پاس ایک ایک ہو کر آ گئے جیسے ہم نے تم کو پہلی بار پیدا کیا تھا اور جو اسباب ہم نے تم کو دیئے تھے وہ تم اپنی پیٹھ کے پیچھے چھوڑ آئے اور ہم تمہارے ساتھ تمہاری سفارش کرنے والوں کو نہیں دیکھتے جن کو تم بلایا کرتے تھے کہ وہ تمہارے شریک ہیں، البتہ تمہارے آپس کے تعلقات کٹ گئے اور جو دعوے کہ تم کیا کرتے تھے، سب کٹ گئے۔ (۹۴)

لفظی تحقیق: فُرَادٰی: ایک ایک کر کے، عربی میں اس کا وہی مطلب ہے جو ہم اپنی زبان میں فرداً فرداً سے ظاہر کرتے ہیں۔ خَوَّلْنَا: عطا کیا ہم نے۔ اس کے معنٰی ہیں نوکر چاکر، خادم، آرام کے سامان جو امیروں کے پاس ہوتے ہیں، "تَخْوِیْلٌ" کے معنٰی ہیں زندگی کے آرام و آسائش کے سامان دینا۔ زَعَمْتُمْ: تم گمان کرتے تھے: "زَعْمٌ" کے معنٰی ہیں گمان کرنا، کوئی غلط بات دل میں سوچنا یا زبان سے کہنا۔

تفسیر

اس سے پہلے کہا گیا کہ آدمی اپنے جاہ و جلال میں پھنس کر یہ سمجھنے لگتا ہے کہ میرے برابر کوئی نہیں بس جو کچھ ہوں میں ہوں، میرا حکم چلتا ہے، میرے اشارے پر میرے خادم کام کرتے ہیں، عیش و عشرت کے سامان موجود ہیں، اسی کو تکبر کہتے ہیں، تکبر کرنے والے سے اگر کوئی کہے کہ قرآن کریم کی آیتوں میں نماز، روزہ،

زکوٰۃ وغیرہ کا حکم ہے تو وہ اپنی ترنگ میں کہہ بیٹھتا ہے کہ دنیا میں صرف یہ کام نہیں ہے، مجھے اپنے کاموں سے فرصت نہیں۔

اس آیت میں ایسے لوگوں سے کہا گیا ہے کہ وہ ساز و سامان جن کے نشے میں تم مست ہو وہ رکھا رہ جائے گا اور تم ویسے ہی خالی ہاتھ جاؤ گے، جیسے: آئے تھے، دنیا کا یہ سب سامان یہیں رہ جائے گا، ہاں! اس کی محبت کی وجہ سے تمہاری جان بڑی مشکل سے نکلے گی، تمہارے ساتھ ان چیزوں میں سے کوئی بھی نہ ہوگی، مشرک کہتے ہیں کہ یہ بت وغیرہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ہماری سفارش کریں گے اور عذاب سے نجات دلوائیں گے، ہمارے کام یہاں بھی ان کے ذریعہ چلتے ہیں اور وہاں بھی چلیں گے لیکن ہوگا یہ کہ ان کے پاس مرتے وقت ڈراؤنی شکل کے فرشتے آئیں گے اور ان کی جان زبردستی نکال کر اللہ تعالیٰ کے سامنے لے جائیں گے، اس وقت وہ تنہا ہوں گے اور کوئی سفارش کرنے والا اس کے ساتھ نظر نہ آئے گا اور وہ سب بیکار خیالات اور جھوٹے دعوے غائب ہو جائیں گے، سب سے رشتے اور تعلقات ٹوٹ جائیں گے۔

قدرت کے کرشمے

اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَ النَّوٰى ؕ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَ

بیشک اللہ ہے چیرنے والا دانے کا اور گٹھلی کا نکالتا ہے زندہ کو سے مردہ اور

مُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ﴿۹۵﴾ فَالِقُ

نکالنے والا ہے مردہ کو سے زندہ یہ ہے اللہ پس کہاں تم بہکے جارہے ہو (۹۵) چیر کر

الْاِصْبَاحِ ۚ وَ جَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا وَّ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ حُسْبَانًا ؕ

نکالنے والا ہے صبح کا اور کیا اس نے رات کو باعث آرام اور سورج اور چاند حساب کیلئے

ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ﴿٩٦﴾

یہ اندازہ کیا ہوا ہے زبردست جاننے والے کا (۹۶)

بامحاورہ ترجمہ:۔ بیشک اللہ ہی ہے جو دانہ اور گٹھلی پھوڑ (کر پودے) نکالتا ہے، مردے سے زندہ نکالتا ہے اور زندہ سے مردہ نکالنے والا ہے یہی تو اللہ ہے پھر تم کدھر بہکے جارہے ہو؟ (۹۵) صبح کی روشنی کو چیر کر نکالنے والا اور اس نے آرام کو رات بنائی اور حساب کیلئے سورج اور چاند یہ غلبہ والے اور علم والے رب کے مقرر کئے ہوئے اندازے ہیں۔ (۹۶)

لفظی تحقیق: فَالِقُ: چیرنے والا۔ "فَلَقٌ" سے ہے، "فَلَقٌ" کے معنیٰ ہیں کسی چیز کو چیر کر اس میں سے ایک اور چیز نکالنا، اس آیت میں یہ لفظ دو جگہ استعمال ہوا ہے، پہلی جگہ اس کے معنیٰ ہیں اللہ تعالیٰ دانے اور گٹھلی کو چیر دیتے ہیں اور اس میں سے درخت اور پودا نکالتے ہیں، دوسری جگہ یہ رات کے اندھیرے کو چیر کر اس کے اندر سے صبح نکالنا مراد ہے۔ سَكَنَ: "سُكُوْنٌ"۔ سے بنا ہے، "سُكُوْنٌ" کے معنیٰ ٹھہرنا یا ٹھہراؤ کے ہیں، "سَكَنَ" وہ چیز جس کے اندر ٹھہرنے سے یا جس کے پاس ہونے کی وجہ سے آرام ملے۔ حُسْبَانٌ: اس کے معنیٰ حساب کے ہیں، مراد یہ ہے کہ سورج اور چاند دنوں کی حرکت ایسے طریقہ پر ہوتی ہے جو حساب سے مقرر کیا ہوا ہے اور ان کے ذریعے سے وقت کا حساب لگایا جاتا ہے۔

تفسیر

اس سے پہلے رکوع میں کہا گیا کہ جو لوگ قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ کی کتاب نہیں مانتے وہ اللہ تعالیٰ کو جیسا سمجھنا چاہئے سمجھے نہیں، انہیں یہ معلوم نہیں کہ اس کی قدرت بہت بڑی ہے، اس نے سارے جہاں کو بنایا ہے اور اس کا ایک نظام قائم فرمایا ہے، اسی نظام کے مطابق یہ ضروری تھا کہ قرآن کریم انسان کو سیدھا راستہ بتانے کیلئے دنیا میں بھیجا جائے اور اس کے پیغمبر اسے لے کر آئیں اس کے بعد قرآن کریم کی خوبیاں بیان کی گئی، اس کے بعد

اسی بات کو سمجھانے کیلئے اللہ تعالیٰ کی قدرت کے کرشمے بیان کیے گئے ہیں تا کہ اس کی قدرت کو جس نے دنیا کے نظام کو قائم کر رکھا ہے لوگ سمجھیں اور اس غلط فہمی سے نجات پائیں کہ انسان کیلئے اس نظام میں کوئی چیز اس کو ہدایت کرنے والی نہیں۔

جب دانہ یا گٹھلی کچھ عرصہ زمین کے اندر گزارنے کے بعد پھٹتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ ہے کہ اس کا ایک سرا اوپر کی طرف نکلتا ہے جو تنا اور شاخ بنتا ہے اور دوسرا حصہ نیچے کی طرف زمین کے اندر جاتا ہے جو اس پودے یا درخت کی جڑ بنتا ہے، زمین سے اوپر کی طرف نکلنے والی پتی نہایت ہی نرم و نازک ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ اپنی قدرت سے سخت زمین کو پھاڑ کر اس کیلئے راستہ بناتے ہیں اسی طرف نیچے جانے والا حصہ دور دور تک زمین میں پھیل جاتا ہے جو ایک طرف پودے یا درخت کیلئے زمین سے خوراک حاصل کرتا ہے اور دوسری طرف اسے گرنے سے بچاتا ہے، کیا یہ سب کچھ خود بخود پودے کے اپنے مزاج سے ہو رہا ہے یا اس کو کرنے والی کوئی ذات موجود ہے؟ انسان تھوڑا سا بھی غور کرے گا تو سمجھ جائے گا کہ یہ سب کچھ کرنے والے اللہ تعالیٰ ہیں، اللہ تعالیٰ نے اس کی تفصیل "سورۂ عبس" میں بیان فرمائی کہ انسان اپنے کھانے کی طرف غور کرے تو اسے معلوم ہوگا کہ اس کے پیدا کرنے میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کا کتنا بڑا کرشمہ کام کر رہا ہے، ارشاد ہوتا ہے، اے انسان! ذرا غور کر، ہم نے کس طرح بارش کے ذریعے پانی کا انتظام کیا، پھر ہم نے زمین کو پھاڑا اور پھر اس میں سے اناج اور پھل پیدا کیے تو یہاں بھی فرمایا کہ وہ اللہ تعالیٰ ہی ہیں جو دانے اور گٹھلی کو پھاڑ کر زمین کے اندر سے اس کی کونپل نکالتے ہیں اور پھر وہ اناج کا پودا یا پھل کا درخت بن جاتا ہے۔

ظاہر طور پر مختلف قسموں کا غلہ اور پھل اپنی اپنی قسموں کے اعتبار سے رنگ و بو اور ذائقہ میں مختلف ہوتا ہے اسی طرح باطنی طور پر ان کے مزاج بھی مختلف ہوتے ہیں، بعض پھل ایک مزاج کے ہوتے ہیں اور بعض میں کئی کئی قسم کے مزاج اکٹھے پائے جاتے ہیں، حکیم کہتے ہیں کہ ترنج کے پھل میں چاروں مزاج سرد، گرم، خشک اور تر بیک وقت موجود ہوتے ہیں، دانے، مغز، چھلکے اور گودے کے مختلف مزاج ہوتے ہیں، انگور میں بھی مختلف مزاج

کی خاصیتیں پائی جاتی ہیں، اس کی گٹھلی اور چھلکا سرد خشک ہے جب کہ مغز اور پانی گرم تر ہے، کیا یہ اس کی اپنی طبیعت کا کام ہے؟ نہیں! بلکہ یہ خاصیتیں اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمائی ہیں، وہ ”وحدہٗ لاشریک لہٗ“ ہیں، نہ اس کی ذات میں کوئی شریک ہے اور نہ اس کی صفتوں میں کوئی ساتھی ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی ایک صفت تو یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ دانے اور گٹھلی سے پودے کو نکالتے ہیں اور دوسری یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ مردہ سے زندہ کو نکالتے ہیں اور زندہ سے مردہ کو نکالتے ہیں، مردہ کی مثال انڈا کی ہے جس سے زندہ چوزا نکلتا ہے اور مرغی زندہ ہے جس سے مردہ انڈا پیدا ہوتا ہے، مجازی معنیٰ میں نیک انسان سے بعض اوقات برا آدمی پیدا ہوتا ہے اور بعض اوقات بدترین آدمی سے نیک اولاد پیدا ہوتی ہے، یہ تو خدا تعالیٰ کی قدرت ہے وہ چاہیں تو کافر سے مؤمن پیدا فرمادیں اور مؤمن سے کافر پیدا فرمادیں یا نیک آدمی کی اولاد بد ہو اور برے آدمی کی اولاد نیک ہو، زندہ اور مردہ کا یہ معنیٰ بھی کیا جاسکتا ہے۔

یہی اللہ تعالیٰ جو یہ سب کام کرتے ہیں وہی ان صفتوں کے مالک ہیں مگر تم کدھر پھرے جاتے ہو، تم کن چیزوں کو معبود بنا رہے ہو، عبادت کے لائق تو وہ اللہ تعالیٰ ہیں جو اپنی قدرت اور حکمت کے ساتھ عقل کو حیران کردینے والے کام انجام دیتے ہیں۔

پھر اللہ تعالیٰ کی ایک صفت بیان کی گئی کہ وہ اندھیرے کو پھاڑنے والے ہیں جس سے روشنی پیدا ہوتی ہے، رات کے اندھیروں کو دور کرنے والی بھی وہی ذات ہے، دوسری جگہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ رات کو قیامت تک لمبی کردیں تو کون ہے جو دن چڑھادے؟ اس کی یہ بھی صفت ہے کہ اس نے رات کو سکون کا ذریعہ بنایا، رات کے وقت ہر چیز تھم جاتی ہے، انسان، چرند، پرند، کیڑے مکوڑے سب رات کو آرام کرتے ہیں، آرام کرنے سے تھکاوٹ دور ہوکر قوتیں بحال ہوجاتی ہیں اور انسان تازہ دم ہوکر پھر سے کام میں لگ جاتا ہے، اگر انسان کو آرام میسر نہ ہو تو اس کی تمام توانائیاں ختم ہوجائیں اور وہ جلد ہی فنا ہوجائے، اللہ تعالیٰ نے کام اور آرام کیلئے الگ وقت مقرر کیے ہیں اور رات کو آرام وسکون کا ذریعہ بنایا ہے۔

سورج اور چاند کو حساب کا ذریعہ بنایا ہے، اللہ تعالیٰ نے ان سیاروں کی ایسی رفتار مقرر کردی ہے جس سے

دن، رات، سردی، گرمی وغیرہ ایک مقررہ وقت پر آتے ہیں اور پھر چلے جاتے ہیں، دوسری جگہ فرمایا ان کا ایک فائدہ یہ ہے کہ تاکہ تم سال و مہینوں کی گنتی معلوم کرسکو، رات اور دن کے ادلنے بدلنے سے دن، ہفتے، مہینے اور پھر سال پیدا ہوتے ہیں، اسی طرح صدیاں گزر جاتی ہیں، تو چاند اور سورج اللہ تعالیٰ نے زمانے کے حساب کیلئے پیدا فرمائے ہیں، یہ اس خدا تعالیٰ کا مقرر کیا ہوا ہے جو غالب اور ہر چیز کو جاننے والے ہیں، وہ کامل قدرت کے مالک ہیں، اس کے حکم کے بغیر کچھ نہیں ہوسکتا مگر تم کدھر سرگردان پھر رہے ہو؟ یہ سب عقلی دلیلیں بیان کی جارہی ہیں کہ ان چیزوں کو روزانہ دیکھتے ہو ان میں غور کرو گے تو سمجھ جاؤ گے کہ اس سارے نظام کو چلانے والی ایک ہی ذات ہے جو کہ اللہ تعالیٰ ہیں، کسی جن، فرشتے یا انسان کے اختیار میں نہیں ہے کہ ایسا کوئی نظام پیش کرے۔

"فَالِقُ الْاِصْبَاحِ" میں ان نعمتوں کا ذکر تھا جو انسان دن کے اجالے سے حاصل کرتا ہے، رات کی تاریکی میں نہیں ہوسکتی، اس کے بعد "جَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا" فرما کر اس طرف اشارہ فرمادیا کہ جس طرح دن کا اجالا ایک عظیم نعمت ہے کہ اس کے ذریعہ انسان اپنے سب کاروبار کرتا ہے اسی طرح رات کے اندھیرے کو بھی برا نہ جانو وہ بھی ایک نعمت ہے۔

رات کی تاریکی کو راحت کیلئے متعین کردینا ایک مستقل نعمت اور اللہ تعالیٰ کی قدرت اس سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ یہ نعمت روزانہ بے مانگے مل جاتی ہے، اس لئے انسان کا دھیان بھی کبھی نہیں جاتا کہ یہ کتنا بڑا احسان و انعام ہے، غور کیجئے! کہ اگر ہر شخص اپنے اختیار و ارادہ سے اپنے آرام کا وقت معین کرتا تو کوئی صبح آٹھ بجے سونے کا ارادہ کرتا، کوئی بارہ بجے، کوئی چار بجے اور کوئی رات کے مختلف حصوں میں جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ رات دن کے چوبیس گھنٹوں میں کوئی بھی ایسا گھنٹہ نہ آتا جس میں انسانی کاروبار، محنت مزدوری، کارخانے اور فیکٹریاں نہ چل رہی ہوتیں، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ سونے والوں کے آرام میں بھی خلل آتا اور کام کرنے والوں کے کام میں بھی، سونے والوں کے آرام میں کام کرنے والوں کے شور و شغب اور کھڑکے اور دھماکے دخل دیتے اور کام کرنے والوں کے کام میں ان لوگوں کی غیر حاضری دخل انداز ہوتی جو اس وقت سو رہے ہوتے ہیں، اس کے علاوہ سونے

والوں کے بہت سے وہ کام رہ جاتے جو ان کے سونے کے وقت میں ہی ہو سکتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی قدرت نے نہ صرف انسان پر بلکہ ہر جاندار پر رات کے وقت نیند کا غلبہ ایسا مسلط فرما دیا کہ وہ کام چھوڑ کر سو جانے کیلئے مجبور ہوتا ہے، شام ہوتے ہی ہر پرندہ، درندہ اور چوپایا اپنے اپنے ٹھکانے کا رخ کرتا ہے، ہر انسان غیر اختیاری طور پر کام چھوڑ کر آرام کرنے کی فکر میں لگتا ہے، ہر طرف ایک سناٹا چھا جاتا ہے، رات کا اندھیرا نیند اور آرام میں مددگار ثابت ہوتا ہے کیونکہ عادۃً زیادہ روشنی میں نیند نہیں آتی۔

غور کیجئے! اگر ساری دنیا کی حکومتیں اور عوام مل کر بین الاقوامی معاہدوں کے ذریعہ سونے کا کوئی ایک وقت مقرر کرنا چاہتے تو اولاً اس میں دشواریاں کتنی ہوتیں؟ دوسرا یہ کہ اگر سارے انسان کسی معاہدہ کے پابند ہو کر ایک معین وقت سویا کرتے تو جانوروں کو اس معاہدہ کا پابند کون بناتا؟ اور وہ کھلے پھرتے تو سونے والے انسانوں اور ان کے سامانوں کا کیا حشر ہوتا؟ یہ اللہ تعالیٰ ہی کی قدرت ہے کہ جس نے غیر اختیاری طور پر ہر انسان اور ہر جاندار پر ایک معین وقت میں نیند مسلط کر کے ان بین الاقوامی معاہدوں کی ضرورت سے بے نیاز فرما دیا۔ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ۔

قدرت کی واضح نشانیاں

وَ هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ لِتَهْتَدُوْا بِهَا فِيْ ظُلُمٰتِ

اور وہی ہے جس نے بنائے لئے تمہارے ستارے تاکہ راستہ پاؤ ذریعے انکے میں اندھیرے

الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ ؕ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۹۷﴾ وَ هُوَ

جنگل اور سمندر کے بیشک کھول دیں ہم نے نشانیاں لئے اس قوم کے جو جانتے ہیں (۹۷) اور وہی ہے

الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّ مُسْتَوْدَعٌ ؕ

جس نے تم کو پیدا کیا سے نفس ایک پس ٹھکانا اور امانت کی جگہ ہے

قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ ﴿٩٨﴾

بیشک کھول دیں ہم نے نشانیاں لئے اس قوم کے جو سوچتے ہیں (۹۸)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور اسی نے تمہارے واسطے ستارے بنادیئے کہ ان کے ذریعے سے جنگل اور دریا میں راستہ معلوم کرو البتہ ہم نے ان لوگوں کیلئے نشانیوں کو تفصیل سے بیان کر دیا ہے جو جانتے ہیں۔(۹۷) وہی ہے جس نے تم سب کو ایک شخص سے پیدا کیا پھر ایک تو تمہارا مستقل ٹھکانہ ہے اور ایک عارضی ٹھکانہ ہے ہم نے ان لوگوں کیلئے نشانیوں کو تفصیل سے بیان کر دیا ہے جو سمجھ رکھتے ہیں۔(۹۸)

لفظی تحقیق: فَمُسْتَقَرٌّ: ٹھکانہ، ٹھہرنے کی جگہ۔ مُسْتَوْدَعٌ: امانت کی جگہ۔ یہ "اِسْتِيْدَاعٌ" سے بنا ہے جو "وَدِيْعَتٌ" سے نکلا ہے، "وَدِيْعَتٌ" کے معنٰی کوئی چیز جو عارضی طور پر امانت رکھی جائے۔

تفسیر

ارشاد ہے کہ یہ جو رات کے وقت تم تارے دیکھتے ہو ان کے بنانے والے اللہ تعالیٰ ہیں، تمہارے لئے ان کے اندر فائدہ یہ ہے کہ جنگل بیابان میں جہاں سوا چٹیل میدان کے اور کچھ نہیں ہوتا اور سمندر میں جہاں پانی کے سوا کچھ نہیں ہوتا ٹھیک راستہ کا اندازہ لگالو، ستاروں کو دیکھ دیکھ کر جاننے والے ٹھیک راستے جان لیتے ہیں، جاننے والوں کیلئے اللہ تعالیٰ اپنی پہچان کے طریقے اور ڈھونڈنے کا پتہ کھول کھول کر بتاتے ہیں، لوگ ان کا خیال کریں تو اللہ تعالیٰ کو پہچان لینا کوئی مشکل بات نہیں۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک اور احسان کا ذکر فرمایا ہے وہی خدا ہے جس نے تمہارے لئے ستاروں کا نظام قائم کیا ہے تا کہ ان کے ذریعے تم خشکی اور تری میں راہ پاؤ اور یہ راہ براہ راست بھی ہوسکتی ہے اور بالواسطہ بھی، جب قافلے جنگلوں اور صحراؤں میں بھٹک جاتے ہیں یا کشتیاں اور جہاز سمندروں میں راستہ گم کر بیٹھتے ہیں تو پھر ان ستاروں کی مدد سے ہی تمہیں منزل کی طرف رہنمائی حاصل ہوتی ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے ستاروں کا نظام

قائم کر کے انسان پر بہت بڑا انعام کیا ہے، اب مقناطیسی آلے قطب نما وغیرہ بھی موجود ہیں جن کی مدد سے سمت معلوم کی جاتی ہے، یہ آلے بھی ستاروں کی حرکتوں کے مطابق ہی بنائے جاتے ہیں، رہنمائی کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے ستاروں کے بعض دوسرے فائدے بھی گنوائے ہیں۔ مثلاً: "سورۂ ملک" میں ہے کہ ہم نے آسمان کو ستاروں کے ذریعے زینت بخشی، مزید یہ کہ شیطانوں کے مارنے کا ذریعہ بھی ستارے ہی ہیں۔

وَ هُوَ الَّذِیْۤ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ: اس آیت میں ایک جان سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں، "سورۂ نساء" میں بھی موجود ہے کہ آپ ہی کے جسم سے آپ کا جوڑا پیدا کیا گیا، غرضیکہ تمام انسانوں کے جد امجد حضرت آدم علیہ السلام ہیں اور ان کو مٹی سے پیدا کیا گیا، "حدیث شریف" میں آتا ہے کہ ہر رنگ، نسل، شکل وصورت اور معاشرے کے لوگ حضرت آدم علیہ السلام ہی کی اولاد ہیں، نیلے، پیلے، چھوٹی، چپٹی، اور بڑی ناک والے کالے اور گورے سب حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں، لہٰذا ایک دوسرے کو رنگ ونسل کی بنیاد پر حقیر جاننا بہت بری بات ہے، دنیا میں ایسے گورے رنگ والے بھی موجود ہیں جو سیاہ رنگ والوں کو اپنے ہوٹلوں میں داخل نہیں ہونے دیتے اور کالے بچوں کو گورے بچوں کے سکولوں میں داخلے پر پابندی ہے یہ انتہاء درجے کی بدتہذیبی اور انسانیت کی توہین ہے، حقیقت یہ ہے کہ کالے اور گورے سب ایک حضرت آدم علیہ السلام ہی کی اولاد ہیں، اللہ تعالیٰ نے آب وہوا کی وجہ سے کسی کو گورا بنا دیا اور کسی کو کالا مگر ساری کی ساری مخلوق اللہ تعالیٰ کی ہے، تجربے بتاتے ہیں کہ چار سو سال تک گرم یا سرد علاقے میں رہنے کی وجہ سے وہاں کی آب وہوا نسل میں شامل ہو جاتی ہے اور سرد ملکوں میں رہنے والے سفید اور گرم اور نمی والے علاقوں کے باشندے سیاہ رنگ اختیار کر لیتے ہیں بہر حال تمام انسان ایک جان سے پیدا ہونے کی بناء پر برابر ہیں اور رنگ ونسل کی وجہ سے کسی کو برتری حاصل نہیں۔

فَمُسْتَقَرٌّ وَّ مُسْتَوْدَعٌ: تمہیں ایک جان سے پیدا کیا پس تمہارے لئے ایک امانت کے طور پر رکھنے کی عارضی جگہ ہے اور ایک مستقل ٹھکانہ ہے، باپ کی پشت سے نکل کر جب مادہ ماں کے رحم میں پہنچتا ہے تو یہ انسان کی عارضی قیام گاہ ہوتی ہے، یہاں مقررہ مدت تک قیام کے دوران وہ آہستہ آہستہ دنیا کے اثرات قبول

کرتا ہے اور پھر ماں کے پیٹ سے دنیا کے ٹھکانے میں آجاتا ہے لیکن یہ جگہ بھی انسان کیلئے مستقل ٹھہرنے کی جگہ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کی ہوئی مدت تک اس دنیا میں رہنے کے بعد پھر عارضی ٹھکانہ یعنی قبر کے حوالے کردیا جاتا ہے، اب وہ قبر میں ٹھہرنے کے دوران آخرت کے اثرات قبول کرتا ہے اور آخر کار قیامت کو وہ حشر میں پہنچ جائے گا، حساب کتاب کے بعد اس کا مستقل ٹھکانہ جنت میں ہوگا یا دوزخ میں، آخری ٹھکانہ وہی ہے۔

قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّفْقَهُوْنَ: ہم نے تمام آیتوں، حکموں اور دلیلوں کو کھول کر بیان کردیا ہے تاکہ سمجھ رکھنے والے لوگ ان میں غور وفکر کریں اور اللہ تعالیٰ کی پہچان حاصل کریں، جو لوگ عقل سے کام نہیں لیتے ان کیلئے یہ چیزیں کچھ بھی فائدہ مند نہیں۔

سب پھل اور سبزیاں اللہ تعالیٰ نے پیدا کیں

وَ هُوَ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ

اور وہی ہے جس نے اتارا سے آسمان پانی پھر نکالی ہم نے ذریعہ اسکے اگنے والی

كُلِّ شَیْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا ۚ

ہر چیز کی پس نکالی ہم نے سے اس سبزکھیتی نکالتے ہیں ہم سے اس دانے ایک پر ایک چڑھا ہوا

وَ مِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِیَةٌ وَّ جَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ

اور سے کھجور سے گچھوں میں خوشے نیچے جھکے ہوئے اور باغ کے انگور

وَّ الزَّیْتُوْنَ وَ الرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّ غَیْرَ مُتَشَابِهٍ ؕ

اور زیتون اور انار آپس میں ملتے جلتے اور الگ الگ ایک دوسرے سے

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور اسی نے آسمان سے پانی اتارا، پھر اس سے ہر چیز اگنے والی ہم نے نکالی، پھر اس سے سبز کھیتی نکالی جس سے ہم دانے نکالتے ہیں ایک پر ایک چڑھا ہوا اور کھجور کے گابھے میں سے پھل کے جھکے

ہوئے گچھے اور انگور کے باغ اور زیتون اور انار آپس میں ملتے جلتے اور جدا جدا بھی۔

لفظی تحقیق: مُتَرَاكِبٌ: "رُكُوْبٌ" کے معنٰی ہیں چڑھنا، سوار ہونا، "تَرَاكُبٌ" کے معنٰی ہیں ایک دوسرے پر چڑھا ہوا ہونا، سوار ہونا، "مُتَرَاكِبٌ" سے مراد یہ ہے کہ دانے اس کثرت سے ہیں کہ ایک دوسرے پر چڑھے ہوئے ہیں۔ قِنْوَانٌ: خوشے۔ مُشْتَبِهًا: ملتے جلتے۔ "شِبْهٌ" کے معنٰی ہیں کسی سے ملنا، کسی جیسا ہونا، "اِشْتِبَاهٌ" سے مراد شکل، مزے، رنگ وغیرہ میں ملتا ہوا ہونا۔ غَيْرَ مُتَشَابِهٍ: اس سے مراد ایسی چیز جو دوسری سے نہ ملے۔

تفسیر

اس آیت میں اور نشانیاں بیان کی گئی ہیں جن پر غور کرنے سے انسان اللہ تعالیٰ کو پہچان سکتا ہے، انسان کو عادت ہوگئی ہے کہ زمین کے اُگے ہوئے پھل، سبزیاں، غلّہ وغیرہ کھاتا رہتا ہے اور نہیں سوچتا کہ یہ چیزیں کیسے پیدا ہوئیں اور کس نے پیدا کیں، اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ بیج ڈالنے کے بعد کھیتی پکنے اور پھل لگنے تک جو کچھ ہوتا ہے اس میں انسان کا کچھ دخل نہیں اس لئے اسے سوچنا چاہئے کہ یہ سب کچھ کون کرتا ہے؟ اللہ تعالیٰ بارش برساتے ہیں اس سے زمین میں بیج اور پودا جم جاتا ہے اور اِدھر اُدھر سے ضروری چیزیں اپنے اندر اکٹھی کرتا ہے پھر ہری بھری کھیتیاں لہلہانے لگتی ہیں، انگور لگتے ہیں، زیتون اور انار پیدا ہوتے ہیں، کھجور کے درخت میں گچھے لگتے ہیں، ان میں سے خوشے نکلتے ہیں پھر نیچے اوپر سب طرف کھجوریں لگتی ہیں، یہ بیشمار پھل جو تم دیکھتے ہو ان کی شکلیں، مزے اور رنگ کبھی ایک جیسے ہوتے ہیں اور کبھی الگ الگ، یہ سب اللہ تعالیٰ کرتے ہیں، تمہارا اس میں کوئی دخل نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے بارش برسانے کیلئے یہ انتظام فرمایا ہے کہ سورج کی گرمی سے سمندروں سے بخارات اٹھتے ہیں جن سے بادل بنتے ہیں اور ہوائیں انہیں اڑا کر دور دراز علاقوں تک لے جاتی ہیں پھر جہاں اللہ تعالیٰ کا حکم

ہوتا ہے وہاں بادلوں سے بارش برسنے لگتی ہے، مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یہاں پر آسمان کا لفظ اس لئے استعمال کیا گیا ہے کہ کہیں لوگ بادلوں پر ہی تکیہ نہ کرنے لگیں بلکہ ان بادلوں کو بھیجنے والے ایک اللہ ہی ہیں جو آسمانوں سے حکم جاری کر کے سارے نظام کو چلا رہے ہیں، اس کی قدرت کا یہ بھی کمال ہے کہ بارش اتار کر اسے یونہی نہیں چھوڑ دیتے بلکہ کچھ فالتو پانی کو جھیل، تالاب اور چشمے کی صورت میں جمع کر دیتے ہیں اور باقی پانی کو ندی نالوں کی صورت میں آگے چلا دیتے ہیں تاکہ جہاں بارش نہیں ہوئی وہ جگہ بھی پانی سے سیراب ہو جائے، اللہ تعالیٰ پانی کا کچھ ذخیرہ زمین کے اندر بھی جمع کر دیتے ہیں جسے لوگ اپنی ضرورت کیلئے کنویں اور ٹیوب ویل کے ذریعے نکال لیتے ہیں غرض یہ کہ پانی اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے، "سورۂ فرقان" میں ارشاد ہے کہ ہم نے آسمان سے پاک پانی اتارا جو خود بھی پاک ہے اور دوسری چیزوں کو بھی پاک کرتا ہے، اللہ تعالیٰ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ اسی پانی سے ہم نے ہر جاندار کو زندگی بخشی، تمام انسان، جانور، چرند، پرند، کیڑے مکوڑے پانی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے، یہ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے۔

اللہ تعالیٰ نے پانی ہی کے ذریعے ہر قسم کے پودے نکالے، تمام فصلیں اور باغات پانی ہی سے زندہ ہیں، جب بارش نہیں ہوتی تو نہ فصلیں اور سبزیاں اگتی ہیں اور نہ درخت پھل لاتے ہیں، پانی ہی کے ذریعے اللہ تعالیٰ سبزہ نکالتے ہیں اور پھر اس سے تہہ بر تہہ دانے نکالتے ہیں، ہر خوشہ پہلے سبز رنگ کا ہوتا ہے پھر پک کر زرد ہو جاتا ہے اور اس سے بیشمار دانے پیدا ہوتے ہیں، کہیں دھان پیدا ہوتے ہیں، کہیں جوار، باجرہ، مکئی اور کہیں گندم پیدا ہوتی ہے، ایک ایک پودے سے بیشمار دانے اللہ تعالیٰ پیدا فرماتے ہیں۔

عام اناج کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا کہ ہم پانی کے ذریعے کھجوریں بھی پیدا کرتے ہیں اور ان کی پیدائش کی صورت یہ ہے کہ کھجور کے درخت کی شاخوں میں جھکے ہوئے گچھے ہوتے ہیں، کھجور کے ایک ایک گچھے میں ڈھیروں کھجوریں ہوتی ہیں جن کے وزن کی وجہ سے شاخیں جھک جاتی ہیں، کھجوروں کے درخت مختلف قسموں کے ہوتے ہیں، بعض قد میں چھوٹے ہوتے ہیں اور بعض بہت لمبے ہوتے ہیں، کھجور کا درخت بہت لمبی عمر پاتا ہے، یہ

درخت دنیا کے گرم خطوں میں خاص طور پر پائے جاتے ہیں۔

کھجور کے درخت کو انسانی زندگی سے ایک مناسبت یہ ہے کہ جس طرح انسان کے سر سے پانی گزر جائے تو یہ مرجاتا ہے اسی طرح کھجور کے درخت کے سرے تک پانی پہنچ جائے تو یہ بھی سوکھ جاتا ہے، انسان کی گردن کٹ جائے تو وہ ختم ہوجاتا ہے اسی طرح اس درخت کا تنا اگر اوپر سے کاٹ دیا جائے تو یہ بھی بیکار ہوجاتا ہے، اس کو انسان کے ساتھ عجیب مشابہت ہے، بہر حال اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں کھجور کا ذکر سب سے پہلے فرمایا کہ اکثر خطوں میں اس کا پھل غذا کے طور پر استعمال ہوتا ہے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مبارک ہے وہ گھر کہ جس گھر میں کھجوریں موجود ہوں اس گھر کے رہنے والے بھوکے نہیں ہیں، کھجور ایک لذیز اور طاقتور غذا ہے اور انسان کیلئے نہایت فائدہ مند ہے۔

دوسرے نمبر پر اللہ تعالیٰ نے انگور کا ذکر فرمایا کہ انگور کے باغ بھی اللہ تعالیٰ نے اسی پانی کے ذریعے پیدا فرمائے، انگور بڑا میٹھا اور طاقتور پھل ہے، اسے پھلوں میں افضل کہا جاتا ہے، بہر حال انگور ایک اچھا اور عمدہ پھل ہے جو کہ غذائیت سے بھرپور ہے، کھجور کے بعد دوسرا نمبر انگور کا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے تیسرے نمبر پر زیتون کا ذکر فرمایا ہے، زیتون زیادہ تر عرب اور افریقہ میں پایا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں نے اس درخت کے بابرکت ہونے کی دعا فرمائی، شام و فلسطین میں زیتون کے بعض درخت یونانیوں کے زمانے سے چلے آرہے ہیں جن کی عمر اڑھائی ہزار سال سے بھی بڑھ چکی ہے، اس درخت کے متعلق پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ زیتون کو کھانے میں استعمال کرو اور اس کی مالش بھی کرو، (Olive Oil) مہنگا ہے مگر دنیا کے ہر خطے میں ملتا ہے، لوگ اسے گھی کی جگہ استعمال کرتے ہیں اور یہ سر میں لگانے کے کام بھی آتا ہے، اس کا پھل بھی کھایا جاتا ہے، اس کے درخت کی لکڑیاں استعمال ہوتی ہیں، پتے اور چھلکا بھی مفید ہے اور اس کی جڑیں بھی کام میں لائی جاتی ہیں، یہ غذا اور دوا دونوں طریقوں سے استعمال میں آتا ہے، اللہ تعالیٰ نے یہ عجیب وغریب درخت بنایا ہے۔

اس کے بعد یہاں انار کا ذکر ہے اسے بھی اللہ تعالیٰ نے پانی کے ذریعے پیدا فرمایا، یہ کھٹا میٹھا پھل ہے،

اس کی مختلف قسمیں ہیں جن میں قندھاری انار کے دانے موٹے اور زیادہ لذیز ہوتے ہیں، اس میں فولاد کافی مقدار میں پایا جاتا ہے جس کی وجہ سے جگر کے مریضوں کے لئے بڑا مفید ہے، گرمی کو مارتا ہے اور گردوں اور جگر کو صاف کرتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کے موٹے موٹے دانوں کو باریک چھلکے میں عجیب طریقے سے محفوظ کیا ہے۔

تمام پھلوں کا ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان میں سے بعض ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں اور بعض ایک دوسرے سے ملتے جلتے نہیں ہیں، بعض کی شکلیں ملتی ہیں تو ذائقہ الگ ہے، بعض کا ذائقہ ملتا ہے تو رنگ مختلف ہے، اللہ تعالیٰ نے "سورۂ رعد" میں فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین میں انگور کے باغات اور کھیتی اور کھجور کے درخت پیدا کیے، سب کو ایک ہی پانی سے سیراب کیا جاتا ہے مگر کوئی میٹھا ہے اور کوئی کڑوا، کوئی تلخ ہے اور کوئی کسیلہ، مختلف رنگ، مختلف ذائقے، مختلف شکلیں، کچھ آپس میں ملتے جلتے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جو ملتے جلتے نہیں ہیں مگر خوراک سب کی ایک ہی پانی ہے، اللہ تعالیٰ کی قدرت کا یہ کتنا بڑا کمال ہے، اس میں عقل والوں کیلئے بڑی نشانیاں ہیں، غور کیجئے! آخر یہ سب کچھ خود بخود ہو رہا ہے یا اسے کرنے والی کوئی ذات موجود ہے؟ یہ اس مالک الملک کی شان ہے کہ خربوزے کے کھیت میں ایک ہی کنویں سے پانی جارہا ہے مگر کوئی خربوزہ میٹھا ہے اور کوئی پھیکا، یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہاں پر اللہ تعالیٰ کی قدرت اور حکمت ہی کام آرہی ہے اس کے علاوہ کوئی ایسی ہستی نہیں جو اس قسم کے عجیب وغریب کام کر سکے۔

اللہ تعالیٰ خیالات سے بڑھ کر ہیں

اُنْظُرُوْٓا اِلٰى ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَ يَنْعِهٖ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكُمْ لَاٰيٰتٍ

دیکھو تم طرف پھل اسکے کی جب وہ پھل لائے اور پکنے اسکے کی بیشک اندر اس کے البتہ نشانیاں ہیں

لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿٩٩﴾ وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَ خَلَقَهُمْ

واسطے اس قوم کے جو ایمان لائے (۹۹) اور یہ لوگ کرتے ہیں اللہ کا شریک جنوں کو حالانکہ اس نے پیدا کیا انکو

وَ خَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَ بَنٰتٍۭ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى

اور تراش رکھے ہیں لئے اس کے بیٹے اور بیٹیاں بغیر علم کے پاک ہے وہ اور بلند ہے

عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

اس سے جو وہ بیان کرتے ہیں (۱۰۰)

۱۲ ع ۶ ۱۸

بامحاورہ ترجمہ:۔ دیکھو! درخت کے پھل کو جب وہ پھل لاتا ہے اور اس کے پکنے کو دیکھو ان چیزوں میں ایمان والوں کیلئے نشانیاں ہیں۔(۹۹) اور جنوں کو اللہ کا شریک ٹھہراتے ہو حالانکہ اس نے ان کو پیدا کیا ہے اور اس کیلئے جہالت کی وجہ سے بیٹے اور بیٹیاں ٹھہراتے ہیں وہ ان باتوں سے پاک ہے اور بہت دور ہے جو لوگ بیان کرتے۔(۱۰۰)

لفظی تحقیق: يَنْعِ: پکنا۔ اس کے معنٰی پختگی اور پکنے کے ہیں، پختہ اور پکے ہوئے پھل کو ''ثَمَرٌ يَانِعٌ'' کہتے ہیں۔ خَرَقُوْا: تراشتے ہیں: اس کے اصل معنٰی پھاڑنے کے ہیں، اس کے بعد اٹکل پچو بات گھڑ لینے کے معنٰی میں استعمال ہوا ہے۔

تفسیر

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی وہ نشانیاں بیان کی ہیں جن کا تعلق زمین سے پھل اور غلہ اگانے سے ہے، اللہ تعالیٰ بارش برساتے ہیں اور اس کی وجہ سے سبزیاں، ہرے بھرے درخت اور پودے پیدا ہوتے ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کے بس کا کام نہیں۔

ارشاد ہے کہ ان پھلوں اور غلوں کے درختوں اور کھیتوں میں لگنے اور پیدا ہونے کا حال تم نے دیکھا، اس کے بعد وہ اور پکتے ہیں اس کے بعد تم انہیں توڑ کر جمع کرتے ہو اور کھاتے ہو، انسان جس طرح غلوں اور پھلوں کو پیدا کرنے میں بے بس ہے اسی طرح ان کے پکانے میں بھی اس کا کوئی دخل نہیں، یہ بھی صرف اللہ تعالیٰ کی قدرت

سے ہوتا ہے اور سوچو تو بڑی بات ہے کیونکہ اس کے بغیر وہ انسان کے کام کے نہیں ہو سکتے۔

اُنْظُرُوْٓا اِلٰى ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَ يَنْعِهٖ: اس پھل کی طرف دیکھو جب وہ پھل دیتا ہے اور اس کے پکنے کی طرف دیکھو پہلے اس کا رنگ سبز ہوتا ہے پھر زرد اور پھر کوئی سرخ ہو جاتا ہے اور کسی کی رنگت زرد ہی رہتی ہے، اللہ تعالیٰ انہیں اپنی حکمت کیساتھ پکاتے ہیں تا کہ انسان کی غذا بن سکیں، ان تمام چیزوں میں ایمان والوں کیلئے نشانیاں ہیں، ایمان والے تو یہ دلیلیں دیکھ کر یقین کر لیتے ہیں کہ بارش کا برسانا، کھیتوں اور درخت کا پھل لانا اسی وحدہٗ لاشریک لہٗ کا کام ہے مگر جو لوگ ایمان سے خالی ہیں وہ ان واضح دلیلوں سے بھی نصیحت نہیں پکڑتے۔

ایسے بڑے کریم کارساز کو چھوڑ کر ان لوگوں کو دیکھو کہ اپنی طرف سے فرشتوں، جنوں وغیرہ کو اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہراتے ہیں حالانکہ یہ سب اس کی مخلوق ہے اور اس نے اپنی قدرت سے بغیر کسی کی مدد کے انہیں پیدا کیا ہے، بعض کہتے ہیں کہ فرشتے وغیرہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں، یہ سب ان کی جہالت کی بات ہے، اللہ تعالیٰ ان سب باتوں سے پاک اور بلند ہیں ان کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی نشانیاں دیکھ کر اس کو ٹھیک طور پر سمجھنے کی کوشش کریں۔

ان تمام دلیلوں کو دیکھنے کے باوجود مشرکوں کا حال یہ ہے کہ انہوں نے جنوں کو اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرایا ہے حالانکہ اسی خدا نے ان کو پیدا کیا ہے، بعض نے انسانوں کو معبود بنا رکھا ہے، بعض نے پتھروں اور قبروں کو حاجت روا اور مشکل کشا سمجھ لیا ہے، کتنے افسوس کا مقام ہے کہ یہ لوگ ذرا غور نہیں کرتے، پھر مشرکوں نے یہ بھی ظلم کیا کہ جہالت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کیلئے بیٹے اور بیٹیاں گھڑ لیے، عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام کو خدا کا بیٹا ٹھہرا لیا اور یہودیوں نے حضرت عزیر علیہ السلام کو بیٹا تسلیم کر لیا، کسی نے کہہ دیا کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں، بعض نے جنوں کو خدا تعالیٰ کی اولاد کہا مگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی نہ کوئی بیوی ہے اور نہ اولاد، وہ تو ان چیزوں سے پاک ہیں، وہ بے نیاز ہے، اولاد کا ہونا تو مخلوق کی صفت ہے اسے اللہ تعالیٰ میں کیسے ثابت کرتے ہو، "سورہ بنی اسرائیل" میں فرمایا کہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ تم اپنے لئے تو بیٹے پسند کرتے ہو اور فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ٹھہراتے ہو۔

اللہ تعالیٰ کی کوئی اولاد نہیں

بَدِیۡعُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ اَنّٰی یَکُوۡنُ لَہٗ وَلَدٌ وَّ لَمۡ تَکُنۡ

نئی طرح بنانے والا آسمانوں کا اور زمین کا کیونکر ہو لئے اسکے اولاد حالانکہ نہیں ہے

لَّہٗ صَاحِبَۃٌ ؕ وَ خَلَقَ کُلَّ شَیۡءٍ ۚ وَ ہُوَ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ ﴿۱۰۱﴾

لئے اس کے کوئی بیوی اور بنائی اس نے ہر چیز اور وہ ہر چیز کو جاننے والے ہیں (۱۰۱)

بامحاورہ ترجمہ:۔ آسمان اور زمین کا نئی طرح پر بنانے والا ہے اور اس کا بیٹا کیونکر ہوسکتا ہے حالانکہ اس کی کوئی بیوی نہیں اور اس نے ہر چیز بنائی اور وہ ہر چیز سے واقف ہیں۔(۱۰۱)

لفظی تحقیق: بَدِیۡعُ: نئی طرح بنانے والا: "بَدِیۡعٌ" بھی "سَمِیۡعٌ، عَلِیۡمٌ، خَبِیۡرٌ، بَصِیۡرٌ" کی طرح اسم صفت ہے اور "بَدۡعٌ" سے بنا ہے، "بَدۡعٌ" کے معنٰی ہیں کسی چیز کو نمونہ کے بغیر پہلی مرتبہ بنانا یعنی ایجاد کرنا۔ صَاحِبَۃٌ: ساتھ رہنے والی: یہاں "صَاحِبَۃٌ" سے مراد بیوی ہے۔

تفسیر

پچھلے سارے رکوع میں اللہ تعالیٰ کی صفتیں بیان کی گئیں جن کے آثار دنیا میں ظاہر ہیں، ان آثار پر غور کر کے ہر شخص اللہ تعالیٰ کو اچھی طرح پہچان سکتا ہے، اس رکوع کی پہلی تین آیتوں میں کچھ اور صفتیں بیان کی گئی ہیں جن سے اللہ تعالیٰ کی قدرت کا اندازہ کرنا آسان ہوجاتا ہے، اس آیت میں اللہ تعالیٰ کو آسمان و زمین کا بے نمونہ بنانے والے اور ہر چیز کو پیدا کرنے والے اور جاننے والے کہا گیا ہے پھر جو لوگ اپنی نادانی سے اللہ تعالیٰ کی اولاد قرار دیتے ہیں ان کی بات کو غلط کہا گیا ہے۔

ارشاد ہے کہ: یہ جو تم اپنے سر کے اوپر آسمان اور پاؤں کے نیچے زمین دیکھتے ہو یہ کس قدر عجیب وغریب

چیزیں ہیں ان کو اللہ تعالیٰ نے بغیر کسی نمونے کے بنایا ہے اسی طرح اس نے ہر چھوٹی اور بڑی چیز بنائی ہے اور وہ ہر چیز کو ہمیشہ سے جاننے والے ہیں اور اسی علم کے مطابق سب کو بنایا ہے، جب وہ ہر چیز ایک لفظ "کُنْ رہوجا" سے پیدا کر سکتے ہیں تو ہر چیز کو اس کی مخلوق کہنا چاہیے، بیٹا، بیٹی اولاد جو اس دنیا میں ہوتی ہے وہ تو بڑے جھنجھٹ سے ہوتی ہے اس کیلئے ایک بیوی چاہیے بغیر بیوی کے اولاد کسی کے نہیں ہوتی، اللہ تعالیٰ کی اولاد کیسے ہو سکتی ہے حالانکہ اس کی بیوی بھی کوئی نہیں جب کوئی اس کی بیوی نہیں تو اولاد کیسے؟ اور بیوی شوہر کی ہم جنس ہوتی ہے بس اتنا فرق ہوتا ہے کہ وہ مذکر ہوتا اور یہ مؤنث لیکن اللہ تعالیٰ کے برابر کی تو کوئی چیز بھی نہیں ہے اور کسی چیز کو اس سے ذرا بھی مشابہت نہیں ہے اللہ تعالیٰ تو اپنے حکم سے ہر چیز پیدا کر دیتے ہیں اس لئے اس عالم میں جو بھی ہے اس کا پیدا کیا ہوا ہے اور کوئی بھی اس کے برابر نہیں۔

دنیا کی چیزوں کے ذریعے اللہ تعالیٰ کو پہچانو

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ ۚ
یہی اللہ ہیں رب ہے تمہارا نہیں کوئی معبود مگر وہی پیدا کرنے والا ہر چیز کا پس عبادت کرو اسکی

وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ﴿۱۰۲﴾ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ۫ وَ هُوَ
اور وہ اوپر ہر چیز کے کام بنانے والا ہے (۱۰۲) نہیں پائیں اس کو آنکھیں اور وہ

يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ وَ هُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ﴿۱۰۳﴾
پاتا ہے آنکھوں کو اور وہ باریک بین خبردار ہے (۱۰۳)

بامحاورہ ترجمہ:۔ یہی اللہ تمہارا رب ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے سو تم اسی کی عبادت کرو اور وہ ہر چیز کا کارساز ہے۔ (۱۰۲) اس کو آنکھیں نہیں پاسکتیں اور وہ آنکھوں کو پا سکتا ہے اور وہ نہایت باریک بین اور خبردار ہے۔ (۱۰۳)

لفظی تحقیق: اَلْوَكِيْلُ: وہ شخص جس پر بھروسہ کیا جائے، اور جب یہ "اسمائے حسنٰی" میں سے ہو تو اس وقت روزی دینے والا، کفایت کرنے والا کے معنٰی ہوتے ہیں۔

تفسیر

اللہ تعالیٰ کی صفتیں بیان کرنے کے بعد یہ سمجھانا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو پہچانو، ظاہر ہے کہ کسی چیز کی خاص نشانیاں اچھی طرح کھول کر بتانے سے اس کی ایک صورت ذہن میں آجاتی ہے اور وہ ایسی صاف ہوتی ہے کہ اس کی طرف اشارہ کیا جاسکتا ہے، پہلے رکوع میں جو کام گنوائے ہیں وہ ایسے ہیں کہ انہیں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں کرسکتا اس لئے ان سب کاموں پر غور کر کے اللہ تعالیٰ کا تصور واضح طور پر ذہن میں آجاتا ہے، اسی تصور کی طرف اشارہ کر کے اس آیت کو شروع کیا گیا ہے، یہ تصور گو ہمارے دل میں ہے لیکن جس کا تصور ہے وہ بہت بلند اور برتر ہے اور عظمت کے لحاظ سے بہت بڑا ہے۔

ارشاد ہے کہ جس میں اوپر کی بیان کی ہوئی سب صفتیں جمع ہیں یہ اللہ تعالیٰ ہیں اور یہی تمہارے رب ہیں اس کے سوا کوئی عبادت کے قابل نہیں اس لئے معبود صرف وہی ہیں، سب چیزیں اسی نے پیدا کی ہیں تم اس کی بندگی میں جھک جاؤ سب کے کام بنانے والے وہی ہیں تم اس کی صفتوں اور کاموں پر دھیان جما کے اس کا تصور تو کرسکتے ہو لیکن تمہاری یہ موجودہ آنکھیں اس کو دیکھ نہیں سکتیں وہ آنکھوں کی ساخت اور بناوٹ اور اس کی قوت سے اچھی طرح واقف ہیں کیونکہ اس کی صفت خبیر ہے یہ تمہاری موجودہ آنکھ تو ہوا وغیرہ کو بھی نہیں دیکھ سکتی پھر اللہ تعالیٰ تو اصلی معنٰی میں پورے طور پر باریک بین ہیں۔

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ: یہی اللہ تمہارا پروردگار ہے جو تمہیں پیدا کر کے درجہ بدرجہ کمال تک پہنچاتے ہیں لہٰذا اس کے سوا کوئی معبود نہیں، عبادت کے لائق وہی ہوسکتا ہے جو بنانے والا اور جاننے والا ہو چونکہ یہ صفتیں کسی دوسری ذات میں نہیں پائی جاتیں اس لئے اس کے سوا معبود بھی کوئی نہیں ہوسکتا، پھر فرمایا ہر چیز کے خالق وہی اللہ تعالیٰ ہیں، لہٰذا عبادت بھی اسی کی کرو چونکہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ جن، فرشتے، پیغمبر وغیرہ سب مخلوق ہیں اس لئے

ان میں سے کوئی بھی معبود نہیں ہوسکتا بلکہ یہ سب اسی کی عبادت کرنے پر مامور ہیں، عبادت انتہائی درجے کی عاجزی کا نام ہے اور عاجزی کا اظہار زبان، دل، اعضاء اور مال سے ہوتا ہے، لہٰذا ہر قسم کی زبانی، دلی، مالی اور بدنی عبادت کے لائق صرف وہی "وحدہٗ لاشریک لہٗ" ہے، آخر اس کی عبادت اور انتہائی تعظیم کیوں نہ کی جائے جب کہ ہر چیز کے کارساز بھی وہی ہیں، ہر چیز کا نظام وانتظام اسی کے پاس ہے لہٰذا ہر قسم کی حاجت کیلئے ہاتھ بھی اسی کے سامنے پھیلانا چاہئے، "سورۂ مزمل" میں ہے کہ چونکہ اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں، لہٰذا ہر کام میں کارساز بھی اسی کو پکڑو وہی تمہارے کام بنائیں گے اور وہی بگاڑیں گے، یہ صفت اسی کے لئے خاص ہے باقی سب اس کے عاجز بندے ہیں۔

یہ بات عام تعلیم کے دوران سمجھائی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نظر نہیں آتے، اس دنیا میں کوئی شخص اس کو ان ظاہری آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتا، یہاں بھی فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو یہ آنکھیں دیکھنے سے عاجز ہیں اس جہان میں انسانی آنکھ میں وہ صلاحیت نہیں ہے جس سے وہ اللہ تعالیٰ کا دیدار کر سکے، البتہ دوسرے جہاں میں ایمان والوں کو اللہ تعالیٰ کا دیدار نصیب ہوگا، ایک حدیث شریف کے الفاظ ہیں کہ: مرنے سے پہلے تم اپنے رب کو نہیں دیکھ سکتے۔

لَطِیْفُ: کے دو معنیٰ آتے ہیں، یعنی: مہربانی کرنے والا اور بہت زیادہ باریک بین۔ **خَبِیْرُ:** سے مراد ہر چیز کی خبر رکھنے والا ہوتا ہے، یہ دونوں صفتیں اللہ تعالیٰ میں پائی جاتی ہیں اس کے علاوہ نہ کوئی لطیف ہے کہ اس کی نظر ہر چھوٹی سے چھوٹی اور پوشیدہ چیز پر ہو اور نہ کوئی علیم ہے، اسی طرح اس کے علاوہ نہ کوئی بدیع ہے اور نہ خالق، یہ تمام صفتیں اسی کے ساتھ خاص ہیں، لہٰذا ایک سچا خدا بھی وہی ہیں۔

انسان کو اس دنیا میں آنکھوں سے

اللہ تعالیٰ کی زیارت ہوسکتی ہے یا نہیں؟

اس مسئلہ میں تمام علماء اہلسنت والجماعۃ کا عقیدہ یہ ہے کہ اس دنیا میں آنکھوں سے اللہ تعالیٰ کی زیارت

نہیں ہوسکتی یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب یہ درخواست کی کہ اے اللہ! مجھے اپنی زیارت کرا دیجئے تو جواب ارشاد ہوا کہ آپ ہرگز مجھے آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے، ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب یہ جواب ملتا ہے تو پھر اور کسی جن اور انسان کی کیا مجال ہے، البتہ آخرت میں مؤمنوں کو اللہ تعالیٰ کی زیارت ہونا صحیح اور قوی متواتر حدیثوں سے ثابت ہے اور خود قرآن کریم میں موجود ہے کہ ''قیامت کے روز بہت سے چہرے تروتازہ ہشاش بشاش ہوں گے اور اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے'' البتہ کافر اور منکر لوگ اس روز بھی سزا کے طور پر اللہ تعالیٰ کے دیدار سے محروم رہیں گے جیسا کہ قرآن کریم کی ایک آیت میں ہے کہ ''کافر اس روز اپنے رب کی زیارت سے محروم ہوں گے'' اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی زیارت مختلف مقامات پر ہوگی، میدان محشر میں بھی اور جنت میں پہنچنے کے بعد بھی اور جنتیوں کیلئے ساری نعمتوں سے بڑی نعمت حق تعالیٰ کی زیارت ہوگی۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: جب جنت والے جنت میں داخل ہو جائیں گے تو اللہ تعالیٰ ان سے فرمائیں گے کہ جو نعمتیں جنت میں مل چکی ہیں ان سے زائد اور کچھ چاہئے تو بتلاؤ کہ ہم وہ بھی دیدیں، یہ لوگ عرض کریں گے یا اللہ! آپ نے ہمیں دوزخ سے بچایا، جنت میں داخل فرمایا اس سے زیادہ ہم اور کیا چاہیں؟ اس وقت پردہ درمیان سے اٹھا دیا جائے گا اور سب کو اللہ تعالیٰ کی زیارت ہوگی اور جنت کی ساری نعمتوں سے بڑھ کر یہ نعمت حاصل ہوگی، یہ حدیث ''صحیح مسلم'' میں حضرت صہیب رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔

''صحیح بخاری'' کی ایک حدیث میں ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ایک رات چاند کی چاندنی میں تشریف فرما تھے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا مجمع تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چاند کی طرف نظر فرمائی اور پھر فرمایا کہ: (آخرت میں) تم اپنے رب کو اسی طرح دیکھو گے جیسے اس چاند کو دیکھ رہے ہو، ''ترمذی اور مسند احمد'' کی ایک حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ جن لوگوں کو جنت میں خاص درجہ عطا فرمائیں گے، ان کو روزانہ صبح و شام اللہ تعالیٰ کی زیارت نصیب ہوگی، خلاصہ یہ ہے کہ دنیا میں کسی کو اللہ تعالیٰ کی زیارت نہیں ہوسکتی اور آخرت میں سب جنت والوں کو ہوگی اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو جو شب معراج میں زیارت ہوئی وہ بھی حقیقت میں آخرت کے جہان ہی کی زیارت ہے۔

کامیاب کون ہے؟

قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَ
تحقیق آ چکیں پاس تمہارے نشانیاں سے رب تمہارے کی پس جس نے دیکھ لیا پس لئے جان اپنی کی اور

مَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا ۭ وَ مَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ﴿۱۰۴﴾ وَ كَذٰلِكَ
جو اندھا رہا سو! پر اس کی جان اور نہیں میں پر تم نگہبان (۱۰۴) اور اسی طرح

نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَ لِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۵﴾
پھیرتے ہیں ہم آیتوں کو اور تا کہ کہیں وہ پڑھا تو نے اور تا کہ بیان کریں ہم اسکو لئے اس قوم کے جو جانتے ہیں (۱۰۵)

بامحاورہ ترجمہ: تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نشانیاں آ چکیں پھر جس نے دیکھ لیا سو اس کا فائدہ اپنے لئے ہے اور جو اندھا رہا سو اس کا وبال اسی پر ہے اور میں تم پر نگہبان نہیں۔ (۱۰۴) اور یوں ہم طرح طرح آیتیں سمجھاتے ہیں اور تا کہ وہ کہیں کہ آپ نے کسی سے پڑھا ہے اور اس لئے کہ ہم اس کو سمجھداروں کیلئے واضح کر دیں۔ (۱۰۵)

لفظی تحقیق: بَصَآئِرُ: نشانیاں۔ "بَصِیْرَۃٌ" کی جمع ہے جو "بَصَرٌ" سے بنا ہے، "بَصَرٌ" کے معنیٰ بینائی کے اور دیکھنے کے ہیں لیکن دیکھنا دو طرح کا ہوتا ہے، ایک ظاہری آنکھ سے دیکھنا ہے اس کیلئے بصارت کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور ایک دل کی آنکھ سے دیکھنا ہے جسے سمجھ کہتے ہیں اس کیلئے بصیرت کا لفظ استعمال ہوتا ہے، دونوں "بَصَرَ" سے بنے ہیں، یہاں بصیرت سے مراد وہ چیز ہے جس سے سمجھنے میں مدد ملے جیسے دلیل، نشانی، علامت وغیرہ۔ حَفِیْظٌ: نگہبان۔ "حِفْظٌ" کے معنیٰ ہیں دیکھ بھال اور نگہبانی، "حَفِیْظٌ" سے یہاں مراد وہ شخص ہے جو لوگوں کے کام دیکھتا ہے اور ان سے زبردستی کام کرائے۔ نُصَرِّفُ: "تَصْرِیْفٌ" سے بنا ہے جس سے مراد ہے ایک ہی چیز کو مختلف شکلوں میں ظاہر کرنا۔ دَرَسْتَ: تو نے پڑھا۔ درس کے معنیٰ ہیں پڑھنا، سیکھنا،

مدرسہ یعنی پڑھنے کی جگہ۔

تفسیر

قرآن مجید اللہ تعالیٰ نے دنیا میں بھیجا ہے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسے لے کر آئے ہیں، پچھلی آیتوں میں قرآن کریم کی حقیقت واضح طور پر کھول دی گئی ہے جو لوگ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے پر یقین رکھتے ہیں ان کیلئے اس کتاب سے بڑھ کر اس زندگی کے آرام حاصل کرنے کا طریقہ کہیں اور میسر نہیں ہوسکتا، اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی صفتیں بیان کی گئی ہیں تاکہ انسان اس کو اچھی طرح پہچان لے۔

فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ: جو شخص اللہ تعالیٰ کے ایک ہونے کو جانے اور مانے گا اس کا فائدہ اسی کی ذات کو پہنچے گا ایسا شخص اللہ تعالیٰ کے قرب کا حقدار ہوجائے گا۔

وَ مَنْ عَمِیَ فَعَلَیْهَا: جو اندھا بنا رہا نہ عقلی دلیل پر غور کیا اور نہ نقلی دلیل کو سمجھا یعنی اللہ تعالیٰ اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بات پر غور نہ کیا، اس نے ہر طرف سے آنکھیں بند کرلیں یعنی جس شخص نے دل ودماغ کو استعمال ہی نہ کیا وہ اللہ تعالیٰ کے ایک ہونے کو کیسے جان سکتا ہے؟ حقیقت میں ایسے شخص کا دل اندھا ہوچکا ہے جو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے خالی ہے، "سورۂ حج" میں اس کی وضاحت یوں فرمائی ہے کہ دراصل بات یہ ہے کہ یہ ظاہری آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ سینوں میں رکھے ہوئے دل اندھے ہوتے ہیں، عام طور پر علم، ایمان اور نیکی کے بارے میں دل اندھے ہوتے ہیں جب دل ہی اندھے ہوجائیں تو بصیرت کیسے آسکتی ہے؟ بصیرت تو غور وفکر، طلب اور جذبے کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے مگر جس شخص نے ان چیزوں کی طرف سے آنکھیں بند کررکھیں ہیں وہ حقیقت کو نہیں پاسکتا۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے پاس حق کے دیکھنے کے وسیلے اور ذریعے پہنچ چکے ہیں یعنی قرآن کریم آیا، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آئے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزات آئے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاق ومعاملات وتعلیمات سب کے

سامنے آئیں، یہ سب اسلام کی سچائی کے پہچاننے کے ذریعے ہیں۔

اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے کوئی سورج کی روشنی میں اپنی آنکھیں بند کر کے خود اندھا بن جائے ایسی صورت میں اسے کوئی چیز نظر نہیں آئے گی اور وہ ہر بھلائی سے محروم ہو کر رہ جائے گا، اسی لئے فرمایا کہ جو شخص خود اندھا بنا رہا تو اس کا وبال اسی کی ذات پر پڑے گا کسی دوسرے شخص کا کچھ نہیں جائے گا، ایسا شخص ایمان، نیکی اور بالآخر نجات سے محروم ہو جائے گا۔

اللہ تعالیٰ نے نیکی اور برائی کو اس طرح سمجھایا ہے کہ اگر انسان اچھے کام کرے گا تو ان کا فائدہ اسی کو پہنچے گا اور اگر برے کام کرے گا تو نقصان بھی خود ہی اٹھائے گا، ہر برے کام کا وبال برائی کرنے والے پر ہو گا نہ کہ کسی دوسرے شخص پر۔

وَ كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ وَ لِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ: اسی طرح ہم اپنی دلیلیں بدل بدل کر بیان کرتے ہیں، کبھی عقلی دلیلیں دیتے ہیں، کہیں پچھلی قوموں کے حالات بیان کر کے اور کبھی نیک آدمیوں کے واقعے سنا کر لوگوں کیلئے ترغیب کا انتظام کرتے ہیں اور بری قوموں اور برے لوگوں کے حالات بیان کر کے ڈرانے کی صورت پیدا کرتے ہیں غرضیکہ ہم اپنی آیتوں کو مختلف طریقوں سے بدل بدل کر بیان کرتے ہیں، ہماری یہ دلیلیں اس قدر مضبوط ہوتی ہیں کہ لوگ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ اے پیغمبر! یہ باتیں آپ نے کسی سے پڑھی ہیں، یہ اتنی مستند باتیں ہیں کہ کسی سے سیکھے بغیر حاصل نہیں ہو سکتیں، درس کا معنیٰ پڑھنا یا سیکھنا ہوتا ہے مگر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم تو اُمی تھے آپ نے کسی مدرسہ، سکول، کالج یا یونیورسٹی میں تو تعلیم حاصل نہیں کی تھی اور یہی آپ کی سچائی کی دلیل تھی، بے پڑھے ہونے کے باوجود ایسی حکمت کی باتیں اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ہی کر سکتے ہیں مگر وہ لوگ کہتے تھے کہ آپ کسی دوسرے شخص سے سیکھ کر آتے ہیں، یہودی اور عیسائی کہتے تھے کہ آپ "تورات انجیل" اور دوسری پرانی کتابوں سے یہ باتیں بیان کرتے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ تمام باتیں اللہ تعالیٰ آپ کو وحی کے ذریعے سکھاتے تھے، بعض اس لفظ کو "دَارَسْتَ" بھی پڑھتے ہیں جس کا معنیٰ مٹ جانا، مٹا دینا یا محو کر دینا ہوتا ہے، مطلب یہ کہ یہ

تو پرانی مٹی ہوئی باتیں ہیں، ہم ان کو پہلے بھی سنتے آئے ہیں، یہ محض قصے کہانیاں ہیں، مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اعتراض کرنے والوں کا یہ کہنا بھی اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم ان تک پہنچ گئے اور ان پر حجت پوری ہوگئی اب وہ انکار نہیں کرسکیں گے بہر حال فرمایا کہ ان دلیلوں کو بدل بدل کر بیان کرنے کا ایک مقصد تو یہ ہے کہ وہ لوگ کہیں کہ آپ نے یہ چیزیں کس سے سیکھی ہیں اور دوسری بات یہ ہے کہ تاکہ ہم واضح کردیں اس کو ان لوگوں کیلئے جو جانتے ہیں، جو لوگ عقلی اور نقلی دلیلوں کو دیکھ کر ایمان لے آتے ہیں ہم ان کی ایمان کی مضبوطی کیلئے ان دلیلوں کو بار بار بیان کرتے ہیں۔

وحی پر چلنے کا حکم

اِتَّبِعْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ وَ اَعْرِضْ
چلئے آپ اسپر　جو　وحی بھیجی گی　طرف آپکی　طرف سے رب آپکے کی　نہیں　کوئی معبود　سوا　اس کے　اور　منہ پھیر لیجئے

عَنِ الْمُشْرِكِیْنَ ﴿۱۰۶﴾ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكُوْا ؕ
سے　مشرکوں　(۱۰۶)　اور　اگر　چاہتا　اللہ　نہ　شرک کرتے وہ

بامحاورہ ترجمہ:۔ آپ اس پر چلئے جو آپ کے رب کی طرف سے آپ کو وحی آئے اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور آپ مشرکوں سے منہ پھیر لیجئے۔ (۱۰۶) اور اگر اللہ چاہتا تو وہ لوگ شرک نہ کرتے۔

لفظی تحقیق:۔ اِتَّبِعْ: پیروی کر۔ "تَبِعٌ" سے بنا ہے، "تَبِعٌ" کے معنٰی ہیں پیچھے پیچھے چلنا، اتباع کے معنٰی بھی یہی ہیں کہ کسی کے حکم اور طریقے پر چلنا۔ اَعْرِضْ: منہ پھیر لیجئے۔ "اَعْرَاضٌ، عَرْضٌ" سے ہے جس کے معنٰی کنارے کے ہیں، "اِعْرَاضٌ" کے اصل معنٰی ہیں ایک کنارے ہو جانا، کسی طرف سے کسی کے منہ پھیر لینے سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ شخص اس سے کنارہ کش ہے اس لئے اس کا ترجمہ منہ پھیر لیجئے کیا گیا ہے۔

تفسیر

ارشاد ہے کہ: اے ہمارے پیغمبر! ان کو کہنے دیجئے کہ کہ قرآن کریم آپ نے کسی سے سیکھ لیا ہے حقیقت تو یہی رہے گی کہ یہ قرآن کریم اس اللہ رب العزت کی کتاب ہے جو آپ کا رب ہے اور اس نے وحی کے ذریعے آپ کی طرف اتارا ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اس کے سوا کوئی نہیں جس کے سامنے اپنا عاجز ہونا ظاہر کیا جائے، کوئی نہیں جس کے سامنے انسان خادموں کی طرح ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو جس کے سامنے عاجزی کے ساتھ سر جھکائے ماتھا زمین پر ٹیکے ادب سے مسکینوں کی طرح بیٹھے، کوئی چیز مانگے، سوال کیلئے ہاتھ پھیلائے، ظاہر ہے کہ آپ کا یہ راستہ ان لوگوں سے الگ ہے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ اوروں کو بھی شریک کرتے ہیں ان سے مرادیں مانگتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ بھی ہمیں کچھ دے سکتے ہیں، یہ لوگ مشرک ہیں ان سے کنارہ کشی اختیار کر لیجئے، ان سے منہ پھیر لیجئے اور ان سے کوئی سروکار نہ رکھیئے اور یوں سمجھ لیجئے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں انسان کو زبردستی سیدھے راستے پر چلانے کا قاعدہ نہیں ہے اس نے اپنے علم و حکمت سے انسان کیلئے یہ طریقہ مقرر کیا ہے کہ دنیا میں اپنے پیغمبر بھیج دیئے، اپنی کتاب بھیج دی، کتاب میں سارے حکم کھول کر رکھ دیئے اور انسان کو اختیار دے دیا کہ اپنی عقل کو کام میں لائے، اللہ تعالیٰ کی کتاب سنے، اس کے پیغمبروں کے ذریعے اس پر عمل کرنے کا طریقہ سیکھے اور پھر اپنے ارادہ و اختیار سے اس طریقہ پر چلے، اللہ تعالیٰ چاہتے تو سب کو زبردستی مسلمان بنا دیتے لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔

اس آیت میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت ہے کہ آپ یہ نہ دیکھئے کہ کون مانتا ہے اور کون نہیں مانتا، آپ خود اس طریقے پر چلتے رہیے جس طریقہ پر چلنے کیلئے آپ کے پاس آپ کے رب کی طرف سے وحی اتری ہے جس میں بڑی چیز یہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، نیز: اس وحی میں تبلیغ کا حکم بھی داخل ہے اس پر قائم رہئے، مشرکوں کی طرف خیال نہ کیجئے کہ افسوس! انہوں نے کیوں اسلام قبول نہ کیا؟

زبردستی نہیں ہے

وَ مَا جَعَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۚ وَ مَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ﴿۱۰۷﴾

اور نہیں بنایا ہم نے آپ کو اوپران کے نگران اور نہیں ہیں آپ اوپران کے زبردستی مُسلّط (۱۰۷)

بامحاورہ ترجمہ:۔ ہم نے آپ کو ان پر نگہبان مقرر نہیں کیا اور آپ ان پر ذمہ دار نہیں ہیں۔ (۱۰۷)

لفظی تحقیق: وَكِيْلٌ: اس سے مراد یہاں وہ شخص ہے جو دوسروں سے زبردستی کام لینے کیلئے مسلط کیا گیا ہو۔

تفسیر

ارشاد ہے کہ: اے ہمارے پیغمبر! ہم نے آپ کو ان پر نگران اور چوکیدار مقرر نہیں کیا ہے کہ ہر وقت ان کو دیکھتے رہیں اور کسی کو غلط راستہ پر نہ چلنے دیں، آپ کا کام صرف ہماری آیتوں کو ان کے سامنے کھول کر بیان کر دینا ہے اور ان کے مطابق عمل کرنے کا طریقہ مقرر کر دینا ہے اور جو آپ کی بات مان کر آپ کے مقرر کیے ہوئے طریقہ پر اپنی رضامندی اور خوشی سے چلنا چاہیں ان کی رہنمائی کرنا ہے، آپ کو ان کی کوئی فکر نہیں ہونی چاہیے، جو شرک ہی کرنے پر تلے ہوئے ہیں اور آپ کی بات نہیں سنتے، حقیقت یہ ہے کہ اس آیت میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ اگر یہ لوگ ایمان نہ لائیں تو آپ غمگین نہ ہوں اور آپ اس کے ذمہ دار نہیں ٹھہرائے جائیں گے۔

رواداری کی تعلیم

وَ لَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ

اور نہ گالی دو ان کو جنہیں یہ پکارتے ہیں سے سوا اللہ کے پس وہ گالیاں دینگے اللہ کو

عَدْوًاۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ

حد سے آگے بڑھ کر بغیر سمجھے بوجھے

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور جن کی یہ لوگ اللہ کے سوا پوجا کرتے ہیں تم لوگ ان کو برا نہ کہو پس وہ اللہ کو حد سے آگے بڑھ کر بغیر سمجھے بوجھے برا کہنے لگیں گے۔

لفظی تحقیق: لَا تَسُبُّوْا: مت برا کہو۔ "سَبٌّ" کے معنٰی ہیں گالیاں دینا، برا کہنا، حقارت کرنا۔ عَدْوًا: بے ادبی سے: اس کے معنٰی ہیں مناسب حد سے آگے نکل جانا، اس سے مراد یہاں بے ادبی اور گستاخی ہے۔

تفسیر

اس آیت میں ارشاد ہے کہ اے مسلمانو! لوگوں کے معبودوں کو خواہ وہ کوئی بھی ہو برا نہ کہو، انہیں گالیاں نہ دو کیونکہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ بھی جوش میں آ کر بے سمجھے بوجھے تمہارے معبود، یعنی: اللہ عزوجل کے ساتھ بے ادبی سے پیش آئیں گے، گستاخی سے اس کو نعوذ باللہ گالیاں دینی شروع کر دیں گے، اس قسم کا جوش بالکل فطری ہے جیسا کہ آگے آتا ہے، یہ وہ سنہری اصول ہے جس کو مضبوطی کے ساتھ گرہ میں باندھ لینا چاہئے، اس کا خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ اگر کسی کو یا کسی کے عزیز یا بزرگ کو گالیاں دو گے تو وہ تمہیں اور تمہارے عزیزوں اور بزرگوں کو گالیاں دے گا اس لئے اپنی زبان کو قابو میں رکھو کہ تمہاری کسی بات سے دوسروں کی توہین نہ ہو ورنہ وہ تمہاری توہین کرے گا۔

آیت کا شان نزول ابن جریرؒ کی روایت کے مطابق یہ ہے کہ جب پیغمبر ﷺ کے چچا ابو طالب کی وفات کے وقت قریش کے مشرک سردار جو پیغمبر ﷺ کی دشمنی اور تکلیف پہنچانے میں لگے ہوئے تھے اور قتل کی سازشیں کرتے رہتے تھے ان کو یہ فکر ہوئی کہ ابو طالب کی وفات ہمارے لئے ایک مشکل مسئلہ بن جائے گی کیونکہ ان کے بعد اگر ہم محمد (ﷺ) کو قتل کریں تو یہ ہماری عزت و شرافت کے خلاف ہوگا کہ لوگ کہیں گے کہ

ابوطالب کے سامنے تو ان کا کچھ بگاڑ نہ سکے، ان کی موت کے بعد اکیلا پا کر قتل کر دیا اس لئے اب وقت ہے کہ ہم مل کر خود ابوطالب ہی سے کوئی فیصلہ کن بات کر لیں۔

یہ بات تقریباً ہر لکھا پڑھا مسلمان جانتا ہے کہ ابوطالب اگرچہ مسلمان نہیں ہوئے تھے لیکن پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صرف محبت بھتیجا ہونے کی وجہ سے ان کے دل میں جمی ہوئی تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دشمنوں کے مقابلہ میں سینہ تانے ہوئے تھے، چند قریشی سرداروں نے یہ مشورہ کر کے ابوطالب کے پاس جانے کیلئے ایک وفد تیار کیا جس میں ابوسفیان، ابوجہل، عمرو بن عاص وغیرہ قریشی سردار شامل تھے، ابوطالب سے اس وفد کی ملاقات کیلئے وقت لینے کا کام ایک شخص مطلب نامی کے سپرد ہوا اس نے ابوطالب سے اجازت لے کر اس وفد کو وہاں پہنچایا۔

وفد نے ابوطالب سے کہا کہ آپ ہمارے بڑے اور سردار ہیں اور آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے بھتیجے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہمیں اور ہمارے معبودوں کو سخت تکلیفیں پہنچا رکھی ہیں، ہم چاہتے ہیں کہ آپ ان کو بلا کر سمجھا دیں کہ وہ ہمارے معبودوں کو برا نہ کہیں تو ہم اس پر صلح کر لیں گے کہ وہ اپنے دین پر جس طرح چاہیں عمل کریں جس کو چاہیں معبود بنائیں ہم ان کو کچھ نہ کہیں گے، ابوطالب نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے پاس بلایا اور کہا کہ یہ آپ کی برادری کے سردار آئے ہیں، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس وفد سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ آپ لوگ کیا چاہتے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ ہماری خواہش یہ ہے کہ آپ ہمیں اور ہمارے معبودوں کو برا بھلا نہ کہیں اور ہم آپ کو اور آپ کے معبود کو برا بھلا نہ کہیں گے اس طرح آپس کی مخالفت ختم ہو جائے گی۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: اچھا یہ بتلاؤ کہ اگر میں تمہاری یہ بات مان لوں تو کیا تم ایک ایسا کلمہ کہنے کیلئے تیار ہو جاؤ گے جس کے کہنے سے تم سارے عرب کے مالک ہو جاؤ گے اور عجم کے لوگ بھی تمہارے پیروکار بن جائیں گے، ابوجہل نے کہا کہ ہم ایسا کلمہ ایک نہیں دس کہنے کیلئے تیار ہیں، بتلائیے وہ کیا ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" یہ سنتے ہی سب غضبناک ہو گئے، ابوطالب نے بھی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا کہ میرے بھتیجے اس کلمہ کے سوا کوئی اور بات کہو کیونکہ آپ کی قوم اس کلمہ سے گھبرا گئی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: چچا جان!

میں تو اس کلمہ کے سوا کوئی دوسرا کلمہ نہیں کہہ سکتا اگر وہ آسمان سے سورج کو اتار لائیں اور میرے ہاتھ میں رکھ دیں جب بھی میں اس کلمہ کے سوا کوئی دوسرا ہرگز نہ کہوں گا، مقصود یہ تھا کہ ان کو مایوس کر دیں۔

اس بات کی وجہ سے یہ لوگ ناراض ہو کر کہنے لگے یا تو آپ ہمارے معبودوں (بتوں) کو برا کہنے سے باز آجایئے ورنہ ہم آپ کو بھی گالیاں دیں گے اور اس ذات کو بھی جس کا آپ اپنے آپ کو پیغمبر بتلاتے ہیں، اس پر یہ آیت اتری "وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ" یعنی آپ ان بتوں کو برا نہ کہیں جن کو ان لوگوں نے خدا بنا رکھا ہے جس کے نتیجے میں وہ اللہ تعالیٰ کو برا کہنے لگیں گے۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو اپنے اخلاق کی بناء پر پہلے ہی اس کے پابند تھے کبھی بچپن میں بھی کسی انسان بلکہ جانور کیلئے بھی گالی کا لفظ آپ کی زبان مبارک پر جاری نہیں ہوا ممکن ہے بعض صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی زبان سے کبھی کوئی سخت کلمہ نکل گیا ہو جس کو مکہ مکرمہ کے مشرکوں نے گالی سمجھ لیا ہو اور قریشی سرداروں کے اس وفد نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے اس معاملہ کو رکھ کر یہ اعلان کر دیا کہ آپ ہمارے بتوں کو گالی دینے سے باز نہ آئیں گے تو ہم آپ کے خدا کو گالی دیں گے۔

اس پر یہ قرآنی حکم اترا کہ جس کے ذریعے مسلمانوں کو روک دیا گیا کہ وہ مشرکوں کے خود کے گھڑے ہوئے خداؤں کے متعلق کوئی سخت کلمہ نہ کہا کریں اس آیت میں یہ بات خاص طور سے قابل غور ہے کہ اس سے پہلی آیت میں خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو براہِ راست کہا جا رہا تھا مثلاً: ارشاد ہے "اِتَّبِعْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ" اور "اَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ" اور "مَا جَعَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا" اور "مَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ" ان تمام آیتوں میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مخاطب تھے کہ آپ ایسا نہ کریں، اس کے بعد اس آیت میں کلام کا انداز پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پھیر کر عام مسلمانوں کی طرف کر دیا گیا، اس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تو کبھی کسی کو گالی دی ہی نہیں تھی ان کو براہِ راست اس کلام کا مخاطب بنانا ان کی دل شکنی کا سبب بن سکتا تھا۔

کسی گناہ کا سبب بننا بھی گناہ ہے

اس آیت سے ایک اصول یہ نکل آیا کہ جو کام اپنی ذات کے اعتبار سے جائز بلکہ کسی درجہ میں پسندیدہ بھی ہو مگر اس کے کرنے سے کوئی فساد ہو سکتا ہو یا اس کے نتیجہ میں لوگ گناہ میں مبتلا ہوتے ہوں وہ کام بھی منع ہو جاتا ہے کیونکہ خود کے بنائے ہوئے معبودوں کو برا کہنا کم از کم جائز تو ضرور ہے اور ایمانی غیرت کے تقاضہ سے کہا جائے تو شاید اپنی ذات میں ثواب بھی ہو چونکہ اس کے نتیجہ میں یہ اندیشہ ہو گیا کہ لوگ اللہ جل شانہٗ کو برا کہیں گے تو بتوں کو برا کہنے والے اس برائی کا سبب بن جائیں گے اس لئے اس جائز کام کو بھی منع کر دیا گیا۔

اس کی ایک اور مثال بھی حدیث میں اس طرح آئی ہے کہ پیغمبر ﷺ نے صحابہ کرام کو فرمایا کہ: کوئی شخص اپنے ماں باپ کو گالی نہ دے، صحابہ کرام نے عرض کیا، اے پیغمبر! یہ تو کسی شخص سے ممکن ہی نہیں کہ اپنے ماں باپ کو گالی دے، فرمایا کہ ہاں انسان خود تو ان کو گالی نہیں دیتا لیکن جب وہ کسی دوسرے شخص کے ماں باپ کو گالی دے اور اس کے نتیجے میں وہ دوسرا اس کے ماں باپ کو گالی دے تو اس گالی دلوانے کا سبب یہ بیٹا بنا تو یہ بھی ایسا ہی ہے جیسے اس نے خود گالی دی ہو۔

اسی معاملہ کی ایک دوسری مثال پیغمبر ﷺ کے زمانے میں یہ پیش آئی کہ پیغمبر ﷺ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ: بیت اللہ شریف جاہلیت کے زمانے میں طوفان کے آنے سے گر گیا تھا تو مکہ کے قریشیوں نے پیغمبر اور پیغمبری سے پہلے اس کی تعمیر کرائی اس تعمیر میں چند چیزیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعمیر کے خلاف ہو گئیں ایک تو یہ کہ جس حصہ کو "حطیم" کہا جاتا ہے یہ بھی بیت اللہ کا حصہ ہے، تعمیر میں اس کو سرمایہ کم ہونے کی بناء پر چھوڑ دیا، دوسرے بیت اللہ شریف کے دو دروازے مشرقی اور مغربی تھے ایک داخل ہونے کیلئے دوسرا باہر نکلنے کیلئے، جاہلیت کے دور کے لوگوں نے مغربی دروازہ بند کر کے صرف ایک کر دیا اور وہ بھی زمین کی سطح سے بلند کر دیا تا کہ سیڑھی کے ذریعے بیت اللہ شریف میں داخلہ صرف ان کی مرضی واجازت سے ہو سکے، اور سیڑھی ان کے قبضے میں رہے، ہر شخص بے روک ٹوک نہ جا سکے، پیغمبر ﷺ نے فرمایا کہ: میرا دل چاہتا ہے کہ بیت اللہ کی

موجودہ تعمیر کو گرا کر کے حضرت خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعمیر کے بالکل مطابق بنادوں مگر خطرہ یہ ہے کہ تمہاری قوم یعنی عرب ابھی ابھی مسلمان ہوئے ہیں، بیت اللہ کو گرانے سے کہیں ان کے دلوں میں کچھ شبہات نہ پیدا ہو جائیں اس لئے میں نے اپنے ارادے کو چھوڑ دیا۔

ظاہر ہے کہ بیت اللہ کی تعمیر کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعمیر کے مطابق بنانا ایک ثواب کا کام تھا مگر اس پر لوگوں کی ناواقفیت کے سبب ایک خطرہ دیکھ کر آپ نے اس ارادہ کو چھوڑ دیا اس واقعہ سے بھی یہی اصول معلوم ہوا کہ اگر کسی جائز بلکہ ثواب کے کام پر کوئی فساد ہو سکتا ہو تو وہ جائز کام بھی منع ہو جاتا ہے۔

ہر ایک کو اپنا اپنا طریقہ پسند ہے

كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ مَّرْجِعُهُمْ

اسی طرح آراستہ کیا ہم نے لئے ہر ایک کے ایک فرقے کاموں اس کے کو پھر طرف رب انکے کی لوٹنا ہے ان کو

فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۰۸﴾

پس بتادے گا انکو جو تھے وہ کرتے (۱۰۸)

با محاورہ ترجمہ:۔ اسی طرح ہم نے ہر ایک فرقے کی نظر میں ان کے عملوں کو خوبصورت بنادیا پھر ان سب کو اپنے رب کے پاس پہنچنا ہے تب وہ ان کو جتلا دیں گے جو کچھ وہ کرتے تھے۔ (۱۰۸)

لفظی تحقیق: زَيَّنَّا: ہم نے خوبصورت بنادیا۔ خوبی، صفائی، ستھرائی، تزیین، کسی کا بناؤ سنگھار کر کے اس کو خوبصورت اور پسندیدہ بنا دینا خواہ وہ حقیقت میں خوبصورت نہ ہو۔ اُمَّةٍ: امت: آدمیوں کا وہ گروہ ہے جن کے نظریات ایک ہوں خواہ وہ ایک ملک میں ہوں یا مختلف ملکوں میں۔

تفسیر

پچھلی آیت میں کہا گیا ہے کہ کسی کے معبودوں کو گالی نہ دو ورنہ وہ جوش میں آجائے گا اور بے سوچے سمجھے

اللہ تعالیٰ کو جو تمہارا واحد معبود ہے گالیاں دینے لگے گا، اس کی وجہ اس آیت میں بیان کی گئی ہے، ارشاد ہے کہ دنیا میں ہم نے طریقہ ہی یہ رکھا ہے کہ ہر امت اپنے ہی طور طریقوں کو پسند کرتی ہے اور اپنی اختیار کی ہوئی عادتیں آسانی سے نہیں چھوڑتی اس لئے امید رکھنا کہ وہ تم کو اپنے سے بہتر اور افضل مان لیں گے، فضول ہے، دنیا میں اس کے بغیر چارہ نہیں کہ ہر ایک کو اس کے حال پر چھوڑا جائے اور اپنے طور طریقوں سے اپنے آپ کو سب سے اچھا بنا کر دکھایا جائے، اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے سب کو قائم رکھنے اور پالنے کا ذمہ لیا ہے اور وہ سب کا رب ہے، ہاں! مرنے کے بعد ان سب کو اپنے رب کے سامنے جا کر جمع ہونا ہے وہاں وہ اس کا فیصلہ فرمادیں گے کہ کون اچھا ہے اور کون برا۔

مسلمانوں کو اس آیت میں دنیا کے اندر رہنے کا طریقہ ایسی اچھی طرح سمجھایا ہے کہ کوئی کیا سمجھائے گا، جس زمانے میں مسلمانوں کو بری طرح ستایا جا رہا تھا اور اس میں کوئی کسر نہیں چھوڑی جا رہی تھی، قرآن مجید ان کو تحمل اور بردباری کا سبق سکھا رہا ہے۔

ہمیں اس سبق سے آج اور بھی زیادہ کام لینے کی ضرورت ہے کیونکہ مسلمانوں کو اس زمانے میں جس قدر برداشت اور رواداری سے کام لینا چاہئے وہ ان میں نظر نہیں آتی، غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ ہمارے پچھلے طور طریقوں نے ہم کو خاص طور پر آج کل طعن و تشنیع کا نشانہ بنا رکھا ہے اس لئے اس پر بگڑنے کے بجائے اپنے آپ کو سنوارنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

نہ ماننے کے سو بہانے

وَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا ؕ

اور قسم کھائی انہوں نے | اللہ کی | زور کی | قسم انکی | البتہ اگر | آئے ان کے پاس | کوئی نشانی | تو وہ ضرور ایمان لائینگے | پر اس

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور تاکید سے اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ اگر ان کے پاس کوئی نشانی آئے تو اس پر

ضرور ایمان لائیں گے۔

لفظی تحقیق: جَهْدَ: سخت کوشش۔ اَيْمَانِ: قسمیں: "يَمِيْنٌ" کی جمع ہے، قسم کو کہتے ہیں۔ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ: اپنی قسموں میں سے بڑی سخت قسم، یہ لوگ مشرک تھے مگر اللہ تعالیٰ کو سب سے بڑا مانتے تھے اور اللہ تعالیٰ کی قسم ان کے ہاں سب سے بڑی سخت قسم سمجھی جاتی تھی۔

تفسیر

اس سے پہلی آیت میں مسلمانوں کو صبر و تحمل سے کام لینے کو کہا گیا تھا تا کہ کافر لوگ ان کی بدزبانی سے بھڑک نہ اٹھیں اور کہنے لگیں کہ مسلمان تو منہ پھٹ اور بداخلاق لوگ ہیں، ان کی بات ماننے کے قابل نہیں، احتیاط سے کام لینے کی اس لئے اور بھی ضرورت ہے کہ دنیا میں ہر ایک کو اپنا ہی طریقہ بھلا لگتا ہے پرانی عادتوں کو انسان مشکل سے چھوڑتا ہے اور اس کو نہ چھوڑنے کے اسے ہزاروں بہانے مل جاتے ہیں، اس لئے تم اپنی بدزبانی سے ایک اور بہانہ ان کیلئے پیدا نہ کرو۔

مکہ کے مشرک پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے اور آپ سے کہتے کہ تم کہتے ہو کہ (حضرت) موسیٰ (علیہ السلام) لاٹھی کو اژدہا بنا دیتے تھے، (حضرت) عیسیٰ (علیہ السلام) مردوں کو زندہ کر دیتے تھے، مٹی کے جانور بنا کر اپنی پھونک سے انہیں زندہ کر دیتے تھے اور بھی معجزے بہت سے پیغمبروں کے بیان کرتے ہو، تم بھی کوئی ایسی ہی صاف نشانی اپنی پیغمبری کی لاؤ، آپ نے دریافت فرمایا کہ تم کیا نشانی چاہتے ہو؟ کہنے لگے اور کچھ نہیں تو اس صفا پہاڑ کو سونے کا کر دو، آپ نے فرمایا: اگر یہ پہاڑ سونے کا ہو گیا تو تم ایمان لے آؤ گے؟ انہوں نے کہا کہ ہم بڑے زور کی قسم کھاتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئیں گے، آپ نے چاہا کہ دعا کریں اور مسلمانوں نے بھی آپ سے درخواست کی کہ دعا فرمائیے، اگر اسی طرح ان کو ہدایت نصیب ہو جائے تو مطلب حاصل ہو جائے گا، اس پر یہ آیت اتری، ارشاد ہے کہ یہ مشرک لوگ بڑے زور کی قسم کھا رہے ہیں کہ اللہ کی قسم اگر ہمارے پاس ایسی کھلی نشانی آ گئی، مثلاً:

صفا پہاڑ سونے کا ہو گیا تو ہم ایمان لے آئیں گے اور ہم سچ کہتے ہیں کہ ہم تمہیں سچا پیغمبر مان لیں گے، بھلا ایسی کھلی نشانی کون جھٹلا سکتا ہے؟

اس سورۃ کے شروع میں بھی اس کا ذکر آ چکا ہے کہ مکہ کے مشرک کوئی ایسی نشانی مانگتے تھے جس کا انکار کسی سے نہ ہو سکے اور یہ سب بہانہ بازیاں تھیں، یہاں ان بہانہ بازیوں کی فطری وجہ بتائی گئی ہے جس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ نہ ماننے کیلئے طرح طرح کے بہانے کیوں ڈھونڈتے ہیں وجہ صرف یہ ہے کہ ان کی طبیعت خراب رسموں کی عادی ہو گئی ہے اور وہ انہیں سب سے اچھی معلوم ہوتی ہے۔

نشانیاں دیکھ کر بھی نہ مانیں گے

قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَ مَا يُشْعِرُكُمْ ۙ اَنَّهَآ اِذَا

آپ کہہ دیجئے بات یہ ہے کہ نشانیاں پاس اللہ کے اور کس نے بتایا تم کو کہ وہ جب

جَآءَتْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۹﴾

آئیں نہ یہ ایمان لائیں (۱۰۹)

بامحاورہ ترجمہ:۔ آپ کہہ دیجئے کہ نشانیاں تو اللہ کے پاس ہیں مگر اے مسلمانو! تم کو کیا خبر ہے کہ نشانیاں آئیں تو یہ ایمان لے ہی آئیں گے۔ (۱۰۹)

تفسیر

مشرک پہلے پیغمبروں کے معجزے اور نشانیاں سن سن کر ٹالنے کیلئے کہہ دیا کرتے ہیں کہ کوئی انوکھی نشانی آئے، مثلاً: یہ صفا پہاڑ سونے کا ہو جائے تو ہم ضرور ایمان لے آئیں گے، اس کا جواب اسی سورۃ میں گزر چکا ہے کہ ہمیں اس طریقے سے ان کا ایماندار بنانا منظور نہیں، ہم نے اپنی نشانیاں پہلے ہی ان کے پاس بھیج دی ہیں اور ان کے سمجھنے کی ان کو کافی عقل دیدی ہے اور اسی عقل کا امتحان منظور ہے کہ دیکھیں یہ ان نشانیوں کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ کو

پہچانتے ہیں یا نہیں، یہاں اسی بارے میں کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں نشانیوں کی کیا کمی ہے اگر اس کے پاس نشانیاں نہ ہوں گی تو پھر کس کے پاس ہوں گی؟

ارشاد ہے کہ اے پیغمبر! آپ ان کے کہنے سے دعا مانگنے کیلئے تیار ہو گئے کہ یہ پہاڑ سونے کا ہو جائے، مسلمان بھی ان کا کہنا ٹھیک سمجھنے لگے کہ اگر یہ پہاڑ سونے کا ہو گیا تو یہ ضرور ایمان لے آئیں گے، آخر ایسی زبردست پکی قسم کھا رہے ہیں اس سے کیا پھریں گے لیکن تمہیں سمجھ لینا چاہئے کہ ایسی نشانیوں کے آنے کے بعد اگر یہ ایمان نہ لائے تو مقررہ قاعدے کے مطابق اللہ تعالیٰ کا عذاب ضرور آئیگا اور یہ لوگ اپنے پرانے رسم ورواج کی محبت میں ایسے پھنسے ہوئے ہیں کہ یہ اس سے نکلتے نہیں معلوم ہوتے، اس کے بعد نہ ماننے کا کوئی اور بہانہ تلاش کریں گے اس لئے ان سے کہہ دیجئے کہ جتنی نشانیاں تم کہو اللہ تعالیٰ کے پاس موجود ہیں اور اسی کے پاس ہو بھی سکتی ہیں لیکن اس کے بعد نہ مانا تو کہیں کے نہ رہو گے اور اے مسلمانو! تمہیں کیا خبر کہ نشانیاں آنے کے بعد یہ ضرور ہی ایمان لے آئیں گے، جن پرانے طریقوں پر یہ قائم ہیں ان کی محبت ان کے دل میں گھر کر چکی ہے اور ان کی وجہ سے انہیں دنیا کے بہت سے فائدے پہنچ رہے ہیں، نشانیاں مانگنا تو ایک بہانہ ہے اور قسمیں بھی اس لئے کھا رہے ہیں کہ انہیں اللہ تعالیٰ کی قدرت کا اندازہ نہیں اور ایسی نشانیوں کو جیسے سارا پہاڑ سونے کا ہو جانا یہ ناممکن سمجھے ہوئے ہیں اس لئے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ایسی زبردست نشانی دیکھ کر ایمان ضرور لے ہی آئیں گے بلکہ ان کے لچھن تو یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ اسے جادو وغیرہ کہہ کر ٹال دیں گے اور پھر اپنے ہی مشرکانہ طریقوں پر جمے رہنے کیلئے کوئی اور بہانہ کھڑا کر دیں گے۔

بیشک نشانی ظاہر کرنا تو اللہ تعالیٰ کی مرضی پر منحصر ہے اس نے اس سے پہلے سینکڑوں معجزے ظاہر کیے ہیں مگر فرمائشیں پوری نہیں فرمائی ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ اس بات کے پابند نہیں ہیں کہ ہر خواہشمند کی خواہش کے مطابق نشانی ظاہر کر دیں البتہ وہ اپنی حکمت کے مطابق جب ضرورت ہوتی ہے کوئی نہ کوئی معجزہ ظاہر فرما دیتے ہیں۔

یہاں سے معلوم ہوا کہ دنیا کی بناوٹ ہی ایسی ہے کہ اس میں مؤمن، کافر، مشرک سبھی رہیں گے اور ساتھ

ہی ایسی نشانیاں بھی رہیں گی جنہیں دیکھ کر عقلمند اسلام کا راستہ اختیار کر لیں گے۔

ان آیتوں سے مسلمانوں کو مطمئن کرنے کیلئے یہ بتلا دیا گیا کہ اگر ہم ان کے مانگے ہوئے معجزوں کو بھی بالکل کھلے اور واضح طور پر ظاہر کر دیں تو یہ جب بھی ایمان نہ لائیں گے کیونکہ ان کا انکار کسی غلط فہمی یا ناواقفیت کی وجہ سے نہیں بلکہ ضد اور ہٹ دھرمی سے ہے جس کا علاج کسی معجزہ سے نہیں ہوا کرتا۔

پہلی ضد انہیں اب بھی روکے گی

وَ نُقَلِّبُ اَفۡـِٕدَتَهُمۡ وَ اَبۡصَارَهُمۡ كَمَا لَمۡ يُؤۡمِنُوۡا بِهٖۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ

اور ہم پلٹ دیں گے دل ان کے اور آنکھیں ان کی جیسے نہیں ایمان لائے وہ پر اس پہلی بار

ع ۱۳ ۱۰ ۱۹ وَّ نَذَرُهُمۡ فِىۡ طُغۡيَانِهِمۡ يَعۡمَهُوۡنَ ۝۱۱۰

اور چھوڑ دینگے ہم انکو میں سرکشی ان کی بھٹکے ہوئے (۱۱۰)

بامحاورہ ترجمہ: اور ہم ان کے دل اور ان کی آنکھیں الٹ دیں گے جیسے کہ نشانیوں پر پہلی بار ایمان نہیں لائے اور ہم ان کو ان کی سرکشی میں بھٹکتے ہوئے چھوڑے رکھیں گے۔(۱۱۰)

لفظی تحقیق: اَفۡـِٕدَةٌ: دل: "فَوَادٌ" کی جمع ہے، "فُؤادٌ" دل کو کہتے ہیں۔ یَعۡمَهُوۡنَ: بھٹکتے ہوئے: "عَمَهٌ" کے معنٰی ہیں کبھی اِدھر کبھی اُدھر جانا، بھٹکنا۔

تفسیر

دنیا کیلئے اللہ تعالیٰ نے مضبوط قاعدے مقرر کر دیئے ہیں اور وہ انہی قاعدوں کے مطابق چل رہی ہے کوئی چیز ان قاعدوں سے باہر نہیں جا سکتی، یہ قاعدے اللہ تعالیٰ ہی کے مقرر کیے ہوئے ہیں اس لئے اس کے مطابق جو کام بھی ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے بارے میں یہ فرماتے ہیں کہ یہ میں نے کیا ہے، یعنی: قرآن کریم میں اسے اس طرح کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کیا، مثلاً: انسان کے دل پر بہت سی چیزوں کا اثر پڑتا ہے اور ایک دفعہ جس چیز

کا گہرا اثر پڑ جائے تو پھر وہ مشکل سے جاتا ہے، انسان کوئی کام کرے تو اس کا اثر دل قبول کرے گا لیکن پہلے وہ ہلکا ہوگا اب اگر اس کام کو چھوڑ دیا تو وہ اثر جاتا رہے گا لیکن اگر پھر کیا تو اس کا اثر پہلے کے اثر کے ساتھ مل کر اور گہرا ہو جائے گا اور اگر کرتا ہی رہا تو اثر گہرے سے گہرا ہوتا چلا جائے گا، اب اگر یہ کام اچھا ہے تو اس کا اثر بار بار کرنے سے جتنا بھی گہرا ہوگا اتنا ہی فائدہ مند ہوگا اور اگر برا ہے اور اس کو نہ چھوڑا تو اس کا اثر بھی ہر دفعہ گہرا ہوتا چلا جائے گا اور جتنا گہرا ہوگا اتنا ہی نقصان دہ ہوگا۔

مکہ کے مشرکوں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو شروع ہی سے اللہ کا پیغمبر نہ مانا اور آپ کا کہنا ماننے سے انکار کر دیا اور قرآن کریم اترا تو اس کی آیتوں کا انکار کر دیا، اس انکار کا اثر جو ان کے دل پر ہوا ان کا نام کفر ہے، انکار روز بروز بڑھتا گیا، نشانیوں پر نشانیاں آئیں، آیتوں پر آیتیں اترتی رہیں لیکن ان کا انکار بڑھتا گیا اس لئے ان کا کفر گہرا ہوتا گیا یہاں تک کہ سارے دل کو ڈھانک لیا گویا مہر لگ گئی، اور یہ سب اسی قاعدے کے مطابق ہوا کہ ایک چیز کے بار بار کرنے سے اس کا اثر دل پر گہرا ہوتا چلا جاتا ہے، یہ قاعدہ اللہ تعالیٰ کا مقرر کیا ہوا ہے اس لئے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے، اس آیت میں کہا گیا ہے کہ ہم ان کے دل پھیر دیں گے اور آنکھیں الٹ دیں گے کیونکہ انہوں نے شروع میں انکار کر دیا اور پھر برابر انکار کرتے چلے گئے، ارشاد ہے کہ ان کی پہلی ضد اور ہٹ دھرمی کے برابر جاری رہنے کا اور ایمان کے برابر انکار کرتے رہنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اب جو بھی آیت یا نشانی آئے گی اس کا انکار ہی کریں گے اور چونکہ انکار کا اثر بار بار کرتے کرتے گہرا ہو چکا ہے اس لئے ہم آئندہ نشانی آنے پر بھی ان کے دل اور آنکھیں اُلٹ دیں گے اور وہ نہ کچھ سمجھ سکیں گے اور نہ دیکھ سکیں گے، اب ان کا یہ حال ہوگا کہ سرکشی اور ضد بڑھتی جائے گی اس کے اثر سے دل سیاہ ہوتا چلا جائے گا اور وہ اس کے اندر بھٹکتے پھریں گے۔

انوکھی نشانیوں کا مطالبہ

وَ لَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَ كَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَ حَشَرْنَا

اور اگر بیشک ہم اتاریں ہم طرف ان کی فرشتے اور باتیں کریں ان سے مردے اور جمع کردیں ہم

عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ

پر ان ہر چیز آمنے سامنے نہیں ہیں وہ کہ ایمان لائیں مگر یہ کہ چاہے اللہ

وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

اور لیکن بہت سے ان میں سے نادانی کرتے ہیں (۱۱۱)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور اگر ہم ان پر فرشتے اتاریں اور ان سے مردے باتیں کریں اور ہم ہر چیز کو ان کے سامنے جمع کردیں تو بھی یہ لوگ ہرگز ایمان لانے والے نہیں مگر یہ کہ اللہ چاہے، لیکن اکثر ان میں نادانی کرتے ہیں۔ (۱۱۱)

تفسیر

پچھلی آیتوں میں جو کچھ کہا گیا تھا اس آیت میں اس کا خلاصہ دیا گیا ہے، مشرک لوگ ایمان لانا تو چاہتے ہی نہ تھے صرف یہ چاہتے تھے کہ کسی طرح پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو لاجواب کردیں اور انہی پر سارا الزام رکھ کر سستے میں چھوٹ جائیں اس لئے وہ ایسی نشانیاں مانگتے تھے جن کا لانا ان کے نزدیک مشکل نظر آتا تھا، قرآن مجید میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات مختلف طور پر سمجھائی گئی ہے کہ آپ کا کام عجیب وغریب نشانیاں دکھانا نہیں ہے۔

قرآن مجید جو دین پیش کرتا ہے کوئی گھڑا ہوا زبردستی کا دین نہیں، یہ وہ راستہ ہے جس کی بات کو انسانی کی عقل ذرا سی توجہ سے سمجھ سکتی ہے کہ واقعی انسان کی بہتری کیلئے یہی راستہ درست ہے؛ جب تک انسان کا علم اس

کی عقل کی رہنمائی کیلئے نہ تھا، ان کو معجزے دکھا کر صحیح دین کی طرف بلایا جاتا تھا لیکن اب جبکہ انسان کا علم کافی ترقی کر گیا ہے اور آگے اور بھی ترقی کی امید ہے، انسان کی عقل اس کی روشنی میں اپنے بھلے اور برے میں اچھی طرح فرق کر سکتی ہے اس لئے لوگوں سے کہا گیا کہ قرآن مجید کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق غور کرو اس میں تمہارے لئے سچائی کے پہچاننے کی کافی نشانیاں موجود ہیں، اب دین کو سمجھنے کیلئے کسی عجیب وغریب کرشمے دکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔

ارشاد ہے کہ اگر ہم ان کے پاس فرشتے بھیجتے ہیں یا مردوں کی ان سے باتیں کرا دیتے ہیں یا تمام اگلی پچھلی امتوں اور چیزوں کو ان کے سامنے لا کھڑا کر دیتے تو بھی وہ ایسے ضدی ہیں کہ ایمان نہ لاتے، اللہ تعالیٰ کو تو یہ منظور ہے کہ لوگ انوکھی چیزوں کا مطالبہ کرنے کے بجائے عقل سے کام لے کر خوب سوچ سمجھ کر اسلام کو اختیار کریں، قرآن مجید اسلام کو دلیلوں کے ذریعے سمجھانا چاہتا ہے زبردستی کا کوئی کام نہیں کرواتا پھر ایسی عجیب وغریب نشانیاں مانگنی فضول ہیں جن سے سوچ سمجھ کو کوئی مدد نہیں ملتی؛ ایسی نشانیاں مانگنا صرف ٹالنے کیلئے ہے۔

پیغمبروں کے دشمن

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَ الْجِنِّ

اور | اسی طرح | کئے ہم نے | واسطے ہر | پیغمبر کے | دشمن | شرارت کرنے والے | آدمی | اور | جن

يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ؕ وَ لَوْ شَآءَ

ڈالتے ہیں | بعض ان کے | طرف | بعض کے | چمکدار | بات | بہکانے کو | اور | اگر | چاہتا

رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَ مَا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۱۲﴾

رب آپ کا | نہ کرتے وہ یہ بات | پس چھوڑ تو ان کو | اور | جو وہ جھوٹ گھڑتے ہیں (۱۱۲)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور اسی طرح ہم نے ہر پیغمبر کیلئے شریر آدمیوں کو دشمن بنا دیا اور جنوں کو جو ایک

دوسرے کوفریب دینے کیلئے چکنی چپڑی باتیں سکھاتے ہیں اور اگر آپ کا رب چاہتا تو وہ لوگ یہ کام نہ کرتے سو آپ چھوڑ دیں وہ جانیں اور ان کا جھوٹ۔ (۱۱۲)

لفظی تحقیق: **شَیٰطِیْنَ**: سرکش۔ یہ شیطان کی جمع ہے، یہ لفظ قرآن کریم میں کئی بار آیا ہے، جو چیز انسان کو سیدھے راستے سے روکے یا ہٹائے اس کو تباہ وبرباد کرنا چاہئے یا کوئی نقصان پہنچانا چاہے وہ شیطان ہے خواہ وہ انسانوں میں سے ہو یا جنوں میں سے۔ **یُوْحِیْ**: دل میں ڈالتا ہے۔ اس کے معنٰی ہیں کوئی بات کسی طریقہ سے کسی کو بتانا، سکھانا نیز اشارہ کو بھی کہتے ہیں۔ **زُخْرُفَ**: اوپر سے چمکدار۔ کوئی چیز جو اندر سے خراب ہو مگر اوپر سے لیپا پوتی وغیرہ کر کے چمکا دی گئی ہو۔ **غُرُوْرًا**: دھوکا اور فریب دینا۔ ظاہری خوبصورتی کے ذریعے کسی کو بری چیز پکڑا دینا، غرور کے معنٰی دھوکہ دہی ہیں چنانچہ وہ شخص جو خود فریبی میں مبتلا ہے اسے مغرور کہا جاتا ہے۔

تفسیر

پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ جو بات کسی مقررہ قاعدے کے مطابق ہوتی ہے اللہ تعالیٰ اس کی نسبت اپنی طرف کرتے ہیں، یعنی: بات کا انداز یوں ہوتا ہے کہ ہم نے ایسا کیا، ظاہر بات ہے کہ تمام قاعدے اور ضابطے اور ان کے نتیجے اسی نے مقرر کیے ہیں انہی قاعدوں کے مطابق عمل کرنے کے بعد کوئی ہدایت پاتا ہے کوئی عمل نہ کرنے کی وجہ سے گمراہ ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کو یوں بیان فرماتے ہیں کہ ہم نے ہدایت دی اور ہم نے گمراہ کیا اور ہم چاہتے تو نہ کوئی گمراہ ہوتا اور نہ دوسروں کو بہکاتا، ان الفاظ سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص ہمارے مقرر کیے ہوئے ضابطوں کی خلاف ورزی نہ کرتا تو اس کے نتیجہ میں ہم اسے گمراہ اور بدکار نہ ٹھہراتے۔

جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے پیغمبر ہونے کے بارے میں "ورقہ بن نوفل" کو بتایا تو انہوں نے کہا کہ آپ کی قوم آپ کی دشمن ہو جائے گی اور آپ کو آپ کے وطن سے نکال دے گی اس پر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تعجب ہوا کہ میری کسی کے ساتھ دشمنی نہیں میں کسی پر زیادتی نہیں کرتا، پھر یہ لوگ مجھ سے کیوں دشمنی کریں گے اور مجھے کیوں

نکال دیں گے، "ورقہ بن نوفل" نے کہا یہ سلسلہ ایسے ہی چلتا رہا ہے، وہ پہلی کتابوں کا عالم تھا، کہنے لگا جس نے بھی ایسی چیز پیش کی جو آپ کر رہے ہیں تو اس کے ساتھ دشمنی ہی کی گئی، افسوس کہ "ورقہ بن نوفل" کو مہلت نہ ملی اور وہ تین دن بعد فوت ہو گئے، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا کہ "ورقہ بن نوفل" کا کیا حال ہے؟ اگر چہ اسے ایمان لانے کا موقع تو نہ ملا مگر وہ آپ کی تصدیق تو کر گیا تھا، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میں نے "ورقہ" کو خواب میں سفید لباس میں دیکھا ہے جس سے میں اس کے بارے میں اچھی توقع رکھتا ہوں، بہر حال ہر پیغمبر کے ساتھ اس کے دشمن بھی پیدا ہوتے رہے ہیں اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کے آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بہت سخت قسم کے دشمنوں سے واسطہ پڑا۔ آگے اللہ نے دشمنوں کی تفصیل بھی بیان کی ہے کہ وہ کون ہیں؟

شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَ الْجِنِّ: وہ شیطان ہیں جو انسانوں میں سے بھی ہیں اور جنوں میں سے بھی ہیں، جنوں میں سے تو ظاہر ہے کہ ابلیس اور اس کی اولاد ہر مؤمن کے کھلے دشمن ہیں، قرآن کریم میں جگہ جگہ موجود ہے "کہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے"، "سورۂ کہف" میں ہے کہ: "تم شیطان اور اس کی اولاد کو میرے سوا دوست بناتے ہو"؟ اس کے کہنے پر چلتے ہو؟ حالانکہ وہ تمہارا شروع ہی سے دشمن ہے اس نے تمہیں بہکانے کی قسم کھا رکھی ہے وہ انسان کے آخری دم تک کوشش کرتا ہے کہ وہ ایمان سے خالی ہو جائے، وہ چاہتا ہے کہ سب لوگ اس کے پیچھے لگ جائیں اور وہ سب کو اپنے ساتھ جہنم میں لے جائے، "سورۂ فاطر" میں ہے کہ: "وہ تو اپنی پارٹی بڑھانا چاہتا ہے، بلاتا ہے کہ آؤ! میرے ساتھ لگ جاؤ، تا کہ سب کو اپنے ساتھ دوزخ میں لے جاؤں" غرضیکہ شیطان کو انسان سے ہر صورت میں دشمنی ہے، البتہ بعض انسان بھی شیطان (شریر) ہوتے ہیں خود بھی شیطانی کام انجام دیتے ہیں اور دوسروں کو بھی شیطانی کاموں پر آمادہ کرتے ہیں، شیطان کا مقصد لڑائی جھگڑا اور دنگا فساد کرانا ہوتا ہے جو انسان یہ کام کرتے ہیں بلا شبہ وہ بھی شیطان ہیں جو ہر پیغمبر کے ساتھ دشمنی کرتے رہے ہیں، کسی انسان کی بدبختی کی سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں کا دشمن ہو، اللہ تعالیٰ کے پیغمبر تو توحید اور ہدایت کا راستہ بتاتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی رضامندی پر چلتے ہیں اور دوسرے انسانوں کو بھی اسی راستے پر چلانا چاہتے ہیں مگر شیطان اسی وجہ سے ان کا دشمن ہے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "سب سے سخت عذاب اس شخص کیلئے ہے جو اللہ کے پیغمبر کو قتل

کرے یا اللہ کا پیغمبر اسے قتل کرے"، ظاہر ہے کہ پیغمبر کا قاتل نہایت ہی بد بخت شخص ہوگا۔

یُوْحِیْ بَعْضُھُمْ اِلٰی بَعْضٍ: ہر پیغمبر کے دشمن ہوئے ہیں اور اسی طرح آپ کے بھی ہیں یہ تمام قسم کے شیطان ایک دوسرے کی طرف خفیہ اشارے کرتے ہیں، یعنی: منصوبہ بندی کرتے ہیں اور پھر لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتے ہیں، حضرت مالک بن دینار رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: شیطان چونکہ انسانوں اور جنوں دونوں قسموں سے ہیں اس لئے میں ہمیشہ "لَا حَوْلَ وَ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ" پڑھتا ہوں، یا "اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ" پڑھتا ہوں تو جنوں کی قسم کے شیطان تو بھاگ جاتے ہیں مگر انسانی شیطان ہمیشہ ساتھ رہتے ہیں اور ہمیشہ آدمی کو گناہ کی طرف لے جانے کی کوشش کرتے ہیں اور پھر یہ ہے کہ انسانی شیطان جناتی شیطانوں سے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں، جناتی شیطان تو نظروں سے اوجھل رہتے ہیں مگر انسانی شیطان کھلم کھلا شیطانی کام کرتے رہتے ہیں حتیٰ کہ آدمی کو گناہ میں مبتلا کر دیتے ہیں۔

یُوْحِیْ: کا ایک معنیٰ اشارہ کرنا ہے اور اس کا دوسرا معنیٰ تیزی سے بات کرنا بھی آتا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کی وحی میں خفیہ اشارہ ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے فرشتے کے ذریعے پیغمبر کے دل پر اترتا ہے، یہاں پر وحی سے مراد دل میں ڈالنا ہے جو ایک دوسرے پر وسوسے ڈالتے ہیں اور لوگوں کو برائی کی طرف مائل کرتے ہیں۔

زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا: شیطان بھی انسانوں کے دلوں میں ایسی بات ڈالتے ہیں جو بظاہر تو بڑی خوبصورت ہوتی ہے مگر اس کے نتیجے ہمیشہ خراب نکلتے ہیں ایک تو چکنی چپڑی بات ڈالتے ہیں اور دوسری دھوکے والی بات کرتے ہیں، یہ شیطان انسانوں کے دلوں میں بھی وسوسے ڈالتے ہیں اور خود ایک دوسرے کو برا خیال کرتے ہیں ایسی بنا سنوار کر بات کرتے ہیں جو دین، اخلاق اور حق کے خلاف ہوتی ہے اور لوگ اس سے دھوکا کھا جاتے ہیں، اسلام دشمن طاقتوں کا اسلام کے ساتھ رویہ بھی ایسا ہی ہے وہ بظاہر تو بڑی ہمدردی اور خیر خواہی کا اظہار کرتے ہیں مگر پیٹھ پیچھے ان کے ارادے نہایت خطرناک ہوتے ہیں جن کے ذریعے وہ اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچاتے رہتے ہیں۔

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا یَفْتَرُوْنَ: اگر آپ کا رب چاہتا تو یہ ایسا نہ کر پاتے مگر

اللہ تعالیٰ کسی سے زبردستی کوئی کام نہیں کروانا چاہتا ہے؛ اس لئے فرمایا کہ: اے پیغمبر! آپ ان کو ان کی حالت پر چھوڑ دیں اور جو کچھ وہ گھڑتے ہیں انہیں گھڑنے دیں ان کا انجام برا ہوگا۔

بُرے لوگوں کے کام

وَ لِتَصْغٰۤی اِلَیْهِ اَفْـِٕدَةُ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَ
اور تاکہ جھکیں طرف اسکی دل ان کے جو ایمان نہیں لاتے پر آخرت اور

لِیَرْضَوْهُ وَ لِیَقْتَرِفُوْا مَا هُمْ مُّقْتَرِفُوْنَ﴿۱۱۳﴾
تاکہ پسند کرلیں اسکو اور تاکہ کرتے رہیں جو کچھ وہ کررہے ہیں (۱۱۳)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور اس لئے کہ ان کی چکنی چپڑی باتوں کی طرف ان لوگوں کے دل مائل ہوں جن کو آخرت کا یقین نہیں اور وہ ان کو پسند بھی کرلیں اور جو کچھ برے کام وہ کررہے ہیں کئے جائیں۔ (۱۱۳)

لفظی تحقیق: تَصْغٰی: یہ "صَغْوٌ" سے بنا ہے جس کے معنیٰ جھکنے اور مائل ہونے کے ہیں۔ یَقْتَرِفُوْا: کریں: یہ "قَرْفٌ" سے بنا ہے "قَرْفٌ" کے معنیٰ ہیں کمانا، "اِقْتِرَفٌ" سے یہاں مراد ہے برے کام کرنا۔

تفسیر

پچھلی آیت میں جن کا بیان تھا اس آیت میں ان ہی لوگوں کا بیان چل رہا ہے وہ اپنی چکنی چپڑی باتوں سے دوسروں کو ورغلاتے ہیں اس دھوکہ بازی کو سچ بنا کر دکھانے سے ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان کی جماعت بڑھ جائے اور لوگ ان کی باتوں کو پسند کرکے ان کے ساتھی ہوجائیں، اور پھر سب مل کر واہی تباہی کام کرتے رہیں کوئی ان کو کہنے سننے والا نہ ہو مگر ان کا قابو انہی لوگوں پر چلتا ہے جو اس دنیا ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں اور اس بات کو بالکل نہیں مانتے کہ مرنے کے بعد آخرت آئے گی اور وہاں ان سب باتوں کا جو اس دنیا میں کی ہوں گی حساب

دینا پڑے گا اور برے کاموں کی سزا بھگتنی پڑے گی۔

وَلِيَقْتَرِفُوْا مَا هُمْ مُّقْتَرِفُوْنَ: اور وہ جو کچھ برا بھلا کماتے ہیں انہیں کمانے دیں، قیامت کے دن ان کی ساری کمائی سامنے آجائے گی اور انہیں ہر بات کا جواب دینا پڑے گا، اللہ تعالیٰ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی کہ زیادہ غمگین نہ ہوں انہیں ان کے حال پر رہنے دیں۔

فیصلہ اللہ تعالیٰ ہی کر سکتے ہیں

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ

کیا پس سوا اللہ کے ڈھونڈوں میں منصف اور وہی ہے جس نے اتاری طرف تمہاری کتاب

مُفَصَّلًا ۭ وَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ

کھلی ہوئی اور جو لوگ کہ دی ہم نے انکو کتاب وہ جانتے ہیں کہ وہ اتاری گئی ہے

مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۱۱۴﴾

طرف سے رب آپ کے کی ساتھ حق کے پس نہ ہوں آپ سے میں شک کرنے والوں (۱۱۴)

بامحاورہ ترجمہ: سو کیا اب اللہ کے سوا کسی اور کو منصف بناؤں حالانکہ اسی نے تم پر واضح کتاب اتاری اور جن لوگوں کو ہم نے واضح کتاب دی ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ کتاب آپ کے رب کی طرف سے ٹھیک اتاری ہوئی ہے سو آپ شک کرنے والوں میں سے مت ہوں۔ (۱۱۴)

لفظی تحقیق: اَبْتَغِيْ: ڈھونڈوں۔ یہ "بَغْیٌ" سے بنا ہے جس کے معنیٰ ہیں طلب کرنا، "اِبْتِغَا" کے معنیٰ ہیں ڈھونڈنا، تلاش کرنا اور چاہنا۔ حَكَمٌ: فیصلہ کرنے والا۔ یہ "حُكْمٌ" سے بنا ہے جس کے معنیٰ قاضی، جج اور منصف کے ہیں۔ اَلْمُمْتَرِيْنَ: شک کرنے والے۔ یہ "مِرْيَةٌ" سے بنا ہے اور "مِرْيَةٌ" کے معنیٰ شک کے ہیں۔

تفسیر

ارشاد ہے کہ اے پیغمبر! آپ اعلان کر دیجئے کہ کیا ان نادان لوگوں کے اور ہمارے درمیان اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور بھی فیصلہ کرنے والا ہو سکتا ہے جس نے انسان کی ہدایت کیلئے یہ پاکیزہ کتاب، یعنی: قرآن مجید دنیا میں بھیج دی ہے اور اس کے اندر ساری کام کی باتیں خوب کھول کر صاف صاف بیان کر دی ہیں، کہیے! میں تو اسے چھوڑ کر کسی اور کو فیصلہ کرنے والا نہیں ٹھہرا سکتا، وہ مجھ سے کہہ رہا ہے کہ پہلے سب لوگ جن کو کتابیں مل چکی ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ یہ آخری کتاب آپ کے رب کی طرف سے بالکل ٹھیک اور سچی باتیں لے کر آئی ہے اس کی سچائی کی طرف سے کوئی شک وشبہ ہرگز نہ کرنا چاہئے۔

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا: یعنی: کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کے اس فیصلہ کے بعد کسی اور فیصلہ کرنے والے کو تلاش کروں؟ یہ نہیں ہو سکتا، اس کے بعد قرآن کریم کی چند ایسی خصوصیات کا ذکر کیا گیا ہے جو خود قرآن کریم کے حق اور اللہ تعالیٰ کا کلام ہونے کا ثبوت ہیں، مثلاً: فرمایا کہ: ''اسی خدا تعالیٰ نے تم پر واضح کتاب اتاری'' جس میں قرآن کریم کے چار خصوصی کمالات کا بیان ہے، اول یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتارا ہوا ہے، دوسرے یہ کہ وہ ایک مکمل کتاب ہے کہ سارا جہان اس کے مقابلہ سے عاجز ہے، تیسرے یہ کہ تمام اہم اور اصولی مضمون اس میں بہت تفصیل سے واضح بیان کئے گئے ہیں، چوتھے یہ کہ قرآن کریم سے پہلے اہل کتاب، یعنی: یہودی اور عیسائی بھی یقین کے ساتھ جانتے تھے کہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتاری ہوئی کتاب ہے، پھر جن میں کوئی سچائی اور حق کہنے کی صفت تھی انہوں نے اس کو ظاہر بھی کر دیا اور جو لوگ دشمن تھے وہ باوجود یقین کے اس کا اظہار نہ کرتے تھے بلکہ الٹا غلط بیانی کرتے تھے۔

فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ: قرآن کریم کی ان چار صفتوں کو بیان کرنے کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے کہ ان واضح باتوں کے بعد آپ شک میں پڑنے والوں میں سے مت ہوں؛ یہ ظاہر ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم

تو کسی وقت بھی شبہ کرنے والوں میں نہ ہو سکتے تھے جیسا کہ خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد "تفسیر ابن کثیر" میں ہے کہ "نہ میں نے کبھی شک کیا اور نہ کبھی سوال کیا" معلوم ہوا کہ یہاں اگرچہ لفظوں میں خطاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے لیکن در حقیقت سنانا دوسروں کو مقصود ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرنے سے مقصد تاکید کرنا منظور ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا کہا گیا تو دوسروں کی کیا ہستی ہے جو کوئی شک کر سکیں۔

قرآن مجید کے حکم اٹل ہیں

وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّ عَدْلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۱۱۵﴾

اور پورا ہے کلام رب آپکے کا سچائی میں اور انصاف میں نہیں کوئی بدلنے والا کلام اسکے کو اور وہی سننے والا جاننے والا ہے (۱۱۵)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور آپ کے رب کی بات پوری سچی اور انصاف کی ہے اس کی بات کو کوئی بدلنے والا نہیں اور وہی ہے سننے والا جاننے والا۔ (۱۱۵)

لفظی تحقیق: عَدْل: انصاف۔ اس کے معنٰی برابری کے ہیں، یعنی: ایسی بات یا حکم جس میں نہ کسی کا نقصان ہو اور نہ کسی پر کوئی زیادتی ہو۔

تفسیر

پچھلی آیت میں کہا گیا کہ قرآن مجید دنیا میں بالکل ٹھیک باتیں لے کر آیا ہے اس میں شک وشبہ نہ کرو، یہ ہر طرح سے اعتماد کے قابل کتاب ہے اور ہمیشہ کیلئے اس کی حفاظت اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے کوئی شخص اس میں سے ایک لفظ بھی ادھر سے ادھر نہیں کر سکتا ہے، لہٰذا کسی قسم کی تبدیلی کا اس میں خیال بھی نہیں کیا جا سکتا ہمیشہ جیسی ہے ویسی ہی رہے گی، اس آیت میں قرآن مجید کے ہمیشہ اور ہر وقت قابل اعتماد ہونے کی کچھ دلیلیں بیان کی گئی ہیں

جو کہ یہ ہیں۔

(۱).... یہ اس کا کلام ہے جو سب کا رب ہے، اسی لئے انسان کا بھی رب ہے اور اس کی تربیت اسی کے ذمہ ہے، تربیت کے معنٰی ہیں ایک چیز کی ساری ضرورتیں پوری کر کے اسے آہستہ آہستہ کمال کو پہنچانا، انسان کی تربیت کیلئے ضروری تھا کہ اس کی عقل کو روشن کرنے کیلئے ہدایت کی صاف صاف روشنی مہیا کی جائے، یہ قرآن مجید وہی روشنی ہے جیسے ظاہری آنکھوں کیلئے سورج روشنی کا ذریعہ ہے ایسے ہی قرآن مجید باطنی آنکھوں کیلئے روشنی کا ذریعہ ہے۔

(۲).... اس میں ہر چیز واقعہ کے مطابق ہے۔

(۳).... اس پر عمل کرنے سے ہر شخص ظلم اور زیادتی سے محفوظ رہے گا۔

(۴).... کوئی اس میں کچھ ادل بدل نہیں کرسکتا۔

(۵).... اس کا بھیجنے والا ہر ایک کی بات سننے والا اور ہر ایک حکم کے موقع و محل کا جاننے والا اور ہر ایک کے دل کی بات کا جاننے والا ہے۔

صِدْقًا وَّ عَدْلًا: قرآن مجید کے کل مضمون دو قسم کے ہیں ایک وہ جن میں دنیا کی تاریخ کے عبرت آموز واقعات وحالات اور نیک عملوں پر وعدہ اور برے عملوں پر سزا کا ڈراوا بیان کیا گیا ہے، دوسرے وہ جن میں انسان کی دنیا وآخرت کی کامیابی کیلئے حکم بیان کئے گئے ہیں ان دونوں قسموں کے متعلق قرآن مجید کی یہ دو صفتیں بیان فرمائیں "صِدْقًا وَّ عَدْلًا" "صِدْق" کا تعلق پہلی قسم سے ہے، یعنی: جتنے واقعات وحالات یا وعدے اور ڈراوے قرآن کریم میں بیان کئے گئے ہیں وہ سب سچے اور صحیح ہیں ان میں کسی غلطی کا امکان نہیں اور "عَدَل" کا تعلق دوسری قسم، یعنی: حکم سے ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے تمام حکم عدل پر مبنی ہیں اور لفظ "عدل" کا مفہوم دو معنٰی کو شامل ہے، ایک انصاف جس میں کسی پر ظلم اور حق تلفی نہ ہو، دوسرے میانہ روی کہ اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے حکم نہ بالکل انسان کی نفسانی خواہشوں کے تابع ہیں اور نہ ایسے ہیں کہ انسان ان حکموں کو پورا نہ کرسکے، خلاصہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے سارے حکم انصاف اور میانہ روی پر مبنی ہیں نہ ان میں کسی پر

ظلم ہے اور نہ ان میں ایسی شدت اور تکلیف ہے جس کو انسان برداشت نہ کر سکے۔

لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ: یعنی: اللہ تعالیٰ کے کلمات کو کوئی بدلنے والا نہیں بدلنے کی ایک صورت تو یہ ہوسکتی ہے کہ کوئی اس میں غلطی ثابت کرے، اس لئے بدلا جائے، یا یہ کہ کوئی دشمن اس کو بدل ڈالے، اللہ تعالیٰ کا کلام ان سب چیزوں سے بالاتر اور پاک ہے اس نے خود وعدہ فرمایا ہے کہ "اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ، یعنی: ہم نے ہی قرآن کریم کو اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کریں گے"، پھر کس کی مجال ہے کہ خدا کی حفاظت کو توڑ کر اس میں کچھ ادل بدل کر سکے، چنانچہ چودہ سو برس اس پر گذر چکے ہیں اور ہر زمانہ میں قرآن کریم کے مخالف اس کے ماننے والوں کی نسبت تعداد میں بھی زیادہ رہے ہیں قوت میں بھی مگر کسی کی مجال نہیں ہوسکی کہ قرآن کریم کے ایک زبر زیر میں فرق کر سکے، ہاں! بدلنے کی ایک صورت یہ بھی ہوسکتی تھی کہ خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو منسوخ کر کے بدل دیا جائے، اسی لئے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اس آیت میں اس کی طرف اشارہ ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم آخری پیغمبر اور قرآن آخری کتاب ہے اس کے بعد منسوخ ہونے کا کوئی امکان نہیں، جیسا کہ قرآن کریم کی دوسری آیتوں میں یہ مضمون اور بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ آیا ہے۔

گمراہ کُن

وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ

اور اگر کہنا مانیں گے تو بہت سوں کا ان میں سے جو میں زمین بہکائیں گے وہ آپ کو سے راستہ اللہ کے

اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ﴿۱۱۶﴾

نہیں پیروی کرتے وہ مگر گمان کی اور نہیں وہ مگر اٹکل دوڑاتے (۱۱۶)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اگر آپ دنیا کے اکثر لوگوں کا کہنا مانیں گے تو آپ کو اللہ کی راہ سے بہکائیں گے وہ سب تو اپنے خیال میں چلتے ہیں اور سب اٹکل ہی دوڑاتے ہیں۔ (۱۱۶)

لفظی تحقیق: اِنْ: یہ لفظ اس آیت میں تین جگہ آیا ہے، پہلی جگہ اس کے معنیٰ ''اگر'' کے ہیں، دوسری اور تیسری جگہ اس کے معنیٰ ''نہیں'' کے ہیں، اس لفظ کے یہ دو معنیٰ یاد رکھنے چاہئیں، اکثر تو یہ اگر ہی کے معنیٰ میں آتا ہے لیکن اگر ''اِنْ'' کے بعد ''اِلاَّ'' آئے تو اس کے معنیٰ ''نہیں'' کے ہوتے ہیں۔

تفسیر

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد ہے کہ دنیا میں آپ کو اکثر لوگ ایسے ہی ملیں گے کہ ان کے کہنے پر عمل کرنے سے آپ صحیح راستہ سے بھٹک سکتے ہیں کیونکہ ان کی باتیں یقینی نہیں ہوتیں بلکہ صرف گمان اور اٹکل پر مبنی ہوتی ہیں اور سیدھے راستہ پر اٹکل سے نہیں چلا جاتا۔

ذرا سا غور کرنے سے سمجھ میں آ سکتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کے پیغمبر دنیا میں نہ آتے اور انسان کو یقینی باتیں نہ بتاتے تو انسان اتنا جلد مہذب نہیں ہو سکتا تھا جتنا اب نظر آتا ہے کیونکہ اس کو گمان اور اٹکل کی باتوں پر چلنا پڑتا ہے اور وہ اس وقت تک ٹھوکریں ہی کھاتا رہتا ہے جب تک تجربے سے اس کو ساری باتیں یقینی طور پر نہ معلوم ہو جاتیں جن پر اس کی معاشرت اور اخلاق کی بنیاد قائم ہے، یہ پیغمبروں کا کام تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کتاب لا کر انسان کو وہ یقینی باتیں بتا دیں جن پر اس کی دنیا و آخرت کی کامیابی کا دارومدار ہے۔

گمراہ اور ہدایت یافتہ

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ مَنْ يَّضِلُّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۚ وَ هُوَ اَعْلَمُ

بیشک رب آپکا وہی زیادہ جانتا ہے اس کو جو بہکا ہے سے راہ اس کی اور وہی زیادہ جانتا ہے

بِالْمُهْتَدِيْنَ ﴿١١٧﴾ فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ

راہ پانے والوں کو (۱۱۷) پس کھاؤ اس سے کہ ذکر کیا گیا نام اللہ کا پر اس اگر ہو تم

بِاٰيٰتِهٖ مُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۸﴾

پر آیتوں اسکی ایمان لانے والے (۱۱۸)

بامحاورہ ترجمہ:۔ آپ کا رب اس کو جو اس کی راہ سے بہکتا ہے خوب جانتا ہے اور وہی ان کو بھی خوب جانتا ہے جو اس کی راہ پر ہیں۔ (۱۱۷) سوتم اس جانور کے گوشت میں سے کھاؤ جس پر ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لیا گیا ہے اگر تم اس کے حکموں پر ایمان لانے والے ہو۔ (۱۱۸)

تفسیر

قرآن مجید جس وقت اترا اس وقت دنیا کے تقریباً تمام لوگ اللہ تعالیٰ کے راستے سے ہٹ چکے تھے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب قرآن مجید سنا کر لوگوں کو اصلی باتیں بتانی شروع کیں تو ان پر اپنے غلط راستوں کا چھوڑنا بہت دشوار معلوم ہوا کیونکہ وہ ان کے عادی ہو چکے تھے اور نئے دین میں شامل ہونے میں انہیں اپنی موت نظر آتی تھی حالانکہ اصل زندگی کا راز اسی میں پوشیدہ تھا۔

قرآن مجید کے طریقے پر مکہ مکرمہ کے لوگ اعتراض کرتے تھے بجائے اس کے کہ اصل بات کے سمجھنے کی کوشش کریں انہیں صرف اعتراض کرنے سے کام تھا، مفسرین نے لکھا ہے کہ قرآن مجید نے جب موت سے مرے ہوئے مردہ جانور کا گوشت کھانے سے منع کیا اور اس کو حرام قرار دیا تو اس پر مکہ مکرمہ کے کافروں نے اپنی عادت کے مطابق ناک بھوں چڑھائی اور جو ان میں زیادہ سمجھ دار بنتے تھے انہوں نے کہا عجیب بات ہے کہ جس کو اللہ مارے وہ تو حرام اور جس کو انسان خود مارے وہ حلال، اس کا جواب سمجھانے کیلئے پچھلی آیتوں میں ابتدائی بات کے طور پر بیان کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے راستہ سے ہٹانے والے ظاہراً بات کو بنا سنوار کر کہتے ہیں لیکن ان کی باتوں میں دھوکے بازی کے سوا کچھ نہیں ہوتا، اصل بات یہ ہے کہ حلال وحرام کا دارومدار اللہ تعالیٰ کے حکم پر ہے اعتراض کی اصل جڑ یہ ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو بھی ہماری خواہشوں کا پابند ہونا چاہئے اور جیسے ہمارے بت

ہمیں کچھ نہیں کہتے ہم جو چاہتے ہیں کرتے ہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ کو بھی ہم پر حکم نہ چلانا چاہیے، پچھلی آیتوں میں ان کے غلط خیالات کی حقیقت بیان کی گئی ہے، اس آیت میں صاف کہہ دیا گیا ہے کہ حکم دینا اللہ تعالیٰ کا کام ہے اور اس کا ماننا بندوں کا کام ہے۔

ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ کے راستے سے بھٹکنے والوں اور اس کے مقرر کیے ہوئے اور سیدھے راستہ پر چلنے والوں کو سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں ان کے واہی تباہی خیالات سے غلط راستہ ٹھیک نہیں ہوسکتا، غلط ہمیشہ غلط رہے گا اس لئے تم ان نادانوں کے کہنے سننے کی پروانہ کرو، یہ بات غلط ہے کہ جو جانور خود مر جائے اسے اللہ تعالیٰ مارتے ہیں اور جو ذبح کیا جائے اسے انسان مارتا ہے سب کو اللہ تعالیٰ ہی مارتے ہیں لیکن ذبح کے وقت چونکہ اللہ تعالیٰ کا نام لیا جاتا ہے اس لئے اس کے نام کی برکت سے اس کا کھانا حلال اور جائز ہوجاتا ہے، چنانچہ کوئی چیز اگر اللہ تعالیٰ کے نام کے سوا کسی اور کا نام لے کر ذبح کی جائے تو وہ بھی حرام ہے خواہ اسے ذبح ہی کیا گیا ہو، لہٰذا حلال ہونا صرف اللہ تعالیٰ کے نام اور اس کے حکم کی برکت سے ہے۔

احکام و مسائل

مسئلہ (۱):..... جس جانور کے ذبح کے وقت "بسم اللہ" بھول سے چھوٹ گئی اس کا کھانا حلال ہوگا۔

مسئلہ (۲):..... جانور کے ذبح کے وقت جان بوجھ کر "بسم اللہ" نہ پڑھنے سے جانور کا کھانا حلال نہ ہوگا بلکہ حرام ہی رہے گا۔

بے بنیاد اعتراض

وَ مَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَ قَدْ

اور کیا ہوا تم کو یہ کہ نہیں کھاتے تم اس میں سے کہ لیا گیا نام اللہ کا پر جس حالانکہ تحقیق

فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ ؕ وَ
کھول دیا لئے تمہارے جو حرام کیا اس نے پر تم مگر جبکہ مجبور ہو جاؤ تم طرف اسکی اور

اِنَّ كَثِيْرًا لَّيُضِلُّوْنَ بِاَهْوَآئِهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ
بیشک بہت سے البتہ بہکاتے ہیں اپنی خواہشوں کے مطابق بغیر سمجھے بوجھے بیشک رب تیرا وہی ہے

اَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِيْنَ ﴿۱۱۹﴾
زیادہ جاننے والا زیادتی کرنے والوں کو (۱۱۹)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور کیا وجہ ہے کہ تم اس جانور میں سے جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہے نہیں کھاتے اور جو کچھ کہ اس نے تم پر حرام کیا ہے وہ واضح کر چکا ہے سوائے اس کے کہ جب اس کھانے پر مجبور ہو جاؤ اور بہت لوگ اپنے خیالات پر بغیر تحقیق بہکاتے پھرتے ہیں یقیناً آپ کا رب حد سے بڑھنے والوں کو خوب جانتا ہے۔ (۱۱۹)

لفظی تحقیق: اُضْطُرِرْتُمْ: تم مجبور ہو جاؤ۔ یہ "اِضْطِرَارٌ" سے ہے جو کہ "ضُرٌّ" سے بنا ہے، "ضُرٌّ" کے معنٰی تنگی، سختی، لاچارگی کے ہیں، "اِضْطِرَارٌ" کے معنٰی ہیں تنگی میں پھنسانا جس میں کوئی چارہ ہی نہ رہے۔

تفسیر

اس آیت میں پچھلی آیت کی مزید وضاحت ہے، یعنی: یہ کہا گیا ہے کہ یہ ذبح کئے ہوئے جانور وہ ہونے چاہئیں جن کو تم پر حرام نہیں کیا گیا ہے۔

ارشاد ہے کہ تمہیں اس سے پہلے واضح طور پر بتا دیا گیا ہے کہ کون کون سی چیز تم پر حرام ہیں ان چیزوں کو سوائے اس حالت کے تمہاری جان ہی نکلنے لگے مت کھاؤ، اس مقصد کیلئے جو الفاظ استعمال کئے گئے ہیں اس کا معنٰی یہ ہے کہ "سوائے اس کے جس کیلئے تم مجبور ہو جاؤ" اس کے سوا جو حلال جانور اللہ تعالیٰ کا نام لے کر ذبح کیا جائے اسے شوق سے کھاؤ جس جانور کی موت کے وقت کوئی انسان اللہ تعالیٰ کا نام لے کر اس کو ذبح کر دے اس کا

گوشت بھی حلال ہے، ان باتوں کو وہی سمجھتے ہیں جن کو حقیقت کا علم ہے مگر یہ لوگ سرکش ہیں اللہ تعالیٰ انہیں خوب جانتے ہیں۔

وَ مَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ: اور تمہیں کیا ہوا ہے کہ تم وہ چیز نہیں کھاتے جس پر اللہ تعالیٰ کا نام لیا گیا ہے ایسی چیز تو حلال طیب ہے اور تمہیں حلال و حرام کی تمیز کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آنی چاہئے، کیونکہ تمہارے سامنے ان چیزوں کی تفصیل بیان ہو چکی ہے جو تم پر حرام ہیں، "سورۂ بقرہ اور سورۂ نحل" میں اللہ تعالیٰ نے حرام کی ہوئی چیزوں کی تفصیل بیان کر دی ہے، لہٰذا اس کی روشنی میں شرعی طریقہ سے ذبح کیے ہوئے حلال جانور کا گوشت شوق سے کھا سکتے ہو اسی طرح تمہارے لئے حرام چیزوں سے پرہیز بھی لازمی ہے سوائے اس کے کہ جس کی طرف تم مجبور کر دیئے گئے ہو، مجبوری کی حالت میں حرام چیز کھانے کی بھی اجازت ہوتی ہے جب جان جانے کا خطرہ ہو تو اس وقت خنزیر اور مردار وغیرہ بھی کھایا جا سکتا ہے اور ایسی حالت میں استعمال کرنے پر کوئی گناہ عائد نہیں ہوتا، البتہ اگر وہ مجبوری کی حالت میں کھائے بغیر مر جائے تو اللہ تعالیٰ کی پکڑ میں آ جائے گا کیونکہ اس کیلئے جان کی حفاظت لازم تھی جبکہ مجبوری کی حالت میں حرام چیز حرام نہیں رہتی بلکہ اس کا استعمال جائز ہو جاتا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ جن جانوروں کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے ان کا گوشت انسانی صحت کیلئے نقصان دہ ہے، بعض حرام کی ہوئی چیزوں سے جسمانی صحت خراب ہوتی ہے اور بعض چیزوں سے روحانیت پر برا اثر پڑتا ہے، حرام چیزوں کی حرمت میں یہی حکمت ہے کہ وہ کسی نہ کسی صورت میں انسان کیلئے نقصان دہ ہیں اسی طرح جن جانوروں کا گوشت انسانی جسم کیلئے فائدہ مند ہے ان کو اللہ تعالیٰ نے حلال قرار دیا ہے، چنانچہ آگے اسی سورۃ میں ان حلال مویشیوں کی تفصیل آ رہی ہے جو گھاس کھاتے ہیں، پالتو ہونے کی وجہ سے لوگوں کے قریب رہتے ہیں اور انسانوں سے مانوس ہوتے ہیں، لوگ ان کا دودھ پیتے ہیں، اون استعمال کرتے ہیں اور گوشت بھی کھاتے ہیں، یہی جانور کھیتی باڑی اور سامان اٹھانے کے کام بھی آتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو حلال قرار دیا ہے، البتہ گوشت استعمال کرنے کیلئے ضروری شرط یہ ہے کہ جانور کو گلے پر چھری چلاتے وقت اللہ کا نام لیکر ذبح کیا گیا ہو۔

مجبوری کی حالت میں جب کہ آدمی جانور تک پہنچنے کی قدرت نہیں رکھتا ہو تو اس صورت میں اس جانور کو شکار کے جانور کی طرح ذبح مقررہ طریقے کے خلاف کیا جا سکتا ہے، مثلاً: اونٹ بھاگ گیا ہے اور کسی طرح قابو میں نہیں آرہا ہے کوئی جانور کنویں میں گر گیا ہے اور مر جانے کا خطرہ ہے تو ایسی صورت میں اگر جسم کے کسی حصے پر بھی زخم لگا کر خون بہا دیا گیا تو جانور حلال ہوگا ایسی صورت میں گلا کٹنا ضروری نہیں ہوتا، اس کے متعلق "ترمذی شریف" میں روایت موجود ہے کہ پوچھنے والے نے پوچھا کہ اس قسم کی مجبوری کی حالت میں ذبح کا کیا حکم ہے تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اگر نیزہ یا کسی دوسرے تیز دھار آلہ سے زخم لگا دیا جائے جس سے خون نکل جائے تو جانور حلال ہو جائے گا خواہ زخم جسم کے کسی بھی حصے پر لگے، پرندوں کے شکار کا بھی یہی حکم ہے ان کو پکڑ کر ذبح کرنا مشکل ہوتا ہے، لہٰذا اگر تیر یا نیزہ چلاتے وقت اللہ تعالیٰ کا نام لے لیا گیا تو جانور حلال ہو جائے گا کبھی شکار کے پیچھے کتا باز یا شکرا وغیرہ چھوڑنا پڑتا ہے اسے چھوڑتے وقت بھی اللہ تعالیٰ کا نام لینا ضروری ہے۔ یہ حکم اس صورت میں ہے کہ زخم لگنے سے جانور یا پرندہ کی جان نکل گئی ہو اور اگر جانور یا پرندہ کی جان نہ نکلی ہو اور آدمی اس جانور یا پرندہ پر پہنچ جائے تو اس صورت میں ان کے گلے پر چھری چلاتے وقت اللہ کا نام لیکر قاعدے کے موافق ذبح کرنا ضروری ہے۔

وَاِنَّ كَثِيْرًا لَّيُضِلُّوْنَ بِاَهْوَآئِهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ: بیشک بہت سے لوگ صرف اپنی خواہشوں کی وجہ سے بغیر علم کے گمراہ کرتے ہیں، مشرکوں کا یہ پراپگینڈہ کہ مسلمان اپنا مارا ہوا کھاتے ہیں اور خدا کا مارا ہوا نہیں کھاتے اسی سلسلہ کی کڑی ہے وہ ایسے اعتراض کر کے لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں، بیشک آپ کا رب زیادتی کرنے والوں کو خوب جانتا ہے جو اس قسم کی بیہودہ باتیں کرتے ہیں ان کی پکڑ ضرور ہوگی۔

احکام ومسائل

مسئلہ (۱):.... خشکی کے جانوروں کے ذبح کیلئے دو شرطوں کا پایا جانا لازمی ہے ایک جانور کے گلے پر اس طرح چھری چلانا کہ جس سے اس کی شہ رگیں، سانس کی نالی، اور نرخرہ کٹ جائے اور دوسرا اللہ تعالیٰ کا نام لینا

جب تک یہ دو شرطیں پوری نہ ہوں ذبح درست نہیں ہوگا اور جب ان شرطوں کے ساتھ ذبح کر دیا جائے تو کھانا حلال ہو جائے گا۔

مسئلہ (۲):.... اگر ذبح کرتے وقت اللہ تعالیٰ کا نام جان بوجھ کر چھوڑ دیا تو جانور حرام ہوگا، البتہ اگر بسم اللہ، اللہ اکبر کہنا بھول گیا تو معاف ہے کیونکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ "ہر مؤمن کے دل میں اللہ تعالیٰ کا نام ہوتا ہے"۔

مسئلہ (۳):.... ذبح کرتے وقت جانور سے جو خون نکلتا ہے وہ حرام بھی ہے اور ناپاک بھی۔

مسئلہ (۴):.... شکار کے جانور کے حلال ہونے کیلئے گلے پر چھری پھیرنا ضروری نہیں جیسا کہ ابھی اشارۃً گزرا بلکہ اللہ تعالیٰ کا نام لے کر اس طرح نیزہ وغیرہ مارا جائے جس سے خون بہہ جائے تو اس کا کھانا حلال ہوگا بشرطیکہ شکاری کے پہنچنے سے پہلے جانور مر جائے لیکن اگر جانور زندہ ہو تو پھر پہلے اس کے گلے پر چھری چلا کر ذبح کرنا ضروری ہے۔

مسئلہ (۵):.... پانی کے جانور بغیر ذبح کیے حلال ہیں، مثلاً: زندہ مچھلی پکڑ کر کنارہ پر پھینک دی اور وہ مر گئی تو وہ حلال ہے، اور اسی طرح اگر کسی غیر مسلم نے مچھلی پکڑ کر کنارہ پر پھینک دی اور وہ مر گئی تو وہ بھی حلال ہے، اس لئے کہ یہ پانی کے جانور بغیر ذبح کے حلال ہیں۔

گناہ نہ کرو

وَ ذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَ بَاطِنَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ یَكْسِبُوْنَ الْاِثْمَ

اور چھوڑ دو کھلا ہوا گناہ اور چھپا ہوا بیشک وہ جو کماتے ہیں گناہ

سَیُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوْا یَقْتَرِفُوْنَ ﴿۱۲۰﴾

سزا دیئے جائیں گے اسکی جو تھے وہ کرتے (۱۲۰)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور چھوڑ دو کھلا ہوا گناہ اور چھپا ہوا، بیشک جو لوگ گناہ کرتے ہیں وہ اپنے کیے کی سزا پائیں گے۔(۱۲۰)

تفسیر

پچھلی آیتوں میں بیان ہوا کہ دنیا میں بہت کم لوگ ہیں جو ٹھیک بات سوچتے اور درست کام کرتے ہیں اکثر لوگ ایسے ہیں جنہوں نے اپنی باگ دوڑ اپنی خواہشوں کے ہاتھ میں دے دی ہے جدھر وہ چلاتی ہے ادھر چلتے ہیں، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے آپ کی امت کو حکم دیا گیا ہے کہ کسی کے کہنے پر مت چلو، قرآن مجید میں جو لکھا ہے اس کے مطابق چلو، اوراوروں کے کہنے پر چلنا گمراہی ہے اور قرآن مجید کے مطابق چلنا سیدھے راستہ پر چلنا ہے، اس آیت میں اسی بات کو اور طرح سمجھایا گیا ہے، ارشاد ہے کہ: کھلا گناہ بھی چھوڑ دو جو لوگ گناہ کرتے ہیں ان کو ان کے کرتوتوں کی سزا ضرور دی جائے گی اس کا مطلب اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے، اگر کوئی کسی ایسے شخص کے کہنے سے جو قرآن مجید کے خلاف کہتا ہے کوئی کام کرے تو یہ کھلا گناہ ہوگا اور اگر جو وہ کہتا ہے وہ کرے تو نہیں لیکن دل میں قرآن مجید کے حکم کے اندر شبہ کرنے لگے تو یہ چھپا ہوا گناہ ہوگا ان دونوں سے بچنا چاہئے۔

جو لوگ دوسروں کو ستانے سے چوری، رشوت، بدمعاشی سے صرف حکومت کے خوف سے بچتے ہیں کہ کہیں پولیس نہ پکڑے اور حاکم سزا نہ دیدے، وہ خفیہ گناہ گار ہیں اور ان کا یہ فعل چھپا گناہ ہے کیونکہ جب انہیں ایسا موقعہ ملے گا کہ نہ وہاں پولیس دیکھتی ہے نہ حاکم موجود ہے وہ نڈر ہو کر کھلم کھلا گناہ کر بیٹھیں گے، اس لئے یہاں چھپے ہوئے اور کھلے ہوئے گناہ سے بچنے کی صورت یہ ہے کہ گناہ پولیس اور حاکم کے خوف سے نہیں بلکہ اس لئے چھوڑے کہ قرآن مجید کے حکم کی نافرمانی ہوتی ہے اور تنہائی میں بھی اس لئے رکے کہ قرآن مجید نے منع کیا ہے اور اگر ایسا نہ کیا تو اس آیت کے مطابق دونوں کو سزا ملے گی کیونکہ پولیس اور حکومت کے خوف سے برے کام سے بچنے والے کا دل گناہ گار ہے اور اس کے گناہ کو اور کوئی نہیں تو اللہ تعالیٰ تو جانتے ہی ہیں اسی طرح تنہائی میں گناہ

کرنے والے کو کوئی روکنے والا نہیں لیکن وہ قرآن مجید کے حکم کو توڑ رہا ہے اور اللہ تعالیٰ اسے دیکھ رہے ہیں اور اس کی اسے سزا دیں گے۔

اس آیت کا صاف مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ظاہر اور باطن دونوں کو پاک وصاف رکھنے کا حکم دیتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ نہ کسی کے سامنے گناہ کرو اور نہ تنہائی میں اور نہ ہاتھ پیر سے کرو اور نہ دل سے، کیونکہ گناہ ہر حالت میں گناہ ہے۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ظاہری، یعنی: کھلے گناہ وہ ہیں جو آنکھ، کان، ہاتھ وغیرہ سے کئے جائیں اور باطنی گناہ، یعنی: ڈھکے چھپے گناہ وہ ہیں جس کا تعلق انسان کے دل کے ساتھ ہو، برا عقیدہ اور بری نیت دل میں پیدا ہوتی ہے، اس لحاظ سے یہ باطنی گناہ شمار ہوتے ہیں، اسی طرح حسد، کینہ، بغض، نفرت وغیرہ روحانی مرض ہیں جن کا تعلق باطن سے ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ظاہری گناہ بھی چھوڑ دو اور باطنی گناہ سے بھی باز آ جاؤ، ساتھ یہ بھی بتلا دیا کہ جو لوگ گناہ کماتے ہیں انہیں ان کی کمائی کے مطابق بدلہ دیا جائے گا گناہ کر کے کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے بچ نہیں سکتا اسے ضرور اس کی سزا بھگتنی ہوگی۔

اللہ کا نام لیکر ذبح کیے ہوئے جانوروں کے

بارے میں شیطانوں کا وسوسہ

وَ لَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَ اِنَّهٗ لَفِسْقٌ ؕ وَ

اور نہ کھاؤ تم اس میں سے کہ نہیں ذکر کیا گیا نام اللہ کا اوپر جسکے اور یہ کھانا البتہ گناہ ہے اور

اِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓى اَوْلِيٰٓـِٕهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ ۚ وَ اِنْ

بیشک شیطان البتہ وسوسہ ڈالتے ہیں طرف دوستوں اپنے کے تا کہ وہ مناظرہ کریں تم سے اور اگر

اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ ﴿١٢١﴾ ع ۱۴ / ۱۱ / ۱

کہنا مانا تم نے ان کا تو بیشک تم ضرور مشرک ہو جاؤ گے (۱۲۱)

با محاورہ ترجمہ:۔ اور ذبح کے وقت جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا اس میں سے نہ کھاؤ اور یہ کھانا گناہ ہے اور شیطان اپنے ساتھیوں کی طرف وسوسے ڈالتے ہیں تاکہ وہ تم سے مناظرہ کریں اور اگر تم نے ان کا کہنا مانا تو تم بھی مشرک ہو جاؤ گے۔ (۱۲۱)

لفظی تحقیق: فِسْقٌ: نافرمانی۔ شرع کے خلاف کام کرنا جو ایسے کام کرے وہ فاسق ہے۔ اَوْلِيَآءُ: "وَلِیٌّ" کی جمع ہے، جس کے معنٰی ہیں: قریبی رشتہ دار، دوست ساتھی اور رفیق۔

تفسیر

جس جانور کو اللہ کے سوا کسی اور کا نام لے کر ذبح کیا گیا ہو وہ حرام ہے اس کا گوشت نہ کھانا چاہئے ورنہ گناہ لازم آئے گا، شریعت کی خلاف ورزی ہوگی، شیطان اپنے تابعداروں کو یہ سکھاتے رہتے ہیں کہ وہ تم سے الٹی سیدھی بحث کریں، مقصد یہ ہے کہ کسی طرح تم شریعت کی پابندی نہ کرو اگر تم نے ان کا کہنا مانا تو تم میں اور مشرکوں میں فرق کیا رہ گیا؟ وہ بھی تو یہی کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو جیسے ماننا چاہئے نہیں مانتے اس کے حکموں کی پروا نہیں کرتے اس میں اپنی طرف سے نکتہ چینی کرتے ہیں اور الٹی سیدھی باتیں کرتے ہیں جیسے پہلے گذرا، اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے فیصلہ کے خلاف کسی اور کا فیصلہ ماننا بھی شرک ہے، ہاں اگر قرآن کریم کے خلاف نہ ہو تو کوئی حرج نہیں اگر قرآن کریم کے خلاف ہو تو اس کا ماننے والا اس آیت کی رو سے مشرکوں میں شامل ہے۔

وَاِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓى اَوْلِيٰٓـئِهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ: شیطان ایسی باتیں اپنے دوستوں کے دلوں میں ڈالتے ہیں تاکہ وہ بہک کر مردار کھانے لگیں یا اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی نذر و نیاز دینے لگیں، شیطان لوگوں کو یہ سمجھاتے ہیں کہ ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے اللہ تعالیٰ کا نام لینے نہ لینے سے چیز کی پاکیزگی میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لہٰذا جو چاہو کرتے جاؤ، حالانکہ اللہ تعالیٰ کا نام نہ لینے سے چیزوں میں روحانی گندگی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ حرام ہو جاتی ہے۔

شیطان اس لئے وسوسہ ڈالتے ہیں تا کہ وہ تمہارے ساتھ مناظرہ کریں اگر تم ان شیطانوں کی بات مان لوگے ان کے بہکاوے میں آجاؤ گے تو بیشک تم مشرک بن جاؤ گے، شرک صرف اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کی پوجا کرنے کا نام ہی نہیں بلکہ اگر اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں دوسروں کا حکم بھی اسی طرح مانا جائے جس طرح اللہ تعالیٰ کا حکم مانا جاتا ہے تو یہ بھی شرک میں داخل ہے، فرمایا: خوب سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کی اطاعت سے تمہارا شمار بھی مشرکوں میں ہوگا۔

احکام ومسائل

مسئلہ (۱):.... جس جانور کے ذبح کے وقت اللہ تعالیٰ کا نام ذکر نہیں کیا گیا اس کو مت کھاؤ وہ حرام ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا نام لینے سے ذبح کیا ہوا جانور حلال ہو جاتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کے نام پر ذبح کرنے سے حرام ہو جاتا ہے۔

روشنی اور اندھیرا برابر نہیں

اَوَ مَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَ جَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي

اور کیا جو وہ تھا مردہ پھر زندہ کردیا ہم نے اسے اور کردی ہم نے لئے اسکے روشنی چلتا ہے اسے لیکر میں

النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ؕ كَذٰلِكَ

لوگوں کے اس جیسا جسکا یہ حال ہے میں اندھیروں نہیں نکلنے والا سے اس اسی طرح

زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۲﴾

خوبصورت بنادی گئی لئے کافروں کے اس کو کہ ہیں وہ کرتے (۱۲۲)

بامحاورہ ترجمہ:۔ بھلا ایک شخص جو کہ مردہ تھا پھر ہم نے اس کو زندہ کردیا اور ہم نے اس کو روشنی دی کہ

اس کو لوگوں میں لئے پھرتا ہے اس کے برابر ہوسکتا ہے کہ جس کا حال یہ ہے کہ وہ اندھیروں میں پڑا ہے اور وہاں سے نہیں نکل سکتا اسی طرح کافروں کی نگاہ میں ان کے کام خوبصورت بنا دیئے گے۔(۱۲۲)

تفسیر

پچھلی آیتوں میں مردہ جانور اور اللہ تعالیٰ کا نام لے کر ذبح کئے ہوئے جانور کے بارے میں حکم بیان کئے گئے کہ مردار حرام ہے اور اللہ تعالیٰ کے نام پر ذبح کیا ہوا حلال ہے، یہ بھی کہا گیا تھا کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور قرآن کریم کی بات نہیں مانتے وہ اس قابل نہیں کہ ان کی بات سنی جائے اس آیت میں یہی حقیقت ایک مثال کے ذریعہ سے سمجھائی گئی ہے۔

اس آیت میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور قرآن کریم پر ایمان لانے والوں اور کفر و انکار کرنے والوں کے کچھ حالات و خیالات اور دونوں کے نیک و بد انجام کا بیان اور مؤمن و کافر اور ایمان و کفر کی حقیقت کو مثالوں میں سمجھایا گیا ہے، مؤمن اور کافر کی مثال زندہ اور مردہ سے اور ایمان و کفر کی مثال روشنی اور اندھیرے سے دی گئی ہے، یہ قرآنی مثالیں ہیں جن میں کوئی شاعری نہیں ایک حقیقت کا اظہار ہے۔

مؤمن زندہ اور کافر مردہ

اس مثال میں مؤمن کو زندہ اور کافر کو مردہ بتلایا گیا ہے وجہ یہ ہے کہ انسان، حیوانوں اور پودوں وغیرہ میں اگر چہ زندگی پائی جاتی ہے اور زندگی کی قسمیں اور شکلیں مختلف ہیں لیکن اتنی بات سے کوئی سمجھدار انسان انکار نہیں کرسکتا کہ ان میں سے ہر ایک کی زندگی کسی خاص مقصد کیلئے ہے اور قدرت نے اس میں اس مقصد کو حاصل کرنے کی پوری اہلیت اور صلاحیت رکھی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے دنیا کی ہر چیز کو پیدا فرمایا ہے اور اس کو جس مقصد کیلئے پیدا فرمایا ہے اس تک پہنچنے کی اس کو پوری ہدایتیں دیدیں جن کے ماتحت ہر مخلوق اپنا اپنا فرض ادا کر رہی ہے، اس دنیا میں زمین، پانی، ہوا اور آگ

اسی طرح آسمانی مخلوق، چاند، سورج اور تمام ستارے اپنا اپنا کام کر رہے ہیں اور یہی اپنے اپنے کام میں لگے رہنا ان کی زندگی کا ثبوت ہے اور جس وقت جس حال میں ان میں سے کوئی چیز اپنا کام کرنا چھوڑ دے تو وہ زندہ نہیں بلکہ مردہ ہے پانی اگر اپنا کام پیاس بجھا دینا اور میل کچیل دور کرنا وغیرہ چھوڑ دے تو وہ پانی نہیں کہلائے گا، آگ جلنا اور جلانا چھوڑ دے تو وہ آگ نہیں رہے گی، درخت اور گھاس اُگنا اور بڑھنا، پھر پھل پھول لانا چھوڑ دے تو وہ درخت اور پودے نہیں رہیں گے کیونکہ اس نے اپنے زندگی کے مقصد کو چھوڑ دیا تو وہ ایک بے جان مردہ کی طرح ہوگئی۔

دنیا کی تمام چیزوں کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد ایک انسان جس میں کچھ بھی عقل و شعور ہو اس بات پر غور کرنے کیلئے مجبور ہوگا کہ انسان کی زندگی کا مقصد کیا ہے اور اس کی ڈیوٹی کیا ہے؟ اور یہ کہ اگر وہ اپنے زندگی کے مقصد کو پورا کر رہا ہے تو وہ زندہ کہلانے کا مستحق ہے اور اس کو پورا نہیں کرتا تو وہ ایک مردہ لاش سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

ارشاد ہے کہ ایک شخص گمراہی اور جہالت کی وجہ سے مردہ ہو چکا تھا، پھر ہم نے اسے ایمان کی روح عطا کر کے زندہ کیا اور اس کیلئے ایک روشنی عطا کر دی جس کے ذریعہ وہ ہر چیز کو دیکھ کر اچھی طرح سمجھ لیتا ہے اور اسی کو لئے ہوئے لوگوں میں چلتا پھرتا ہے اور ان کی باتوں کی اچھائی برائی دیکھ سکتا ہے، کیا اس کے برابر وہ شخص ہو سکتا ہے جو بہت سے اندھیروں میں پھنسا ہوا ہے اور کوئی صورت ان سے نکلنے کی نہیں نہ اس کا دل زندہ ہے جو ایمان اور یقین سے ہوتا ہے اور نہ اس کے پاس کوئی روشنی ہے جس سے وہ ارد گرد کی چیزوں کو دیکھے اور اچھے برے میں تمیز کر سکے، اس اندھیرے میں جو چیزیں اس کے ساتھ لگ گئی ہیں یا کسی نے اسے پکڑا دی ہیں بس وہ انہی کو سب کچھ سمجھتا ہے ان کے سوا نہ کچھ دیکھ سکتا ہے، کیونکہ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا ہے اور اس کا دل تاریک ہے جہالت کے پردے پڑے ہوئے ہیں تعصب کی گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں اور اسی جیسے لوگ اس کی برابر تائید کر رہے ہیں جس کی وجہ سے وہ اپنی غلط باتوں میں اور بھی دھنسا چلا جاتا ہے یہی تاریکیاں اور اندھیرے

اسے گھیرے ہوئے ہیں اپنی باتوں اور اپنے کاموں کے سوا اور کوئی چیز اس کی نظر میں نہیں جچتی، ظاہر بات ہے کہ اس کی باتوں کو وہی پسند کرتا ہے یا اسی جیسے لوگ مان سکتے ہیں، آنکھوں والے اور اپنے پاس روشنی رکھنے والے ان باتوں کو نہیں مان سکتے کیونکہ وہ ان کی بھلائی برائی ان دونوں کے ذریعے اچھی طرح دیکھ سکتے ہیں اسی سے سمجھ میں آسکتا ہے کہ اندھیرے میں پھنسے ہوئے لوگ کیوں اپنی انہی چیزوں کو اچھا سمجھتے ہیں ان کے پاس نہ زندہ روح ہے اور نہ روشنی ہے پھر وہ ان کی برائی کو کیسے دیکھ سکتے ہیں، ان کیلئے انہی عملوں کو خوبصورت کردیا گیا ہے ان کو وہ سامان میسر ہی نہیں جس سے وہ اچھی چیزوں کو دیکھیں اور پرکھیں۔

گناہ کے ذریعے دل و دماغ میں گمراہی کا اندھیرا چھا جاتا ہے اور دل پر زنگ چڑھ جاتا ہے جس کی وجہ سے انسان حق و باطل میں فرق نہیں کرسکتا اس سے صحیح اور غلط کی پہچان اُٹھ جاتی ہے، اسی طرح سنت ایک روشنی ہے اور بدعت اندھیرا ہے جس کی وجہ سے انسان سیدھے راستے سے بھٹک جاتا ہے، علم اور جہالت کو بھی نور اور اندھیرا کہا گیا ہے، علم ہی انسان کو اچھائی اور برائی میں تمیز سکھاتا ہے، قرآن کریم اور ایمان بھی روشنی ہے جن سے مؤمن کا دل روشن ہوتا ہے اور وہ سیدھے راستے کو پالیتا ہے۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے کہ: ''ہر ظلم قیامت کے دن اندھیروں کی شکل میں ظاہر ہوگا''، یعنی: شرک، کفر، قتل ناحق، حق تلفی اور زیادتی وغیرہ قیامت کے دن اندھیروں کی صورت میں ہوں گے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی فرمان ہے کہ: انسان کے گناہ اور برائیوں کے سبب اس کیلئے قبر میں اندھیرے ہوں گے ایسے لوگوں کیلئے پل صراط پر بھی سخت اندھیرا ہوگا جب کہ ایمان والوں کیلئے وہاں روشنی ہوگی، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: ایمان والوں کو پل صراط سے گزرتے وقت ان کا ایمان روشنی عطا کرے گا اور وہ وہاں سے بخیر و خوبی گزر جائیں گے۔

بڑے مجرم

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِیْ كُلِّ قَرْيَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا لِيَمْكُرُوْا

اور	اسی طرح	کیا ہم نے	میں	ہر	بستی	بڑے لوگوں کو	مجرم اس کے	تا کہ شرارت کریں	

فِيْهَا ؕ وَ مَا يَمْكُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ وَ مَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

میں اس اور نہیں وہ شرارت کرتے مگر ساتھ آپ اپنے اور نہیں وہ جانتے (۱۲۳)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور اسی طرح ہم نے ہر بستی میں ان کے بڑوں ہی کو مجرم بنایا، تا کہ وہ چال چلیں اس میں اور اپنے ہی آپ پر چال چلتے ہیں اور ان کو اس کا شعور نہیں۔(۱۲۳)

تفسیر

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: انسان کی عادت یہ ہے کہ جب اس کے پاس بہت سارا مال و دولت ہو جاتا ہے اور لوگ اس کا کہنا ماننے لگتے ہیں تو وہ اپنے آپ کو بڑا سمجھنے لگتا ہے اور پھر ایسی تدبیریں سوچتا ہے کہ اس کی دولت بڑھتی ہی رہے اور اس کا اقتدار بنا ہی رہے اور عزت جوں کی توں رہے بلکہ روز بروز زیادہ ہو، اس مقصد کے حاصل کرنے کیلئے وہ جوڑ توڑ کرتا رہتا ہے اور مکر و فریب سے کام لیتا ہے، اللہ تعالیٰ اس آیت میں فرماتے ہیں کہ: ہم نے اس دولت دینے کو ایسا ہی خوبصورت بنا دیا ہے، اسی طرح ہم نے ہر بستی میں شرارت کرنے والا مالداروں اور سرداروں کو ہی بنایا ہے۔

اسلام کی تاریخ سے ظاہر ہے کہ عرب کے کافر جو اپنے مرتبہ اور مال میں مست تھے اور اسلام اور مسلمانوں کے مٹانے کیلئے سوچ سوچ کر نئی نئی ترکیبیں نکالتے تھے آخر موت کے گھاٹ اتارے گئے اور اسلام اور مسلمانوں کا بول بالا ہوا، اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ شرارت اور فتنہ وفساد کے بانی وہی لوگ ہوتے ہیں جو اپنے مال و مرتبہ میں مست ہو کر اپنا اور اپنی قوم کا انجام نہیں سوچتے، مفلس اور نادار لوگ ٹھیک بات کو جلد قبول کر لیتے ہیں اور اگر مالداران کو نہ اکسائیں تو وہ شرارت نہیں کرتے یہ بات تاریخ سے ظاہر ہے۔

اس آیت میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا مقصود ہے کہ قریش کے بڑے لوگ جو آپ کی مخالفت پر اتر آئے ہیں اس سے آپ غمگین نہ ہوں کہ یہ کوئی نئی بات نہیں، پچھلے پیغمبروں کو بھی ایسے لوگوں سے پالا پڑا ہے اور آخر کار

کافر رسوا اور ذلیل ہوئے اور اللہ تعالیٰ کا کلمہ بلند ہوا۔

پیغمبری اللہ تعالیٰ کی عطا ہے

وَ اِذَا جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَآ
اور جب آتی ہے ان تک کوئی آیت کہتے ہیں ہرگز ہم نہ مانیں گے جب تک کہ دیا جائے ہمیں ویسا ہی جو

اُوْتِىَ رُسُلُ اللّٰهِ ؔ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ؕ سَيُصِيْبُ
دیا گیا پیغمبروں کو اللہ کے اللہ زیادہ جانتا ہے کہاں بھیجے پیغام اپنے عنقریب پہنچے گی

وقف لازم
وقف منزل

الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا صَغَارٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَ عَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا
ان کو جنھوں نے جرم کئے ذلت پاس اللہ کے اور عذاب سخت اس لئے کہ

كَانُوْا يَمْكُرُوْنَ ﴿۱۲۴﴾
تھے وہ مکر کرتے (۱۲۴)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور جب ان کے پاس کوئی آیت آتی ہے تو کہتے ہیں ہم ہرگز ایمان نہ لائیں گے یہاں تک کہ ہمیں وہ کچھ دیا جائے جو کچھ کے پیغمبروں کو دیا گیا ہے، اللہ اس موقع کو خوب جانتا ہے جہاں اپنے پیغام بھیجے، عنقریب گنا ہگاروں کو اللہ کے ہاں ذلت اور سخت عذاب پہنچے گا، اس وجہ سے کہ وہ مکر کرتے تھے۔ (۱۲۴)

تفسیر

اس سے پہلے کہا گیا کہ دولت اور مرتبہ والے سیدھی اور سچی بات کہنے والوں کی چلنے نہیں دیتے اور ایسے حیلے اور مکر کرتے ہیں کہ وہ کبھی آگے نہ بڑھ سکیں اور نہ ان کی کوئی بات چلنے پائے، مکہ مکرمہ کے بااثر لوگ یہی کرتے تھے اور ایسے سر پھرے ہوگئے تھے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتے کہ ہم مالدار اور عزت والے ہیں،

پیغمبر ہوتے تو ہم ہوتے، تمہارے پاس نہ دولت، نہ نام، نہ مرتبہ تم کیسے پیغمبر ہو گئے؟ اس آیت میں اس کا جواب دیا گیا ہے۔

اس بارے میں ایک واقعہ بھی نقل کیا جاتا ہے کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کا باپ ولید بڑا امیر کبیر آدمی تھا، دس بیٹے اور وسیع مال و دولت تھا، معاشرے میں بڑا وقار حاصل تھا، کہتا تھا یہ سب کچھ میرے پاس ہے وحی تو مجھ پر آنی چاہئے تھی پیغمبری مجھے ملنی چاہئے تھی، یہ محمد کو کیسے مل گئی؟ کہتے تھے یہ قرآن کریم مکہ اور طائف کے بڑے آدمیوں پر کیوں نہیں اتارا گیا، پیغمبری ایک غریب شخص کو کیسے مل گئی؟ مگر اللہ تعالیٰ نے اس کا مختصر جواب دیدیا، اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں کہ اس نے پیغمبری کا پیغام کہاں رکھنا ہے (کس کو پیغمبر بنانا ہے)، وہ خالق ہیں اور باصلاحیت آدمی کو جانتے ہیں جو اس کا بوجھ اٹھا سکے، پیغمبری کی تقسیم نہ مال و دولت پر ہے اور نہ قوم اور برادری پر، یہ تو اللہ تعالیٰ کی عنایت ہے جس پر کردے، یہ کس تکبر میں مبتلا ہیں، ہر آدمی اس قابل نہیں ہے کہ اس پر وحی اتاری جائے یہ تو اللہ تعالیٰ کے انتخاب پر منحصر ہے۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے بروایت قتادہ نقل کیا ہے کہ قریش کے سب سے بڑے سردار ابوجہل نے ایک مرتبہ کہا کہ بنوعبد مناف، یعنی: پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان سے ہم نے ہر محاذ پر مقابلہ کیا جس میں کبھی ہم ان سے پیچھے نہیں رہے لیکن اب وہ یوں کہتے ہیں کہ تم شرافت و بزرگی میں ہمارا مقابلہ اس لئے نہیں کر سکتے کہ ہمارے خاندان میں ایک پیغمبر آئے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آتی ہے، پھر کہا کہ میں اللہ تعالیٰ کی قسم کھاتا ہوں کہ ہم کبھی ان کی پیروی نہ کریں گے جب تک خود ہمارے پاس ایسی ہی وحی نہ آنے لگے جیسی ان کے پاس آتی ہے اس آیت میں اسی کا بیان ہے۔

ارشاد ہے کہ ان کا حال تو دیکھو جب کوئی آیت یا نشانی ہمارا پیغمبر ان کے پاس لاتا ہے تو غرور سے سر ہلا کر کہتے ہیں کہ ہم تو تیری بات ہرگز نہ مانیں گے جب تک خود ہمارے اوپر وحی نہ اترے اور جو تم کہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں کو جو ملا کرتا ہے وہی ہم کو بھی ملے، ہم مالدار اور بارسوخ ہونے کی وجہ سے پیغمبر ہونے کے تم

سے زیادہ مستحق ہیں، ان سے کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ کو تم سے زیادہ اس بات کا علم ہے کہ پیغمبر ہونے کا مستحق کون ہے اور پیغمبری کسے ملنی چاہئے جس شخص کو اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ مقام اور مرتبہ دینا منظور ہوتا ہے اس کو شروع ہی سے اس کے قابل بنا کر پیدا کیا جاتا ہے اس کے اخلاق وعملوں کی خاص تربیت کی جاتی ہے، مالدار اور سردار ہونا اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی وقعت کی چیز نہیں ہے تم جو اپنے مال و دولت کے نشے میں چور ہو سچی اور ٹھیک بات کو ٹھکرا دیتے ہو اور گستاخی سے کہہ دیتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کو ہدایت دینی ہوگی تو خود ہمارے پاس فرشتے بھیج کہ اپنا پیغام براہ راست بھیجے گا تم جیسوں کی بات ہمارے نزدیک قابل قبول نہیں تمہاری اس گستاخی اور غرور کے بدلے تم پر اللہ تعالیٰ کی پھٹکار ہوگی اور اس مکروفریب کے بدلے میں جس کی بدولت تم نے یہ سب ڈھونگ رچا رکھا ہے تمہیں ذلیل کیا جائے گا اور تم پر سخت مار پڑے گی یہ تمہارا مکروفریب، دھوکے بازیاں اور بڑھ چڑھ کے بولنا عنقریب رنگ لائے گا تم دنیا میں بھی کہیں کے نہ رہو گے اور آخرت میں بھی منہ کی کھاؤ گے۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی فرمان ہے کہ قیامت والے دن متکبر لوگ چیونٹیوں کی شکل میں چھوٹے چھوٹے اٹھائے جائیں گے ان کو غرور کرنے کی وجہ سے ذلیل کیا جائے گا اللہ تعالیٰ نے ان کو دولت کی نعمت عطا کی مگر انہوں نے اس کا شکر کرنے کے بجائے تکبر کیا۔

دنیا کی دولت اور عزت بھی نشہ آور چیز کی طرح ہے کہ آدمی سچی باتوں کی طرف سے بالکل اندھا بہرہ ہو جاتا ہے اور جب تک موت کا وقت نہ آ جائے نہ آنکھ کھلتی ہے نہ کان، اللہ تعالیٰ اس آفت سے بچائے اور دولت والوں کو دولت کا صحیح استعمال کرنا سکھائے۔ آمین

ہدایت سے محروم

فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ ۚ وَ مَنْ

پس جس کیلئے ارادہ کرے اللہ یہ کہ ہدایت کرے اس کو کھول دیتا ہے سینہ اس کا واسطے اسلام کے اور جس کیلئے

يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي
ارادہ کرتا ہے یہ کہ گمراہ کرے اسکو کر دیتا ہے سینہ اس کے کو تنگ بھنچا ہوا گویا کہ زور سے چڑھتا ہے میں

السَّمَآءِ ؕ كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲۵﴾
آسمان اسی طرح کرتا ہے اللہ عذاب اوپر ان کے جو ایمان نہیں لاتے (۱۲۵)

با محاورہ ترجمہ:۔ سو اللہ جس کو چاہتا ہے کہ ہدایت کرے اس کے سینہ کو اسلام کے واسطے کھول دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے گمراہ کرے تو اس کے سینہ کو تنگ سے تنگ کر دیتا ہے گویا وہ زور سے آسمان پر چڑھتا ہے، اور اسی طرح اللہ ایمان نہ لانے والوں پر عذاب ڈالے گا۔ (۱۲۵)

لفظی تحقیق: حَرَجٌ: اس کے معنٰی ہیں ایسی گھنی جھاڑیاں جن میں کوئی گھس نہ سکے، یہاں اس سے مراد بھنچا ہوا اور گھٹا ہوا ہے۔ رِجْسٌ: پلید چیز، شیطان، ناپاکی، لعنت، پھٹکار، یہاں اس سے مراد دنیا میں لعنت اور آخرت میں عذاب ہے، یعنی: دونوں جہاں کی پھٹکار۔

تفسیر

آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ دنیا میں کسی کے مزاج اور طبیعت کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ ہمیشہ ٹیڑھی چال چلے کوئی بہت جلد سیدھے راستے کو پہچان لیتا ہے، اللہ تعالیٰ نے یہ قاعدہ مقرر کیا ہے کہ جو سیدھے راستے پر چلتا ہے اسے ہدایت کی جاتی ہے اور جو سیدھے راستے کو چھوڑ دیتا ہے اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے اس کو گمراہ کیا اور سیدھی راہ سے ہٹا دیا۔

يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ: شرح صدر، یعنی: سینے کا کھول دینا اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ہے اگر کسی شخص کے دل میں اسلام، دین اور ایمان کی سمجھ پیدا ہو جائے اور وہ اسلام کو قبول کرے تو یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان ہے، مگر اس کا دارومدار بھی انسان کی طلب پر ہی ہے، ”سورۂ عنکبوت“ میں ہے کہ جو لوگ ہماری طرف آنا

چاہتے ہیں ہم ان کے سامنے ہدایت کے راستے کھول دیتے ہیں اور جو لوگ اس جذبہ سے خالی ہوتے ہیں انہیں ہدایت نصیب نہیں ہوتی اور وہ محروم ہی رہتے ہیں ایسے لوگ اپنی صلاحیت اور عقل کو کام میں نہیں لاتے جس کی وجہ سے ان کیلئے ہدایت کا راستہ واضح نہیں ہوتا، دوسری جگہ یہ بھی موجود ہے اپنے رب کی طرف رجوع کرو، جو آدمی اللہ تعالیٰ سے سیدھے راستے کی طلب کرے گا یقیناً ان کے سامنے راستہ واضح کر دیا جائے گا اس کے برخلاف جو شخص مغرور ہے حساب کتاب کی فکر نہیں رکھتا ایمان والوں کو کمزور اور حقیر جانتا ہے دنیا کے اقتدار کو پسند کرتا ہے ایسے لوگ ہدایت کے مستحق نہیں ہوتے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ جس شخص کا سینہ اللہ تعالیٰ کھول دیں اس کی نشانیاں کیا ہیں؟ فرمایا ”الإنابة إلى دار الخلود و التجافي عن دار الغرور و الاستعداد للموت قبل ورود الموت“ یہ تین نشانیاں بیان فرمائیں کہ جس شخص کو شرح صدر حاصل ہو جائے وہ آخرت کی طرف رُخ کرتا ہے ہر وقت فکر میں رہتا ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش ہونا ہے، اور دوسری نشانی کہ وہ دھوکے کے گھر، یعنی: اس دنیا میں زیادہ مصروف نہیں ہوتا، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زہد کی بھی ایسی ہی تعریف فرمائی ہے، یعنی: زہد اس چیز کا نام ہے کہ تمہیں اس چیز پر اعتماد نہ ہو جو تمہارے ہاتھ میں ہے بلکہ اس چیز پر زیادہ اعتماد ہو جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے، یقیناً وہی پائیدار ہے اس دنیا میں ہمارے پاس جو ذریعے ہیں وہ تو عارضی ہیں ان پر کیسے بھروسہ کیا جا سکتا ہے؟

شرح صدر کی دوسری علامت یہ ہے کہ حتی الامکان دنیا سے دل نہ لگایا جائے، اس کا مطلب یہ نہیں کہ دنیا کو بالکل ہی چھوڑ دیا جائے کیونکہ اسلام میں دنیا کے چھوڑنے کا کوئی تصور نہیں، تاہم دنیا سے بچنے کی کوشش کرنی چاہئے اس کو عارضی قیام گاہ ہی سمجھنا چاہئے اور توجہ ہمیشہ رہنے والے گھر کی طرف ہی ہونی چاہئے۔

شرح صدر کی تیسری علامت یہ ہے کہ ایسا شخص موت کے آنے سے پہلے اس کی تیاری میں لگا رہتا ہے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے، یعنی: لذتوں کو ختم کر دینے والی چیز موت کا کثرت سے ذکر کیا کرو، اس سے دل

میں صفائی پیدا ہوتی ہے جو شخص قرآن پاک کی تلاوت کرتا ہے اور موت کو کثرت سے یاد کرتا ہے اس کے دل پر زنگ نہیں چڑھے گا۔

وَ مَنۡ یُّرِدۡ اَنۡ یُّضِلَّهٗ یَجۡعَلۡ صَدۡرَهٗ ضَیِّقًا حَرَجًا: دل کی کشادگی کے ذکر کے بعد اللہ تعالیٰ نے دل کی تنگی کے متعلق فرمایا ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ گمراہ کرنے کا ارادہ کرتے ہیں اس کے سینے کو تنگ کردیتے ہیں، جس شخص کو اللہ تعالیٰ گمراہی میں رکھنا چاہتے ہیں اس کا دل تنگ اور سخت کردیتے ہیں اس کو حق بات کا قبول کرنا اور اس پر عمل کرنا ایسا مشکل معلوم ہوتا ہے جیسے کسی انسان کا آسمان پر چڑھنا، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ جب وہ اللہ تعالیٰ کا ذکر سنتا ہے تو اس کو وحشت ہونے لگتی ہے اور جب کفر وشرک کی بات سنتا ہے تو ان میں دل لگتا ہے۔

دل کا تنگ ہوجانا بلا وجہ نہیں ہوتا بلکہ اس کے بھی اسباب ہوتے ہیں جو لوگ اپنے دل کا شیشہ صاف رکھتے ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے ہیں اور ہدایت کے طلبگار رہتے ہیں اللہ تعالیٰ یقیناً ان کے سامنے سیدھے راستے کو واضح کردیں گے اس کے برخلاف جو شخص اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہی نہیں کرتا، جسے حساب کتاب کی فکر ہی نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کو حقیر سمجھتا ہے، دنیا سے محبت کرتا ہے اور مرتبہ کو پسند کرتا ہے ایسے لوگوں کے دلوں کو اللہ تعالیٰ تنگ کردیتے ہیں اور پھر وہ ہدایت کو قبول کرنے کی صلاحیت ہی کھو بیٹھتے ہیں ایسے لوگوں کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ایسے لوگ اندھے اور بہرے ہوجاتے ہیں ان کے دل تنگ ہوجاتے ہیں، پھر نہ وہ عقل کو صحیح طور پر استعمال کرتے ہیں اور نہ انہیں سیدھا راستہ ملتا ہے۔

كَذٰلِكَ يَجۡعَلُ اللّٰهُ الرِّجۡسَ عَلَى الَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ: اسی طرح اللہ تعالیٰ ایمان نہ لانے والوں پر ان کے کفر وشرارت کی وجہ سے پھٹکار ڈالتے ہیں۔

سیدھا راستہ

وَ هٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسۡتَقِيۡمًا ؕ قَدۡ فَصَّلۡنَا الۡاٰيٰتِ لِقَوۡمٍ

اور | یہ | راستہ ہے | رب آپ کے کا | سیدھا | تحقیق | کھول دیا ہم نے | نشانیوں کو | لئے ایسی قوم کے

يَذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۲۶﴾ لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَ هُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا
جونصیحت پکڑتے ہیں (۱۲۶) لئے انہی کے گھر ہے سلامتی کا پاس رب کے ان کے اور وہی مددگار ہے انکا وجہ سے اکی

كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۷﴾
جو تھے وہ عمل کرتے (۱۲۷)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور یہ آپکے رب کا سیدھا راستہ ہے ہم نے نشانیوں کو غور کرنے والوں کے لئے واضح کردیا ہے۔(۱۲۶) انہی کے لئے اپنے رب کے ہاں سلامتی کا گھر ہے اور وہ ان کے عملوں کی وجہ سے ان کا مددگار ہے۔(۱۲۷)

لفظی تحقیق: دَارُ السَّلٰمِ: یہ دو لفظ کا مجموعہ ہے "دَارُ" اور "السَّلٰمِ" "دَارُ": کے معنٰی گھر، اور السَّلٰمِ: کے معنٰی سلامتی، امن، چین، آرام و آسائش کے ہیں، دَارُ السَّلٰمِ: کے معنٰی ہوئے آرام و آسائش کا گھر، یہ جنت کا نام ہے۔

تفسیر

اس آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ جس کی طبیعت دنیا کی بناوٹ کی رو سے جیسی بن گئی ہے اور جس کی طبیعت جیسی بن گئی ہے اس کے مطابق اللہ تعالیٰ اسے سیدھا راستہ دکھاتے ہیں یا اس کی طبیعت اور عملوں کے مطابق اسے گمراہی کے گڑھے میں دھکیل دیتے ہیں، یہ جو قرآن مجید بتا رہا ہے اور اے پیغمبر! جو کچھ آپ انہیں سکھا رہے ہیں یہی آپ کے رب کا مقرر کیا ہوا سیدھا راستہ ہے جو انسان کو منزل مقصود تک پہنچائے گا جو اس پر چلیں گے وہ ایسی جگہ پہنچ جائیں گے جہاں انہیں سارے جھگڑوں سے نجات مل جائے گی، ان کے رب کے پاس ان کیلئے جنت کی تمام نعمتیں تیار ہیں۔

اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ ان نیک بخت لوگوں کیلئے ان کے رب کے پاس "دارالسلام" ہے، رب کے پاس ہونے کے یہ معنٰی بھی ہوسکتے ہیں کہ یہ "دارالسلام" یہاں نقد نہیں ملتا بلکہ جب وہ قیامت کے روز اپنے

رب کے پاس جائیں گے اس وقت ملے گا اور یہ معنٰی بھی ہو سکتے ہیں کہ "دار السلام" کا وعدہ غلط نہیں ہو سکتا، اللہ تعالیٰ اس کا ضامن ہے وہ اس کے پاس محفوظ ہے اور اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ اس "دار السلام" کی نعمتوں اور راحتوں کو آج کوئی تصور میں بھی نہیں لا سکتا، اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں جس کے پاس یہ خزانہ محفوظ ہے۔

ان نیک لوگوں نے دنیا میں جو اپنی خواہشوں کو چھوڑ کر اپنے رب کی فرمانبرداری پر کمر باندھی تھی اس کے صلہ میں ان کو اپنے رب کا قرب حاصل ہوگا اور وہ ان کا مددگار بن جائے گا۔

شیطان کا راستہ

وَ يَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ۚ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ

اور جس دن جمع کرے گا ان کو سب کے سب کو (کہے گا) اے گروہ! جنوں کے تحقیق تم نے بہت سے تابع کر لئے

مِّنَ الْاِنْسِ ۚ وَ قَالَ اَوْلِيٰٓؤُهُمْ مِّنَ الْاِنْسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ

میں سے انسانوں سے اور کہا دوستوں نے انکے میں سے انسانوں اے رب ہمارے! فائدہ اٹھایا

بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَّ بَلَغْنَآ اَجَلَنَا الَّذِيْٓ اَجَّلْتَ لَنَا ؕ

بعض ہمارے نے سے بعض اور پہنچے ہم وقت اپنے تک جو مقرر کیا تھا آپ نے ہمارے لئے

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور جس دن ان سب کو جمع کرے گا فرمائے گا اے جنوں کی جماعت! تم نے آدمیوں میں سے بہت سو کو اپنے تابع کر لیا اور آدمیوں میں سے ان کے دوست کہیں گے اے ہمارے رب! ہم نے ایک دوسرے سے کام نکالا اور ہم اپنے وقت کو پہنچے جو آپ نے ہمارے لئے مقرر کیا تھا۔

لفظی تحقیق: اِسْتَكْثَرْتُمْ: بہت سے لے لئے تم نے۔ "كَثْرَةٌ" کے معنٰی زیادتی کے ہیں، "اِسْتِكْثَارٌ" کے معنٰی ہوئے بہت سا حصہ لے لینا اور زیادہ چیز لے لینا۔ اِسْتَمْتَعَ: فائدہ۔ "مَتَاعٌ" کے معنٰی ہیں کوئی کام کی چیز، مال و دولت، ساز و سامان وغیرہ، "اِسْتِمْتَاعٌ" کے معنٰی ہیں بہت سا مال و متاع یعنی سامان، دولت وغیرہ اکٹھا کر لینا، فائدہ اٹھانا۔ اَجَلٌ: اس کے معنٰی مقررہ وقت اور ساری مدت کے بھی ہیں، یہاں موت

مراد ہے جو مقررہ وقت پر آتی ہے۔ اَجَلْتَ: وقت مقرر کیا تو نے۔ یہ "تَأْجِیْلٌ" سے بنا ہے، جس کا معنیٰ ہے: وقت مقرر کرنا۔

تفسیر

اس آیت میں برے لوگوں کا حال بتایا گیا ہے۔ ارشاد ہے کہ: ایک دن سب انسان اور شیطان اللہ تعالیٰ کے سامنے جمع ہوں گے، شیطانوں سے انسانوں کے منہ درمنہ کہا جائے گا کہ تم نے دنیا میں خوب ہاتھ مارا اور بہت سے انسانوں کو اپنا تابع اور غلام بنالیا، چور کی داڑھی میں تنکا، شیطان کے غلام خود بخود بول پڑیں گے کہ ہم ان کے غلام نہ تھے نہ ان کی پوجا پاٹ کرتے تھے یونہی ایک دوسرے سے مل ملا کر کبھی ہم ان کا اور کبھی یہ ہمارا کہنا مان لیتے تھے اور ایک دوسرے کا کام نکال دیتے تھے یہاں تک کہ موت آ گئی اور جتنے دن آپ نے دنیا میں ہمارے جینے کیلئے مقرر کیے تھے وہ ختم ہوئے شیطانوں سے پہلے پوچھنے کا مطلب ہی یہی تھا کہ جواب انسان سے لیا جائے، آگے ان کا جواب دیا جائے گا۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش سے دو ہزار سال پہلے جن یہاں آباد تھے، پھر جب انہوں نے فتنہ و فساد کا بازار گرم کیا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں یہاں سے بھگا دیا اور یہ خوفناک جنگلوں، پہاڑوں اور جزیروں کی طرف چلے گئے اس طرح زمین ان سے پاک ہوگئی اور اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کر کے آپ کی نسل کو پھیلایا، مفسرین کرام یہ بھی فرماتے ہیں کہ انسانوں کی طرح جنوں میں بھی نیک اور بد ہوتے ہیں، بعض کافر بعض مشرک، بعض منافق اور بعض مؤمن اور موحد ہوتے ہیں جس طرح انسانوں میں مختلف فرقے پائے جاتے ہیں اسی طرح جن بھی مختلف فرقوں میں تقسیم ہیں، بہر حال جن اور انسان اللہ تعالیٰ کے قانون کے پابند ہیں، اگلے رکوع میں اس کی مزید تفصیل آئے گی۔

بُروں کا حشر

قَالَ النَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ اِنَّ

فرمائے گا آگ ہے ٹھکانہ تمہارا رہنے والے ہو میں اسی مگر جب چاہے اللہ بیشک

رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۲۸﴾ وَكَذٰلِكَ نُوَلِّيْ بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًا

رب تیرا حکمت والا ہے جاننے والا ہے (۱۲۸) اور اسی طرح ساتھی بناتے ہیں ہم بعض ظالموں کو بعض کا

ع ۱۵ ۸ ۲ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۱۲۹﴾

بوجہ اسکے جو تھے وہ کماتے (۱۲۹)

بامحاورہ ترجمہ:۔ فرمائے گا، تمہارا گھر آگ ہے اسی میں ہمیشہ رہا کرو گے مگر جب اللہ چاہے، البتہ آپ کا رب حکمت والا خبردار ہے۔(۱۲۸) اور اسی طرح ہم ان کے برے عملوں کی وجہ سے بعض گناہگاروں کو بعض کا ساتھی بنادیں گے۔(۱۲۹)

تفسیر

اس آیت میں ارشاد ہے کہ تم سب بہکنے اور بہکانے والوں کا ٹھکانہ دوزخ کی آگ ہے وہیں تمہیں رہنا ہوگا اس میں سے نکلنا نہ تمہارے اپنے بس کا ہوگا اور نہ اس میں سے نکالنا کسی اور کے بس کا ہوگا، تمہارے وہ معبود جن کی تم پوجا کرتے تھے جن پر نذر و نیاز اور چڑھاوے چڑھاتے تھے سب اپنا سا منہ لے کر رہ جائیں گے ان میں سے کوئی ذرہ بھر بھی تمہارے کام نہ آئے گا، اختیار صرف اللہ تعالیٰ کا ہوگا اور تم پر ظاہر ہوجائے گا کہ یہ بات تمہیں دنیا میں مانی چاہئے تھی آج جو تم مجبوراً مان رہے ہو یہ کوئی ماننا نہیں ہے آج تم اس کے سوا کچھ اور مان ہی نہیں سکتے کہ سارے کام اللہ تعالیٰ کی مرضی سے ہوتے ہیں اور جو کوئی خواہ وہ کچھ ہی ہو بالکل کچھ نہیں کرسکتا اور بات اصل میں ہے بھی یہی کہ سب کچھ اسی کی مرضی اور رحم و کرم سے ہوتے ہیں اور کسی میں نہ کوئی طاقت ہے نہ کسی

کو کچھ اختیار ہے۔

اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ: اس کا یہ مطلب ہے کہ قرآن پاک میں ہے کہ دوزخی جب دوزخ میں جلیں گے تو پانی مانگیں گے، پھر ان کو پانی کی طرف لے جایا جائے گا جو کہ کھولتا ہوا ہوگا اگر چہ اس سے دوزخیوں کو کوئی خاص فائدہ تو نہ ہوگا مگر اتنی دیر تک آگ میں جلنے سے بچے رہیں گے۔

وَ كَذٰلِكَ نُوَلِّيْ بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًا: جنوں اور انسانوں کے حساب کتاب کے ذکر کے بعد اللہ تعالیٰ نے آخرت میں مختلف لوگوں کے آپس میں قریب ہونے کا ذکر کیا ہے جن لوگوں کی سزا کا بیان ہوا ہے ان کے بارے میں فرمایا کہ: ہم اسی طرح بعض ظالموں کو بعض کے ساتھ، یعنی: دوزخ میں ملا دیں گے اور وہ ایک دوسرے کے ساتھی ہوں گے، "نُوَلِّيْ" کے معنیٰ قریب کرنے کے بھی ہوتے ہیں، چنانچہ حضرت سعید ابن جبیر رحمۃ اللہ علیہ، حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور بعض دیگر مفسرین نے اس آیت میں قریب کا معنیٰ ہی لیا ہے اور پورا مطلب اس طرح بیان کیا ہے کہ "اس طرح ہم بعض ظالموں کو بعض دوسرے ظالموں کے قریب کر دیں گے، یعنی: یہ سب ایک دوسرے کے قریب ہوں گے" اور اس سے بھی ان کی ذلت اور رسوائی مقصود ہے تاکہ ایک دوسرے کو دیکھیں اور ان کی ذلت و خواری اور حسرت و افسوس میں اضافہ ہو"، سورۂ تکویر" میں آخرت کے بارے میں تمام لوگوں کے متعلق فرمایا کہ: "جب ہر قسم کے لوگوں کو ملا دیا جائے گا"، مفسرین اس سے یہی مراد لیتے ہیں کہ ہر قسم کے لوگوں کے علیحدہ علیحدہ گروہ بنا دیئے جائیں گے، حشر کے میدان میں نیکوں کی قطاریں الگ ہوں گی اور بروں کی الگ ہوں گی، پھر یہ بھی ہے کہ عملوں اور جرموں کے اعتبار سے بھی الگ الگ قطاریں ہوں گی جس درجے کی کسی نے نیکی یا برائی کی ہے وہ اسی گروہ میں شامل ہوگا اسی طرح ظالم ظالموں کے ساتھ مل جائیں گے، شرک کرنے والے مشرکوں کے ساتھ ہوں گے اور توحید والے موحدوں کے گروہ میں شامل ہوں گے، یہاں تک کہ چور چوروں کے ساتھ ہوں گے اور عبادت گزار عبادت گزاروں کے ساتھ جس طرح دنیا میں لوگ اچھی سوسائٹی کی تلاش میں رہتے ہیں اسی طرح آخرت میں بھی ان کو بہتر سوسائٹی نصیب ہوگی اور جو لوگ اس دنیا میں

بری سوسائٹی میں رہتے تھے آخرت میں بھی انہیں ویسے ہی لوگوں کا ساتھ ملے گا، وہ سزا کے دوران بھی ایک دوسرے کے قریب ہی ہوں گے اور ایک دوسرے کو دیکھتے ہوں گے، آیت کریمہ کا یہ مفہوم بھی قرآن وحدیث سے ثابت ہے۔

"نُوَلِّیْ" کا ایک معنیٰ مسلط کر دینا بھی ہے، اس معنیٰ کے اعتبار سے تفسیر یہ ہوگی کہ اللہ تعالیٰ اپنے قانون کے مطابق ایک ظالم پر دوسرے بڑے ظالم کو مسلط کر دیتے ہیں، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے کہ: یعنی: اے لوگو! جس طرح کے تم خود ہو گے اسی طرح کے تم پر حاکم مقرر کر دیئے جائیں گے، اگر تم اچھی عادتوں اور خصلتوں کے مالک ہو اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے حقوق ادا کرتے ہو نیکی کا حکم کرتے ہو اور برائی سے روکتے ہو تو تمہارے حاکم بھی رحم دل اور خدمت کا جذبہ رکھنے والے ہوں گے اور اگر تم ظلم کے عادی ہو گے، کمزوروں پر ظلم کرو گے، غریبوں کی حق تلفی کرو گے تو اللہ تعالیٰ تم پر حاکم بھی ایسے مسلط کر دیں گے جو تمہیں ظلم کا نشانہ بنائیں گے اور تمہیں ذلیل وخوار کر کے رکھ دیں گے، ایک دوسری حدیث میں آتا ہے کہ جو شخص ظالم کی مدد کرے گا اللہ تعالیٰ اس پر ایک بڑا ظالم مسلط کر دیں گے جو اسے ذلیل کرے گا، دنیا میں جہاں کہیں لوگوں میں ظلم وستم کا دور دورہ ہو ان پر حاکم بھی ایسے ہی مسلط ہوتے ہیں جو ان کے ساتھ ذلت کا سلوک کرتے ہیں اور یہ سب کچھ ان کی اپنی کمائی کا بدلہ ہوتا ہے جو سلوک وہ اپنے سے کم تر لوگوں کے ساتھ کرتے ہیں وہی سلوک ان کے ساتھ بھی کیا جاتا ہے جب کوئی قوم عدل وانصاف کے بجائے ظلم کو پسند کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ ان پر کسی ظالم کو ہی مسلط کر دیتا ہے تو بہر حال اسی طرح ہم بعض کو بعض پر مسلط کر دیتے ہیں اور انسانوں پر شیطانوں کا مسلط ہونا انسانوں کے اپنے عملوں کی وجہ سے ہوتا ہے اصل میں یہ بیان تو کفر وشرک اور شیطان کے مسلط کر دینے کا تھا تاہم ایک انسان کو دوسرے پر مسلط کر دینے پر بھی بولا جاتا ہے اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کا قانون ہے کہ وہ ایک ظالم کو دوسرے ظالم کے ذریعے دور کر دیتے ہیں اور پھر یہ بھی بیان ہو گیا کہ جس طرح دنیا میں ایک طرح کی سوجھ بوجھ کے آدمی ایک گروہ میں شامل ہوتے ہیں اسی طرح آخرت میں ہر شخص اپنے اپنے عملوں اور عقیدوں کے مطابق اپنے اپنے گروہ میں شامل ہوگا۔

دنیا میں بھی عملوں و اخلاق کا اجتماعی معاملوں میں اثر

یہ موجودہ رشتوں اور ناطوں اور رسمی تنظیموں کا کٹ جانا قیامت کے دن میں تو واضح اور مکمل طور پر سب کے سامنے آ ہی جائے گا، مگر دنیا میں بھی اس کا ایک ادنیٰ سا نمونہ ہر جگہ پایا جاتا ہے کہ نیک آدمی کو نیکوں سے مناسبت ہوتی ہے انہی کی جماعت اور سوسائٹی سے وابستہ ہوتا ہے اور اس طرح نیک کاموں میں اس کیلئے راستے کھلتے نظر آتے ہیں اور ارادہ مضبوط ہوتا جاتا ہے اسی طرح بدکردار کو اپنے ہی جیسے بدکرداروں سے تعلق اور انس ہوتا ہے وہ انہیں میں اٹھتا بیٹھتا ہے اور ان کی صحبت سے اس کی بدعملی و بدخلقی میں روز نیا اضافہ ہوتا رہتا ہے اور نیکی کے راستے اس کے سامنے سے بند ہوتے جاتے ہیں یہ اس کے برے عمل کی نقد سزا اسی دنیا میں ملتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اچھے اور برے عملوں کی ایک جزا سزا تو آخرت میں ملے گی اور ایک جزا سزا نقد اسی دنیا میں اس طرح مل جاتی ہے کہ نیک آدمی کو ساتھی بھی نیک اور دیانتدار نصیب ہو جاتے ہیں جو اس کے کام کو چار چاند لگا دیتے ہیں اور برے اور بدنیت آدمی کو اعضاء و جوارح اور ساتھی بھی اسی جیسے ملتے ہیں جو اس کو اور بھی زیادہ گہرے غار میں دھکیل دیتے ہیں۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: جب اللہ تعالیٰ کسی بادشاہ اور حاکم سے راضی ہوتے ہیں تو اس کو اچھے وزیر اور اچھا عملہ دیدیتے ہیں جس سے اس کی حکومت کے سب درست ہونے لگتے ہیں اور جب کسی سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتے ہیں تو اس کو عملہ اور ساتھی بھی برے ملتے ہیں، برے افسروں سے واسطہ پڑتا ہے وہ اگر کوئی اچھا کام کرنے کا ارادہ بھی کرتا ہے تو اس پر قابو نہیں پاتا۔

پیغمبروں کا پیغام

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ

اے گروہ! جنوں کے اور انسانوں کے کیا نہیں آئے تم تک پیغمبر میں سے تم بیان کرتے تھے

عَلَيۡكُمۡ اٰيٰتِىۡ وَيُنۡذِرُوۡنَكُمۡ لِقَآءَ يَوۡمِكُمۡ هٰذَا‌ ؕ قَالُوۡا شَهِدۡنَا

پر تم آیتیں میری اور ڈراتے تھے تم کو ملاقات سے دن تمہارے کی جو یہ ہے کہیں گے گواہی دیتے ہیں ہم

عَلٰٓى اَنۡفُسِنَا‌ وَغَرَّتۡهُمُ الۡحَيٰوةُ الدُّنۡيَا وَشَهِدُوۡا عَلٰٓى اَنۡفُسِهِمۡ

خلاف جانوں اپنی کے اور بہکایا ان کو زندگی نے دنیا کی اور گواہی دی انہوں نے اوپر جانوں اپنی کے

اَنَّهُمۡ كَانُوۡا كٰفِرِيۡنَ ﴿۱۳۰﴾

کہ وہ تھے کفر کرنے والے (۱۳۰)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اے جنوں اور انسانوں کی جماعت! کیا تمہارے پاس تم ہی میں سے پیغمبر نہیں پہنچے تھے کہ تم کو میرے حکم سناتے تھے اور اس دن کے پیش آنے سے ڈراتے تھے، کہیں گے: ہم اپنی جانوں کے خلاف گواہی دیتے ہیں اور ان کو ان کی دنیا کی زندگی نے بہکایا اور انہوں نے اپنی جانوں کے خلاف گواہی دی کہ وہ کفر کرنے والے تھے۔ (۱۳۰)

تفسیر

اس سے پہلی آیتوں سے معلوم ہوا کہ قیامت کے دن سب پر حقیقت کھل جائے گی اور اس وقت سب ایمان لے آئیں گے اور سمجھیں گے کہ یہ ایمان ان کے کام آ جائے گا مگر ایمان وہی کام آئے گا جو اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں کو عقل سے پہچان کر اور اللہ تعالیٰ کی آیتیں سن کر دیکھ کر لایا گیا ہو۔

ارشاد ہے کہ قیامت میں کہا جائے گا کہ اے جن و انسان! کیا دنیا میں تمہارے پاس ہمارے پیغمبر تم ہی میں سے نہیں آئے تھے اور انہوں نے تمہیں ہماری آیتیں نہیں سنائی تھیں اور تمہیں آج کے دن سے نہیں ڈرایا تھا؟ سب لوگ جواب دیں گے کہ ہاں، آج ہماری آنکھیں کھل گئی ہیں اور ہمیں صاف نظر آ رہا ہے کہ ہم سخت غلطی پر تھے اور ہم نے دنیا میں پیغمبروں کا کہنا نہ مان کر آج اپنے آپ کو بڑی آفت میں پھنسا لیا اس دن تو یہ کہیں

گے، لیکن آج ان کو دنیا نے بڑا دھوکا دے رکھا ہے وہ یہیں کی زندگی کی فضول چیزوں میں پھنس کر رہ گئے ہیں۔

ایک سوال وجواب کا ذکر گزرا جو کہ قیامت کے دن جنوں اور انسانوں کو مخاطب کر کے کیا جائے گا کہ تم جو کفر اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں مبتلا ہوئے اس کی کیا وجہ ہے؟ کیا تمہارے پاس ہمارے پیغمبر نہیں پہنچے جو تمہاری قوم میں سے تھے جو میری آیتیں تم کو پڑھ پڑھ کر سناتے اور آج کے دن کی حاضری اور حساب سے ڈراتے تھے؟ اس کے جواب میں ان سب کی طرف سے پیغمبروں کے آنے اور حق کا پیغام سنانے کا اور اس کے باوجود کفر و نافرمانی میں مبتلا ہونے کا اقرار ذکر کیا گیا ہے اور ان کی طرف سے کوئی وجہ اور سبب اس برے کام کا ذکر نہیں کیا گیا بلکہ حق تعالیٰ نے ہی اس کی وجہ یہ بتلائی ہے کہ ان لوگوں کو دنیا کی زندگی اور لذتوں نے دھوکہ میں ڈال دیا کہ وہ اسی کو سب کچھ سمجھ بیٹھے جو حقیقت میں کچھ نہ تھا اور انجام سے غافل ہو گئے۔

اس آیت میں ایک بات تو یہ غور کے قابل ہے کہ بعض دوسری آیتوں میں تو یہ ذکر ہے کہ مشرکوں سے جب قیامت کے دن ان کے کفر و شرک کے متعلق سوال ہوگا تو وہ اپنے جرم سے مکر جائیں گے اور اللہ تعالیٰ کے دربار میں قسم کھا کر یہ جھوٹ بولیں گے کہ قسم ہے ہمارے پروردگار اللہ تعالیٰ کی! ہم مشرک ہرگز نہ تھے اور اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے کفر و شرک کا شرمندگی کے ساتھ اقرار کر لیں گے، ان دونوں آیتوں میں آپس میں اختلاف نظر آتا ہے مگر دوسری آیتوں میں اس کی تشریح اس طرح موجود ہے کہ ابتدا میں جب ان سے سوال ہوگا تو مکر جائیں گے مگر اس وقت اللہ تعالیٰ اپنی قدرت سے ان کی زبانیں بند کر دیں گے، ہاتھوں، پیروں اور دوسرے اعضاء سے گواہی لیں گے، اللہ تعالیٰ کی قدرت سے وہ بول پڑیں گے اور وہ صاف صاف اس کے سارے عملوں کا کچا چٹھا بیان کر دیں گے اور اس وقت جنوں اور انسانوں کو یہ معلوم ہوگا کہ ہمارے ہاتھ پاؤں اور کان اور زبان سب قدرت کے کارخانہ کے خفیہ افراد تھے جنہوں نے سارے معاملوں اور حالات کی سچی اور صحیح گواہی دیدی تو اب ان کو انکار کرنے کی کوئی گنجائش نہ رہے گی اس وقت یہ سب لوگ صاف صاف جرم کا اعتراف کر لیں گے۔

کیا جنوں میں بھی پیغمبر ہوتے ہیں

اس آیت میں اللہ تعالٰی نے جنوں اور انسانوں کی دونوں جماعتوں کو خطاب کر کے یہ فرمایا کہ کیا ہمارے پیغمبر تمہارے پاس نہیں پہنچے جو تم میں سے تھے، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جس طرح انسانوں کے پیغمبر انسان بھیجے گئے ہیں اسی طرح جنوں کے اندر پیغمبر جن بھیجے گئے ہوں گے۔

اس مسئلہ میں علماء تفسیر و حدیث کے مختلف قول ہیں بعض کا کہنا یہ ہے کہ رسول اور نبی صرف انسان ہی ہوئے ہیں اور ہوتے چلے آئے ہیں، جنوں میں سے کوئی شخص پیغمبر نہیں ہوا ہے بلکہ ایسا ہوا ہے کہ انسانی پیغمبر اور پیغمبر کا کلام اپنی قوم کو پہنچانے کیلئے جنوں کی قوم میں کچھ لوگ ہوئے ہیں جو حقیقت میں پیغمبروں کے قاصد ہوتے تھے مجازی طور پر ان کو بھی پیغمبر کہہ دیا جاتا ہے، ان حضرات کی دلیل قرآن مجید کی ان آیتوں سے ہے جن میں جنوں کے ایسے قول ذکر ہیں کہ انہوں نے پیغمبر کا کلام یا قرآن سن کر اپنی قوم کو پہنچایا، مثلاً: "وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ" اور "سورہ جن" کی آیت: "فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا ۝ يَّهْدِيْٓ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ" وغیرہ۔

لیکن علماء کی ایک جماعت اس آیت کے ظاہری معنٰی کے اعتبار سے اس کی بھی قائل ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے ہر گروہ کے پیغمبر اسی گروہ میں سے ہوتے تھے، انسانوں کے مختلف طبقوں میں انسانی پیغمبر آتے تھے اور جنوں کے مختلف طبقوں میں جنوں ہی میں سے پیغمبر ہوتے تھے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ خصوصیت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سارے جہاں کے انسانوں اور جنوں کا ایک اکیلا پیغمبر بنا کر بھیجا گیا اور وہ بھی کسی ایک زمانہ کیلئے نہیں بلکہ قیامت تک پیدا ہونے والے تمام جن اور انسان آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی سب کے پیغمبر ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے ہاں بے انصافی نہیں ہے

ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّ اَهْلُهَا
یہ اس لئے کہ نہیں ہے رب آپ کا ہلاک کرنے والا بستیوں کو پر ظلم ان کے حالانکہ لوگ وہاں کے

غٰفِلُوْنَ ﴿۱۳۱﴾ وَ لِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ؕ وَ مَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ
بے خبر ہوں (۱۳۱) اور واسطے ہر ایک کے درجے ہیں اس کے جو کیا انہوں نے اور نہیں رب آپ کا بے خبر

عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۲﴾
اس سے جو وہ کرتے ہیں (۱۳۲)

بامحاورہ ترجمہ:۔ یہ اس واسطے کہ آپ کا رب بستیوں کو ان کے ظلم پر ہلاک کرنے والا نہیں جبکہ وہاں کے لوگ بے خبر ہوں۔ (۱۳۱) ہر ایک کیلئے ان کے عمل کے درجے ہیں اور آپ کا رب ان کے کام سے بے خبر نہیں۔ (۱۳۲)

تفسیر

ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو بھیج کر پہلے سے انسان کو آنے والی مصیبتوں سے خبردار کردینے کا سلسلہ مقرر کیا ہے کیونکہ وہ کسی کو بے خبری میں اس کی زیادتیوں کی وجہ سے سزا دے کر تباہ و برباد نہیں کرتا، پہلے وہ اس بات کو واضح کردیتا ہے کہ تمہارے لئے چلنے کا یہ راستہ ہے اس راستہ سے ذرا سا بھی ہٹنا ظلم ہے اور اس کا نتیجہ تباہی و بربادی ہے خواہ وہ دنیا میں ہو یا آخرت میں یا دونوں میں، اسی کو واضح کرنے کیلئے دنیا میں پیغمبر آئے ہیں، پیغمبر زبان سے اس راستہ کو اچھی طرح واضح کردیتے ہیں اور خود اس پر عمل کر کے دکھادیتے ہیں جب یہ سب کچھ ہو چکتا ہے تو انسان کو موقع دیا جاتا ہے کہ اس کے مطابق چلے پھر اس کے عمل دیکھے جاتے ہیں اور ان کے مطابق

اس کے درجے مقرر ہوتے ہیں انسان کو یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ جو جی چاہے کرے کوئی پوچھنے والا نہیں ہے، اللہ تعالیٰ سب کے سب عملوں کی خبر رکھتے ہیں اس سے کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں ہے انسان کو اس کے ذرا ذرا سے عمل کا بدلہ ملے گا اس کو چاہیئے کہ جو کچھ کرے سوچ سمجھ کر کرے اور قرآن کریم کی ہدایت سے باہر ذرا بھی نہ جائے۔

انسانوں اور جنوں میں پیغمبر بھیجنا اللہ تعالیٰ کے عدل وانصاف اور رحمت کا تقاضا ہے کہ وہ کسی قوم پر ویسے ہی عذاب نہیں بھیج دیتے جب تک کہ پہلے ان کو پیغمبروں کے ذریعہ خبردار نہ کر دیا جائے اور ہدایت کی روشنی ان کیلئے نہ بھیج دی جائے، اللہ تعالیٰ کے نزدیک انسانوں اور جنوں میں ہر طبقہ کے لوگوں کے درجے مقرر ہیں اور یہ درجے ان کے عملوں ہی کے مطابق رکھے گئے ہیں ان میں سے ہر ایک کی جزا وسزا انہی عملوں کے مطابق ہوگی۔

اللہ تعالیٰ کو تمہارے ماننے نہ ماننے کی پرواہ نہیں

وَ رَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ ۭ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَ يَسْتَخْلِفْ

اور رب آپ کا بے پرواہ ہے والا رحمت اگر چاہے لے جائے تم کو اور قائم کر دے

مِنْۢ بَعْدِكُمْ مَّا يَشَآءُ كَمَآ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ اٰخَرِيْنَ ؁۱۳۳

سے بعد تمہارے جس کو چاہے جیسے پیدا کیا تم کو سے اولاد قوموں دوسری کی (۱۳۳)

اِنَّ مَا تُوْعَدُوْنَ لَاٰتٍ ۙ وَّ مَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ؁۱۳۴

بیشک جو وعدہ کئے گئے تم سے ضرور آنیوالی ہے اور نہیں تم عاجز کر دینے والے (۱۳۴)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور آپ کا رب بے پرواہ ہے رحمت والا ہے اگر چاہے تو تم کو لے جائے اور تمہارے پیچھے جس کو چاہے قائم کر دے جیسا تم کو اوروں کی اولاد سے پیدا کیا۔ (۱۳۳) جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے وہ آنے والی ہے اور تم عاجز نہیں کر سکتے۔ (۱۳۴)

لفظی تحقیق: يَسْتَخْلِفْ: پیچھے لائے۔ "اِسْتِخْلَاف" کے معنیٰ ہیں کسی کے بعد اس کا کوئی قائم مقام

مقرر کرنا اس قائم مقام کو اس شخص کا خلیفہ کہتے ہیں، خلیفہ اس کو بھی کہتے ہیں جسے کوئی اپنا کام کرنے کیلئے خود دیدے۔

تفسیر

اس آیت میں بتایا ہے کہ یہ نہ سمجھنا کہ اللہ تعالیٰ اس بات کا محتاج ہے کہ تم اس کے کہنے پر چلو اگر تم اس کا کہنا نہ مانو گے تو اس کے کام رُک جائیں گے، جیسے: اس دنیا میں ہوتا ہے کہ اگر لوگ بادشاہ کی بات نہ مانیں اور اس سے بغاوت کردیں تو وہ کہیں کا نہیں رہتا، اللہ تعالیٰ کو تمہاری عبادت اور تابعداری کی نہ ضرورت ہے نہ پرواہ، اس نے جو اپنے حکم تمہاری طرف بھیجے ہیں، یہ اس کی رحمت ہے اور ان کے ماننے میں سراسر تمہارا ہی بھلا ہے اس کی سلطنت کا کارخانہ تمہارے بل بوتے پر قائم نہیں ہے کہ اگر تم اس کی خدمت نہ کروگے تو اس کی حکومت میں کچھ فرق آجائے گا اگر اس کا کام دوسروں کے دم پر موقوف ہوتا تو وہ نافرمانوں کو کان پکڑ کے نکال دیتا اور ان کی جگہ فرمانبردار بندوں کو مقرر کردیتا، اس کیلئے ایک کو ہٹا کر دوسرے کو اس کی جگہ لے آنا کچھ بھی مشکل نہیں، تم اپنی ہی طرف دیکھو کہ تمہاری جگہ پہلے یہاں اور لوگ تھے اب وہ یہاں نہیں ہیں اور ان کی اولاد میں سے آج کل تم ہو جو یہاں رہتے سہتے ہو، اسی طرح تم کو ہٹا کر اوروں کو تمہاری جگہ لے آنا اس کے نزدیک کیا مشکل ہے یہ نہ سمجھنا کہ اگر وہ تم کو مٹانا چاہے تو تم اس سے بچ کر کہیں چھپ جاؤ گے اور یہ بھی یاد رکھو! کہ جو اس نے کہہ دیا ہے وہ پورا ہو کر رہے گا یہ نہ سمجھنا کہ یہ نری دھمکی ہے ہونا ہوانا کچھ نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے کسی انسان کو بے نیاز نہیں بنایا

اللہ تعالیٰ نے کسی انسان کو بے نیاز نہیں بنایا اس میں بڑی حکمت ہے، انسان بے نیاز ہوجائے تو ظلم کرتا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کا کمال ہے، ورنہ انسان کی عادت یہ ہے کہ اگر وہ دوسروں سے بے نیاز اور مستغنی ہوجائے تو اس کو دوسروں کے نفع نقصان اور رنج وراحت کی کوئی پرواہ نہیں رہتی بلکہ اسی حالت میں وہ دوسروں پر ظلم کیلئے تیار

ہوجاتا ہے، قرآن کریم کی ایک آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ انسان جب اپنے آپ کو بے نیاز اور مستغنی پاتا ہے تو وہ سرکشی پر تیار ہوجاتا ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایسی ضرورتوں میں جکڑ دیا ہے جو دوسروں کی مدد کے بغیر پوری ہی نہیں ہوسکتی، بڑے سے بڑا بادشادہ اور حاکم نوکروں چاکروں اور چپڑاسیوں کا محتاج ہے، بڑے سے بڑا مالدار کارخانہ والا مزدوروں کا محتاج ہے، صبح کو جس طرح ایک مزدور اور رکشہ چلانے والا کچھ پیسے حاصل کرکے محتاجی دور کرنے کیلئے روزگار کی تلاش میں نکلتا ہے ٹھیک اسی طرح بڑے بڑے مالدار جن کو سرمایہ دار کہا جاتا ہے وہ مزدور اور نوکروں چاکروں کے محتاج ہیں، قدرت نے سب کو محتاجی کی ایک زنجیر میں جکڑا ہوا ہے ہر ایک دوسرے کا محتاج ہے کسی کا کسی پر احسان نہیں اور یہ نہ ہوتا تو نہ کوئی مالدار کسی کو ایک پیسہ دیتا اور نہ کوئی مزدور کسی کا ذرا سا بوجھ اٹھاتا یہ تو صرف اللہ تعالیٰ کی صفت ہے کہ وہ سب سے بے نیاز ہونے کے باوجود سب پر رحم کرنے والے ہیں۔

اس کے بعد یہ بھی بتلادیا کہ جس طرح اس کی رحمت عام ہے اسی طرح اس کی قدرت ہر چیز اور ہر کام پر حاوی ہے اگر وہ چاہے تو تم سب کو ایک آن میں فنا کرسکتا ہے اور ساری مخلوق کے فنا کردینے سے بھی اس کے قدرت کے کارخانہ میں معمولی سا فرق نہیں آتا پھر اگر وہ چاہے تو ساری کائنات کو فنا کرکے ان کی جگہ دوسری مخلوق اسی طرح اسی آن میں پیدا کرکے کھڑی کردے جس کی ایک مثال انسان کے ہر دور میں اس کے سامنے رہتی ہے کہ آج کروڑوں انسان زمین کے چپہ چپہ پر آباد اور زندگی کے تمام شعبوں کے مختلف کاروبار کو چلارہے ہیں اگر آپ ایک سو سال پہلے کی طرف غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس وقت بھی یہ دنیا اسی طرح آباد تھی اور سب کام چل رہے تھے مگر موجودہ آباد کرنے والوں اور کام چلانے والوں میں سے کوئی نہ تھا ایک دوسری قوم تھی جو آج زمین کے پیٹ میں ہے اور جس کا آج نام ونشان بھی نہیں ملتا اور موجودہ دنیا اسی پہلی قوم کی نسل سے پیدا کی گئی ہے۔

اگر اللہ تعالیٰ چاہیں تو تم سب کو لے جائیں، لے جانے سے مراد ایسا فنا کردینا ہے کہ نام ونشان تک گم ہوجائے اور اسی لئے یہاں ہلاک کرنے یا ماردینے کا ذکر نہیں فرمایا، بلکہ لے جانا ارشاد فرمایا، جس میں بے نام و نشان کردینے کی طرف اشارہ ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے غنی اور بے نیاز ہونے کا پھر رحمت والا ہونے کا اور پھر مکمل قدرت کے مالک ہونے کا بیان کرنے کے بعد دوسری آیت میں نافرمانوں اور حکم نہ ماننے والوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو جس عذاب سے ڈرایا ہے وہ ضرور آنے والا ہے اور تم سب مل کر بھی اللہ تعالیٰ کے عذاب کو نہیں ٹال سکتے۔

کھلا ہوا مقابلہ

قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّیْ عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ

آپ کہہ دیجئے　اے قوم میری!　کرتے رہو کام　پر　جگہ اپنی　بیشک میں بھی کام کر رہا ہوں　پس عنقریب　جان لوگے تم

مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۱۳۵﴾

کون ہے　ہوتا ہے　لئے جس کے　انجام　اس گھر کا　یقیناً بات یہ ہے کہ　نہیں　کامیاب　ظالم لوگ　(۱۳۵)

بامحاورہ ترجمہ:۔ آپ کہہ دیجئے، اے میری قوم! تم اپنی جگہ پر کام کرتے رہو میں بھی کام کرتا ہوں، عنقریب تم جان لوگے کہ آخرت کا گھر کس کو ملتا ہے، یقیناً ظالموں کا بھلا نہ ہوگا۔ (۱۳۵)

لفظی تحقیق: عَاقِبَةُ الدَّارِ: انجام اس گھر کا۔ ”عَقِبْ“ کے معنیٰ ہیں پیچھے، ”عَاقِبَةٌ“ پیچھے آنے والی چیز، ”اَلدَّارِ“ گھر، اس سے مراد یہ گھر، یعنی: دنیا ہے ”عَاقِبَةُ الدَّارِ“ یعنی: دنیا کے گھر کے ختم ہونے کے بعد جو گھر آنے والا ہے۔

تفسیر

اس سے پہلے کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے انسانوں کیلئے نہایت مناسب راستہ مقرر کر دیا ہے جس پر چلنے سے وہ منزل مقصود تک بہ آسانی پہنچ سکتا ہے اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر سے فرمایا ہے کہ ان سے کہہ دیجئے کہ ابھی تمہارا جو جی چاہے کرو، عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ انجام کس کا اچھا ہوگا ہمارا یا تمہارا، مگر یہ قاعدہ یاد رکھو! کہ ظالم کامیابی نہیں پا سکتے۔

ارشاد ہے کہ: ان سے کہہ دیجئے کہ اے میری قوم! مجھے جو اللہ تعالیٰ نے بتایا تھا میں تمہیں بتا چکا، اگر تم اب بھی اپنے ہی طریقے پر جمے رہنا چاہتے ہو تو تم جانو، مگر یہ طریقہ غلط ہے میں اس پر نہیں چل سکتا، میں تو وہ کروں گا جو اللہ تعالیٰ نے مجھے بتایا ہے تمہاری ہٹ دھرمی کی وجہ سے یہی کہنا پڑتا ہے کہ اب میرا تمہارا راستہ ایک نہیں رہا، تم اپنے طریقے پر عمل کئے جاؤ اور میں اپنے طریقے پر عمل کرتا ہوں، آگے چل کر معلوم ہو جائے گا کہ انجام کس کا اچھا ہوتا ہے میرا یا تمہارا، اتنی بات ضرور ہے کہ ظالم کبھی نہیں پھلتے پھولتے، آخر ہمیشہ سر پکڑ کر رونا ہی پڑتا ہے۔

جن لوگوں سے یہ کہا گیا ہے وہ مکہ مکرمہ کے کافر ہیں اور اس وقت کوئی امید نظر نہیں آتی تھی کہ یہ کھاتے پیتے طاقتور لوگ کبھی نیچے ہو سکتے ہیں لیکن تھوڑے ہی دن بعد بدر کی جنگ ہوئی اور سب نے ان کا انجام دیکھ لیا کہ کیا ہوا اور یہ تو دنیا میں ان کے کرتوتوں کی سزا تھی ابھی اس دنیا کے ختم ہونے کے بعد آخرت میں ان کا جو حشر ہوگا وہ الگ رہا، اس آیت کا کہنا یہاں تک تو سچ ہو ہی چکا ہے وہاں بھی سچ ہونا ابھی باقی ہے۔

کافروں کے کرتوت

وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَ الْاَنْعَامِ نَصِیْبًا فَقَالُوْا

اور کرتے ہیں لئے اللہ کے اس میں سے جو پیدا کیا اس نے سے کھیتی اور مویشی سے ایک حصہ پس کہتے ہیں

هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَ هٰذَا لِشُرَكَآئِنَا ۚ فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ

یہ لئے اللہ کے میں خیال انکے اور یہ لئے شریکوں ہمارے کے پس جو ہو لئے شریکوں انکے کے

فَلَا یَصِلُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَ مَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ یَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ ؕ

وہ نہیں پہنچتا طرف اللہ کی اور جو ہے لئے اللہ کے پس وہ پہنچتا ہے طرف لئے شریکوں انکے کے

سَآءَ مَا یَحْكُمُوْنَ ﴿۱۳۶﴾

بُرا ہے جو وہ فیصلہ کرتے ہیں (۱۳۶)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور اللہ کی پیدا کی ہوئی کھیتی اور مویشی میں سے اس کا ایک حصہ ٹھہراتے ہیں پھر اپنے خیال میں کہتے ہیں یہ حصہ اللہ کا ہے اور یہ ہمارے شریکوں کا ہے، سو جو حصہ شریکوں کا ہے وہ تو اللہ کی طرف نہیں پہنچتا اور جو اللہ کا ہے وہ ان کے شریکوں کی طرف پہنچ جاتا ہے، کیا ہی بُرا انصاف کرتے ہیں۔ (۱۳۶)

تفسیر

ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو راستہ انسان کیلئے مقرر کیا ہے اور اپنے پیغمبر بھیج کر اس کو اچھی طرح واضح کردیا ہے انسان اس راستہ سے ہٹ گیا ہے؛ اس لئے یہ لوگ پیغمبر ﷺ کے کہنے پر نہیں چلتے، لیکن پیغمبر ﷺ کے مقرر کئے ہوئے راستہ پر چلنا ضرور ہے؛ اس لئے پیغمبر ﷺ سے کہا گیا تھا کہ ان سے کہہ دیجئے کہ اگر تم میرا کہنا نہیں مانتے تو آگے چل کر پچھتاؤ گے تم جانو جو تم کرتے ہو کئے جاؤ، اور مجھے جو کرنا ہے وہ میں کروں گا، عنقریب تمہیں معلوم ہوجائے گا کہ تمہارا انجام اچھا ہوتا ہے یا میرا، ارشاد ہے کہ: ان کیلئے اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے ہری بھری کھیتیاں تیار کیں اور مویشی پیدا کئے اور ان چیزوں کے پیدا کرنے میں ان کے جھوٹے معبودوں اور بتوں وغیرہ کا کوئی دخل نہیں، پھر بھی ان کی عقل دیکھو کہ اللہ تعالیٰ سے زیادہ اپنے بنائے ہوئے معبودوں کا خیال کرتے ہیں اور ان چیزوں میں سے اپنے خیال میں ایک حصہ اللہ تعالیٰ کیلئے نکالتے ہیں اور ایک حصہ بتوں کیلئے، پھر سوچتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے اسے حصے کی کیا ضرورت ہے؛ اس لئے اللہ تعالیٰ کے حصہ میں سے کچھ نکال کر بتوں کے حصے میں ڈال دیتے ہیں اور بتوں کے حصے میں سے لے کر اللہ تعالیٰ کے حصے میں کچھ نہیں بڑھاتے، کبھی ایسا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے حصے میں بڑھیا مال چلا گیا اور بتوں کے حصہ میں گھٹیا تو اسے بدل دیتے ہیں اور گھٹیا اللہ تعالیٰ کی طرف اور بڑھیا بتوں کی طرف کردیتے ہیں، ان کی یہ باتیں بری ہیں کیونکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دل میں اللہ تعالیٰ کا احترام نہیں ہے، دوسرے یہ کہ یہ مانتے ہوئے کہ اللہ تعالیٰ محتاج نہیں اور بت محتاج ہیں، بتوں کو اللہ تعالیٰ کے برابر ٹھہراتے ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ مانتے ہیں،

خیر! ان کا یہ کام تو سراسر بیوقوفی ہے، ہاں! اس کے اندر جو خیال ہے بہت برا ہے اور ان کیلئے سخت خطرناک ہے یہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ بے ادبی کرتے ہیں اور اس کی انہیں سخت سزا ملے گی۔

"اَنْعَامِ" سے مراد وہ جانور ہیں جنہیں عام طور پر لوگ پالتے ہیں اور وہ انسانوں سے مانوس ہوتے ہیں، یہ چار جوڑے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کیلئے حلال فرمائے ہیں، یعنی: اونٹ، گائے، بھیڑ، بکری یہ تمام جانور نر اور مادہ ہر دو حلال ہیں، بھینس بھی گائے ہی کی ایک قسم ہے، یہ مویشی اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر انسانوں کی خدمت کیلئے پیدا فرمائے ہیں، لوگ ان کا دودھ، گوشت، گھی، کھال اور اون وغیرہ استعمال کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا یہ خاص انعام ہے کہ اس نے انہیں انسانوں کا فرمانبردار بنا دیا ہے، بڑے طاقتور ہونے کے باوجود یہ انسانوں کے اشارے پر چلتے ہیں اور انہیں ہر قسم کی خدمت مہیا کرتے ہیں ان جانوروں کو خوراک کے طور پر استعمال کرنے کے علاوہ اونٹ سے سواری اور سامان اٹھانے کا کام لیا جاتا ہے، عرب کے خشک اور وسیع ریگستانوں میں اونٹ ہی سواری اور سامان اٹھانے کا کام دیتا ہے، اس کے علاوہ میدانی علاقوں میں اونٹ اور بھینس سے کھیتی باڑی کا کام بھی لیا جاتا ہے ان کے ذریعے کنوؤں سے پانی نکالا جاتا ہے اور ہل میں بھی جوتتے ہیں غرضیکہ یہ جانور انسانوں کے قریبی دوست اور اعلیٰ قسم کے خادم ہیں، اللہ تعالیٰ نے انہیں انسانوں کا فرمانبردار بنا دیا ہے ان کے دلوں میں یہ ڈال دیا ہے کہ تمہیں ہر صورت میں انسانوں کی خدمت کرنا ہے سو (۱۰۰) اونٹ کی قطار ہو تو ایک دس سالہ بچہ نکیل پکڑ کر سب کو اپنے پیچھے چلا لیتا ہے وگرنہ جنگلی جانور بڑے خطرناک ہوتے ہیں اور ایک ہی وار میں آدمی کا کام تمام کر دیتے ہیں جنگلی جانوروں کے شکار کیلئے انسان کو بڑی محنت کرنی پڑتی ہے جب جا کر وہ قابو میں آتے ہیں اور پھر انہیں باندھ کر یا پنجرے میں بند کر کے رکھنا پڑتا ہے مگر یہ "اَنْعَامِ" ایسے جانور ہیں جو اللہ تعالیٰ نے صرف انسان کی خدمت میں لگا دیئے ہیں۔

قابلِ توجہ بات

اس آیت میں عرب کے مشرکوں کی ایک گمراہی اور غلط طریقہ کار پر تنبیہ کی گئی ہے اس لئے ساتھ اس کے ضمن میں ان مسلمانوں کیلئے بھی ایک قابل توجہ بات ہے جو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی زندگی اور اس کے بخشے ہوئے جسم وجاں کی پوری توانائی کو مختلف حصوں میں بانٹتے ہیں، عمر اور وقت کا ایک حصہ اللہ تعالیٰ اور اس کی عبادت کیلئے مخصوص کرتے حالانکہ حق تو اس کا یہ تھا کہ عمر کے سارے اوقات اور لمحے اسی کی عبادت اور اطاعت کیلئے وقف ہوتے، انسانی ضرورتوں اور مجبوریوں کیلئے اس میں سے کوئی وقت اپنے لئے بھی نکال لیتے، اور حق تو یہ ہے کہ پھر بھی اس کے شکر کا حق ادا نہ ہوتا، مگر یہاں تو حالت ہماری یہ ہے کہ دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں سے اگر ہم کوئی وقت اللہ تعالیٰ کی یاد اور عبادت کیلئے مقرر بھی کر لیتے ہیں تو جب کوئی ضرورت پیش آتی ہے تو نہ اپنے کاروبار میں کوئی حرج ڈالا جاتا ہے نہ آرام کے وقتوں میں، سارا نزلہ اس وقت پر پڑتا ہے جو نماز، تلاوت یا عبادت کیلئے مقرر کیا تھا کوئی کام پیش آئے یا بیماری یا کوئی دوسری ضرورت تو سب سے پہلے اس کا اثر اس وقت پر پڑتا ہے جو ہم نے اللہ تعالیٰ کے ذکر یا عبادت کیلئے مخصوص کیا تھا یہ کیسا غلط فیصلہ اور کتنی ناشکری اور حق تلفی ہے اللہ تعالیٰ ہم کو اور سب مسلمانوں کو اس سے محفوظ رکھیں۔ آمین

ایک اور بڑی بیوقوفی

وَ	كَذٰلِكَ	زَيَّنَ	لِكَثِيْرٍ	مِّنَ	الْمُشْرِكِيْنَ	قَتْلَ	اَوْلَادِهِمْ
اور	اسی طرح	اچھا کر دیا	لئے بہت سوں کے	سے	میں مشرکوں	مار ڈالنا	اولاد اپنی کا

شُرَكَآؤُهُمْ	لِيُرْدُوْهُمْ	وَ	لِيَلْبِسُوْا	عَلَيْهِمْ	دِيْنَهُمْ ط	وَ	لَوْ	شَآءَ
شریکوں ان کے نے	تا کہ برباد کریں ان کو	اور	تا کہ گڈمڈ کر دیں	پر ان	دین ان کا	اور	اگر	چاہتا

اللّٰهُ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَ مَا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۳۷﴾

اللہ نہ کرتے وہ یہ پس ان کو چھوڑیئے اور جو وہ جھوٹ تراشتے ہیں (۱۳۷)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور اسی طرح بہت سے مشرکوں کی نگاہ میں ان کے شریکوں نے ان کی اولاد کے قتل کو مزین کر دیا، تا کہ ان کو ہلاک کر دیں اور ان کے دین کو ان پر گڈمڈ کر دیں، اور اگر اللہ چاہتا تو وہ یہ کام نہ کرتے سو چھوڑ دیجئے وہ جانیں اور ان کا جھوٹ۔ (۱۳۷)

تفسیر

ارشاد ہے کہ ان میں سے بہت سے ایک اور عجیب حرکت کرتے ہیں ان کے شیطانوں نے ان کو یہ سمجھا دیا ہے کہ اولاد کو بتوں کے نام پر ذبح کرنا بڑا اچھا کام ہے، چنانچہ اب ان میں ہر بہانے سے اپنے بچوں کو مار ڈالنے کا رواج ہو گیا ہے دین میں یہ طریقہ مقرر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نام پر جانور قربان کرو، انہوں نے اولاد کو مارنا شروع کر دیا دین میں جانور کی قربانی تھی شیطان نے کہا کہ اولاد کی قربانی اس سے بڑھ کر ہے، دین میں اللہ تعالیٰ کے نام پر قربانی کرنے کا حکم ہے، شیطان نے کہا کہ بتوں کے نام پر کرنی چاہئے، یہ ان کی کم عقلی ہے کہ ہمیشہ شیطان ہی کا کہنا مانتے ہیں اللہ تعالیٰ نے بھی دنیا میں ڈھیل دے رکھی ہے اسے آزمانا ہے کہ دیکھیں عقل سے ٹھیک کام کون لیتا ہے ورنہ اگر وہ چاہتے تو کسی کو بھی ایسے بیہودہ کام نہ کرنے دیتے لیکن نہیں، دنیا امتحان کی جگہ ہے یہاں زور زبردستی سے ٹھیک راستے پر چلانا مقصود نہیں ان کی غلط باتوں کو اور ان کو دونوں کو چلنے دو۔

معلوم ہوا کہ دین کی اصل شکل کو بگاڑنا شیطانی کام ہے ایسے کام نہ کرنے چاہئیں جو دیکھنے میں تو دین کے نظر آئیں لیکن اندر سے دین کی جڑ کو کھودتے ہوں۔

وَ كَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ: اسی طرح ان کے شریکوں نے بہت سے مشرکوں کیلئے ان کی اولادوں کے قتل کو مزین کر رکھا تھا یہاں پر شریکوں سے مراد وہ کاہن

ہیں جو انسانی بچوں کی قربانی کو ان کے سامنے بڑا خوبصورت بنا کر پیش کرتے تھے انہیں بتاتے تھے کہ بتوں کے نام پر بچوں کو قربان کرنے کا کتنا بڑا فائدہ حاصل ہوگا اور وہ جاہل لوگ ان کا کہا مان کر اپنے بچوں کو باطل خداؤں کے نام پر قربان کر دیتے تھے، ان کے کاہنوں کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ وہ اپنے پیروکاروں کو ہلاک کر سکیں انہیں پھلنے پھولنے کا موقع نہ مل سکے اور وہ اس طرح ان کے محتاج بن کر رہیں اور دوسری وجہ یہ تھی کہ ان پر ان کے دین کو گڈ مڈ کر دیں، یعنی: دین کے معاملوں کو اس قدر گڈ مڈ کر دیا جائے کہ انہیں حق و باطل کی پہچان ہی نہ ہو سکے اور وہ لوگ اس طرح اندھیرے میں بھٹکتے رہیں اور ہر معاملہ میں انہی کے محتاج بن کر رہیں۔

اولاد کو قتل کرنے کی کئی صورتیں قرآن پاک میں ذکر کی گئی ہیں عرب کے مشرک اور بعض دوسری قومیں بھی بچی کو پیدا ہوتے ہی قتل کر دیتی تھیں، لڑکی کی پیدائش کو وہ شرم کا باعث سمجھتے تھے کہ بڑی ہوگی تو اس کا نکاح کرنا پڑے گا، پھر ہمارا داماد بنے گا وغیرہ وغیرہ، وہ ظالم نہیں سمجھتے تھے کہ آخر وہ بھی تو کسی ماں ہی کے پیٹ سے پیدا ہوئے ہیں اور کسی کے داماد بنے ہیں اگر بچیوں کو زندہ نہ چھوڑا ہوتا تو خود وہ کیسے پیدا ہوتے اور آئندہ انسانی نسل کیسے بڑھے گی، اس کے علاوہ وہ معاشی مسئلہ کا سہارا بھی لیتے تھے کہ بچی جوان ہو جائے گی تو اس کی شادی کیلئے جہیز کہاں سے لائیں اگر خرچ کریں گے تو مال میں کمی آجائے گی وہ بچوں کی پیدائش کو اپنے آرام و راحت میں خلل انداز بھی سمجھتے تھے صرف اولاد کا قتل اسی وجہ سے تھا کہ اولاد ہوگی تو ان کی پرورش کا کیا بندوبست ہوگا؟ ان کی زندگی کی ضرورتوں کے حاصل کرنے کیلئے سخت محنت کرنی پڑے گی، لہٰذا ان کا ابتداء میں ہی خاتمہ کر دیا جاتا۔

دین کی اور غلط شکلیں

وَ قَالُوْا هٰذِهٖۤ اَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ ۖ لَّا يَطْعَمُهَاۤ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ

اور کہا انہوں نے یہ ہیں چوپائے اور کھیتی جن کا کھانا منع ہے نہیں کھائے گا اس کو مگر جسے ہم چاہیں

بِزَعْمِهِمْ وَ اَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا وَ اَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُوْنَ اسْمَ

موافق گمان اپنے کے اور کچھ چوپائے منع کی گئیں پیٹھیں ان کی اور کچھ چوپائے نہیں کہ نہیں لیتے نام

اللّٰهِ عَلَيْهَا افْتِرَآءً عَلَيْهِ ؕ سَيَجْزِيْهِمْ بِمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۳۸﴾

اللہ کا پر ان جھوٹ باندھتے ہوئے اوپر اس کے عنقریب سزا دیگا ان کو اسکی جو تھے وہ جھوٹ باندھتے (۱۳۷)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور کہتے ہیں کہ یہ مویشی اور کھیت ممنوع ہے اس کو کوئی نہ کھائے، مگر جس کو ہم چاہیں ان کے خیال کے موافق اور بعض مویشی کی پیٹھ پر چڑھنا حرام کیا، اور بعض مویشی کے ذبح کے وقت اللہ کا نام نہیں لیتے اللہ پر بہتان باندھ کر، عنقریب وہ ان کو ان کے جھوٹ کی سزا دے گا۔ (۱۳۷)

تفسیر

اس آیت میں ان کے چند اور بیہودہ کام بیان کئے گئے ہیں جن کو انہوں نے شیطان کے بہکانے سے اپنا دین بنا رکھا تھا بعض چیزوں، مثلاً: کسی جانور اور کسی کھیت کو بتوں کے نام پر وقف کر دیتے تھے اور ان کے کھانے کی عام اجازت نہ تھی کسی کیلئے یہ تھا کہ اس کو عورتیں نہ کھائیں یا شادی شدہ کھائیں کنواری یا بیوہ نہ کھائیں یا یہ کہ صرف مرد کھائیں یا جوان کھائیں بچے اور بوڑھے نہ کھائیں یا اس کے برعکس یا صرف بتوں کے مَہَنْت (سادھوؤں کے سردار) کھائیں وغیرہ، یہ صرف ان کی خیالی باتیں تھیں جو سوچا کر لیا، اسی طرح بعض جانور بتوں کے نام پر چھوڑ دیتے تھے کہ ان پر کوئی سواری نہ کرے، بعض کا دودھ نکالتے وقت یا ذبح کرتے وقت اللہ تعالیٰ کا نام لینا منع تھا، اس ڈر سے کہ کہیں بتوں کے ساتھ اس میں خدا کا حصہ نہ ہو جائے، پھر تماشا یہ تھا کہ ان سب باتوں کو اللہ تعالیٰ کا حکم بتاتے تھے کہ ہم کو ایسا کرنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اور انہی باتوں کو کرنے سے اس کی رضا مندی حاصل ہو سکتی ہے ان باتوں کا اس آیت میں ذکر کیا ہے اور کہا گیا ہے کہ اس جھوٹ گھڑنے کی انہیں سزا ملے گی۔

ارشاد ہے کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ جانور یہ کھیت بتوں کے نام پر وقف ہیں انہیں وہی کھا سکتے ہیں جسے ہم

اجازت دیں ہر ایک نہیں کھا سکتا یہ سب ان کی من گھڑت باتیں ہے، بعض جانوروں کو بتوں کے نام پر آزاد چھوڑ دیتے ہیں کہ ان کی پیٹھ پر نہ کوئی سوار ہو نہ بوجھ لادے۔

وَ اَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ: بعض جانور ایسے تھے کہ مشرک لوگ ان پر اللہ تعالیٰ کا نام نہیں لیتے تھے نہ دودھ دوہتے وقت اللہ تعالیٰ کا نام لیتے تھے، نہ سواری کرتے وقت اور نہ ہی ذبح کرتے وقت، البتہ غیر اللہ کا نام ضرور لیتے تھے، جیسے: لات، مناۃ، عزیٰ وغیرہ، یعنی: یہ ان کی نذر و نیاز ہے۔

وہ لوگ اپنے ان کرتوتوں کے باوجود یہ کہتے کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ نے کرنے کا حکم دیا ہے جو سراسر جھوٹ ہے، یہ اللہ تعالیٰ پر بہتان باندھتے ہیں اللہ تعالیٰ اس جھوٹ بولنے کی انہیں سزا ضرور دیں گے، ان سارے جانوروں کے بارے میں تفصیل "سورۂ مائدہ" کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔

احکام و مسائل

مسئلہ (۱):..... ایسے جانور جو غیر اللہ کے نام پر ذبح کیے جائیں یا غیر اللہ کے نام پر ایسے ہی چھوڑ دیے جائیں یا غیر اللہ کیلئے خاص کر دیے جائیں ان کا کھانا حرام ہے۔

مشرکوں کی اور فضول باتیں

وَ قَالُوْا مَا فِيْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَ مُحَرَّمٌ

اور کہا جو کچھ میں پیٹوں ان جانوروں کے ہے صرف ہے لئے مردوں ہمارے کے اور حرام ہے

عَلٰٓى اَزْوَاجِنَا ۚ وَ اِنْ يَّكُنْ مَّيْتَةً فَهُمْ فِيْهِ شُرَكَآءُ ؕ سَيَجْزِيْهِمْ

پر بیویوں ہماری اور اگر ہو وہ مردہ پس وہ سب میں اس شریک ہیں عنقریب سزا دے گا ان کو

وَصْفَهُمْ ؕ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۳۹﴾ قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْٓا

باتیں بنانے انکے کی بیشک وہ حکمت والا جاننے والا (۱۳۹) بیشک نقصان میں ہیں وہ جنہوں نے مار ڈالا

اَوْلَادَهُمْ سَفَهًاۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّ حَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً

اولاد اپنی کو بیوقوفی سے بغیر سمجھے اور حرام کرلیا جو رزق دیا ان کو اللہ نے جھوٹ باندھتے ہوئے

عَلَى اللّٰهِ ۭ قَدْ ضَلُّوْا وَ مَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ۝۱۴۰

پر اللہ بیشک بھٹک گئے وہ اور نہیں وہ راہ پانے والے (۱۴۰)

ع ۱۱/۱۶ ۳

بامحاورہ ترجمہ:- اور کہتے ہیں جو بچہ اس مویشی کے پیٹ میں ہے اس کو تو خاص مرد ہی کھائیں وہ ہماری بیویوں پر حرام ہے، اور جو بچہ مردہ ہو تو اس کے کھانے میں سب برابر ہیں، عنقریب ان کو ان غلط باتیں بیان کرنے کی سزا دے گا، وہ حکمت والا ہے جاننے والا ہے۔ (۱۳۹) بیشک خسارے میں ہوئے جنہوں نے اپنی اولاد کو قتل کیا نادانی سے بغیر سمجھے، اور اس رزق کو جو اللہ نے انہیں دیا حرام ٹھہرالیا اللہ پر بہتان باندھ کر، بیشک وہ گمراہ ہوئے اور سیدھی راہ پر نہ آئے۔ (۱۴۰)

لفظی تحقیق: وَصْفَهُمْ: ان کا کہنا۔ وصف کے معنٰی ہیں بیان کرنا، یہاں اس سے ان کا اپنی طرف سے حرام حلال کے بارے میں حکم چلانا مراد ہے۔

تفسیر

اس آیت میں ان کی ایک اور فضول رسم کا ذکر ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ان کے ہاں بتوں کے نام پر آزاد کئے ہوئے جانور جن کے نام: "بحیرہ، سائبہ" وغیرہ ہوتے تھے اور ان کا ذکر "سورۂ مائدہ" میں گزر چکا ہے کوئی بچہ جنین (وہ بچہ مویشی کے پیٹ میں) ہو تو اس کا کھانا عورتوں کو منع ہے اسے صرف مرد کھا سکتے ہیں لیکن اگر بچہ مرا ہوا پیدا ہو تو اسے مرد عورت سب کھا سکتے ہیں اگر ان سے پوچھو کہ اس کی وجہ کیا ہے؟ تو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا یہی حکم ہے، اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ ان کا یہ کہنا بڑی گستاخی ہے اور وہ انہیں اس کی سزا دیں گے، ارشاد ہے کہ ان کے گناہ سراسر ان کے نقصان کا باعث ہیں ایک تو نادانی اور جہالت سے اپنے اولاد کو قتل کرنا، خواہ بتوں پر قربانی کے

طور پر ہو یا تنگدستی کے خوف سے یا شرم کی وجہ سے ہو، جیسا کہ بعض جاہل لوگ لڑکیوں کے بارے میں خیال کرتے تھے کہ ان کی دوسرے سے شادی ہوگی تو یہ ان کیلئے شرم کا باعث ہے اور دوسرا اللہ کے دیئے ہوئے رزق کو حرام کرلینا اور پھر جھوٹ کہنا کہ اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے یہ سب باتیں یقیناً گمراہی کی ہیں سیدھے راستے پر چلنے والے ایسی باتیں نہیں کرتے۔

اللہ تعالیٰ کی مہربانیاں

وَ هُوَ الَّذِیْۤ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّ غَیْرَ مَعْرُوْشٰتٍ وَّ النَّخْلَ

اور وہی ہے جس نے پیدا کئے باغ اونچے چڑھائے ہوئے اور نہ چڑھائے ہوئے اور کھجور

وَ الزَّرْعَ مُخْتَلِفًا اُكُلُهٗ وَ الزَّیْتُوْنَ وَ الرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَّ

اور کھیتی الگ الگ ہیں پھل اسکے اور زیتون اور انار ایک دوسرے سے ملتے جلتے اور

غَیْرَ مُتَشَابِهٍ ؕ كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖۤ اِذَاۤ اَثْمَرَ وَ اٰتُوْا حَقَّهٗ یَوْمَ

نہ ملتے جلتے کھاؤ میں سے اسکے پھل جب وہ پھلے اور دو حق اس کا دن

حَصَادِهٖ ۖ٘ وَ لَا تُسْرِفُوْا ؕ اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْنَ ﴿۱۴۱﴾

کاٹنے اسکے کے اور نہ فضول خرچی کرو بیشک وہ نہیں پسند کرتا بیجا خرچ کرنے والوں کو (۱۴۱)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور اسی نے باغ پیدا کئے جو ٹٹیوں (جو کسی سہارے کے ساتھ چڑھائی جائیں، جیسے انگور کی بیلیں وغیرہ) پر چڑھائے جاتے ہیں اور جو ٹٹیوں (جو کسی سہارے کے ساتھ نہ چڑھائی جائیں، جیسے: کدو اور لوکی کی بیلیں وغیرہ) پر نہیں چڑھائے جاتے اور کھجور کے درخت اور کھیتی کہ ان کے پھل مختلف ہیں اور زیتون اور انار کو پیدا کیا ایک دوسرے کے مشابہ اور جدا جدا بھی جس وقت پھل لائیں ان کے پھل میں سے کھاؤ اور جس دن ان کو کاٹو ان کا حق ادا کرو اور بیجا نہ خرچ کرو، بیشک وہ بیجا خرچ کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ (۱۴۱)

لفظی تحقیق: مَعْرُوْشٰتٍ: اونچے چڑھائے ہوئے۔ "مَعْرُوْشَةٌ" کی جمع ہے اور "عَرْشٌ" سے بنا ہے "عَرْشٌ" کے معنیٰ ہیں: اونچا کرنا، بیلوں کو لکڑیوں کے ٹھاٹر پر چڑھانا، جیسے: انگور کی بیلیں لکڑیوں کی ٹٹیاں (سہاروں) چھت کی شکل میں باندھ کر ان پر چڑھائی جاتی ہیں اور غیر معروشات وہ جن کو اوپر چڑھانے کا دستور نہیں، جیسے: تربوز، خربوزہ وغیرہ کی بیلیں جو زمین ہی پر پھیل جاتی ہیں یا تنے دار پودے۔

تفسیر

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی کھلی ہوئی مہربانیوں اور عنایتوں کا بیان ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جن کو ہر شخص ذرا سی توجہ سے سمجھ کر ان سے اللہ تعالیٰ کو پہچان سکتا ہے اس میں ان لوگوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر اوروں کی تعظیم کرتے ہیں اور اپنے پھلوں، غلوں اور کھانوں میں سے ان کے نام کا حصہ الگ نکال دیتے ہیں حالانکہ ان جھوٹے معبودوں نے نہ کچھ پیدا کیا اور نہ کر سکتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کو بالکل بھولے ہوئے ہیں جس نے انسان کیلئے زمین سے سب کچھ پیدا کیا۔

ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ کو پہچاننا ہے تو اپنے اردگرد باغوں کو دیکھو جن میں انگور کی بیلیں اونچی ٹٹیوں پر چڑھی ہوئی ہیں اور ان میں انگور کے خوشے لٹک رہے ہیں ان بیلوں کو دیکھو جو آپ ہی آپ زمین پر پھیلی ہوئی ہیں کھجور کے درختوں اور کھیتوں کو دیکھو جن میں مختلف قسم کے پھل میوے اور غلے پیدا ہوتے ہیں، زیتون اور انار کو دیکھو ان سب کی شکلیں ملتی جلتی اور الگ الگ شکل کی ہوتی ہیں، مزے میں مختلف، کھٹی، کھٹ میٹھی اور پھیکی کھانے کی چیزیں پیدا ہوتی ہیں، یہ چیزیں جب پک کر تیار ہو جائیں تو ان میں سے شوق سے کھاؤ اور ان کے کاٹنے اور توڑنے کے دن اللہ تعالیٰ کے نام پر مسکینوں اور محتاجوں کا حق نکال کر الگ رکھ دو لیکن اس کا خیال رکھو کہ کوئی چیز فضول ضائع نہ کی جائے اللہ تعالیٰ فضول ضائع کرنے والوں کو اور حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔

مُتَشَابِهًا وَّ غَيْرَ مُتَشَابِهٍ: ایک دوسرے کے مشابہ اور غیر مشابہ، یعنی: بعض ایک دوسرے سے رنگ وذائقے وغیرہ میں ملتے جلتے ہیں اور بعض رنگ وذائقے وغیرہ میں نہیں ملتے جلتے، پھر یہ بھی ہے کہ بعض ظاہری طور پر آپس میں ملتے جلتے ہیں اور بعض نہیں ملتے، پھر یہ بھی ہے کہ بعض ظاہری طور پر آپس میں ملتے جلتے ہیں مگر پوشیدہ طور پر نہیں ملتے بعض رنگ میں ملتے ہیں اور بعض ذائقہ میں، بعض کی ظاہری شکل ایک جیسی ہوتی ہے مگر ذائقہ مختلف، بہرحال اللہ تعالیٰ نے یہ تمام پھل انسان کے فائدے کیلئے پیدا کئے ہیں۔

كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ: جب یہ درخت اور پودے پھل دینے لگیں تو ان کے پھل کھاؤ اور ان کو خود بخود اپنے آپ پر حرام نہ قرار دے لو، اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو کہ اس نے تمہارے لئے ایسی ایسی نعمتیں پیدا کی ہیں ان کے کھانے سے انکار کر کے اللہ تعالیٰ کی ناشکری نہ کرو، دوسری بات یہ ہے کہ انہیں اللہ تعالیٰ کے نام پر دو، غیر اللہ کی نیاز کیلئے انہیں استعمال نہ کرو کیونکہ یہ بھی حد درجے کی ناشکری اور شرک ہوگا۔

وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ: فصل یا پھل کٹنے کے دن اس کا حق ادا کرو، اس حق کی تشریح میں مفسرین کرام کے دو مختلف قول پائے جاتے ہیں، یعنی: بعض مفسرین اس حق سے صرف صدقہ خیرات مراد لیتے ہیں، جب کہ بعض دوسرے اس سے عشر یا نصف عشر مراد لیتے ہیں، جو حضرات اسے صرف صدقہ پر محمول کرتے ہیں ان کی دلیل یہ ہے کہ عشر یا نصف عشر کی تفصیل مدنی زندگی میں اتریں جب کہ یہ سورۃ مکی ہے، لہٰذا اس حق سے عشر یا نصف عشر مراد نہیں لیا جاسکتا صدقہ وخیرات کرنے کا حکم بھی قرآن پاک میں ذکر کیا گیا ہے، ''سورہ معارج'' میں ہے کہ تمہارے مالوں میں سوال کرنے والوں اور محتاجوں کا حق ہے، یہ حق کبھی واجب ہوتا ہے اور کبھی سنت یا نفل، بہرحال اللہ تعالیٰ نے مالداروں کے مال میں غریبوں اور محتاجوں کا حق رکھا ہے اسی لئے فرمایا جب کھیتی یا پھل پک جائیں تو اس کا حق ادا کرو، یعنی: جب فصل کاٹی جائے یا پھل درختوں سے اتارا جائے تو اسے گھر لاتے وقت مسکینوں، یتیموں اور بیواؤں کو بھی کچھ نہ کچھ دو۔

امام ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ اور ابوبکر بن عربی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ زکوٰۃ مکی زندگی میں ہی فرض ہوگئی تھی تاہم اس

کی مقدار مدینے میں جا کر مقرر ہوئی،، لہٰذا مکی دور میں بھی بطور زکوٰۃ کچھ نہ کچھ ادا کرنا پڑتا تھا اس کی دلیل ''سورۂ مزمل'' کی آیت میں ہے جس میں نماز کے ساتھ زکوٰۃ کا بھی حکم ہے جب کہ یہ سورۃ مکی زندگی کے بالکل ابتدائی دور میں اتری تھی، چنانچہ بعض مفسرین اور امام اعظم امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہاں پر مراد زمین کی پیداوار سے عشر کی ادائیگی ہے جس کی تشریح ۲ھ میں مدینہ منورہ میں مکمل ہوئی اور جس کے مطابق سونے چاندی میں سے چالیسواں حصہ زکوٰۃ مقرر ہوئی، مویشیوں میں سے پانچ اونٹوں کے بدلے ایک بکری، ہر تیس گائے بھینس میں سے ایک گائے یا ایک بھینس، اور چالیس بھیڑ بکریوں میں سے ایک بکری اور بھیڑ زکوٰۃ مقرر ہوئی، زمین کی پیداوار پر دسویں اور بیسویں کا اطلاق ہوا، چنانچہ جس زمین کی آبپاشی محنت کے ذریعے، یعنی: نہر، کنویں یا پانی باہر سے لاد کر کی جاتی ہے اس زمین کی پیداوار میں سے بیسواں حصہ اور جو زمین بارانی (جو زمین محض بارش سے سیراب ہوتی ہو) ہے اس کی پیداوار میں سے دسواں حصہ عشر بطور زکوٰۃ مقرر ہوا، البتہ زمینی پیداوار کے نصاب کے متعلق اماموں میں کچھ اختلاف پایا جاتا ہے۔

وَلَا تُسۡرِفُوۡا ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الۡمُسۡرِفِيۡنَ: فضول خرچی نہ کرو مال کو بلاضرورت یا ضرورت سے زیادہ خرچ نہ کرو، اگر کوئی کام تھوڑے خرچہ سے پورا ہوسکتا ہے تو اس کیلئے زیادہ خرچ نہ کرو یہی اسراف ہے، ''سورۂ اعراف'' میں موجود ہے کہ کھاؤ پیو مگر فضول خرچی نہ کرو، اللہ تعالیٰ فضول خرچ کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے، ہر ناجائز کام، مثلاً: عیاشی، فحاشی اور باطل رسموں پر خرچ کرنا اسراف وفضول خرچی میں آئے گا، روپیہ پیسہ ہو یا اناج اور پھل، ضرورت سے زائد استعمال کرنا فضول خرچی کے زمرہ میں آئے گا، ''سورہ بنی اسرائیل'' میں ہے کہ: ''فضول خرچ شیطان کے بھائی ہیں''، یہ لوگ انسانی بھلائی کے کام کرنے کے بجائے فضول کاموں میں مال اڑاتے ہیں اور اس طرح شیطان کو خوش کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: اس کی عطا کی ہوئی نعمتیں کھاؤ پیو مگر فضول خرچی نہ کرو، جب کھیتی پک جائے اور درختوں کا پھل اتار لو تو اس میں سے غریبوں اور مسکینوں کا حق ادا کرو۔

یہاں سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں اگر کوئی شخص اپنا سارا مال بلکہ جان بھی خرچ کردے تو اس کو اسراف نہیں کہا جاسکتا بلکہ حق کی ادائیگی کہنا بھی مشکل ہے، پھر اس جگہ اسراف سے منع کرنے کا کیا مطلب ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جو شخص اپنی خواہشوں میں بے تحاشا حد سے زائد خرچ کرتا ہے وہ عموماً دوسروں کے حقوق ادا کرنے میں کوتاہی کیا کرتا ہے یہاں اسی کوتاہی سے روکا گیا ہے، یعنی: ایک طرف کوئی آدمی اپنا سارا مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں لٹا کر خالی ہو بیٹھے تو اہل و اولاد اور رشتہ داروں بلکہ خود کے حقوق کیسے ادا کرے گا اس لئے ہدایت یہ کی گئی کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے میں میانہ روی سے کام لے تاکہ سب حقوق ادا ہوسکیں۔

احکام ومسائل

مسئلہ (۱):.... ایسی زمینیں جو صرف بارش سے سیراب کی جاتی ہیں جہاں پانی سے سیراب کا اور کوئی ذریعہ نہیں صرف بارش پر پیداوار کا مدار ہے ان زمینوں کی پیداوار کا دسواں حصہ بطور زکوٰۃ نکالنا واجب ہے اور جو زمینیں کنووں وغیرہ سے سیراب کی جاتی ہیں ان کی پیداوار کا بیسواں حصہ نکالنا واجب ہے۔

جانور بھی اللہ تعالیٰ ہی نے بنائے

وَ مِنَ الْاَنْعَامِ حَمُوْلَةً وَّ فَرْشًا ؕ كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ وَ لَا

اور سے چوپایوں بوجھ اٹھانے والے اور نیچے قد والے کھاؤ اس سے جو دیا تم کو اللہ نے اور نہ

تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝۱۴۲ ثَمٰنِيَةَ

پیچھے پیچھے چلو قدموں کے شیطان کے بیشک وہ لئے تمہارے دشمن ہے کھلا (۱۴۲) آٹھ

اَزْوَاجٍ ۚ مِنَ الضَّاْنِ اثْنَيْنِ وَ مِنَ الْمَعْزِ اثْنَيْنِ ؕ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَيْنِ

جوڑے میں سے بھیڑ دو اور میں سے بکری دو آپ کہہ دیجئے کیا دو نر

حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ؕ

حرام کئے | یا | دو مادہ | یا | وہ کہ لپٹے ہیں | پر جس | بچہ دانیاں | دونوں مادہ کے

با محاورہ ترجمہ:- اور چوپایوں میں بوجھ اٹھانے والے اور زمین سے لگے ہوئے پیدا کئے، اللہ کے رزق میں سے کھاؤ اور شیطان کے قدموں پر نہ چلو وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ (۱۴۲) آٹھ نر مادہ پیدا کئے دو بھیڑ میں سے اور دو بکریوں میں سے، پوچھئے کہ اللہ نے دونوں نر حرام کئے یا دونوں مادہ یا اس بچہ کو جس کو دونوں مادہ اپنے پیٹ میں لئے ہوئے ہوں۔

لفظی تحقیق: اِشْتِمَالٌ: لپٹ جانا۔ یہ "شَمْلٌ" سے بنا ہے جس کے معنٰی کسی چیز کو ڈھانک لینے اور اپنے اندر چھپانے کے ہیں، "اِشْتِمَالٌ" کے معنٰی ہیں: کسی چیز کے گرد لپٹ جانا اور اس کو اپنے اندر چھپا لینا، جیسے: اوڑھنے کی چادر اردگرد لپیٹی جاتی ہے اور بدن کو ڈھانک لیتی ہے، یہاں یہ کہا گیا ہے کہ بچہ کو پیدا ہونے سے پہلے مادہ کا رحم، یعنی: بچہ دانی اپنے اندر لپیٹے رکھتی ہے۔

تفسیر

اللہ تعالیٰ نے چوپائے بھی انسانوں کیلئے بنائے جن میں سے بعض بوجھ اٹھانے اور لادنے کے کام آتے ہیں یہ لمبے قد ہیں اور بعض چھوٹے قد ہیں جن کا دودھ پیا جاتا ہے اور گوشت کھایا جاتا ہے ان کو کھاؤ اور پیو، ارشاد ہے کہ: ان سے پوچھو کہ تم جو بعض جانوروں کو بتوں کے نام پر حرام یا حلال کر لیتے ہو بتاؤ یہ اللہ تعالیٰ نے کہاں کہا ہے؟

وَمِنَ الْاَنْعَامِ حَمُوْلَةً وَّ فَرْشًا: کھیتی اور پھلوں کا ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے بعض جانوروں کے فائدے بھی ذکر کئے ہیں، جانوروں میں سے بعض ایسے ہیں جو سامان اٹھانے کا کام کرتے ہیں ان میں سے اونٹ، بیل، خچر گدھے وغیرہ ہیں جو انسانوں کیلئے بڑے فائدہ مند کام انجام دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے انہیں انسانوں

کا خادم بنادیا ہے، فرمایا: بوجھ اٹھانے والے جانوروں کے علاوہ بعض جانور ایسے ہیں جو زمین سے لگے ہوئے ہیں، یعنی: چھوٹے قد کے ہیں ان میں بھیڑ، بکریاں اور دوسرے چھوٹے جانور ہیں یہ بھی انسانوں کیلئے بڑے فائدہ مند ہیں، امام ابوبکر جصاص رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ان کو "فَرْشًا" اس لئے کہا گیا ہے کہ ان کے چمڑے اور بالوں سے مصلّٰی وغیرہ بنا کر زمین پر بچھایا جاتا ہے، بالوں سے کپڑا بنا کر کمبل کے طور پر لیا جاتا ہے اور پہننے کے کام بھی آتا ہے کھال کو رنگ کرنے کے بعد فرش پر بچھایا جاتا ہے، اس کے علاوہ چونکہ یہ جانور ذبح کے وقت زمین پر لٹا دیئے جاتے ہیں، لہٰذا "فَرْشًا" کہنے کی یہ وجہ بھی ہوسکتی ہے، دنیا میں ہر روز لاکھوں، کروڑوں بھیڑ بکریاں ذبح کردی جاتی ہیں جو کہ انسانوں کیلئے نہایت طاقتور غذا کا کام دیتی ہیں یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ہے۔

كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ: جو رزق تمہیں اللہ تعالیٰ نے دیا ہے اسے کھاؤ یہ رزق خواہ کھیتی کی شکل میں ہو یا پھلوں کی صورت میں یا جانوروں کی شکل میں اسے استعمال کرو، کیونکہ یہ چیزیں اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے پیدا فرمائی ہیں، البتہ ان کے کھانے میں اور دوسری ضرورتوں میں فضول خرچی نہ کرو۔

ان انعاموں کے جائز استعمال پر کوئی پابندی نہیں، البتہ شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو، شیطان کے نقش قدم پر چلنا اللہ تعالیٰ کے حکم کی پابندی کو چھوڑ دینا ہے، جو شخص شریعت پر عمل کرنے کے بجائے اپنی خواہش کی پیروی کرتا ہے رسم ورواج کے پیچھے چلتا ہے وہ حقیقت میں شیطان کی پیروی کرتا ہے، شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے وہ انسان کو مرتے دم تک بہکانے کی کوشش کرتا ہے وہ تمہیں ایمان سے دور کرکے گمراہی کے گڑھے میں دھکیلنا چاہتا ہے، لہٰذا تمہارا کام یہ ہے کہ اس سے ہمیشہ بچ کر رہو۔

جانوروں کے نر مادہ مل کر آٹھ جانور، یعنی: چار جوڑے ہیں، دو بھیڑوں کے اور دو بکریوں کے، اور دو جوڑوں کا ذکر آگے آئے گا، اب یہ بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے ان میں سے نر کو حرام کیا ہے یا مادہ کو یا ان کے بچوں کو اگر اس نے نہیں کیا تو تمہیں کیا حق ہے کہ ان میں سے کسی کو حرام یا حلال کرو۔

جانوروں کی دو باقی قسمیں

نَبِّـُٔوْنِیْ بِعِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۱۴۳﴾ وَ مِنَ الْاِبِلِ اثْنَیْنِ وَ

خبر دو تم مجھے اسکے علم کی اگر ہو تم سچے (۱۴۳) اور میں سے اونٹ دو اور

مِنَ الْبَقَرِ اثْنَیْنِ ؕ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَیْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَیَیْنِ اَمَّا

میں سے گائے دو آپ کہہ دیجئے کیا دونوں نر حرام کئے یا دونوں مادہ یا

اشْتَمَلَتْ عَلَیْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَیَیْنِ ؕ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ

وہ کہ لپٹے ہیں پر اس بچہ دانیاں دونوں مادہ کے کیا تھے تم حاضر جب

وَصّٰىكُمُ اللّٰهُ بِهٰذَا ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا

حکم دیا تھا تم کو اللہ نے اس کا پس کون زیادہ ظالم ہے اس سے جو باندھے پر اللہ کے جھوٹ

لِّیُضِلَّ النَّاسَ بِغَیْرِ عِلْمٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۴۴﴾ ع ۱۷

تا کہ گمراہ کرے لوگوں کو بغیر علم کے بیشک اللہ نہیں راہ دکھاتا لوگوں کو ظلم کرنے والوں (۱۴۴)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اگر تم سچے ہو تو مجھ کو سند بتلاؤ۔ (۱۴۳) اونٹ میں سے دو اور گائے میں سے دو پیدا کیے، پوچھئے تو دونوں نر حرام کئے ہیں یا دونوں مادہ، یا اس بچہ کو جس کو دونوں مادہ اپنے پیٹ میں لئے ہوئے ہوں، کیا جس وقت اللہ نے تم کو یہ حکم دیا تھا تم حاضر تھے، پھر اس سے زیادہ کون ظالم ہے جو اللہ پر بہتان باندھے تا کہ لوگوں کو بلاتحقیق گمراہ کرے، بیشک اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا۔ (۱۴۴)

تفسیر

ارشاد ہے کہ مجھے بتاؤ ان جانوروں کے حرام ہونے کا علم تمہیں کیسے ہوا؟ کیونکہ علم کیلئے ثبوت کی ضرورت

ہے اگر تم سچے ہو تو بتاؤ تم سے اللہ کے کس پیغمبر نے یہ کہا؟ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اونٹ کے نر مادہ اور گائے کے نر مادہ کے دو جوڑے بنائے ان کے بارے میں پوچھئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے نر حرام کئے یا ان کی مادہ یا ان کے پیٹ کے بچے، اگر کسی پیغمبر نے کہا ہو تو اس کا ثبوت لاؤ اور نہیں تو یہ بتلاؤ کہ جب اللہ تعالیٰ نے انہیں حرام کیا تھا کیا تم خود اس وقت حاضر تھے اور تم نے اپنے کانوں سے سنا جب ان میں سے کوئی بات بھی نہیں تو بتاؤ کہ اس آدمی سے زیادہ ظالم کون ہے جو اللہ تعالیٰ پر بہتان باندھے اور جس کو اس نے حرام نہیں کیا اس کے بارے میں کہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے حرام کیا ہے؟ آگے ارشاد ہے کہ جب ان کے کرتوتوں سے ثابت ہو گیا کہ یہ ہر طرح ظالم ہیں اور انہیں سچی بات سمجھنے اور سیدھی راہ پر چلنے کی صلاحیت ہی نہیں، پھر ان کو ہدایت کیسے ہو؟ اللہ تعالیٰ نے تو یہ قاعدہ مقرر کر دیا ہے کہ وہ ان لوگوں کو جن میں ٹھیک کام کرنے کی صلاحیت نہیں انہیں ہدایت نہیں کرتے۔

اس آیت میں بہت وضاحت کے ساتھ ان لوگوں کی تردید کی گئی ہے جو اپنے گھڑے ہوئے حیلے بہانوں سے بغیر ثبوت کے چیزوں کو اپنے اوپر حلال یا حرام کر لیتے ہیں اور یہ بھی معلوم ہوا کہ یقینی علم کے حاصل کرنے کے دو طریقے ہیں کوئی معتبر آدمی بتائے یا خود سنے یا دیکھے اس لئے قرآن مجید میں جو باتیں ہیں وہ یقینی ہیں کیونکہ اس کتاب کو اللہ تعالیٰ کے پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں سچا کہہ کر دیا ہے۔

حرام چیزیں

قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ

آپ کہہ دیجئے نہیں پاتا میں اس میں جو وحی کی گئی طرف میری حرام پر کسی کھانے والے جو کھائے اسکو مگر

اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ

یہ کہ ہو وہ مردار یا خون بہتا ہوا یا گوشت سور کا کیونکہ وہ

رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ
ناپاک ہے یا ناجائز پکارا گیا واسطے غیر اللہ کے پر جس پس جو بے قرار ہوجائے نہ نافرمانی کرنے والا

وَّ لَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴۵﴾
اور نہ زیادتی کرنیوالا پس تحقیق رب آپ کا معاف کرنیوالا نہایت مہربان ہے (۱۴۵)

بامحاورہ ترجمہ:۔ آپ کہہ دیجئے کہ میں اس وحی میں جو مجھ کو پہنچی ہے کھانے والے پر کسی ایسی چیز کو جو اسے کھائے حرام نہیں پاتا، مگر یہ کہ وہ چیز مردار ہو یا بہتا ہوا خون ہو یا سور کا گوشت جو ناپاک ہے یا ناجائز (ذبیحہ) جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا جائے، پھر جو کوئی بھوک سے بے اختیار ہوجائے نافرمانی نہ کرے اور نہ زیادتی تو آپ کا رب بڑا معاف کرنے والا نہایت مہربان ہے۔ (۱۴۵)

لفظی تحقیق: اُهِلَّ: اعلان کیا گیا۔ اس کا مصدر "اِهْلَالٌ" ہے، "اِهْلَالٌ" کے معنٰی ہیں: کھلم کھلا پکارنا اور اعلان کرنا، مطلب یہ ہے کہ ایسا جانور جس کو غیر اللہ کے نام پر پکارا گیا ہو۔ بَاغٍ: نافرمان۔ اصل میں "بَاغِیْ" ہے جو "بَغَاوت" سے بنا ہے "بغاوت" کے معنٰی ہیں: کسی کا حکم ماننے سے انکار کردینا، یہاں اللہ تعالیٰ کا نافرمان مراد ہے۔ عَادٍ: یہ اصل میں "عَادِیْ" ہے جو "عُدْوَانٌ" سے بنا ہے، اس کے معنٰی ہیں حد سے نکل جانا اور زیادتی کرنا۔

تفسیر

ارشاد ہے کہ تمہیں کسی چیز کے حلال یا حرام کرنے کا کوئی اختیار نہیں ہے کسی چیز کو حلال یا حرام کرنا اللہ تعالیٰ کا کام ہے مجھے اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں حرام بتائی ہیں وہ گنوا دیتا ہوں ان میں وہ کوئی نہیں ہے جسے تم خواہ مخواہ حرام کر بیٹھتے ہو سنو اللہ تعالیٰ کی حرام کی ہوئی چار چیزیں ہیں۔

(۱)..... مردار جانور۔

(۲)..... بہتا ہوا خون۔

(۳)..... سور کا گوشت۔

(۴)..... غیر اللہ کے نام پر پکاری ہوئی چیز، مثلاً: یوں کہنا شیخ سدو کا بکرا، سید احمد کبیر کی گائے۔

حرام چیزوں کا ذکر "سورہ مائدہ" کے پہلے رکوع کی تفسیر میں گزر چکا ہے وہ یہی چار ہیں باقی ان میں تفصیل ہے۔

مَيْتَةً: اے پیغمبر! آپ اعلان فرما دیں کہ کھانے کے معاملے میں تو ان چیزوں کے علاوہ کسی اور چیز کو حرام نہیں پاتا، ان میں **پہلی چیز مردار** ہے مردار وہ جانور ہے جو حلال ہو مگر بغیر ذبح کیے خود بخود مر جائے یا اگر ذبح بھی کیا جائے تو شریعت کے خلاف کسی اور طریقہ سے، مثلاً: گلا گھونٹ دیا جائے یا لکڑی، پتھر وغیرہ مار کر موت کے گھاٹ اتار دیا جائے یا ذبح کرتے وقت جان بوجھ کر اس پر اللہ تعالیٰ کا نام نہ لیا جائے اگر کسی زندہ جانور کا کوئی عضو کاٹ لیا جائے تو وہ بھی مردار ہی کہلائے گا، کسی جانور کو اگر کوئی دوسرا جانور سینگ مار کر ہلاک کر دے یا کوئی درندہ پھاڑ کھائے اور وہ مر جائے تو وہ بھی مردار ہے ایسے تمام جانور مردار ہیں، البتہ دو جانور حدیث کے مطابق اس حرام ہونے سے خارج ہیں اور بغیر ذبح کیے ان کا کھانا درست ہے، حدیث میں آیا ہے کہ "ہمارے لئے دو مری ہوئی چیزیں حلال ہیں ایک مچھلی اور دوسرے ٹڈی اور دو خون حلال ہیں ایک جگر اور دوسرا تلی" جن کے بارے میں آگے آ رہا ہے۔

دَمًا مَّسْفُوْحًا: چار حرام چیزوں میں سے **دوسری چیز** بہتا ہوا خون ہے ذبح کرتے وقت جانور کی رگوں سے جو خون بہتا ہے وہ بالکل حرام ہے، البتہ ذبح کے بعد جو تھوڑا بہت خون گوشت کے ساتھ رہ جاتا ہے وہ ناپاک نہیں ہے اس لئے اگر گوشت کو دھوئے بغیر بھی پکا کر کھا لیا جائے تو کوئی حرج نہیں تاہم صفائی ستھرائی کا تقاضہ ہے کہ گوشت کو دھو کر اور صاف کر کے پکایا جائے، ظاہر ہے کہ جانور کی رگ کاٹنے سے یہی مقصود ہے کہ اس کا تمام خون بہہ جائے جو کہ حرام ہے، البتہ ایک چیز کی گنجائش ہے جس جانور کو شرعی طریقہ سے ذبح کرنا ممکن نہ ہو، مثلاً: کوئی پرندہ ہے یا تیز بھاگنے والا جانور ہے تو اسے اللہ تعالیٰ کا نام لے کر زخمی کر دینا ہی کافی ہے ایسے جانور کو تیر

چلاتے وقت یا نیزہ وغیرہ مارتے وقت اللہ تعالیٰ کا نام لے لیا جائے تو وہ جانور اس شرط کے ساتھ حلال ہو جائے گا کہ شکاری کے پہنچنے سے پہلے وہ جانور یا پرندہ نہ مر گیا ہو اور اگر مرا نہ ہو تو پھر اس کے گلے پر چھری چلا کر ذبح کرنا ضروری ہے، مقصد یہ کہ اگر اللہ تعالیٰ کا نام لے کر تیز دھار آلے سے حملہ کیا جائے تو جانور اگر شکاری کے پہنچنے سے پہلے مر گیا ہے تو ذبح کے بغیر حلال ہوگا ورنہ بغیر ذبح کیے حلال نہیں ہوگا، اگر لکڑی، غلیل یا بندوق کا نشانہ لگایا جائے تو یہ جانور یا پرندہ ہر صورت میں بغیر ذبح کئے حلال نہیں ہوگا کیونکہ تیز دھار آلہ شرط ہے، بہر حال اللہ تعالیٰ نے بہتے ہوئے خون کو بالکل حرام قرار دیا ہے، البتہ خون کی دو قسمیں حدیث شریف کے مطابق حلال ہیں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہمارے لئے دو مری ہوئی چیزیں حلال ہیں ایک مچھلی اور دوسرے ٹڈی اور دو خون حلال ہیں ایک جگر اور دوسرا تلی''۔

لَحْمَ خِنْزِيْرٍ: چار حرام چیزوں میں سے تیسری حرام چیز خنزیر کا گوشت ہے، خنزیر نجس العین جانور ہے اسی لئے سب شریعتوں میں خنزیر حرام رہا ہے، عیسائیوں نے اپنی بدعملیوں کی وجہ سے اسے بھیڑ بکری کی طرح کھانا شروع کر دیا ہے، چنانچہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام قیامت کے قریب زمانہ میں زمین پر اتریں گے تو آپ صلیب کو توڑ دیں گے اور خنزیر کو قتل کریں گے تاکہ عیسائیوں کو ذلیل کریں اور ان کے غلط کاموں پر سے پردہ اٹھایا جائے، خنزیر ایسا ناپاک جانور ہے جسے اللہ تعالیٰ نے گندگی فرمایا ہے جس طرح پیشاب، پاخانہ وغیرہ کسی صورت میں بھی پاک نہیں ہو سکتے اسی طرح یہ جانور بھی نجس العین ہے اور اس کا کوئی حصہ یعنی گوشت، کھال ہڈی وغیرہ سب ناپاک ہیں حتیٰ کہ اس کے بال بھی ناپاک ہیں، باقی حرام جانوروں کی کھال دباغت (کھال کو نمک وغیرہ لگا کر یا دھوپ میں رکھ کر یا کسی اور طریقہ سے پاک کر لینے) سے پاک ہو جاتی ہے مگر خنزیر کی کھال دباغت سے بھی پاک نہیں ہوتی۔

اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ: چار حرام چیزوں میں سے چوتھا نمبر غیر اللہ کے نام پر پکاری ہوئی چیز کا ہے، یعنی: وہ چیز بھی حرام ہے جس پر اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی دوسرے کا نام پکارا گیا ہو اس کو اللہ تعالیٰ نے ''فِسْقًا'' کہا ہے

کہ یہ گناہ کی بات ہے، اگر کوئی چیز کسی بت، جن، فرشتے، پیغمبر یا بزرگ کے قرب یا رضا حاصل کرنے کیلئے نیاز کے طور پر دی جائے، یہ سب غیر اللہ کی نذریں ہیں، اس سے اگر یہ مقصود ہو کہ فلاں ہستی خوش ہو کر کسی مصیبت سے بچالے گی یا کوئی بگڑا ہوا کام بن جائے گا تو ایسی چیز بہر حال حرام ہو جاتی ہے، اگر جانور کو ذبح کرتے وقت بسم اللہ بھی پڑھ لی جائے تب بھی جانور حرام ہی رہے گا، البتہ اگر کوئی شخص ایسے عقیدے سے توبہ کر کے ذبح کرتا ہے تو پھر جانور حلال ہوگا، غیر اللہ کیلئے نذر تمام پیغمبروں کے زمانے میں حرام رہی ہے، یہ کسی صورت میں بھی حلال نہیں بلکہ اس کی ناپاکی مردار کی ناپاکی سے بھی بڑھ جاتی ہے وجہ یہ ہے کہ مردار میں تو صرف یہ خرابی ہے کہ اس کی جان اللہ تعالیٰ کے نام پر نہیں نکلی مگر جو جانور غیر اللہ کے نام پر نذر کیا گیا ہے اس پر تو غیر اللہ کا نام آ گیا ہے جو عین شرک ہے جس طرح کوئی کتا یا خنزیر تکبیر کہہ کر ذبح کرنے سے حلال نہیں ہو جاتا اسی طرح سے غیر اللہ کی نذر کا جانور بھی بسم اللہ اللہ اکبر کہنے سے حلال نہیں ہوتا، حدیث شریف میں آتا ہے کہ جو غیر اللہ کی تعظیم خوشی یا قرب کیلئے جانور ذبح کرتا ہے اس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے ذبح کرتے وقت اللہ تعالیٰ کا نام لے یا نہ لے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ یہ جانور غیر اللہ کی طرف نسبت کی بنا پر ہی حرام ہو گیا ہے اور اب تکبیر اسے حلال نہیں کر سکتی ، ہاں ! اگر اللہ تعالیٰ کے نام پر اس کی رضا اور قرب کیلئے ذبح کرے اور پھر اس کا ثواب کسی فوت شدہ رشتہ دار پیر یا بزرگ کو ایصال ثواب کرے تو جائز ہے۔

فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ: آیت کے آخر میں ارشاد ہے کہ جو کوئی مجبور ہو گیا ہو نہ وہ نافرمانی کرنے والا ہے اور نہ حد سے تجاوز کرنے والا ہے تو بیشک آپ کا رب بخشش کرنے والا اور مہربان ہے مجبوری سے مراد یہ ہے کہ کسی شخص کے پاس فاقہ کے وقت کھانے کی کوئی چیز موجود نہیں اور نہ ہی اسے کوئی حلال چیز میسر ہے تو ایسی حالت میں اگر وہ ایسی حرام چیزوں میں سے کوئی چیز کھا کر جان بچالے تو اللہ تعالیٰ معاف کر دیں گے اس پر کوئی پکڑ نہیں ہوگی، "غَيْرَ بَاغٍ" کا مطلب ہے کہ وہ حرام کھانا لذت حاصل کرنے کیلئے نہ کھائے، اور دوسری بات یہ ہے کہ زیادتی بھی نہ کرے، یعنی: صرف اتنا کھائے جس سے جان بچ سکتی ہو اس سے زیادہ کا لالچ نہ

کرے ا، گر پاؤ بھر چیز کھانے سے جان بچا سکتا ہے تو پھر اس سے زیادہ ایک لقمہ بھی کھانے کی کوشش نہ کرے اگر ان دو شرطوں کے ساتھ سخت مجبوری کی حالت میں کوئی حرام چیز بھی استعمال کرے گا تو اللہ تعالیٰ معاف فرما دیں گے بلکہ فقہائے کرام تو یہ بھی فرماتے ہیں کہ مجبوری کی حالت میں اگر حرام چیز میسر ہے مگر کوئی شخص اس حرام چیز کو نہ کھا کر اپنی جان ضائع کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی پکڑ ہوگی جب ایسی حالت میں اللہ تعالیٰ نے حرام چیز کے کھانے کی اجازت دی ہے تو پھر اس نے کیوں نہ استعمال کیا، بہر حال جان بچانے کیلئے حرام چیز کا کھا لینا بہتر ہے بجائے اس کے کہ اس کی جان ضائع ہو۔

احکام و مسائل

مسئلہ (۱):.... مردار، بہتا ہوا خون، خنزیر اور غیر اللہ کے نام پر پکاری ہوئی چیز کا کھانا حرام ہے اگر فاقہ سے کسی کی جان جا رہی ہو تو ان چیزوں میں سے چند لقمے کھا لینا جائز ہے جس سے اس کی جان بچ جائے۔

یہودیوں پر حرام کی ہوئی چیزیں

وَ عَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ ۚ وَ مِنَ الْبَقَرِ وَ

اور اوپر ان کے جو یہودی ہوئے حرام کیا ہم نے ہر ایک والا ناخن اور سے گائے اور

الْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَآ اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَآ اَوِ

بکری حرام کیا ہم نے پر ان چربیاں ان کی مگر جو اٹھائی ہوں پیٹھوں ان کی نے یا

الْحَوَايَآ اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ؕ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ ۫ۖ

انتڑیوں نے یا جو ملی ہوئی ہو ساتھ ہڈی کے یہ بدلہ دیا ہم نے سرکشی ان کی کا

وَ اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۱۴۶﴾

اور بیشک ہم سچے ہیں (۱۴۶)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور یہودیوں پر ہم نے ہر ایک ناخن والا جانور حرام کیا تھا اور گائے اور بکری میں سے ان کی چربی حرام کی تھی مگر جو پیٹھ پر یا انتڑیوں پر لگی ہو یا جو چربی ہڈی کیساتھ ملی ہو (وہ حرام نہ تھی) یہ سزا ہم نے ان کو ان کی شرارت پر دی تھی اور بیشک ہم سچے ہیں۔ (۱۴۶)

لفظی تحقیق: حَوَایَا: انتڑیاں۔ یہ "حَوِیَّۃٌ" کی جمع ہے جو "حَوٰی" سے بنا ہے "حَوٰی" کے معنٰی ہے: گھیرنا کسی چیز کو اپنے اندر لپیٹ لینا، "حَوِیَّۃٌ" وہ چیز جو کسی کے گرد لپٹ کر اس کو اپنے اندر چھپالے یہاں مراد: آنتیں ہیں جو ایک دوسرے سے لپٹی ہوتی ہیں۔

تفسیر

یہودی جو خود کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا امتی ہونے کا دعویٰ کرتے تھے یہ لوگ اگر چہ ابتدائی دور میں صحیح ایمان رکھنے والے تھے مگر بعد میں وہ لوگ اپنے پیغمبر کی تعلیم سے ہٹ گئے انہوں نے اللہ تعالیٰ کی کتابوں میں جگہ جگہ ردو بدل کیا اور اپنے دین کو بگاڑ کر رکھ دیا اور غضب کے مستحق ٹھہرے، بہر حال ہم نے یہودیوں کیلئے ہر ناخن والا جانور حرام قرار دے دیا اس سے مراد وہ جانور ہیں جن کے پاؤں پنجے کی شکل میں ہوں اور درمیان سے پھٹے ہوئے نہ ہوں ان میں اونٹ، شتر مرغ، بطخ اور مرغابی وغیرہ شامل ہیں اگر چہ یہ جانور بنیادی طور پر حلال ہیں مگر جیسا کہ آگے آرہا ہے اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کی سرکشی کی وجہ سے ان پر یہ جانور حرام قرار دے دیے، اور اس طرح سزا کے طور پر یہودیوں کو ایک نعمت سے محروم کر دیا گیا۔

ناخن والے جانوروں کے علاوہ گائے، بیل، بھیڑ بکریوں میں سے ہم نے ان پر ان جانوروں کی چربی حرام کردی، یعنی: یہودی لوگ گائے اور بھیڑ بکریوں کا گوشت تو استعمال کر سکتے تھے مگر چربی استعمال نہیں کر سکتے تھے سوائے اس چربی کے جو ان جانوروں کے پیٹھوں کے ساتھ لگی ہوئی ہو یا جو آنتوں کے ساتھ ملی ہوئی ہو یا جو ہڈیوں کے ساتھ لگی ہوئی ہو، اللہ تعالیٰ نے ان تین قسم کی چربی کے علاوہ باقی ساری چربی یہودیوں کیلئے ممنوع قرار

دے دی وہ نہ اسے کھا سکتے تھے اور نہ کسی دوسرے کام میں استعمال کر سکتے تھے یہودیوں کے لئے یہ بڑا سخت حکم تھا، ایک حلال جانور کا گوشت تو کھا سکتے تھے مگر چربی نہیں کھا سکتے تھے، جسے گوشت سے علیحدہ کرنے کے لئے انہیں بڑی مشقت اٹھانا پڑتی تھی کیونکہ وہ ان پر حرام تھی۔

یہودیوں کو یہ سزا اللہ تعالیٰ نے ان کی بغاوت کی وجہ سے دی بعض حلال جانور ان پر حرام کر دیئے تاکہ انہیں تکلیف ہو اور اگر وہ اس سزا میں پورا نہ اتریں اور حرام کی ہوئی چیزوں کو بھی استعمال کریں تو ان پر مزید وبال لایا جا سکے، انسانوں پر ظلم و زیادتی کرنا، انسانی حقوق کو ضائع کرنا شرارت کرنا اور اللہ تعالیٰ کے حکموں کے آگے نہ جھکنے کی وجہ سے ہی اللہ تعالیٰ نے انہیں اس قسم کی آزمائش میں مبتلا کر دیا ہے، حدیث شریف میں آتا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انسانوں کو اپنے گناہوں کی وجہ سے رزق سے محروم کر دیا جاتا ہے، ایک حدیث میں یہ بھی آتا ہے کہ انسان کے گناہوں کی وجہ سے خود اس پر، جانوروں پر اور کیڑے مکوڑوں پر برے اثرات پڑتے ہیں اسی لئے جب کوئی شریر آدمی مر جاتا ہے تو اس علاقے کے جانور اور درخت اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اس موذی سے جان چھوٹی، وہ جانتے ہیں کہ اس بدکار آدمی کی وجہ سے وہ بھی پریشانی میں مبتلا تھے، البتہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سزا اپنی حکمت کے مطابق دیتے ہیں کبھی فوراً پکڑ لیتے ہیں اور کبھی مہلت دے دیتے ہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: میں ان کو ڈھیل دیتا ہوں میری تدبیر بڑی مضبوط ہے، بعض انسانوں کو اللہ تعالیٰ دنیا میں بالکل سزا نہیں دیتے اس میں بھی اس کی خاص مصلحت ہوتی ہے جونہی انسان موت کی طرف بڑھتا ہے اس کی سزا فوراً شروع ہو جاتی ہے بعض کو ان کی کوتاہیوں کی وجہ سے دنیا میں ہی سزا دے دیتے ہیں یہ سب اس کی حکمت پر منحصر ہے۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی فرمان ہے کہ انسان بڑا مجرم ہے جس نے کرید کرید کر سوال کیا تو اس کے سوال کی وجہ سے ایک حلال چیز مسلمانوں پر حرام کر دی گئی اگر وہ سوال نہ کرتا تو وہ چیز حرام قرار نہ دی جاتی اس نے خواہ مخواہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق کو ایک نعمت سے محروم کر دیا، قرآن کریم میں اکثر مقام پر آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجرموں اور نافرمانوں کو نہیں چھوڑتے، دنیا پر جو پریشانیاں، تکلیفیں، بیماریاں آتی ہیں یہ اکثر انسانوں کے ہاتھ کی کمائی کا نتیجہ

ہوتی ہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: ان تکلیفوں میں تمہارے ہاتھوں کا دخل ہوتا ہے جس کی وجہ سے اور بہت سی چیزوں کو نظر انداز بھی کر دیا جاتا ہے فوری طور پر پکڑ نہیں ہوتی مگر آگے حشر کے میدان میں ذرے ذرے کا حساب ہوگا اور عملوں کے مطابق جزا اور سزا کا فیصلہ ہوگا، بہر حال فرمایا کہ ان کے گناہوں کی وجہ سے ہم نے ان پر بعض پابندیاں عائد کر دیں اور ہم اپنی بات میں بالکل سچے ہیں ہمارا فیصلہ حق پر مبنی ہوتا ہے اور اس میں کسی قسم کا شبہ نہیں ہونا چاہیے۔

مجرم بچ نہیں سکتے

فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ رَّبُّكُمْ ذُوْ رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ ۚ وَ لَا يُرَدُّ

پس اگر | جھٹلائیں آپ کو | پس کہہ دیجئے | رب تمہارا | والا | رحمت | وسیع | اور | نہ | ٹالا جائیگا

بَاْسُهٗ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿١٤٧﴾

عذاب اس کا | سے | لوگ | جو جرم کرنے والے ہیں (۱۴۷)

با محاورہ ترجمہ:۔ پھر اگر آپ کو جھٹلائیں تو آپ کہہ دیں کہ تمہارا رب وسیع رحمت والا ہے اور گناہگار لوگوں سے اس کا عذاب نہیں ٹالا جائے گا۔ (۱۴۷)

تفسیر

اس آیت میں ارشاد ہے کہ اگر یہ لوگ آپ کو جھوٹا کہیں حالانکہ اس کے سوا جھوٹا کہنے کی وجہ نہیں کہ ان کا دل آپ کی بات ماننے کو نہیں چاہتا، ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ اگر مان لیں تو ان کی بات بے مزہ ہو جائیگی، ارشاد ہوتا ہے کہ ان سے کہہ دیجئے کہ تم خود جھوٹے اور غلط بات پر اڑنے والے ہو اور تم کو اس کی سزا فوراً اس لئے نہیں ملتی کہ تمہارے رب کی رحمت بہت وسیع ہے وہ جرم کرنے والے کو فوراً نہیں پکڑتا بلکہ اسے ڈھیل دیتا ہے لیکن اس کے معنٰی یہ نہیں ہیں کہ تم یہ سمجھنے لگو کہ تمہارا طرز عمل ٹھیک ہے اور تم مجرم نہیں ہو، اللہ تعالیٰ مجرم کو ڈھیل تو دے دیتے

ہیں لیکن دیر یا سویر اسے سزا ضرور ملے گی اگر وہ اپنے گناہ پر پچھتا کر معافی مانگتا ہوا اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضر نہ ہوا تو اسے سزا مل کر رہے گی کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب مجرموں کے سر سے کبھی نہیں ٹلتا صرف اس کی رحمت نے اسے روک رکھا ہے کہ شاید گناہگار گناہ سے توبہ کرلے، قرآن مجید کے حکموں کی خلاف ورزی کرنے والوں کو ہنسی خوشی چاق و چوبند چلتے پھرتے دیکھ کر یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ گناہگاروں کو سزا اور عذاب کا اعلان محض دھمکی ہے ورنہ اس کی کیا وجہ ہے کہ ساری نعمتیں گناہگاروں کو حاصل ہیں اور وہ مزے سے دندناتے پھر رہے ہیں کسی کا بال تک بیکا نہیں ہوتا۔

اس آیت سے اور بہت سی اور آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ

(۱)۔۔۔۔ مجرموں کو عذاب مل کر رہے گا دیر لگنا کسی مصلحت کی وجہ سے ہوتا ہے اور اس کا ایک وقت مقرر ہے جب وقت آ گیا پھر وہ ٹلنے والا نہیں۔

(۲)۔۔۔۔ اگر کسی قوم کا کوئی فرد گناہ کرے تو اس کا وبال اس کی ساری قوم پر پڑتا ہے افراد کے جرم اگر بڑھتے رہے تو وقت آنے پر ساری قوم فنا ہوگی اس لئے مجرم کو بدکاری سے روکنا ساری قوم کا فرض ہے اگر قوم اس فرض سے غافل رہی تو آخر کار فنا ہوگی۔

دھوکا

سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَ لَآ اٰبَآؤُنَا

اب کہیں گے یہ لوگ جنھوں نے شرک کیا اگر چاہتا اللہ نہ شرک کرتے ہم اور نہ باپ دادا ہمارے

وَ لَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ ؕ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ

اور نہ حرام کرتے ہم کوئی چیز اسی طرح جھٹلایا ان لوگوں نے جو پہلے تھے ان سے

حَتّٰى ذَاقُوْا بَاْسَنَا ؕ

یہاں تک کہ چکھا انہوں نے عذاب ہمارا

بامحاورہ ترجمہ:۔ مشرک اب کہیں گے اگر اللہ چاہتا تو ہم شرک نہ کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم کوئی چیز حرام کرتے اسی طرح ان کے اگلے بھی جھٹلاتے رہے یہاں تک کہ انہوں نے ہمارا عذاب چکھا۔

تفسیر

اس آیت میں ارشاد ہے کہ یہ شرک کرنے والے اور بدکاریوں میں پھنسے رہنے والے اپنے برے کاموں کا یہ بہانہ ڈھونڈ لیں گے کہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں یہ تو وہی باتیں ہیں جو ہمارے باپ دادا کرتے چلے آئے ہیں اگر اللہ تعالیٰ کو یہ باتیں پسند نہ ہوتیں تو اس نے کب کا روک دیا ہوتا تم جو کہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر اور چیزوں کے خیال میں لگا رہنا اور بغیر اس کے حکم کے کچھ چیزوں کو حلال اور کچھ کو حرام کر لینا یہ سب باتیں چھوڑ دو بھلا بتاؤ ہم تمہاری بات کیسے مان لیں یہ باتیں پہلے زمانہ سے چلی آتی ہیں نہ کسی کی تباہی ہوئی نہ عذاب آیا، ان کے ان بے ہودہ خیالوں کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ: ان سے کہہ دیجئے! ایسا عذاب جس سے سب تباہ ہو جائیں اللہ تعالیٰ کی وسیع رحمت کی وجہ سے رکا ہوا ہے مہلت اس لئے دی جا رہی ہے کہ شاید یہ گناہ کرنے والے اب بھی سنبھل جائیں اور بدکاریاں چھوڑ دیں ورنہ مجرموں کیلئے عذاب ہر وقت تیار ہے پہلے لوگوں کے اوپر عذاب آ چکے ہیں اور وہ اپنی نافرمانیوں کی شامت سے تباہ ہو چکے ہیں عذاب آنے سے پہلے وہ بھی یہ کہتے تھے کہ گناہ کوئی چیز نہیں جو جی چاہے وہ کیے جاؤ عذاب اور سزا کوئی چیز نہیں آخر ان پر عذاب آیا اور وہ مٹ گئے۔

اس آیت میں ہمارے لئے بہت سخت تنبیہ ہے ہم کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ قرآن مجید میں جن کاموں سے منع کیا گیا ہے اور ان کے کرنے والوں کو سزا کی دھمکی دی گئی ہے ان کو چھوڑ دینے کا یہی وقت ہے اس مہلت کو غنیمت سمجھنا چاہئے یہ زلزلے، طوفان، بیماریاں اور آفتیں وغیرہ جو دنیا میں آتی رہتی ہیں ان کا مطلب یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے غضب سے ڈر کر اس کی نافرمانی کرنا چھوڑ دے کیونکہ انسان کو طوفان اور زلزلوں کو

روکنے کی کوئی طاقت نہیں ہے انسان کے تجربے ضرور بڑھ گئے لیکن ان سے وہ زیادہ سے زیادہ صرف ان آفتوں کی عمومی وجہیں بیان کرسکتا ہے ان کو روک نہیں سکتا یہ کہنا کہ یہی تو قدرتی حادثات ہیں انسان کے عمل کو ان میں کیا دخل یہ صرف ان کی باتیں ہیں۔

اٹکل پچّو باتیں

قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا ؕ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا

آپ کہہ دیجئے کیا پاس تمہارے سے کوئی یقینی بات تاکہ نکالو تم اس کو لئے ہمارے نہیں پیروی کرتے تم مگر

الظَّنَّ وَ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ ﴿۱۴۸﴾ قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ۚ

گمان کی اور نہیں تم مگر اٹکل چلاتے (۱۴۸) آپ کہہ دیجئے لئے اللہ کے ہے دلیل کامل

فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۴۹﴾

پس اگر وہ چاہتا تو ہدایت کرتا سب کو (۱۴۹)

با محاورہ ترجمہ: آپ کہہ دیں! تمہارے پاس کچھ علم بھی ہے کہ اس کو ہمارے سامنے ظاہر کرو تم تو صرف اٹکل پر چلتے ہو اور صرف اندازے ہی کرتے ہو۔(۱۴۸) آپ کہہ دیں! بس اللہ کے پاس مکمل دلیل ہے سو اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دے دیتا۔(۱۴۹)

لفظی تحقیق: ظَنٌّ: ایسا فیصلہ جس سے دل کو پورا اطمینان نہ ہو کیونکہ ابھی تجربے یا دلیل سے ثابت نہیں ہوا لیکن صحیح ہونے کی امید ہو۔ خَرْصٌ: اٹکل کرنا۔ اس سے یقین حاصل نہیں ہوتا اور نہ ظن، ہم اسے اٹکل پچو بات کرنا کہتے ہیں۔ اَلْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ: ایسی دلیل کو جس سے دعویٰ ثابت ہو حجت کہتے ہیں، "اَلْبَالِغَةُ، بُلُوْغٌ" سے بنا ہے، جس کے معنیٰ ہیں: حد کو پہنچ جانا "اَلْبَالِغَةُ" کے معنیٰ ہیں: حد کو پہنچی ہوئی، پوری، جس میں عقل کو شبہ کی گنجائش نہ رہے۔

تفسیر

اس آیت میں صاف صاف کہا گیا ہے کہ اس قسم کی باتوں کی کہ دنیا کی مصیبتوں کا انسان کے عملوں سے کوئی تعلق نہیں ہے اور عذاب، ثواب کوئی چیز نہیں ہے کسی کے پاس یقینی دلیل نہیں ہے جو لوگ اپنی خواہشوں میں مگن ہیں ان کی اپنی مرضی ہی انہیں دلیل معلوم ہوتی ہے اس کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو بات کہتے ہیں وہ یقینی ہوتی ہے اور اس کی دلیل اور حجت ایسی مضبوط ہوتی ہے کہ دل کو اس پر پورا یقین اور اطمینان حاصل ہو جاتا ہے اور ایسے لوگوں کی عقلیں جو خواہشوں کے غلام نہیں ہوتے اسے فوراً قبول کر لیتی ہیں۔

ارشاد ہے کہ ان سے کہہ دیجئے کہ! اگر تمہارے پاس کوئی یقینی دلیل ہے کہ برے عملوں سے عذاب نہیں آتا تو پیش کرو، ورنہ ظاہر ہے کہ تمہاری ساری باتیں اٹکل پچو ہیں اللہ تعالیٰ نے جو کچھ کہا ہے اس کے پاس اس کی بڑی مضبوط دلیل ہے جس کو ایسے لوگ فوراً قبول کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے حکموں کا پاس کرتے ہیں اور خود ہر انسان کا ضمیر اس کے اوپر گواہ ہے، اللہ تعالیٰ اس دلیل کے ذریعہ انسان کو ٹھیک بات منوانا چاہتے ہیں ورنہ اس کے نزدیک کیا مشکل تھا کہ سب کو یونہی ہدایت دے دیتے۔

اے پیغمبر! آپ ان سے کہہ دیں کہ! کیا تمہارے پاس کوئی علم ہے یعنی شرک پر اصرار کرنے کی کوئی دلیل ہے؟ اگر ہے تو ہمارے پاس پیش کرو ہم بھی دیکھیں کہ کس بنا پر تم شرک کر رہے ہو تم نے یہ جو بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام بنا رکھے ہیں اور انہیں بعض پر حرام اور بعض کیلئے حلال کرتے ہو اس کے ثبوت کیلئے کوئی چیز تو پیش کرو کوئی صحیفہ ہو کوئی کتاب ہو، کسی عقلمند نے، کسی دانشور نے ان شرکیہ کاموں کی تصدیق کی ہو لاؤ! کیا دلیل ہے تمہارے پاس؟ قرآن کریم میں جگہ جگہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ لاؤ! اپنی دلیل جو تمہارے دعوے کی تصدیق کرے اور اگر کچھ پیش نہیں کر سکتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم صرف اپنے خیالات کی پیروی کر رہے ہو جو بات وہم و خیال میں آ جاتی ہے اس کے پیچھے بھاگ نکلتے ہو اور تم محض اٹکل دوڑا رہے ہو کہ فلاں شخص نے یہ منت مانی تھی تو اس کی فلاں مراد پوری ہو گئی یا فلاں نے فلاں کام نہیں کیا تھا تو اس کا یہ نقصان ہو گیا یہ سب اٹکل پچو باتیں ہیں جن

کے پیچھے کوئی ٹھوس دلیل نہیں ہے یہ محض گمان ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ حق کے مقابلے میں ایسے گمان کی کیا حیثیت ہے اور یہ کیا فائدہ دے سکتا ہے؟

اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے ، یاد رکھو! اللہ تعالیٰ کی دلیل ہی مکمل ہے اس مالک الملک نے پیغمبروں اور کتابوں کے ذریعے عقلی اور نقلی دلیلوں کے ساتھ حق کو اتارا ہے اور اپنی دلیل مکمل کر دی ہے تاکہ کل قیامت کے دن کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ ہمارے پاس کوئی سمجھانے والا نہیں آیا کوئی خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا نہیں آیا اب تمہارے پاس خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے آچکے، اللہ تعالیٰ نے اپنی دلیل مکمل کر دی ہے اب تمہارے پاس انکار کرنے کا کوئی جواز باقی نہیں رہا اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے حق دلیلوں کو پھیلا دیا ہے اگر اب بھی حقیقت کو نہیں مانتے تو یہ دن کے وقت آنکھیں بند کر سورج کے موجود ہونے کے انکار کے برابر ہے۔

اگر اللہ تعالیٰ چاہتے تو تم سب کو ہدایت دے دیتے مگر یہ اس کی حکمت اور مصلحت کے خلاف ہے وہ زبردستی کسی کو سیدھے راستے پر نہیں چلانا چاہتے وہ چاہتے تو کفر کو بالکل ہی جڑ سے ختم کر دیتے اور ایمان کے سوا کوئی چیز باقی نہ رہتی مگر اسکی حکمت کا تقاضا ہے کہ تمہیں آزمائیں، "سورہ انبیاء" میں ہے کہ ہم تمہیں برائی اور اچھائی کے ذریعے آزماتے ہیں آزمائش جبھی ہوتی ہے جب اسے ہدایت واضح کرنے کے بعد کھلا چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ اپنی مرضی سے ایمان کا راستہ قبول کر لے یا کفر کا، ہاں! اگر کفر کا راستہ اختیار کرے گا تو آگے اس کیلئے دوزخ تیار ہے، اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہترین مخلوق بنا کر پیدا فرمایا ہے، اسے عقل عطا کی ہے اس کیلئے نیکی اور برائی کا راستہ واضح کیا ہے، انسان بھی اگر پتھر ہی کی طرح ہوتا کہ جدھر لڑھکا دیا لڑھک گیا تو پھر اس سے پوچھ گچھ بھی نہیں ہوتی۔

گواہ لاؤ

قُلْ هَلُمَّ شُهَدَآءَكُمُ الَّذِيْنَ يَشْهَدُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ هٰذَا ۚ

آپ کہہ دیجئے لاؤ گواہ اپنے جو گواہی دیں کہ اللہ نے حرام کیا یہ سب

فَاِنْ شَهِدُوْا فَلَا تَشْهَدْ مَعَهُمْ ۚ وَ لَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا

پس اگر گواہی دیں تو گواہی نہ دیں آپ ساتھ ان کے اور نہ پیروی کیجئے خواہشوں کی ان لوگوں کی جنہوں نے جھٹلایا

بِاٰيٰتِنَا وَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَهُمْ بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ ﴿۱۵۰﴾ ع ۱۸ ۵

ساتھ آیتوں ہماری اور جو نہیں ایمان لاتے ساتھ آخرت کے اور وہ ساتھ رب اپنے کے برابر ٹھہراتے ہیں اوروں کو (۱۵۰)

بامحاورہ ترجمہ:۔ آپ کہہ دیں کہ! اپنے گواہ لاؤ جو اس بات کی گواہی دیں کہ اللہ نے ان چیزوں کو حرام کیا، پھر اگر وہ ایسی گواہی دیں تو بھی آپ ان کا اعتبار نہ کریں اور ان کی خوشی پر نہ چلیے جنہوں نے ہمارے حکموں کو جھٹلایا اور جو آخرت کا یقین نہیں کرتے اور وہ اوروں کو اپنے رب کے برابر کرتے ہیں۔ (۱۵۰)

تفسیر

اس آیت میں ارشاد ہے کہ دلیل تو تمہارے پاس کوئی نہیں، اچھا اب اگر کوئی ایسی گواہی دینے والا تمہارے پاس ہو تو لاؤ، جو کہے کہ ہاں! جس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ چیزیں حرام کیں میں موجود تھا، ظاہر ہے کہ ان کے پاس ایسے گواہ بھی نہیں ہیں، بالفرض! انہوں نے اپنے اثر سے یا رشوت سے ایسے گواہ بھی پیدا کر لیے تو وہ یقیناً جھوٹے ہوں گے، آپ ان کی ہاں میں ہاں نہ ملائیں اور نہ ان کی بات مانیں اب چونکہ ان کے پاس نہ کوئی دلیل ہے نہ گواہ، یہ صاف ظاہر ہے کہ یہ صرف اپنے مطلب کی باتوں پر چلتے ہیں اور جو جی چاہتا ہے وہ کرتے ہیں آپ کو کچھ ضرورت نہیں کہ ان کی خواہشوں کی پیروی کریں اور ان کے کہنے پر چلیں، آپ ہرگز ایسے لوگوں کی بات نہ مانیں جو ہماری آیتوں کو جھوٹا کہتے ہیں آخرت پر یقین نہیں رکھتے اور اپنے رب کے برابر اوروں کا رتبہ ٹھہراتے ہیں۔

یہاں سے ایک بڑے کام کی بات معلوم ہوتی ہے اور اس سے ایک ضروری معاملہ کا فیصلہ ہو جاتا ہے، یعنی: ایسے لوگوں کا کہنا نہ ماننا چاہیے جو قرآن کریم کو سچے دل سے نہیں مانتے آخرت پر یقین نہیں رکھتے اور اپنے

رب کے برابر بلکہ اس سے بھی زیادہ اور لوگوں کو اوران کے کہنے کو اہمیت دیتے ہیں اگر مسلمانوں میں خدانخواستہ ایسے لوگ ہوں تو ان کو قانون بنانے یا قانونی فیصلے کرنے کا کوئی حق نہیں ہے وہ قانون بنانے کے یا اجتہاد کے مقدموں کے فیصلے کرنے کے اہل نہیں ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے واضح حکم

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ

کہئے آؤتم پڑھ کرسناؤں جو حرام کیا رب تمہارے نے پرتم کہ نہ شریک ٹھہراؤ ساتھ اسکے

شَيْـًٔا وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ وَ لَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ

کسی چیز کو اور ساتھ ماں باپ کے نیکی اور نہ قتل کرو اولادوں اپنی کو سے

اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَ اِيَّاهُمْ ۚ

افلاس ہم دیتے ہیں رزق تم کو اور ان کو

بامحاورہ ترجمہ:۔آپ کہہ دیں! تم آؤ میں سنادوں جو تم پر تمہارے رب نے حرام کیا کہ اس کیساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور ماں باپ کیساتھ نیکی کرو اور اپنی اولاد کو مفلسی کی وجہ سے نہ مار ڈالو ہم تم کو اوران کو رزق دیتے ہیں۔

لفظی تحقیق: تَعَالَوْا : جس کا مفرد ''تَعَالْ'' ہے،اس کا مصدر ''تَعَالیٰ'' ہے جو ''عُلُوٌّ'' سے بنا ہے، ''عُلُوٌّ'' کے معنیٰ بلندی کے ہیں ''تَعَالیٰ'' کے معنیٰ ہیں: بلند ہونا، اوپر ہونا، اگر کوئی شخص اونچی جگہ، مثلاً: اونچے چبوترے یا کوٹھے پر ہو اور وہ نیچے سے کسی کو اپنے پاس بلائے تو عربی میں یوں کہے گا ''تَعَالْ'' جس کی اردو ہے ''اوپر چلے آیئے'' اس کے بعد ہر شخص کو پاس بلانے یا اس کو متوجہ کرنے کیلئے استعمال ہونے لگا یہاں اس سے مراد ہے ادھر توجہ کرو، اردو میں کہیں گے ''آؤ تمہیں حکم سناؤں''۔ اِمْلَاقٍ: ''مَلَقٌ'' سے بنا ہے، ''مَلَقٌ'' کے

معنٰی ہیں لطیف، نرمی، ''اِمْلَاقٍ'' کے معنٰی ہیں: خرچ کر کے پیسہ نبیڑ دینا، کنگال ہو جانا۔

تفسیر

انسان کا کام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکموں کو پورا کرے اپنی طرف سے اپنے اوپر کوئی پابندی عائد نہ کرے اگر ایسا کرے گا تو ظالم کہلائے گا، اس سے پہلے رکوع میں کھانے پینے کی چیزوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتارے ہوئے مضبوط حکم بتائے گئے تھے اس رکوع میں اخلاق اور معاملوں کے بارے میں صاف ہدایتیں دی گئی ہیں، انسان کی اپنی سوچی ہوئی باتیں وہم وگمان پر مبنی ہوتی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کے حکم یقینی ہیں جن میں شک وشبہ کی بالکل گنجائش نہیں۔

اب کی تین آیتوں میں چند حکموں کا ذکر آرہا ہے یہ حکم ایسے ہیں جن پر ''قرآن کریم'' اور ''تورات'' دونوں متفق ہیں، چنانچہ ''ترمذی شریف'' کی روایت میں آتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے بعض فرماتے ہیں کہ جو آدمی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مُہر شدہ صحیفے کو پڑھنا چاہتا ہے اسے چاہئے کہ قرآن کریم کی یہ تین آیتیں پڑھ لے ، یعنی ''قُلْ تَعَالَوْا سے لے کر لَعَلَّکُمْ تَعْقِلُوْنَ تک''، یہ تین آیتیں ہیں جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین کے ایسے اصول بیان کئے گئے ہیں جو ہمیشہ باقی رہیں گے۔

اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں مختلف زمانوں کی باتیں بیان فرمائی ہیں، جب انسانی نسل ابھی پیدا نہیں ہوئی تھی تو اللہ تعالیٰ نے تمام روحوں سے عہد لیا تھا کہ بتاؤ میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟ تو سب نے اقرار کیا تھا آپ ہمارے رب ہیں پھر اللہ تعالیٰ نے ''سورۂ الحاقہ'' میں قیامت کے دن کی تفصیل بیان کی ہیں اور ان آیتوں میں ان باتوں کا ذکر ہے جن کی ضرورت اس دنیا میں ہے گویا ذکر کی گئی تین آیتوں میں موجودہ دور کی بات کی گئی ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی گئی ہے کہ جب قریش کی مخالفت حد سے بڑھ گئی تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے

اپنی دعوت دوسرے قبیلوں کے سامنے پیش کرنا شروع کردی خاص طور پر حج کے موقع پر جب لوگوں کی تعداد جمع ہوتی تو آپ ان کے سامنے دین کی تعلیمات پیش کرتے، "ترمذی شریف" کی روایت میں آتا ہے کہ آپ دوسرے قبیلوں کے لوگوں سے فرماتے، اے لوگو! تم میں سے کوئی ہے جو میرا حمایتی بن جائے تاکہ میں اللہ تعالیٰ کا پیغام دوسروں تک پہنچاسکوں، فرماتے تھے قریش نے تو مجھے خدا کا پیغام پہنچانے سے روک دیا ہے اب اس معاملہ میں کون میری مدد کرنے کو تیار ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایسے ہی ایک موقع پر میں اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ موجود تھے، منیٰ کے مقام پر بعض قبیلوں سے ملاقات ہوئی آپ نے قبیلہ کے سرداروں مفروق اور ہانی سے اسلام کی تبلیغ کی بات کی تو مفروق کہنے لگا، اے قریش کے بھائی! آپ کس کی چیز پیش کرتے ہیں؟ اس پر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہی آیت پڑھ کر سنائی تو مفروق کہنے لگا کہ اس آیت میں ایسی بنیادی اور اخلاقی تعلیم ہے کہ اچھی طبیعت والا انسان اسے ماننے پر مجبور ہے اس نے تسلیم کیا کہ قریش آپ پر جھوٹ باندھتے ہیں حالانکہ آپ کا قول عمدہ اخلاق کا بہترین نمونہ ہے آپ نے اس سے مزید کچھ باتیں کیں اور فرمایا: اگر اس دین کو مان لو تو وہ وقت دور نہیں جب ساری دنیا کی قومیں تمہاری غلام بن جائیں گی حتیٰ کہ قیصر و کسریٰ بھی تمہارے ماتحت ہوجائیں گے اس پر دونوں شخصوں کو بہت تعجب ہوا کہ قیصر و کسریٰ جیسی بڑی طاقتیں بھی مغلوب ہوسکتی ہیں بہرحال پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسلام کے حق ہونے کو ظاہر کرنے کیلئے یہی آیت اس مجلس میں پڑھ کر سنائی۔

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ: ارشاد ہے کہ اے پیغمبر! آپ کہہ دیں آؤ میں تمہیں پڑھ کر سناؤں وہ چیز جو تمہارے پروردگار نے تم پر حرام کی ہے، پہلے بیان ہوچکا ہے کہ یہاں سے مسلسل تین آیتوں میں چند حکموں کا ذکر ہے جس پر دین کی بنیاد ہے، اگر ان پر عمل کر کے دنیا کی زندگی کو گزار لیا تو آخرت میں اس پر بڑے بڑے انعاموں سے نوازیں جائیں گے۔

اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا: پہلی حرام چیز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہراؤ، شرک کو اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے حرام قرار دیا ہے، اللہ تعالیٰ کو ایک جاننا اور ماننا دین ابراہیمی کا اٹل اصول ہے اور تمام

آسمانی کتابیں اس پر متفق ہیں، شرک کو اللہ تعالیٰ نے کبیرہ گناہ کہا ہے، "سورۂ لقمان" میں ہے کہ سب سے بڑا ظلم اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرانا ہے، حضرت مسیح علیہ السلام نے بھی اپنی امت کو یہی تعلیم دی کہ جس طرح "سورۂ مائدہ" میں ہے کہ ''جس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کیا اللہ تعالیٰ نے اس پر جنت حرام کر دی اور اس کا ٹھکانہ دوزخ میں ہوگا''۔

شرک کی تعریف اور اس کی قسمیں

"تفسیر مظہری" میں ہے کہ لفظ "شَيْئًا" کے معنٰی یہاں یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ شرک کی کسی قسم جلی (یعنی واضح) اور خفی (یعنی مخفی) میں مبتلا نہ ہو واضح شرک کو تو سب جانتے ہیں کہ کسی غیر اللہ کو عبادت اور اطاعت میں یا اس کی مخصوص صفتوں میں اللہ تعالیٰ کے برابر یا اس کا ساتھی قرار دینا ہے۔

مخفی شرک یہ ہے کہ:

(۱)۔۔۔۔ اپنے کاروبار اور دینی و دنیاوی مقصدوں میں اور نفع نقصان میں اگر چہ عقیدہ تو یہی ہو کہ کارساز اللہ تعالیٰ ہیں مگر عملاً دوسروں کو کارساز سمجھے اور ساری کوششیں دوسروں ہی سے وابستہ رکھے۔

(۲)۔۔۔۔ یا عبادتوں میں ریاکاری کرے کہ دوسروں کو دکھانے کیلئے نماز وغیرہ کو درست کر کے پڑھے۔

(۳)۔۔۔۔ یا صدقہ خیرات شہرت کے خیال سے کرے یا عملاً نفع نقصان کا مالک کسی غیر اللہ کو قرار دے۔

وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا: اللہ تعالیٰ نے دوسری چیز کے متعلق فرمایا کہ: والدین کے ساتھ احسان کرو، اللہ تعالیٰ نے بدسلوکی کو حرام فرمایا ہے، اللہ تعالیٰ کے حقوق کے بعد سب سے اہم چیز والدین کے حقوق ہیں جن کی قرآن کریم میں بار بار تاکید کی گئی ہے، "سورۂ بنی اسرائیل" میں ہے کہ: آپ کے رب نے یہ حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور والدین کے ساتھ اچھے برتاؤ سے پیش آؤ، والدین کسی انسان کے قریب ترین احسان کرنے والے ہوتے ہیں وہ اپنے بچوں کی بغیر کسی لالچ کے پرورش کرتے ہیں، لہٰذا ان کے ساتھ اچھا برتاؤ رکھنا لازم ہے ان کو تکلیف پہنچانا حرام ہے، مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ: ماں باپ کو نہ زبان سے تکلیف پہنچانی چاہئے

اور نہ کسی عمل سے یہ مکمل طور پر حرام ہے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے کہ: وہ شخص بدبخت ہے جس نے والدین میں سے ایک یا دونوں کو پایا مگر ان کی خدمت کر کے جنت میں جانے کا حقدار نہ بن سکا، والدین جنت کے دروازوں میں سے درمیان والا اور افضل دروازہ ہیں اب یہ تمہاری مرضی ہے کہ ماں باپ کی خدمت کر کے یہ دروازہ اپنے لئے کھول لو یا ان کے ساتھ بدسلوکی کر کے اسے اپنے لئے بند کرلو، بہر حال فرمایا کہ: والدین کے ساتھ نیک سلوک کرنا اور اچھا برتاؤ رکھنا ضروری ہے اور ان کو تکلیف دینا حرام ہے۔

محدثین اور فقہاء کرام فرماتے ہیں کہ: ماں اور باپ دونوں اچھے برتاؤ کے حقدار ہیں، البتہ ادب باپ کا زیادہ ہے اور خدمت ماں کی، کیونکہ ماں، باپ کی نسبت کمزور ہوتی ہے، فرماتے ہیں کہ اگر والدین غیر مسلم بھی ہوں تب بھی ان کا احترام واجب ہے، البتہ اللہ تعالیٰ کا حق ان دونوں کے حقوق پر فوقیت رکھتا ہے اگر والدین شرک پر آمادہ کریں یا شریعت کے خلاف کسی بات کا حکم دیں تو ان کی فرمانبرداری کرنا جائز نہیں، بہر حال اللہ تعالیٰ نے والدین کے حقوق کی بڑی تاکید فرمائی ہے جیسا کہ "سورۂ بنی اسرائیل" میں ہے: اگر والدین مؤمن ہیں تو ان کے ادب واحترام کے علاوہ ان کیلئے دعا کو بھی اپنا کام بنالو کہ اے اللہ! ان پر رحم فرما، جس طرح انہوں نے بچپن میں میری پرورش کی، چنانچہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے کہ: والدین کے حقوق میں یہ بات بھی شامل ہے کہ ان کی وفات کے بعد ان کیلئے دعائیں کریں اور ایصال ثواب کریں، بہر حال ماں باپ کے ساتھ بدسلوکی کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے۔

"صحیحین (بخاری ومسلم)" میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ انہوں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا کہ سب سے افضل اور بہتر عمل کون سا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: نماز کو اس کے (مستحب) وقت میں پڑھنا، فرماتے ہیں کہ میں نے پھر سوال کیا کہ اس کے بعد کون سا عمل افضل ہے؟ تو فرمایا: ''والدین کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو''، پھر پوچھا کہ اس کے بعد کون سا عمل ہے؟ فرمایا: اللہ تعالیٰ کے راستہ میں جہاد کرنا۔

وَ لَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ : تیسری بات اللہ تعالیٰ نے یہ فرمائی ہے کہ اپنی اولادوں کو غربت کی وجہ سے مت قتل کرو، دوسرے مقام پر آتا ہے کہ مفلسی کے آئندہ خطرے کے پیش نظر اپنی اولاد کو قتل نہ

کرو، اللہ تعالیٰ کا مقصود یہ ہے کہ اگر تم فی الحال غریب ہو تو صرف اس لئے اولاد کو قتل نہ کرو کہ تمہارے پاس اسے کھلانے پلانے کیلئے کچھ نہیں یا اگر اس وقت تو تنگدستی نہیں مگر ڈر ہے کہ اولاد زیادہ ہوگئی تو ان کو زندگی کی ضرورتیں مہیا کرنا مشکل ہو جائے گا، اس پیشگی خطرے کی وجہ سے بھی اپنی اولاد کی جان کو ضائع نہ کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اولاد کے قتل کو حرام قرار دیا ہے۔

نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ: اپنی اولاد کو رزق کی کمی کی وجہ سے قتل نہ کرو، کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ تمہیں بھی رزق ہم ہی دیتے ہیں اور جن کو تم قتل کرتے ہو ان کے رزق کے ذمہ دار بھی ہم ہیں، روزی کے تمام اسباب ہماری قدرت میں ہیں اور ہم ہی انہیں تقسیم کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے دوسرے مقام پر فرمایا کہ رازق اور طاقت والے تو اللہ تعالیٰ ہی ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بیان بھی آتا ہے کہ روزی اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اسی سے طلب کرو کہ وہ تمہارے لئے روزی کے دروازے کھول دیں۔

وہ دس چیزیں جن کے حرام ہونے کا حکم ان آیتوں اور آگے کی آیتوں میں آرہا ہے یہ ہیں:

(۱)۔۔۔۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ عبادت واطاعت میں کسی کو شریک ٹھہرانا، (۲)۔۔۔۔ والدین کے ساتھ اچھا برتاؤ نہ کرنا، (۳)۔۔۔۔ فقر وافلاس کے خوف سے اولاد کو قتل کر دینا، (۴)۔۔۔۔ بے حیائی کے کام کرنا، (۵)۔۔۔۔ کسی کو ناحق قتل کرنا، (۶)۔۔۔۔ یتیم کا مال ناجائز طور پر کھا جانا، (۷)۔۔۔۔ ناپ تول میں کمی کرنا، (۸)۔۔۔۔ شہادت یا فیصلہ یا دوسرے کے کلام میں بے انصافی کرنا، (۹)۔۔۔۔ اللہ تعالیٰ کے عہد کو پورا نہ کرنا، (۱۰)۔۔۔۔ اللہ تعالیٰ کے سیدھے راستہ کو چھوڑ کر دائیں بائیں دوسرے راستے اختیار کرنا۔

احکام و مسائل

مسئلہ (۱):۔۔۔۔ ماں باپ اگر کسی شرعی حکم کی نافرمانی کرنے کو کہیں تو ان کی فرمانبرداری جائز نہیں، اس

حالت میں ان کو نرمی سے سمجھانا چاہئے کہ صحیح کیا ہے اور کیا نہیں۔

مسئلہ (۲):.... پیدائش میں وقفہ کسی شرعی مجبوری کی بناء پر وقتی طور پر کرنا جائز ہے، وہ شرعی مجبوری یہ ہیں: (۱).... عورت کمزور ہو۔ (۲).... حمل کا بوجھ برداشت نہ ہوتا ہو وغیرہ۔

بے حیائی مت کرو

وَ لَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ ۚ وَ لَا

اور مت قریب جاؤ بے حیائی کے جو کھلی ہو سے اس اور جو چھپی ہو اور نہ

تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ

قتل کرو جان کو جسے حرام کیا اللہ نے مگر ساتھ حق کے یہ حکم کیا تم کو

بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۵۱﴾

ساتھ اسکے تاکہ تم سمجھو (۱۵۱)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور بے حیائی کے کاموں کے پاس مت جاؤ جو اس میں ظاہر ہو اور پوشیدہ ہو جس جان کو اللہ نے حرام کیا ہے اسے نہ مار ڈالو مگر حق کے ساتھ، یہ تم کو حکم کیا تاکہ تم سمجھو۔ (۱۵۱)

تفسیر

اللہ تعالیٰ کے مقرر کیے ہوئے کچھ حکموں کا اس آیت میں بیان ہے۔

ارشاد ہے کہ بے حیائی اور برائی کے کاموں کے پاس نہ جاؤ وہ کھلم کھلا ہوں یا پوشیدہ ہوں، جس جان کی حفاظت اور احترام کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے، یعنی: انسان کی جان کو ناحق مت قتل کرو، ناحق قتل وہ ہے جس کا حکم شریعت نے نہ دیا ہو ان باتوں کا حکم تمہیں اس لئے دیا گیا ہے تم عقل سے کام لو اور سمجھو کہ تمہارا کام حکم پر عمل کرنا ہے اور چال چلن کے قاعدے مقرر کرنا نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکموں کے مطابق چلنا ہے۔

عربوں نے آپس میں یہ دستور جاری کر رکھا تھا کہ برے کام بدکاری وغیرہ کھلم کھلا منع ہیں اور چھپ کر کرنے میں جہاں کوئی نہ دیکھ رہا ہو کوئی حرج نہیں، یہاں ان سے کہا گیا ہے کہ گناہ چاہے سب کے سامنے ہو یا چھپ کر ہر حالت میں منع ہے، اسی طرح عرب میں آدمی کا مار ڈالنا کوئی بڑی بات نہ تھی لوٹ مار ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا، یہاں ان باتوں سے انہیں روکا گیا ہے آدمی کی جان لینا کسی طرح جائز نہیں جب تک کہ اس کی شرعاً اجازت نہ ہو اسی طرح حرم میں کسی بھی قسم کا شکار مارنا بھی جائز نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے معاملوں اور چال چلن کے قاعدے مقرر کر کے یہ سمجھا دیا کہ انسان اپنی خوشی کے قاعدے اپنی زندگی بسر کرنے کیلئے نہیں بنا سکتا، اس کا کام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے قاعدوں پر چلے اور اس کے حکم کے مطابق زندگی بسر کرے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق زندگی بسر کرنے سے آدمی کا ہر کام اللہ تعالیٰ کی عبادت بن جاتا ہے۔

یہاں چوتھا حکم یہ ہے کہ کسی قسم کی فحاشی کے قریب نہ جاؤ، بے حیائی بہت سے قسموں کی ہے بعض چیزیں ذہنی اور عقلی طور پر انسان میں برے اخلاق پیدا کرتی ہیں، حدیث شریف میں چوری کو بے حیائی کہا گیا ہے، جب کہ قرآن کریم میں بخل کو بے حیائی کہا گیا ہے عورتوں سے بدکاری اور مردوں کے ساتھ بدکاری بلاشبہ بہت بڑی بے حیائی کے کام ہیں، بعض چیزیں لوگوں کو عریانی کی طرف مائل کرتی ہیں جس سے دین اور اخلاق خراب ہوتا ہے، اسی لئے فرمایا کہ: بے حیائی کے قریب بھی نہ جاؤ۔

"سورۂ نور" اور "سورۂ احزاب" میں موجود ہے کہ عورتوں کی زیب و زینت اور عریانی اور پھر مردوں سے خلط ملط سخت فحاشی کی بات ہے اسی طرح تصویریں، مجسمے، بیہودہ گانے بے حیائی پر آمادہ کرتے ہیں اسی لئے علماء کرام فرماتے ہیں کہ: سب مغربی تہذیبیں بے حیائی پر قائم ہیں عورتوں کا ننگے سر اور ننگے بازو سرعام پھرنا، اخباروں میں ننگی تصویروں کی مشہوری، ریڈیو اور ٹیلیویژن پر غیر اخلاقی گانے اور دوسرے مناظر انسانیت کی تباہی کا باعث بن رہے ہیں اخلاق بگڑ رہا ہے اس کی اصلاح کرنے کے بجائے فلمی صنعت کو ترقی دینے کے منصوبے بنتے ہیں، کھیل تماشے کو بڑی اہمیت دی جارہی ہے کھیل کی ٹیمیں اور ناچ گانے والوں کی ٹولیاں بیرونی ملکوں میں

بھیجے جاتے ہیں جس پر اربوں کھربوں روپے خرچ ہوتے ہیں اور اس کے بدلے میں عریانی، فحاشی اور بے حیائی پھیلائی جاتی ہے، اسلام تو ایسی چیزوں کو مٹانے کیلئے آیا تھا مگر بڑے لوگ انہی چیزوں کی سرپرستی کر رہے ہیں دین تو کہتا ہے کہ حیاء ایمان کا حصہ ہے، نیز: جس میں حیا نہیں اس میں ایمان نہیں، مگر آج شرم وحیا کا جنازہ نکل رہا ہے اور بے حیائی بلا روک ٹوک معاشرے میں تیزی سے پھیل رہی ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: بے حیائی کے قریب بھی نہ جاؤ یہ مکمل طور پر حرام ہے۔

پانچواں حکم جس کا کرنا حرام ہے وہ یہ ہے کہ جس جان کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے اس کو ناحق قتل مت کرو، تین قسم کے قتل جائز ہیں ان کے علاوہ باقی تمام قتل حرام ہیں، جو قتل جائز ہیں ان میں پہلا یہ ہے کہ جان کے بدلے جان، اگر کسی نے کسی دوسرے شخص کو ناحق قتل کیا ہے تو قصاص (یعنی: بدلے) کے طور پر قاتل کو قتل کرنا حق ہے اور شرعاً اس کی اجازت ہے، دوسرا یہ ہے کہ اگر کوئی شادی شدہ آزاد مسلمان بدکاری کرے تو اسے پتھر مار مار قتل کیا جائیگا، اس کو عربی میں رجم کرنا اور فارسی میں سنگسار کرنا کہتے ہیں، تیسری صورت یہ ہے کہ کوئی عقلمند مسلمان اسلام کو چھوڑ کر دہریہ بن جائے یا کوئی دوسرا دین اختیار کرے تو ایسا مرتد شخص بھی واجب القتل ہے، ان تین صورتوں کے علاوہ کسی شخص کا قتل کرنا ناحق ہے۔

جب باغیوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر کا محاصرہ کر لیا تو انہوں نے اپنے مکان کی چھت پر کھڑے ہو کر فرمایا تھا لوگو! تم مجھے قتل کیوں کرنا چاہتے ہو حالانکہ میں نے آج تک کسی کو ناحق قتل نہیں کیا، بدکاری نہیں کی وہ تو مجھ سے اسلامی دور سے پہلے جاہلیت کے زمانہ میں بھی نہیں ہوا اور جب سے میں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ مبارک پر بیعت کی ہے میں مرتد نہیں ہو، اپھر تم کس جرم میں میرے قتل کے پیچھے پڑے ہو مگر باغیوں نے آپ کی کوئی بات نہ سنی اور فتنے کی ایسی بنیاد ڈال دی جو قیامت تک چلتی رہے گی۔

قتل کی وبا دنیا کے اکثر و بیشتر ملکوں میں عام ہے قدیم تہذیب والے ہوں یا جدید تہذیب والے ان کے ہاں، قتل روزمرہ کا معمول بن چکا ہے، "ابن ماجہ شریف" کی روایت میں آتا ہے کہ پوری دنیا کا تباہ ہو جانا اتنا اہم نہیں جتنا ایک مسلمان کا قتل ہو جانا مگر یہاں تو معمولی معمولی وجہوں کی بنا پر ہر روز قتل ہوتے ہیں ذاتی رنجشوں کے

علاوہ سیاسی قتل بھی عام ہونے لگے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ معاشرہ میں امن وامان ختم ہو چکا ہے انسانی جانوں کی حفاظت کا واحد ذریعہ قصاص اور دیت کا قانون (یعنی: بدلہ کا قانون) ہے مگر اس کو پسند نہیں کیا جاتا تو پھر دنیا میں امن کیسے قائم ہوسکتا ہے؟

ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ: یہ پانچ باتیں ایسی ہیں جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے تمہیں تاکیدی حکم دیا ہے کہ ان سے بچو یہ مکمل طور پر حرام ہیں تاکہ تم سمجھ جاؤ اگر مان جاؤ گے تو دنیا اور آخرت میں امن نصیب ہوگا ورنہ یہاں بھی بے سکونی اور آخرت میں بھی عذاب ہوگا۔

مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ: سے **ایک تفسیر** کے مطابق ظاہری فحاشی سے زبان اور ہاتھ پاؤں وغیرہ کے تمام گناہ مراد ہوں گے اور باطنی فحاشی سے مراد وہ گناہ ہوں گے جو دل سے متعلق ہیں، جیسے: حسد، کینہ، حرص، ناشکری، بے صبری وغیرہ، **اور دوسری تفسیر** کے مطابق ظاہری فحاشی سے مراد وہ بے حیائی کے کام ہوں گے جن کو کھلم کھلا کیا جاتا ہے اور پوشیدہ وہ جو چھپا کر کئے جائیں، کھلی بدکاری میں اس کے تمام اجزاء داخل ہیں بری نظر سے کسی عورت کی طرف دیکھنا، ہاتھ وغیرہ سے چھونا اس سے بے حیائی کی باتیں کرنا سب اس میں داخل ہیں اور باطنی بے حیائی میں وہ خیالات اور ارادے اور ان کو پورا کرنے کی پوشیدہ تدبیریں داخل ہیں جو کسی بے حیائی اور بدکاری کے سلسلہ میں عمل میں لائی جائیں، اور بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ ظاہری فحاشی سے وہ بے حیائی کے کام مراد ہیں جن کا برا ہونا عام طور پر مشہور ومعلوم ہے اور سب جانتے ہیں اور پوشیدہ سے مراد وہ کام ہیں جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک بے حیائی کے کام ہیں اگرچہ عام طور پر ان کو لوگ برا نہیں جانتے یا عام لوگوں کو ان کا حرام ہونا معلوم نہیں، مثلاً: بیوی کو تین طلاق دینے کے بعد بیوی بنا کر رکھ چھوڑا یا کسی ایسی عورت سے نکاح کرلیا جو شرعاً اس کیلئے حلال نہیں۔

احکام ومسائل

مسئلہ (۱):..... جس طرح کسی مسلمان کا قتل حرام ہے اسی طرح ایسے غیر مسلم کا قتل بھی حرام ہے جو کسی

اسلامی ملک کے قانون کا پابند ہوکر رہتا ہے۔

عدل اور انصاف کرو

وَ لَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ

اور نہ قریب جاؤ مال (کی طرف) یتیم کے مگر اس طریقہ سے کہ وہ بہتر ہو یہاں تک کہ وہ پہنچ جائے

اَشُدَّهٗ ۚ وَ اَوْفُوا الْكَيْلَ وَ الْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ ۚ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا

بلوغ کو اور پورا کرو ناپ اور تول ساتھ انصاف کے نہیں تکلیف دیتے ہم کسی جان کو

اِلَّا وُسْعَهَا ۚ وَ اِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَ لَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۚ

مگر جتنی اسکو طاقت ہو اور جب کچھ کہو تم تو انصاف کرو اور اگرچہ ہو قریبی رشتہ دار

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ مگر اس طرح کہ بہتر ہو یہاں تک کہ وہ اپنی جوانی کو پہنچ جائے اور ناپ تول کو انصاف سے پورا کرو، ہم ہر کسی کے ذمے وہی چیز لازم کرتے ہیں جس کی اس کو طاقت ہو جب بات کہو تو حق کی کہو اگرچہ وہ اپنا قریبی ہو۔

تفسیر

وَ لَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ: حرام چیزوں کا ذکر چل رہا ہے جن میں سے چھٹی یہ ہے کہ یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ مگر اس طریقہ سے جو بہتر ہو، یتیم اور کمزور کے حقوق کے متعلق اللہ تعالیٰ نے بڑے تاکیدی حکم دیئے ہیں جب کوئی چھوٹا بچہ باپ کے سہارے سے محروم ہوجاتا ہے تو اس کی جائیداد کے انتظام کیلئے رشتہ داروں میں سے اس کا کوئی سرپرست بنتا ہے جو بچے کے بالغ ہونے تک مال کی حفاظت کا ذمہ دار ہوتا ہے مگر تجربہ یہی ہے کہ ان کے مال کو خود سرپرستوں نے ہی کھانے کی کوشش کی، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اس معاملہ میں مختلف جگہوں پر ضروری حکم دیئے ہیں، چنانچہ "سورۂ نساء" کی ابتداء میں بھی یہی مسئلے بیان ہوئے

ہیں اور اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر فرمایا ہے کہ ان کے مالوں کو مت کھاؤ، آگے یہ بھی فرمایا کہ: یتیموں کے مال کو فضول خرچی میں نہ اڑاؤ اس نیت سے کہ یہ بڑے ہوجائیں گے تو ہمارا اختیار جاتا رہے گا اور ان کا مال ان کو واپس کرنا پڑے گا، "سورہ بقرہ" میں بھی یتیموں کے مال کی حفاظت کرنے کا حکم دیا گیا ہے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یتیموں کے سرپرست کھانے میں یتیموں کو اپنے ساتھ ملا لیتے تھے کیونکہ ان کا علیحدہ کھانا تیار کرنے میں خرچہ زیادہ آتا، جب اللہ تعالیٰ نے یتیموں کے مال کے متعلق بڑے سخت حکم دیئے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ان کا کھانا پینا بھی علیحدہ کر دیا اس خوف سے کہ کہیں ان کا کوئی لقمہ ہماری طرف نہ آجائے مگر اس طرح یتیموں کا مال زیادہ خرچ ہوتا تھا تو اللہ تعالیٰ نے "سورۂ بقرہ" میں اس مسئلہ کی وضاحت فرمائی، اور فرمایا کہ: اگر تم انہیں کھانے وغیرہ میں ساتھ ملالو تو وہ تمہارے بھائی ہیں گویا اللہ تعالیٰ نے اس بات کی اجازت دیدی، اور فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں کہ کون غلط رویہ اختیار کرنے والا ہے اور کون درست رویہ اختیار کرنے والا ہے تم نیک نیتی سے یتیموں کے مال کی حفاظت کرو اور اسے ناجائز طریقے سے ہضم کرنے کی کوشش نہ کرو، اللہ تعالیٰ تمہاری نیتوں سے بھی واقف ہیں اور وہ تمہارے ساتھ تمہاری نیتوں کے مطابق ہی سلوک کریں گے۔

بہرحال یتیم کا سرپرست، جج یا قاضی کے کسی کو امانت دار مقرر کرنے سے ہو یا دادا یا کوئی دوسرا رشتہ دار خود سرپرست ہو سب کیلئے حکم یہی ہے کہ یتیم کے مال کا انتظام اس طریقے سے کریں جو اس کے حق میں بہتر ہو، اس آیت میں اصل حکم یہ ہے کہ بری نیت سے یتیم کے مال کے قریب بھی نہ جاؤ، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: جو لوگ یتیموں کا مال ناجائز طریقے سے کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں آگ بھرتے ہیں، لہٰذا یتیم کے مال کے قریب تک نہ جانے کا حکم دیا گیا ہے۔

یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ مگر بہتر طریقے سے اور وہ بھی اس وقت تک کہ وہ یتیم اپنی قوت، یعنی: جوانی تک پہنچ جائے، مفسرین کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ لفظ "اَشُدَّ" مفرد ہے یا جمع بعض فرماتے ہیں کہ "اَشُدَّ، شِدَّتْ" کی جمع ہے اور بعض دوسرے حضرات کہتے ہیں کہ "اَشُدَّ، شَدٌّ" کی جمع ہے اور مطلب دونوں

صورتوں میں یہی ہے کہ اس کی قوتیں مکمل ہونے تک یتیم کے مال کی حفاظت کرو اور اس کے بعد اسے یتیم کو لوٹا دو، قوتوں کی پختگی سے فقہائے کرام یہ بھی مراد لیتے ہیں کہ یتیم کا صرف بالغ ہونا کافی نہیں بلکہ سوجھ بوجھ بھی اس میں ہونا ضروری ہے، چنانچہ بعض فقہاء اس کیلئے اٹھارہ سے تیس سال تک کی عمر کا تعین کرتے ہیں کہ اس دوران یتیم اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے مال کو خود کام میں لا سکے، لہٰذا اسے اس کا مال واپس کر دینا چاہئے، امام اعظم امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر یتیم احمق نہ ہو تو پچیس سال کی عمر کو پہنچنے پر اس کا مال اسے واپس کر دینا چاہئے اگر اس کے بعد بھی وہ اپنے نفع نقصان کو نہیں پہچانتا تو اس کی ذمہ داری خود اس پر ہوگی نہ کہ اس کے سرپرست پر، بعض فقہائے کرام اس سے صرف بلوغت مراد لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب یتیم اٹھارہ سال کی عمر کو پہنچ جائے تو پھر اس کا مال نہیں روکنا چاہئے بلکہ فوراً واپس کر دینا چاہئے، بہرحال چھٹا حکم یہ ہے کہ بلوغت کی عمر کے پہنچنے تک یتیم کے مال کی اچھے طریقے سے نگرانی کرو اور اسے نقصان پہنچانے کی غرض سے اس کے قریب بھی نہ جاؤ۔

وَ اَوْفُوا الْكَيْلَ وَ الْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ: ساتواں حکم یہاں یہ ہے کہ ناپ اور تول کو انصاف کے ساتھ پورا کرو، یعنی: اللہ تعالیٰ نے ناپ تول میں کمی کرنے کو حرام قرار دیا ہے، ناپ تول میں کمی کے جرم میں پچھلی بعض قومیں بھی ملوث رہیں ہیں، چنانچہ "ایکہ" اور "مدین" والوں کا ذکر قرآن کریم میں بھی موجود ہے ایسے لوگوں کا طریقہ کار یہ ہے کہ جب اپنا حق لینا ہوتا ہے تو پورا لیتے ہیں اور جب خود کوئی جنس دوسرے سے خریدتے ہیں تو پوری پوری لیتے ہیں اور جب وہی چیز آگے فروخت کرنا ہوتی ہے تو ناپ تول میں کمی کرتے ہیں، "سورۂ مطففین" میں موجود ہے کہ ناپ تول میں کمی کرنے والوں کیلئے ہلاکت و بربادی ہے کہ جب وہ لوگوں سے لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں اور جب ناپ کر یا تول کر دوسروں کو دیتے ہیں تو کمی کر دیتے ہیں ایسا کرنا سخت گناہ اور حرام ہے۔

"ترمذی شریف" کی روایت میں آتا ہے کہ ایک موقع پر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تاجروں سے خطاب فرمایا: اے تاجروں کے گروہ! تم دو چیزوں (ناپ اور تول) کے سرپرست بنائے گئے ہو یہ تمہارا دور ہے مگر یاد رکھو! ناپ تول میں خرابی کی وجہ سے پہلی کئی امتیں تباہ ہو گئیں، لہٰذا تم اس معاملہ میں خرابی نہ کرنا کہ ناپ تول میں کمی کرنا مکمل طور پر حرام ہے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے کہ: جب کوئی چیز تول کر دو تو تول میں بڑھا کر دو اسی طرح پیمائش

میں بھی کمی کے بجائے کچھ زیادہ ہی دے دیا کرو، تاکہ تمہاری طرف کسی کا حق نہ رہ جائے اس کے ساتھ ساتھ آپ نے یہ بات بھی فرمادی کہ انسان کو اپنی طرف سے پوری کوشش کرنی چاہئے کہ کسی کا حق ضائع نہ ہو اگر انسان کی نیک نیتی اور پوری کوشش کے باوجود کوئی کمی زیادتی رہ جائے تو اللہ تعالیٰ پکڑ نہیں کریں گے، بعض اوقات ایک چیز پوری پوری تول کردی جاتی ہے مگر وہی چیز جب دوبارہ تولی جاتی ہے تو اس میں کمی واقع ہوجاتی ہے، ایسی باتیں غیر اختیاری ہوتی ہیں اور اللہ تعالیٰ معاف فرمادیتے ہیں کیونکہ اس کا ارشاد ہے کہ: ہم کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے، لہٰذا انسان کو اس معاملے میں اپنی کوشش کے مطابق نیک نیتی سے کام لینا چاہئے اس کے باوجود اگر کوئی خامی رہ جائے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی پکڑ نہیں ہوگی۔

ناپ اور تول میں کمی پر جو ڈراوا بیان کیا گیا ہے وہ ڈراوا ہر اس شخص کیلئے بھی ہے جو کسی ادارے میں کام کررہا ہے، یعنی: کہ جس طرح ناپ تول میں کمی کرنا حرام ہے اسی طرح اپنے فرض کی ادائیگی میں کوتاہی بھی حرام ہے، اگر کوئی مزدور اپنے مقررہ وقت تک کام نہیں کرتا کوئی ملازم اپنی ڈیوٹی کے اوقات میں سیٹ پر نہیں بیٹھتا، کوئی افسر، جج یا سپاہی اپنی دیوٹی کا پابند نہیں ہے تو وہ بھی اسی حکم کے تحت آتا ہے اگر کسی شخص نے اپنی ڈیوٹی کی طرف پورے اوقات میں توجہ نہیں دی اور اس میں کمی کی تو وہ بھی یہاں پر موجود وعید کا نشانہ بنتا ہے ہمارے ملک میں تو یہ برائی اتنی عام ہوچکی ہے کہ اسے برائی تصور نہیں کیا جاتا، دفتروں اور کارخانوں کا حال دیکھ لیں کہیں بھی آپ کو پوری حاضری نہیں ملے گی بلکہ اکثریت اس جرم میں ملوث ہوتی ہے اللہ تعالیٰ کا کوئی کوئی بندہ ہی ایسا ہوتا ہے جو اپنی ڈیوٹی پر پورا اترتا ہو ورنہ معاملہ بہت ہی خراب ہے۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عام عادت تھی کہ جس کسی کا کوئی حق آپ کے ذمہ ہوتا تو اس کے ادا کرنے کے وقت اس کے حق سے زائد ادا فرمانے کو پسند فرماتے تھے اور "بخاری" کی ایک حدیث میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: "اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحمت کرے جو بیچنے کے وقت بھی نرم ہو کہ حق سے زیادہ دے اور خریدنے کے وقت بھی نرم ہو کہ حق سے زیادہ نہ لے بلکہ کچھ معمولی کمی بھی ہو تو راضی ہوجائے"، مگر یہ حکم اخلاقی ہے کہ دینے میں زیادہ دے اور لینے میں کم بھی ہو تو جھگڑا نہ کرے، قانونی چیز نہیں کہ آدمی ایسا کرنے پر

مجبور ہو اسی بات کی طرف اشارہ کرنے کیلئے قرآن کریم میں یہ ارشاد فرمایا کہ: ہم کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ چیز کا حکم نہیں دیتے، یعنی: دوسرے کو اس کے حق سے زیادہ ادا کرنا اور اپنے حق میں کمی پر راضی ہو جانا کوئی زبردستی کا حکم نہیں کیونکہ عام لوگوں کو ایسا کرنا آسان نہیں۔

وَ اِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَ لَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى: جب بات کرو تو انصاف کے ساتھ کرو اگرچہ تمہارا رشتہ دار ہی ہو، یہاں پر قول سے مراد فیصلہ بھی ہو سکتا ہے اور گواہی بھی، اور مطلب یہ ہے کہ اگر تم کسی معاملے میں ثالث (فیصلہ کرنے والے) مقرر کیے گئے ہو تو تمہارا فیصلہ حق و انصاف پر مبنی ہونا چاہئے اور ناانصافی کی بات نہیں ہونی چاہئے، خواہ مقدمہ کا فریق تمہارا رشتہ دار ہی ہو، یہاں جس چیز کو حرام کیا گیا ہے وہ ناانصافی ہے کوئی عام بات ہو یا فیصلہ ہو انصاف کا دامن نہیں چھوٹنا چاہئے اور اگر کسی معاملہ میں آپ کی گواہی درکار ہو تو پھر بھی واقعے کے مطابق یا اپنے علم کی رو سے صحیح صحیح گواہی دو اس میں بھی کوتاہی حرام ہے اگرچہ تمہارا رشتہ دار ہی ہو غلط بیانی واقعوں کو توڑ موڑ کو پیش کرنا جس سے کسی کا نقصان ہو یا کسی کو نفع پہنچانا مقصود ہو اس حکم کے تحت حرام ہے اللہ تعالیٰ کا حکم ہے ہمیشہ حق کی گواہی دو اور بات کرو تو انصاف سے کرو اس کے خلاف کرنا جائز نہیں ہے۔

یعنی جب تم بات کہو تو حق کی کہو اگرچہ وہ اپنا رشتہ دار ہی ہو اس جگہ کسی خاص بات کا ذکر نہیں اسی لئے جمہور مفسرین کے نزدیک یہ ہر قسم کی بات کو شامل ہے خواہ وہ بات کسی معاملہ کی گواہی ہو یا حاکم کی طرف سے فیصلہ یا آپس میں مختلف قسم کی گفتگو ان سب میں قرآنی ارشاد یہ ہے کہ ہر جگہ ہر حال بات کرتے ہوئے حق و انصاف کا خیال رہنا چاہئے کسی مقدمہ کی گواہی یا فیصلہ میں حق و انصاف قائم رکھنے کے معنٰی ظاہر ہیں کہ گواہ کو جو بات یقینی طور پر معلوم ہو وہ اپنی طرف سے کسی لفظ کی کمی زیادتی کئے بغیر جتنا معلوم ہے صاف صاف کہہ دے اپنی اٹکل اور گمان کو دخل نہ دے اور اس کی فکر نہ کرے کہ اس سے کس کو فائدہ پہنچے گا اور کس کو نقصان اسی طرح کسی مقدمہ کا فیصلہ کرنا ہے تو گواہوں کو شرعی اصول پر جانچنے کے بعد جو کچھ ان کی گواہی سے نیز دوسری قسم کے قرینے سے ثابت ہو اس کے مطابق فیصلہ کرے۔

احکام و مسائل

مسئلہ (۱):.... یتیم کے مال کا انتظام اس طرح سے کریں جو اس کے حق میں بہتر ہو اور جس میں مال کی حفاظت کے ساتھ ساتھ اس میں اضافے کی صورت بھی ہو مثال کے طور پر اگر یتیم کے مال کو اپنے مال کے ساتھ ملا کر تجارت وغیرہ کرنے میں بہتر نتیجے کی توقع ہو تو پھر نیک نیتی کے ساتھ ایسا کرنا جائز ہے۔

اللہ تعالیٰ کا سیدھا راستہ

وَ بِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۱۵۲﴾

اور ساتھ عہد اللہ کے وفاداری کرو یہ حکم کیا تم کو ساتھ اسکے تا کہ تم نصیحت پکڑو (۱۵۲)

وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَ لَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ

اور یہ کہ یہ راستہ ہے میرا سیدھا پس چلو اس پر اور نہ پیروی کرو اور رستوں کی

فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۵۳﴾

پس جدا کر دیں تم کو سے راستہ اس کے یہ حکم کیا تم کو ساتھ اسکے تا کہ تم بچتے رہو (۱۵۳)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور اللہ کا عہد پورا کرو تم کو یہ حکم دیا ہے تا کہ تم نصیحت پکڑو۔ (۱۵۲) اور یہ کہ میری راہ سیدھی ہے، سو اس پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ تم کو اللہ کے راستے سے جدا کر دیں گے، یہ تم کو حکم دیا ہے تا کہ تم بھٹکنے سے بچتے رہو۔ (۱۵۳)

تفسیر

شروع رکوع سے جو حکم بیان ہوتے چلے آ رہے ہیں انہیں کے سلسلے میں اس آیت کے اندر مزید حکم دیئے گئے ہیں، ارشاد ہے کہ: اللہ تعالیٰ کو مان لینا گویا اس بات کا پکا وعدہ کرنا ہے کہ ہم آپ کے سارے حکم بے چون

وچرا پورا کریں گے یہ نہیں ہوسکتا کہ اللہ تعالیٰ کو مانے بھی اور اس کی نافرمانی بھی کرے، جو نافرمانی کرتا ہے اس نے اللہ تعالیٰ کو مانا ہی نہیں جو ایمان لے آیا اس نے حکم کو مان لیا، لہٰذا اس قول وقرار پر پورے اترو اور اپنا وعدہ پورا کرو، یہ حکم تمہیں اسی لئے دیئے جارہے ہیں کہ تمہیں اپنا وعدہ یاد آجائے اور تم بات کہہ کر اس سے نہ پھر جاؤ، حکم دینے سے یہ بھی غرض ہے کہ تم پر اللہ تعالیٰ کا سیدھا راستہ واضح ہوجائے یہ باتیں جو تم کو بتائی جارہی ہیں یہی اللہ تعالیٰ کا مقرر کیا ہوا سیدھا راستہ ہے، "سورہ فاتحہ" میں تمہیں سکھایا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ سے مانگو کہ ہمیں صراط مستقیم، یعنی: سیدھا راستہ دکھا اب اس صراط مستقیم، یعنی: سیدھے راستے کو تم پر واضح کردیا گیا ہے اس راہ کو مضبوط پکڑو اس کے سوا اگر کسی اور راستہ پر چلو گے تو اللہ تعالیٰ کے راستے سے بھٹک جاؤ گے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو آپس کے اختلاف سے بچنا چاہئے کیونکہ ان کا ایک دین ایک راستہ مقرر ہے جس پر قائم رہنے کی ہدایت کی گئی ہے اگر اختلاف ہوا تو ظاہر ہے کہ سب کا ایک راستہ نہ رہے گا اور مختلف لوگ مختلف راستوں پر چل پڑیں گے، اس آیت میں منع کیا گیا ہے کہ ایک راستہ کو چھوڑ کر اور راستے مت ڈھونڈنا ورنہ بھٹک جاؤ گے اس سے اتفاق کی تائید اور اختلاف کی برائی نکلتی ہے۔

وَ بِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا: یہاں نواں حکم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے عہد کو پورا کرو، اس عہد سے مراد "عہد الست" بھی ہوسکتا ہے، وہی عہد جو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی پیدائش سے پہلے تمام انسانوں کی روحوں کو جمع کرکے لیا تھا، کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ تو سب نے ایک زبان اقرار کیا تھا، کیوں نہیں، بیشک آپ ہی ہمارے پروردگار ہیں، اس عہد کی یاد دہانی اللہ تعالیٰ کے پیغمبر اور اس کی کتابیں کراتی رہی ہیں، اس عہد کو پورا کرنے کا حکم دیا گیا ہے، یعنی: اللہ تعالیٰ کو ایک جانتے اور مانتے رہو، مفسر قرآن امام ابوبکر جصاص رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس میں تمام حکم شامل ہیں اور تمام فرضوں وواجبات کو پورا کرنے کا حکم دیا گیا ہے اس کے علاوہ بندہ خود بھی بعض چیزوں کو اپنے اوپر لازم قرار دے لیتا ہے، مثلاً: جب وہ کوئی جائز منت یا نذر مانتا ہے تو اس کو پورا کرنا بھی ضروری ہوجاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کی ایک صفت یہ بھی بیان فرمائی ہے کہ وہ اپنی نذروں کو پورا کرتے ہیں، بہرحال عہد، "عہد الست" ہو یا حکموں کے پورا کرنے کا ان سب کو پورا کرنا ضروری ہے اور اس کے خلاف

کرنا حرام ہے یہاں تک نو حکم بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ اس کا تمہیں تاکیدی حکم دیتے ہیں تاکہ تم نصیحت پکڑو۔

وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ: اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ایک اصولی بات بیان فرمائی ہے کہ یہی میرا سیدھا راستہ ہے جو قرآن پاک بیان کرتا ہے اور جس کے بعض اصول یہاں بیان کئے گئے ہیں اور یہی راستہ میری رضا اور خوشنودی کے مقام تک پہنچانے والا ہے، لہٰذا اسی کی پیروی کرو۔

وَ لَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ: دسواں حکم یہاں یہ ہے کہ مختلف راستوں پر مت چلو، وجہ یہ ہے کہ یہ مختلف راستے تمہیں اللہ تعالیٰ کے راستے سے جدا کردیں گے ان راستوں سے گمراہی کے وہ تمام راستے مراد ہیں جن سے عقیدے اور عمل میں خرابی پیدا ہوتی ہے تمام گمراہ فرقے عقیدے میں خرابی کی پیداوار ہیں اور عمل میں خرابی سے مراد یہ ہے کہ انسان بدعتوں اور من گھڑت رسموں پر عمل کرنے لگے جب سیدھے راستے کی وضاحت اللہ تعالیٰ کے کلام اور پیغمبر کے فرمان سے ہوچکی تو اب اس کے خلاف چلنے والے بدعتوں پر عمل کرتے ہیں جس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے گمراہی عقیدے میں ہو یا عمل میں یہ بہرحال ناقابل برداشت ہے۔

بعض حضرات فقہائے کرام کے فقہی اختلاف کو ''سُبُلْ'' میں داخل کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی مسلکوں کا فقہی اختلاف بھی اس آیت کی زد میں آتا ہے، یہ بات درست نہیں بلکہ ان تمام مسلکوں کے امام ہدایت پر ہیں ان کے درمیان اختلاف عقیدے کا اختلاف نہیں ہے یہ ایسا اختلاف ہے کہ جسے خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے برداشت کیا ہے، اس کی مثال حدیث شریف میں موجود ہے، آپ نے بنوقریظہ کے ساتھ جہاد کیلئے جو لشکر روانہ فرمایا تو اسے ہدایت کی کہ ''تم میں سے کوئی شخص نماز نہ پڑھے مگر قریظہ میں جاکر''، لشکر روانہ ہوگیا، چار میل کی مسافت تھی راستے میں نماز کا وقت ہوگیا اب نماز کی ادائیگی کے سلسلے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم دو گروہوں میں تقسیم ہوگئے، بعض کا خیال تھا کہ وقت ہوگیا ہے راستے میں ہی نماز ادا کرلینی چاہئے ان کی دلیل تھی کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے

ارشادِ مبارک کا مقصد یہ تھا کہ کوئی شخص پیچھے نہ رہے، فوراً چلے جاؤ اور قریظہ میں جا کر نماز ادا کرو، چنانچہ انہوں نے راستے میں ہی نماز پڑھ لی، بعض دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم نے ظاہر الفاظ پر عمل کرتے ہوئے راستے میں نماز ادا نہ کی بلکہ قریظہ پہنچ کر یہ فرض ادا کیا جب معاملہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا گیا تو آپ نے کسی گروہ کا برا نہیں منایا، بلکہ فرمایا: دونوں گروہ حق پر ہیں جنہوں نے نماز راستے میں پڑھی وہ بھی حق پر ہیں اور جنہوں نے قریظہ پہنچ کر ادا کی ان کا موقف بھی درست ہے، بہر حال دین کے چاروں اماموں کا فقہی اختلاف بھی اسی نوعیت کا ہے اور کسی کو بھی غلط قرار نہیں دیا جا سکتا، بلکہ حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی سب حق پر ہیں، بعض لوگ اسے بڑھا چڑھا کر فرقہ بندی پر محمول کرتے ہیں جو کہ ٹھیک بات نہیں ہے سب کا بنیادی عقیدہ صحیح ہے، البتہ بعض اوقات سنت کی تشریح میں اختلاف ہو جاتا ہے بعض امام ایک چیز کو ضروری قرار دیتے ہیں اور بعض غیر ضروری سمجھتے ہیں بعض کسی عمل کو مستحب خیال کرتے ہیں اور بعض اسے واجب سمجھتے ہیں یہ غور و فکر کا اختلاف ہے جو کہ باعث رحمت ہے نہ کہ باعث زحمت، اور ان میں سے کسی کے بارے میں بدگمانی نہیں ہونی چاہئے البتہ جو شخص کفر، شرک، یا بدعتوں میں ملوث ہو گیا وہ بلاشبہ گمراہ ہو گیا۔

بہر حال اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر کے بتائے ہوئے سیدھے راستے پر چلو اور گمراہی کے راستوں سے بچ جاؤ، اگر گمراہی کے راستے پر چلو گے تو منزل مقصود کو نہیں پا سکو گے، اللہ تعالیٰ تمہیں یہ حکم تاکیدی طور پر دیتے ہیں تاکہ تم اس راستے پر چل کر گمراہی سے بچ جاؤ۔

خلاصہ

جن دس چیزوں کا تفصیلی بیان ان آیتوں میں آیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

(۱)....اللہ تعالیٰ کے ساتھ عبادت واطاعت میں کسی کو ساتھی ٹھہرانا حرام ہے۔

(۲)....والدین کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا ضروری ہے۔

(۳)....فقر و افلاس کے خوف سے اولاد کو قتل کر دینا حرام ہے۔

(۴).... بے حیائی کے کام کرنا حرام ہے۔

(۵).... کسی کو ناحق قتل کرنا حرام ہے۔

(۶).... یتیم کا مال ناجائز طور پر کھا جانا حرام ہے۔

(۷).... ناپ تول میں کمی کرنا حرام ہے۔

(۸).... گواہی یا فیصلہ یا دوسرے کے کلام میں بے انصافی کرنا حرام ہے۔

(۹).... اللہ تعالیٰ کے عہد کو پورا نہ کرنا حرام ہے۔

(۱۰).... اللہ تعالیٰ کے سیدھے راستہ کو چھوڑ کر دائیں بائیں دوسرے راستے اختیار کرنا حرام ہے۔

ان آیتوں کی اہم خصوصیات

کعب احبارؒ جو "تورات" کے ماہر عالم ہیں پہلے یہودی تھے پھر مسلمان ہوئے، وہ فرماتے ہیں کہ قرآن مجید کی یہ آیتیں جن میں دس حرام چیزوں کا بیان ہے اللہ تعالیٰ کی کتاب "تورات" بسم اللہ کے بعد انہی آیتوں سے شروع ہوتی ہے اور کہا گیا ہے کہ یہی وہ دس کلمات ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اترے تھے۔

مفسر قرآن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ یہی وہ محکم (یعنی: ناقابل تنسیخ) آیتیں ہیں جن کا ذکر "سورۂ آل عمران" میں آیا ہے کہ جن پر حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام پیغمبروں کی شریعتیں متفق رہی ہیں ان میں سے کوئی چیز کسی مذہب و دین اور کسی شریعت میں منسوخ نہیں ہوئی۔

یہ آیتیں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وصیت نامہ ہیں

حاکم نے حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام کو خطاب کر کے فرمایا: کون ہے جو مجھ سے تین آیتوں پر بیعت کرے، پھر یہی تین آیتیں تلاوت فرما کر ارشاد فرمایا کہ: جو شخص

اس بیعت کو پورا کرے گا تو اس کا اجر اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہو گیا۔

پہلی آیت میں جو پانچ حکم بیان کئے گئے ہیں، شرک سے بچنا، والدین کی نافرمانی سے بچنا، قتل اولاد سے بچنا، بے حیائی کے کاموں سے بچنا، کسی کا ناحق خون کرنے سے بچنا، ان کے آخر میں تو لفظ "تَعْقِلُوْنَ" استعمال فرمایا، کیونکہ جاہلیت کے زمانے والے ان چیزوں کو عیب ہی نہ جانتے تھے اس لئے اشارہ کیا گیا کہ باپ دادا کی رسموں اور خیالوں کو چھوڑ کر عقل سے کام لو۔

دوسری آیت میں چار حکم بیان ہوئے، یعنی: یتیم کے مال کو ناحق نہ کھانا، ناپ تول میں کمی نہ کرنا، بات کہنے میں حق اور سچ کا لحاظ رکھنا اور اللہ تعالیٰ کے عہد کو پورا کرنا، یہ چیزیں ایسی ہیں کہ ان کے ضروری ہونے کو تو یہ جاہل بھی جانتے تھے اور ان میں کچھ لوگ عمل بھی کرتے تھے مگر زیادہ تر لوگ ان حکموں میں غفلت کرتے تھے اور غفلت کا علاج ہے خدا اور آخرت کی یاد، اس لئے اس آیت کے آخر میں لفظ "تَذَكَّرُوْنَ" فرمایا ہے۔

تیسری آیت میں صراط مستقیم، یعنی: سیدھے راستے کو اختیار کرنے اور اس کے خلاف دوسرے راستوں سے بچنے کی ہدایت ہے اور صرف اللہ تعالیٰ کا ڈر ہی ایسی چیز ہے جو انسانوں کو اپنے خیالوں اور خواہشوں سے باز رکھنے کا صحیح ذریعہ ہو سکتی ہے، اس لئے اس کے آخر میں "لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ" ارشاد فرمایا۔

اور تینوں جگہ وصیت کا لفظ لایا گیا جو تاکیدی حکم کو کہا جاتا ہے اسی لئے بعض صحابہ کرام نے فرمایا کہ: جو شخص پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مہر کیا ہوا وصیت نامہ دیکھنا چاہئے وہ یہ تین آیتیں پڑھ لے۔

تفسیر ابن کثیر میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے انہوں نے فرمایا کہ: جو شخص پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایسا وصیت نامہ دیکھنا چاہے جس پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مہر لگی ہوئی ہو تو وہ ان آیتوں کو پڑھ لے ان میں وہ وصیت موجود ہے جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے امت کو دی ہے۔

ہدایت کا سلسلہ

ثُمَّ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ تَمَامًا عَلَى الَّذِيْٓ اَحْسَنَ وَ تَفْصِيْلًا

پھر دی ہم نے موسیٰ کو کتاب نعمت پوری کرنے کیلئے اوپر اس کے جس نے نیکی کی اور کھولنے کیلئے

ع ۱۹ ۶ لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّ هُدًى وَّ رَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ بِلِقَآءِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۵۴﴾

واسطے ہر چیز کے اور رہنمائی اور رحمت تا کہ وہ لوگ ساتھ ملاقات رب اپنے کے ایمان لے آئیں (۱۵۴)

بامحاورہ ترجمہ:۔ پھر ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی نیک کام کرنے والوں پر نعمت پوری کرنے کیلئے اور ہر چیز کی تفصیل کیلئے اور ہدایت اور رحمت کیلئے تا کہ وہ لوگ اپنے رب کے ملنے کا یقین کریں۔ (۱۵۴)

تفسیر

رکوع کی پہلی تین آیتوں میں جو حکم سنائے گئے وہ انسانوں کیلئے ہمیشہ سے مقرر ہیں اور شروع سے جتنے بھی پیغمبر آئے وہ موقع کے لحاظ سے لوگوں کو حکم بتاتے اور سمجھاتے رہے جس گناہ میں لوگ زیادہ مبتلا ہوئے اسی کی خرابی واضح کرنے کیلئے ان کے پاس پیغمبر آئے اور اس برائی کو انسانوں میں سے دور کرنے کی کوشش کی اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو "تورات" عطا ہوئی اور اس میں اچھے کام کرنے والوں کیلئے پورے قانون بیان کر دیئے گئے اور تفصیل کے ساتھ سارے حکم سنا دیئے گئے یہ انسانی زندگی کا ایک مکمل طریقہ تھا اور اس میں اس زمانے کے مطابق نیک لوگوں کیلئے اس طریقہ کے واضح کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

ارشاد ہے کہ انسانوں کیلئے دنیا کی زندگی بسر کرنے کیلئے اللہ تعالیٰ نے جو قاعدے شروع ہی سے مقرر کر دیئے ہیں وہ تم نے سنے یہی قاعدے انسانوں کو ہر زمانے میں ان کے پیغمبر بتاتے رہے جو پیغمبر اپنی قوم میں کوئی خاص برائی دیکھتے تھے جو ان قاعدوں میں سے کسی کے خلاف ہوتی تھی اسی قاعدے پر وہ اپنے زمانے میں زور دیتے تھے پھر جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کا زمانہ آیا اور مصر کے ظالم فرعون نے بنی اسرائیل کو اتنا دبایا کہ نیم مردہ

کر دیا تو ہم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے ان کو فرعون کے ظلم سے نکالا اور ان کی ہدایت کیلئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی۔

اس کتاب میں ہم نے اس زمانے کے مطابق ہر چیز کو کھول کر بیان کر دیا تاکہ ہر مشکل کے وقت ان کی رہنمائی کرے اور ان کو اپنے رب کے پہچاننے کا موقعہ ملے اور اس بات کا یقین ان کے دلوں میں بیٹھ جائے کہ مرنے کے بعد ان کو اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہونا ہے جہاں فرمانبرداروں کو انعام ملے گا اور نافرمان اپنی نافرمانی کی سزا بھگتیں گے، دنیا میں اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی پہلی کتاب "تورات" ہے اور بنی اسرائیل پہلی قوم ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے ایک مکمل شریعت عطا فرمائی جو اس زمانے کے حالات کے مطابق تھی، "زبور" اسی کا ایک ضمنی مضمون تھا، "انجیل" اس کے ایک پہلو پر زور دینے کیلئے آئی جس پر زمانے کے لحاظ سے زور دینا ضروری تھا پھر ان سب کا خلاصہ قرآن مجید ہے جو ہر زمانے کیلئے کافی ہے اس کا ذکر آگے آرہا ہے۔

لَّعَلَّهُمْ بِلِقَآءِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ: امید ہے کہ یہ لوگ اپنے رب کی ملاقات پر یقین رکھیں جب اللہ تعالیٰ کی کتاب کو پڑھیں گے ان کیلئے ہدایت کا راستہ واضح ہوگا تو انہیں یقین آجائے گا کہ ایک دن انہیں اپنے رب کی بارگاہ میں پیش ہو کر اس دنیا کی زندگی کا حساب بھی دینا ہے جب کسی انسان کا عقیدہ آخرت پر مضبوط ہو جاتا ہے تو پھر وہ برائیوں سے رُک کر نیکی کی طرف مائل ہو جاتا ہے اور جب یہی عقیدہ کمزور پڑ جاتا ہے تو پھر اسے کسی قسم کی برائی کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوتی وہ بے لگام ہو کر جہاں چاہے چلا جاتا ہے اور آخرت کی ہمیشہ کی زندگی کو عذاب میں مبتلا کر لیتا ہے، مقصد یہ کہ برائی سے بچنے کیلئے آخرت پر ایمان لانا ضروری ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ نے پرہیزگاروں کی صفتیں بیان کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا ہے کہ وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

قرآن مجید

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿١٥٥﴾

اور یہ کتاب ہے جو ہم نے اتاری برکت والی پس چلو اس پر اور ڈرتے رہو تاکہ تم رحمت کئے جاؤ (۱۵۵)

اَنْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اُنْزِلَ الْكِتٰبُ عَلٰى طَآئِفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا ۠

کہ کبھی کہو تم سوائے اسکے نہیں کہ اتاری گئی کتاب اوپر دو فرقوں کے سے پہلے ہمارے

وَ اِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغٰفِلِيْنَ ﴿۱۵۶﴾ اَوْ تَقُوْلُوْا لَوْ اَنَّآ اُنْزِلَ

اور بیشک تھے ہم سے پڑھنے پڑھانے ان کے بالکل بے خبر (۱۵۶) یا کہو تم اگر (ایسے ہوتے) ہم کہ اتاری جاتی

عَلَيْنَا الْكِتٰبُ لَكُنَّآ اَهْدٰى مِنْهُمْ ۚ

پر ہم کتاب البتہ ہوتے ہم زیادہ فرمانبردار سے ان

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور ایک یہ کتاب ہے برکت والی کہ ہم نے اتاری، سو اس پر چلو اور ڈرتے رہو تا کہ تم پر رحمت ہو۔ (۱۵۵) اس واسطے کہ کبھی تم کہنے لگو کہ کتاب جو اتری تھی سو انہی دو فرقوں پر جو ہم سے پہلے تھے اور ہم کو تو ان کے پڑھنے پڑھانے کی خبر ہی نہیں تھی۔ (۱۵۶) یا کہنے لگو کہ اگر ہم پر کتاب اتاری تو ہم ان سے زیادہ ہدایت پر ہوتے۔

تفسیر

"تورات" کا تعارف کرانے کے بعد اب اللہ تعالیٰ نے اپنی آخری کتاب قرآن حکیم کا ذکر فرمایا ہے اور یہ کتاب بھی جس کی یہ بھی ایک سورۃ ہے اس کی کل ۱۱۴ سورتیں ہیں اس کو بھی ہم نے اتارا ہے یہ بھی ایک عظیم کتاب ہے اس سے عظیم کوئی کتاب دنیا میں موجود نہیں تمام تر اختصار کے باوجود اس کتاب میں علم و حکمت کے وہ خزانے موجود ہیں جس پر انسانیت کبھی بھی حاوی نہیں ہو سکتی، اور یہ ایسی کتاب ہے جسے ایک دم اتارنے کے بجائے تھوڑا تھوڑا کر کے اتارا گیا اور پوری کتاب تیئس سال میں مکمل ہوئی برخلاف اس کے "تورات" کو ایک ہی مرتبہ میں اتارا گیا۔

جب یہ بات واضح ہوگئی کہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتاری ہوئی برکت والی کتاب ہے تو حکم ہوا کہ اب اس کی پیروی کرو، فقہاء و محدثین نے مثال کے طور پر وضاحت کی ہے کہ نماز میں فرض، واجب، مستحب،

مباح نوافل وغیرہ سب آتے ہیں ہر ایک کے درجے کو پہچاننا اور اس پر عمل کرنا ضروری ہے اگر فرض چھوٹ جائے تو نماز نہیں ہوتی، واجب رہ جائے تو سجدہ سہو سے وہ خامی دور ہو جاتی ہے، سنت اور مستحب چھوٹ جائے تو نماز اعلیٰ درجے کی نہیں رہتی، بہر حال فرمایا کہ: قرآن پاک کے ہر حکم پر عمل کرو اور ڈرتے رہو اور برائی سے بچتے رہو، کفر شرک اور بدعت کے قریب نہ جاؤ تاکہ تم پر رحم کیا جائے، اللہ تعالیٰ کی رحمت کے حاصل کرنے کا یہی ذریعہ ہے کہ اس برکت والی کتاب کی پیروی کی جائے اس کے حکم کی خلاف ورزی سے ہمیشہ ڈرتے رہنا چاہئے یہ دونوں کتابوں، یعنی: "تورات" اور قرآن پاک کی حقیقت واضح ہوگئی اور ان کتابوں میں موجود مشترک چیزوں کا ذکر بھی ہوگیا۔

اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم کے اتارنے کی دو وجہیں بیان فرمائی ہیں، پہلی وجہ یہ ہے کہ اے عرب کے مشرکوں! تم یہ نہ کہہ سکو کہ ہم سے پہلے دو گروہوں پر کتاب اتاری گئی اور یہ گروہ یہودی اور عیسائی جن پر اللہ تعالیٰ نے بالترتیب "تورات" اور "انجیل" اتاری یہ دونوں گروہ اہل کتاب کہلاتے ہیں اور مشرک لوگ ان دونوں گروہوں سے بخوبی واقف تھے امام ابوبکر جصاص رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: مجوسیوں کو اہل کتاب میں شامل نہیں کیا گیا کیونکہ وہ خالصتاً مشرک تھے۔

تم پر یہ کتاب اس وجہ سے اتاری ہے کہ تم یہ نہ کہہ سکو کہ ہم سے پہلے دو گروہوں پر تو کتابیں اتاری گئیں اور ہم ان کے پڑھنے پڑھانے سے بے خبر رہے، یعنی: ہم تو ان کتابوں کو پڑھ ہی نہیں سکے کیونکہ "تورات" عبرانی زبان میں تھی جب کہ "انجیل" سریانی زبان میں اور ہماری زبان عربی ہے، لہٰذا ہم ان سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کر سکتے، پچھلی کتابوں کے عربوں تک نہ پہنچنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انہیں آگے پہنچانے کا فرض ادا نہیں کیا، لہٰذا ہم تک ان کتابوں کی تعلیمات نہیں پہنچی اور ہم ان کو پہچاننے اور اس پر عمل کرنے سے قاصر رہے، چنانچہ اب اللہ تعالیٰ نے یہ قرآن کریم خود عربی زبان میں اتار کر تمہارے اس عذر کو ختم کر دیا ہے اب تم یہ عذر پیش نہیں کر سکتے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم تم تک نہیں پہنچ سکے۔

قرآن کریم کے اتارنے کی دوسری وجہ اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ کل کو تم یہ نہ کہہ سکو کہ اگر ہم پر کتاب اتاری جاتی تو ہم یہودیوں اور عیسائیوں سے زیادہ ہدایت یافتہ ہوتے۔

قرآن حکیم سے منہ موڑنا

فَقَدْ جَآءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةٌ ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ
پس تحقیق آ گئی پاس تمہارے نشانی سے رب تمہارے کی اور ہدایت اور رحمت پس کون ہے زیادہ ظالم

مِمَّنْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ صَدَفَ عَنْهَا ۗ سَنَجْزِى الَّذِيْنَ
اس سے جو جھٹلادے آیتوں کو اللہ کی اور منہ موڑے سے ان ہم سزا دیں گے ان کو جو

يَصْدِفُوْنَ عَنْ اٰيٰتِنَا سُوْٓءَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يَصْدِفُوْنَ ﴿۱۵۷﴾
وہ منہ موڑتے ہیں سے آیتوں ہماری بُرا عذاب اس وجہ سے کہ تھے وہ وہ منہ موڑتے (۱۵۷)

بامحاورہ ترجمہ:۔ سو تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نشانی اور ہدایت اور رحمت آ چکی ہے اب اس سے زیادہ ظالم کون ہے جو اللہ کی آیتوں کو جھٹلادے اور ان سے کترائے؟ جو ہماری آیتوں سے کتراتے ہیں ہم ان کو اس کترانے کے بدلے برا عذاب دیں گے۔(۱۵۷)

لفظی تحقیق: صَدَفَ: منہ موڑا۔ "صَدَفٌ" سے بنا ہے، جس کے معنٰی ہیں: منہ موڑنا، کترانا، اعراض کرنا۔

تفسیر

ارشاد ہے کہ یہ کتاب تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس آ پہنچی ہے اس میں بہت صاف صاف نہایت واضح اور روشن دلیلیں موجود ہیں سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کرتی ہے اس میں جو بات ہے سراسر تمہارے فائدے کی ہے یہ خدا کی رحمت ہے جو اس نے تم پر اتاری جس کتاب میں یہ ساری خوبیاں موجود ہوں اور پھر ایسی کہ کبھی ختم ہونے کا نام ہی نہ لیں ہر وقت رہنمائی کیلئے تیار، ہر حالت میں مدد کیلئے موجود، آڑے وقتوں میں کام آنے والی، اپنے ماننے والوں کی خوشحالی اور عزت کی ضامن، اللہ تعالیٰ کے ساتھ رشتہ جوڑنے والی اس سے اگر غفلت برتی جائے اور اس کے حکموں کو اگر پیٹھ پیچھے پھینک کر فضول باتوں میں مشغول رہا جائے تو واقع

بڑی بدبختی کی نشانی ہے، اب تم بتاؤ کہ! اگر کوئی ایسی کارآمد اور فائدہ مند کتاب کو بھلا کر بیٹھ جائے اور اس کی طرف سے منہ موڑے تو اس سے زیادہ گھاٹا پانے والا اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے والا کون ہوسکتا ہے؟ اس کو چھوڑ بیٹھنا انتہائی ظلم ہے، جو کوئی اپنی جان پر بلکہ دوسرے انسانوں پر کرسکتا ہے یہ نہیں ہوسکتا کہ اس کا بدلہ اسے نہ بھگتنا پڑے، ہم نے ایسے لوگوں کیلئے برا عذاب تجویز کر رکھا ہے وہ اپنی غفلت کی سزا یہاں بھی بھگتیں گے ان سے ساری عظمت اور عزت چھن جائے گی اور مرنے کے بعد بھی انہیں چین نہیں ملے گا۔

مکہ والوں کو یہ آیتیں سنائی گئیں بہت کم لوگوں نے ان پر یقین کیا، باقی سب نے اس کان سے سنا اس کان سے اڑا دیا، تاریخ گواہ ہے کہ ماننے والوں کو کیسی ترقی نصیب ہوئی اور ان کے مرتبے اور درجے کہاں سے کہاں پہنچے اور نہ ماننے والوں کو کیسی ذلت اور خواری سے پالا پڑا انہی مٹھی بھر ماننے والوں نے ان نہ ماننے والوں کا بھرکس (کچومر) نکال دیا نہ ان کی غلط بات پر اتحاد نے کام دیا اور نہ ان کے سامان اور ہتھیاروں نے انہیں کچھ فائدہ پہنچایا، پیغام آج بھی اسی طرح باقی ہے سننے والوں کو ہوش سے کام لینا چاہئے۔

ایمان لانے کیلئے اب کس بات کا انتظار ہے

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ رَبُّكَ اَوْ يَاْتِيَ
کیا انتظار کر رہے ہیں مگر یہ کہ آئیں پاس انکے فرشتے یا آئے رب آپ کا یا آئے

بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ ؕ يَوْمَ يَاْتِيْ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا
کوئی نشانی رب آپکے کی جس دن آئے کوئی نشانی رب آپکے کی نہ کام آئے گا کسی کے

اِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ اَوْ كَسَبَتْ فِيْٓ اِيْمَانِهَا
ایمان لانا اس کا کہ نہ تھا ایمان لایا سے پہلے یا کمائی تھی میں ایمان اپنے

خَيْرًا ۗ قُلِ انْتَظِرُوْٓا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ﴿۱۵۸﴾

بھلائی آپ کہہ دیجئے انتظار کرو ہم بھی انتظار میں ہیں (۱۵۸)

بامحاورہ ترجمہ:۔ لوگ کس کی راہ دیکھتے ہیں مگر یہی کہ ان کے پاس فرشتے آئیں یا آپ کا رب آئے یا آپ کے رب کی کوئی نشانی آئے، جس دن تیرے رب کی ایک نشانی آئے گی کسی کیلئے اس کا ایمان لانا کام نہ آئے گا جو پہلے سے ایمان نہ لایا تھا یا اپنے ایمان میں کچھ نیکی نہ کی تھی تو آپ کہہ دیں تم راہ دیکھو ہم بھی راہ دیکھتے ہیں۔(۱۵۸)

لفظی تحقیق: تَأْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ: اس سے موت کے یا عذاب کے فرشتے مراد ہیں، یا وہ فرشتے مراد ہیں جو سامنے آ کر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سچائی اور قرآن کریم کے حق ہونے کی گواہی دیں۔ يَأْتِيَ رَبُّكَ: سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ خود ان کے پاس آئیں اور ان سے کہیں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے پیغمبر ہیں یا اللہ تعالیٰ کے آنے کا یہ مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ خود ان کے پاس اپنا عذاب لے کر آ جائیں اس سے مراد دنیا کا عذاب بھی ہوسکتا ہے اور قیامت کے دن کا بھی۔

تفسیر

اس آیت میں کہا گیا ہے کہ انسان کی ہدایت کا اتنا اہتمام کر دینے کے بعد اب اور کس چیز کی ضرورت باقی ہے جس کے پورا ہونے کا انتظار کر رہے ہیں کتاب آ چکی ہے اس کے سمجھانے اور اس پر عمل کرنے کا طریقہ بتانے کیلئے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے، کیا یہ لوگ اب یہ راہ دیکھ رہے ہیں کہ ان کے پاس فرشتے آئیں، یا وہ رب جس نے یہ سب کچھ انسان کیلئے بھیجا ہے خود ان کے سامنے آئے یا اس کی کوئی اور نشانی آئے؟ واقعی ایمان نہ لانے والے یہی باتیں اپنے منہ سے کہتے تھے کہ ان سب کا جواب اس آیت میں دیا گیا ہے۔

ایمان لانا اور گناہوں سے توبہ کرنا اسی وقت کام آئے گا جب قرآن مجید اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بات اپنی عقل اور سمجھ سے کام لے کر ابھی مان لوگے وہ جب کوئی ایسی مصیبت جس سے قرآن کریم اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

ڈرار ہے ہیں سر پر آ پڑی تو اس وقت کا ایمان لانا یا توبہ کرنا بیکار ہوگا کیونکہ فائدہ دینے والا ایمان وہ ہے جسے غیب کے اوپر ایمان لانا کہتے ہیں اور غیب وہ ہے جس کو صرف قرآن اور پیغمبر کے کہنے سے اور اپنی عقل کی گواہی سے مانا جائے جب غیب کی باتیں ظاہر ہوگئیں جو کہ موت کے وقت ظاہر ہونی شروع ہوجاتی ہیں یا جو فنا کے قریب ظاہر ہوں گی، جیسے: سورج کا مغرب سے نکل آنا وغیرہ، اس وقت کا ایمان لانا غیب پر ایمان لانا نہ ہوگا اس لئے کچھ کام نہ آئے گا اور نہ اس وقت توبہ قبول ہوگی۔

قرآن مجید کی بہت سی آیتوں میں ذکر ہے کہ دوزخ والے دوزخ میں پہنچ کر فریاد کریں گے اور بڑے بڑے وعدے کریں گے کہ اگر ہمیں اب دنیا میں دوبارہ لوٹا دیا جائے تو ہم ایمان لانے اور نیک عمل کرنے کے سوا کچھ نہ کریں گے مگر سب کا جواب یہی ہوگا کہ ایمان و عمل کا وقت ختم ہو چکا اور اب جو کچھ کہہ رہے ہو مجبور ہو کر کہہ رہے ہو اس کا اعتبار نہیں۔

اسی آیت کی تفسیر میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ جس وقت قیامت کی آخری نشانیوں میں یہ نشانی ظاہر ہوگی کہ سورج مشرق کے بجائے مغرب سے نکلے گا اور اس کو دیکھتے ہی سارے جہاں کے کافر ایمان کا کلمہ پڑھنے لگیں گے اور سارے نافرمان فرمانبردار بن جائیں گے لیکن اس وقت کا ایمان لانا اور توبہ قابل قبول نہ ہوگا، اس آیت میں اتنی بات تو قرآن کریم سے معلوم ہوگئی کہ بعض نشانیاں ایسی واقع ہوں گی، جن کے بعد توبہ کا دروازہ بند ہو جائے گا کسی کافر یا فاسق کی توبہ قبول نہ ہوگی لیکن قرآن کریم نے اس کی وضاحت نہیں فرمائی کہ وہ کون سی نشانی ہے، "صحیح بخاری" میں اسی آیت کی تفسیر میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ''قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک یہ واقعہ پیش نہ آ جائے کہ سورج مغرب کی طرف سے نکلے جب لوگ یہ نشانی دیکھیں گے تو سب ایمان لے آئیں گے یہی وہ وقت ہوگا جس کیلئے قرآن کریم میں یہ ارشاد ہے کہ اس وقت کسی کو ایمان لانا فائدہ نہیں دے گا۔

اس کی تفصیل "صحیح مسلم" میں حذیفہ ابن اسید رضی اللہ عنہ کی روایت اس طرح نقل کی گئی ہے کہ ایک مرتبہ صحابہ کرام قیامت کی نشانیوں کا ذکر آپس میں کر رہے تھے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے اس وقت آپ نے فرمایا

کہ قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک تم دس نشانیاں نہ دیکھ لو:

(۱)۔۔۔۔ سورج کا مغرب کی جانب سے نکلنا۔

(۲)۔۔۔۔ ایک خاص قسم کا دھواں۔

(۳)۔۔۔۔ دابۃ الارض۔ (زمین سے نکلنے والا ایک تیز رفتار اور خوفناک جانور)

(۴)۔۔۔۔ یاجوج وماجوج کا نکلنا۔

(۵)۔۔۔۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اترنا۔

(۶)۔۔۔۔ دجال کا نکلنا۔

(۷)۔۔۔۔ تین جگہوں پر زمین کا دھنس جانا ایک مشرق میں۔

(۸)۔۔۔۔ ایک مغرب میں۔

(۹)۔۔۔۔ ایک جزیرۃ العرب میں۔

(۱۰)۔۔۔۔ ایک آگ جو عدن کی گہرائی سے نکلے گی اور لوگوں کو آگے آگے ہنکا کر لے جائے گی۔

"مسند احمد" میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: ان نشانیوں میں سب سے "پہلے مغرب کی طرف سے سورج کا نکلنا" اور "دابۃ الارض" (زمین سے نکلنے والا ایک تیز رفتار اور خوفناک جانور) کا نکلنا واقع ہوگا۔

قُلِ انْتَظِرُوْٓا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ: آیت کے اس حصہ میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خطاب ہے کہ آپ ان لوگوں سے کہہ دیجئے کہ! اللہ تعالیٰ کی طرف سے ساری دلیلیں پوری ہوجانے کے بعد بھی اگر تمہیں موت یا قیامت کا انتظار ہے تو یہ انتظار کرتے رہو ہم بھی اسی کا انتظار کریں گے کہ تمہارے ساتھ تمہارے رب کا کیا معاملہ ہوتا ہے۔

فرقہ بندی

اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ ؕ

بیشک وہ لوگ جو الگ کر بیٹھے دین اپنا اور ہوگئے فرقہ فرقہ نہیں آپ میں سے ان میں کسی چیز

اِنَّمَآ اَمْرُهُمْ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۱۵۹﴾

بات یہی ہے کہ کام انکا طرف اللہ کے پھر وہ خبر دے گا ان کو اس کی جو تھے وہ کرتے (۱۵۹)

بامحاورہ ترجمہ:۔ جنہوں نے اپنے دین میں راہیں نکالیں اور بہت سے فرقے ہو گئے، آپ کو ان سے کچھ سروکار نہیں ان کا کام اللہ ہی کے حوالے ہے، پھر ان کو وہی جتلا دے گا جو کچھ وہ کرتے تھے۔ (۱۵۹)

تفسیر

اس سے پہلے رکوع میں ان باتوں کو مختصر طور پر گنوا کر جو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کیلئے مقرر کر دی ہیں کہا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کی ہوئی انسانوں کیلئے سیدھی راہ یہی ہے اس کو چھوڑ کر اور راستے اختیار کرنا گمراہی ہے، پھر کہا تھا کہ انہی باتوں کو "تورات" میں بیان کیا گیا اور سب کے بعد ان کو آئندہ ہر زمانے کے انسانوں کیلئے قرآن کریم میں مناسب تبدیلی کے ساتھ جمع کر دیا گیا اور آخری پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ دنیا میں بھیج دیا گیا اب انسان کو چاہئے کہ اس کی پیروی کرے کیونکہ اس وقت اس کیلئے اللہ تعالیٰ کا مقرر کیا ہوا دین یہی ہے، پہلے کہہ دیا گیا کہ اس دین کے ٹکڑے ٹکڑے مت کرنا اور دین میں الگ الگ فرقے مت بنانا اسی سلسلہ کو جاری رکھتے ہوئے نہایت تاکید کے ساتھ اس آیت میں دین کے اندر فرقہ بندی سے منع کیا گیا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ: اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا کہ وہ لوگ جنہوں نے اپنے دین میں تفریق کر ڈالی ہے، یعنی: ٹکڑے ٹکڑے کر کے مختلف گروہوں میں بٹ گئے ہیں آپ کا ایسے لوگوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے، لہٰذا آپ ان سے بیزاری کا اعلان فرمائیں، اس آیت میں جس تفریق سے منع فرمایا گیا ہے اس کی مثال پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں بیان فرمائی ہے کہ بنی اسرائیل اکہتر (۷۱) فرقوں میں بٹ گئے یہ سب کے سب گمراہ ٹھہرے، سوائے ایک فرقہ کے جو اسلام پر تھا اور وہ ایک جماعت تھی پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے بہتر (۷۲) گروہ علیحدہ ہوئے

وہ بھی سب کے سب گمراہ تھے، سوائے ایک گروہ کے جو اسلام پر تھا اور وہ ایک جماعت تھی پھر تم تہتر (۷۳) فرقے بن جاؤ گے تمام گمراہ ہوں گے سوائے ایک فرقہ کے جو اسلام پر ہوگا اور اس کی ایک جماعت ہوگی، دوسری حدیث میں یہ الفاظ آتے ہیں کہ سب فرقے دوزخی ہوں گے سوائے ایک فرقہ کے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا وہ ایک نجات پانے والا فرقہ کون سا ہوگا؟ فرمایا: جس پر میں اور میرے صحابہ ہیں، دین کی تفریق کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے سب کو بیان کر دیا، بنی اسرائیل نے تو بلاشبہ دین میں تفریق کی اور الگ الگ فرقوں میں بٹ گئے مگر اس آخری امت کی فرقہ بندی کا ذکر بھی یہاں مختصراً ذکر کر دیا گیا ہے، اس حدیث میں یہودیوں اور عیسائیوں کا ذکر ہے تاہم اس امت کے لوگوں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے طریقے سے ہٹ کر الگ الگ گروہ بنالئے ہیں وہ یقیناً حق پر نہیں۔

ایک ضروری وضاحت

اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ اختلاف دو قسم کے ہیں ایک عقیدے میں اور دوسرا مسلکوں میں، دوسرے لفظوں میں ہم ان کی تقسیم اصول وفروع میں بھی کر سکتے ہیں، اصول میں وہ باتیں آتی ہیں جن پر ایمان لانا ضروری ہے اور ایمان اسی طرح لانا چاہئے جس طرح اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبر نے حکم دیا ہے، صحابہ کرام اس ایمان کا نمونہ ہیں، اور فروع کو عملوں سے تعبیر کر سکتے ہیں، اب یہ سمجھیں کہ بدعتی عقیدے میں اختلاف کرتے ہیں تاہم انہیں ایمان سے بالکل خارج نہیں کیا جا سکتا، ایمان کے باوجود ان میں عقیدے کی خرابی پائی جاتی ہے اس کے علاوہ ان کے عملوں میں بھی خرابی ہے یہ لوگ عقیدے اور عملوں دونوں چیزوں میں خرابی کی بناء پر دوزخ میں جائیں گے، البتہ ان میں سے جو لوگ کفر اور شرک میں مبتلا ہو جائیں گے وہ ہمیشہ کیلئے دوزخی ہیں اور جو عملوں میں کوتاہی کی وجہ سے دوزخ میں جائیں گے انہیں سزا بھگتنے کے بعد نکال لیا جائے گا۔

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ”ترمذی شریف“ میں لکھا ہے کہ تمام اہل حق اس بات پر متفق ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو ایک جاننے اور ماننے والوں کو ہمیشہ دوزخ میں نہیں رکھا جائے گا، ایمان کے باوجود جن لوگوں کا عقیدہ خراب

ہوگا یا جن کے عمل خراب ہوں گے وہ جہنم میں جائیں گے مگر پاکی کیلیئے، جب وہ اپنے عملوں کی سزا بھگت کر پاک ہوجائیں گے تو وہاں سے نکال لیئے جائیں گے مگر کفر اور شرک کرنے والے کبھی پاک نہیں ہوں گے، لہٰذا وہ ہمیشہ کیلئے دوزخ میں ہی رہیں گے۔

فروع، یعنی: عملوں کا اختلاف دین میں قابل برداشت ہے اور اس میں کسی ایک کو دوسرے پر ملامت نہیں کرنی چاہئے، عملوں میں ایک گروہ ایک طریقے پر عمل کرتا ہے اور دوسرا دوسرے طریقے پر، تو اس میں کوئی حرج نہیں اس قسم کا اختلاف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین، اور اماموں میں بھی پایا جاتا ہے مگر یہ اختلاف نقصان دہ نہیں، ایمان اور یقین لانے والی باتوں میں حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی سب متفق ہیں اور ان میں کوئی اختلاف نہیں، فروع، یعنی: عملوں میں بعض امام ایک چیز کو سنت قرار دیتے ہیں مگر دوسرے ایسا نہیں سمجھتے، بعض کسی چیز کو مباح تسلیم کرتے ہیں جب کہ دوسرے ایسا نہیں سمجھتے، یہ معمولی باتیں ہیں، البتہ ان کو زیادہ طول دینے سے گمراہی پیدا ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔

فروعی، یعنی: عملی اختلاف کی مثالیں خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ مبارک میں بھی ملتی ہیں، جب جب خندق جنگ ختم ہوئی تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم واپس لوٹے آپ ہتھیار اتارنا چاہتے تھے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام اترے اور کہنے لگے کہ ہم فرشتوں نے تو ابھی ہتھیار نہیں اتارے آپ کیسے ہتھیار اتارتے ہیں پہلے بنی قریظہ کا فیصلہ ہونا چاہئے وہاں پر یہودیوں نے مسلمانوں کے خلاف سازشیں کی تھی، چنانچہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بنی قریظہ کے خلاف جہاد کا اعلان فرمایا اور حکم دیا تم میں سے ہر شخص عصر کی نماز بنی قریظہ میں جا کر پڑھے اس حکم کے پورا کرنے میں تمام مجاہد بنی قریظہ کی طرف نکل کھڑے ہوئے راستے میں عصر کی نماز کا وقت ہوگیا ایک گروہ نے کہا کہ نماز کا وقت تنگ ہو رہا ہے، لہٰذا نماز پڑھ لینی چاہئے ان کی دلیل پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بنی قریظہ میں جا کر نماز پڑھنے کا حکم اس لئے تھا کہ یہاں مدینہ میں کوئی نہ رہے بلکہ فوراً چلے جاؤ، اب چونکہ نماز کا وقت ہوگیا ہے، لہٰذا نماز ادا کرلینی چاہئے برخلاف اس کے دوسرا گروہ کہتا تھا کہ آپ کے الفاظ یہ تھے کہ نماز بنی قریظہ میں ہی جا کر پڑھنی ہے، لہٰذا راستے میں نہیں

پڑھنی چاہئے چنانچہ دونوں گروہوں نے اپنی اپنی اجتہادی رائے کے مطابق عمل کیا پھر جب معاملہ پیغمبر ﷺ کی خدمت میں پیش ہوا تو پیغمبر ﷺ کے الفاظ "بخاری شریف" میں اس طرح آتے ہیں کہ آپ نے ان میں سے کسی کو نہیں ڈانٹا، گویا دونوں گروہ ٹھیک ہیں، بہرحال ایسے معاملہ میں اجتہاد کی گنجائش موجود تھی ایک گروہ نے الفاظ پر عمل کیا اور دوسرے نے مطلب سمجھنے کی کوشش کی، لہٰذا دونوں حق پر تھے پیغمبر ﷺ نے دونوں کو درست قرار دیا کسی کو ڈانٹ ڈپٹ نہیں کی، غرضیکہ! فروع میں اس قسم کے اختلاف کی گنجائش موجود ہے جس میں بات کو بڑھا کر گمراہی کی طرف نہیں جانا چاہئے۔

جو شخص اجتہاد کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو اس کے بارے میں پیغمبر ﷺ نے فرمایا: جب وہ اجتہاد کرتا ہے پھر وہ ٹھیک بات کو پالیتا ہے تو اس کیلئے دوہرا اجر ہوتا ہے اور اگر وہ غلطی کرتا ہے تو پھر بھی ایک اجر کا مستحق ہوتا ہے کیونکہ اس نے اپنی صلاحیت کے مطابق مسئلہ کے حل میں پوری پوری کوشش کی، حدیث شریف میں اس قسم کے اجتہاد کی مثال ملتی ہے پیغمبر ﷺ کے دو صحابی کسی سفر پر گئے راستے میں پانی ختم ہو گیا نماز کا وقت آیا تو انہوں نے تیمم کر کے نماز ادا کر لی مگر نماز کا وقت ابھی باقی تھا کہ پانی میسر آ گیا ان میں سے ایک شخص نے وضو کر کے دوبارہ نماز پڑھی جب کہ دوسرے شخص نے پہلی ادا کی ہوئی نماز پر ہی اکتفا کیا، جب پیغمبر ﷺ کی خدمت میں یہ واقعہ بیان کیا تو آپ نے تیمم سے نماز پڑھنے والے آدمی سے فرمایا تو نے سنت کو پالیا، یعنی: پانی کے نہ ہونے کی صورت میں تیمم کر کے نماز پڑھ لینی کافی ہے تمہارا فرض ادا ہو گیا، اور جس شخص نے دوبارہ نماز پڑھی تھی اس کو پیغمبر ﷺ نے فرمایا: تیرے لئے دوہرا اجر ہے تیری پہلی نماز کے ذریعے فرض کی ادائیگی ہوئی اور دوسری نماز نفل بن گئی، لہٰذا تیرے لئے دوہرا اجر ہے، یہ فروعی اختلاف کی مثالیں ہیں اس قسم کا اختلاف نقصان دہ نہیں، حدیث کی کتابوں میں اس طرح کی بہت ساری مثالیں موجود ہیں جو کہ وہاں دیکھی جا سکتی ہیں۔

اختلاف سے بچنے کیلئے ہمیں پیغمبر ﷺ کی ایک حدیث ہمیشہ سامنے رکھنی چاہئے وہ یہ ہے کہ "تم میں سے جو لوگ میرے بعد زندہ رہیں گے وہ بہت اختلاف دیکھیں گے اس لئے (میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ) تم

میری سنت اور خلفائے راشدین کی سنت کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے اسی کے مطابق ہر کام میں عمل کرو نئے نئے طریقوں سے بچتے رہو کیونکہ دین میں نئی پیدا کی ہوئی چیز بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے"۔

اِنَّمَآ اَمْرُهُمْ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ: بیشک ان کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے وہ خود کوئی فیصلہ فرمائیں گے، پھر ان کو بتلادیں گے جو کچھ وہ کیا کرتے تھے ان کے تمام برے عملوں ان کے سامنے رکھ دیئے جائیں گے، پھر اللہ تعالیٰ ہی ان کو سزا دیں گے آپ کو ان سے کوئی تعلق نہیں، آپ ان سے بیزاری کا اظہار ہی کریں کیونکہ دین میں تفریق ہرگز جائز نہیں، پچھلے رکوع میں یہ بھی مضمون گزر چکا ہے کہ سیدھا راستہ صرف ایک ہی ہے اسی کی پیروی کرو اور مختلف راستوں پر نہ چلو ورنہ اصل راستے سے الگ ہوجاؤ گے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جیسا کہ "سورۂ یٰس" میں ہے کہ آپ سیدھے راستے پر ہیں لوگوں کو اسی راستے کی طرف دعوت دیں، اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا: آپ سیدھی اور واضح ہدایت پر ہیں خود بھی اسی پر عمل کریں اور دوسروں کو بھی اسی کی تلقین کریں۔

نیکی کا ثواب

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ۚ وَ مَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ

جو آئے ساتھ نیکی کے پس لئے اسکے دس میں برابر اس کے اور جو آئے ساتھ برائی کے

فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۱۶۰﴾ قُلْ اِنَّنِيْ هَدٰىنِيْ

پس نہ بدلہ دیا جائے گا مگر اس کے برابر اور وہ نہ ظلم کئے جائیں گے (۱۶۰) آپ کہہ دیجئے کہ بیشک میں ہدایت کی مجھکو

رَبِّيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۚ دِيْنًا قِيَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۚ

رب نے میرے طرف راہ سیدھی کے ایک دین مضبوط شریعت ابراہیم کی جو ایک ہی طرف کے تھے

وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۶۱﴾

اور نہ تھے میں سے مشرکوں (۱۶۱)

بامحاورہ ترجمہ:۔ جوکوئی ایک نیکی کرتا ہے تو اس کیلئے اس کا دس گنا ہے اور جوکوئی ایک برائی کرتا ہے سو اس کے برابر سزا پائے گا اور ان پر ظلم نہ ہوگا۔ (۱۶۰) آپ کہہ دیں! میرے رب نے مجھ کو سیدھی راہ سمجھائی ابراہیم کے صحیح دین کی جو ایک ہی طرف کے تھے اور جو شرک والوں میں سے نہ تھے۔ (۱۶۱)

لفظی تحقیق: دِیْنٌ: عمل کا راستہ، کام کرنے کا بہتر طریقہ، اسی طریقہ کو اگر قانون کی شکل میں لکھ لیا جائے تو اسے ملت کہتے ہیں اور شریعت بھی یہی ہے۔

تفسیر

اس آیت میں عملوں کا بدلہ ملنے کا عام اصول بیان کیا گیا ہے قانون کی بنیاد اس رحمت پر ہے جس کا ذکر اس سورۃ کے دوسرے رکوع کے شروع میں گزرا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر رحمت کو لازم کرلیا ہے، اس رحمت کا تقاضہ تھا کہ انسان نیک کام کرے تو اسے اس کا انعام دیا جائے لیکن چونکہ وہ نیک کام جبھی کرے گا جب وہ اپنی نفسانی خواہشوں کو دبائے گا اس لئے نیک کام کرنے کے بدلے کے علاوہ اس کو اس محنت کا جو اسے اپنی خواہش کے دبانے میں کرنی پڑی ہے بدلہ الگ ملے گا اور وہ یہ ہوگا کہ اس کو ایک نیکی کے بدلے کم سے کم دس نیکیوں کا ثواب دیا جائے گا گویا اس نے ایک نیکی ایک دفعہ نہیں بلکہ دس دفعہ انجام دی ہے اور برائی کا بدلہ صرف ایک گناہ ملے گا، اس کے ساتھ کوئی اور محنت نہیں ہے جس کا بدلہ ملے ظاہر ہے کہ اس میں ظلم کا شبہ بھی نہیں ہوسکتا۔

آگے ارشاد ہے کہ اے پیغمبر! ان سے کہہ دیجئے کہ میرے رب نے مجھے بالکل سیدھا راستہ دکھا دیا ہے اور یہ بالکل سیدھا راستہ وہ مضبوط دین ہے جس کے قاعدوں کی بنیاد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے رکھی، وہ خالص نیت والے تھے ان کو خدا کی مرضی تلاش کرنے کے سوا اور کسی بات کی ہرگز خواہش نہ تھی اور جب کسی کے دل میں خود غرضی اور خواہشوں کی غلامی نہیں ہوتی تو وہ مشرک نہیں ہوتا، چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہرگز مشرکوں میں سے نہ تھے اور بت پرستی اور خود غرضی جو عرب میں رائج ہے ہرگز حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین میں نہیں ہوسکتی۔

جو شخص ایک دفعہ "لَآ اِلٰهَ اِلاَّ اللّٰهُ" صحیح نیت کے ساتھ کہتا ہے وہ بڑا اونچا عمل کرتا ہے جب اس نے اللہ تعالیٰ کی محبت میں یہ کلمہ ایک دفعہ کہا تو اللہ تعالیٰ اس سے دس گنا محبت کرتے ہیں، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ہر حمد اور تسبیح کا کلمہ اور اچھائی کا حکم دینا اور برائی سے منع کرنا نیکی کے کام ہیں اور انسان کیلئے صدقہ کی طرح ہیں اور ہر نیکی کا اجر کم از کم دس گنا ہے۔

وَ مَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا: جو کوئی برائی کرے گا اس کے برابر بدلہ دیا جائے گا یعنی: برائی کا بدلہ نیکی کی طرح بڑھا کر نہیں دیا جائے گا بلکہ اس کی اتنی ہی سزا دی جاتی ہے جتنی برائی کوئی کرتا ہے یہ بھی اللہ تعالیٰ کی خاص مہربانی ہے کہ ایک شخص برائی چھوڑنے کا ارادہ کرتا ہے مگر برائی نہیں کرتا تو اس کو بھی برائی چھوڑنے پر ایک نیکی کا اجر مل جاتا ہے، تاہم جو نیکی صحیح نیت اور تمام شرطوں کے ساتھ کی جائے اس کا کم از کم اجر دس گنا ہے اور زیادہ سے زیادہ کی کوئی حد نہیں، اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ایک نیکی کا اجر سات سو یا اس سے بھی زیادہ عطا فرما سکتے ہیں اس کے خزانے بڑے وسیع ہیں کوئی شخص جس قسم کا تعلق اللہ تعالیٰ سے قائم کرے گا اس قسم کا اجر وثواب پائے گا، البتہ برائی کا بدلہ ایک ہی ملے گا اور کسی پر زیادتی نہیں کی جائے گی نہ کسی کی نیکی کو کم کیا جائے گا اور نہ کسی کی برائی میں اضافہ کیا جائے گا۔

ایک حدیث قدسی میں ہے کہ "جو شخص ایک نیکی کرتا ہے اس کو دس نیکیوں کا ثواب ملتا ہے اور اس سے بھی زیادہ، اور جو شخص ایک گناہ کرتا ہے تو اس کی سزا صرف ایک ہی گناہ کی برابر ملے گی یا میں اس کو بھی معاف کر دوں گا اور جو شخص اتنے گناہ کر کے میرے پاس آئے جن سے ساری زمین بھر جائے اور بخشش مانگے تو میں اتنی ہی بخشش سے اس کے ساتھ معاملہ کروں گا اور جو شخص میری طرف ایک بالشت قریب ہوتا ہے میں ایک ذراع، یعنی: ایک ہاتھ اس کی طرف بڑھتا ہوں اور جو شخص ایک ہاتھ میری طرف آتا ہے میں اس کی طرف باع کے بقدر آتا ہوں (باع کہتے ہیں دونوں ہاتھوں کے پھیلاؤ کو) اور جو شخص میری طرف جھپٹ کر آتا ہے میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں۔

دِيْنًا قِيَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۚ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ: یہ دین مضبوط ہے جو اللہ تعالیٰ

کی طرف سے آئی ہوئی مضبوط بنیادوں پر قائم ہے کسی کے شخصی خیالات نہیں اور کوئی نیا دین و مذہب بھی نہیں جس میں کسی کو شبہ ہو سکے بلکہ پچھلے تمام پیغمبروں کا یہی دین ہے، خصوصیت سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نام اس لئے ذکر فرمایا کہ دنیا کے ہر مذہب والے ان کی عظمت و امامت کے قائل ہیں موجودہ فرقوں میں سے یہودی اور عیسائی عرب کے مشرک آپس میں کتنے ہی اختلاف رکھتے ہوں مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بزرگی اور امامت پر سب متفق ہیں، یہی وہ مقام ہے جو اللہ تعالیٰ نے خصوصی انعام کے طور پر ان کو دیا ہے۔

پھر ان میں سے ہر فرقہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین پر قائم ہیں اور ہمارا مذہب ہی دین ابراہیمی ہے ان کے اس غلط فہمی کو دور کرنے کیلئے فرمایا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تو غیر اللہ کی عبادت سے پرہیز کرنے والے اور شرک سے نفرت کرنے والے تھے اور یہی ان کا سب سے بڑا شاہکار ہے، تم لوگ جبکہ شرک میں مبتلا ہو گئے تو یہودیوں نے حضرت عزیر علیہ السلام کو، عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اور عرب کے مشرکوں نے ہزاروں پتھروں کو خدائی کا شریک مان لیا تو پھر کسی کو یہ کہنے کا حق نہیں رہا کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین کا پابند ہے، ہاں! یہ حق صرف مسلمانوں کو پہنچتا ہے جو شرک و کفر سے بیزار ہیں۔

جو شخص اللہ تعالیٰ کے ایک ہونے کو جانتا اور مانتا ہے کعبے کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتا ہے، جنابت کا غسل کرتا ہے اور ختنہ کرتا ہے وہ حنیف کہلائے گا، یہ سب چیزیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین میں تھیں، یہاں پر حنیف سے مراد ایسا شخص ہے جو کفر، شرک اور بدعتوں کو چھوڑ کر کے ایک اصول اور ایک دین کو ماننے والا ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام حنیف تھے اور خدا تعالیٰ کی نعمتوں کے شکر گزار تھے شرک سے بیزار اور یکسو ہونے والے تھے، اللہ تعالیٰ نے دوسروں کو بھی حکم دیا کہ تم سب کے سب حنیف بن جاؤ اور شرک کرنے والے نہ بنو، پچھلے رکوع میں بھی گزر چکا ہے کہ یہی سیدھا راستہ ہے جس کی تشریح قرآن کریم میں جگہ جگہ موجود ہے اسی راستے پر چلو اور یہودیت، نصرانیت، مجوسیت، اور صابیت کے گمراہی والے راستے پر مت چلو، بدعتوں اور نفسانی خواہشوں کے غلط راستوں کو بھی اختیار مت کرو۔

خالص توحید

قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَ نُسُكِيْ وَ مَحْيَايَ وَ مَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶۲﴾

آپ کہدیجئے بیشک نماز میری اور قربانی میری اور زندگی میری اور موت میری ہے لئے اللہ کے پالنے والا سارے جہان کا (۱۶۲)

لَا شَرِيْكَ لَهٗ ۚ وَ بِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۱۶۳﴾

نہیں کوئی شریک اس کا اور اسی کا حکم دیا گیا مجھے اور میں پہلا ہوں ماننے والوں سے (۱۶۳)

بامحاورہ ترجمہ:۔ کہہ دیں کہ! میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا اللہ ہی کیلئے ہے جو سارے جہان کا پالنے والا ہے۔ (۱۶۲) اس کا کوئی شریک نہیں اور یہی مجھے حکم ہوا اور میں سب سے پہلا فرمانبردار ہوں۔ (۱۶۳)

لفظی تحقیق: نُسُكٌ: یہ تین معنوں کیلئے آتا ہے، قربانی، حج کے تمام اعمال اور تمام عبادتیں، ان تینوں معنوں کے اعتبار سے ترجمہ یوں ہوگا کہ آپ کہہ دیں کہ میری نماز اور میری قربانی اللہ تعالیٰ کیلئے ہے، دوسرا ترجمہ یوں ہوگا کہ میری نماز اور میرے حج کے تمام اعمال اللہ تعالیٰ کیلئے ہیں، تیسرا ترجمہ یوں ہوگا کہ میری نماز اور میرے تمام عبادتیں اللہ تعالیٰ کیلئے ہیں۔

تفسیر

پہلے سے ذکر چلا آ رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا بھر کے انسانوں کیلئے اس دنیا میں زندگی بسر کرنے کا ایک ہی طریقہ مقرر کیا ہے اس کا نام مضبوط دین اور سیدھا راستہ ہے جو اس راستہ سے ہٹے گا وہ تباہ ہو کر رہے گا، اس راستہ کے بتانے کیلئے اللہ تعالیٰ نے وقتاً فوقتاً دنیا میں پیغمبر بھیجے اور وہ انسان کو اپنے اپنے زمانے میں وہ باتیں بتاتے رہے جو اس زمانے کے لحاظ سے دین پر قائم رہنے کیلئے ضروری تھیں جب تک انسان کی زندگی سادہ تھی

قانون بھی سادے تھے جب آبادی بڑھی اور زندگی کے مسائل رفتہ رفتہ زیادہ پیچیدہ ہوتے گئے دین کے قوانین بھی زیادہ پیچیدہ ہوتے گئے یہاں تک کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا زمانہ آیا تو وہ "تورات" لے کر آئے جس میں تفصیلی ہدایتیں درج تھیں، سب سے آخر میں آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم آخری کتاب، یعنی: قرآن کریم لے کر دنیا میں تشریف لائے اس کتاب میں انسانوں کیلئے زندگی کے تمام قاعدوں اور قانونوں کو جمع کر دیا گیا اور کہا گیا کہ اس کی روشنی میں عقل سے کام لے کر کھرا کھوٹا پہچانو اور اس کے بتائے ہوئے سیدھے راستے پر چلو اس راستے کا نام دین ہے۔

اس آیت میں اسلام کا خلاصہ دیا گیا ہے ارشاد ہے کہ اے ہمارے پیغمبر! یہ بتوں کی پوجا کرنے والے، آگ کی پوجا کرنے والے، وہمی لوگ اور خواہشوں کے بندے کافر مشرک وغیرہ اپنا اپنا طریقہ آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں ان سے کہہ دیجئے کہ! مجھے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ملا ہے وہ تمہارے سامنے بیان کر دیتا ہوں مجھے اللہ تعالیٰ نے دنیا میں اسی طریقہ کے چلانے کیلئے بھیجا ہے اور میں تم سے پہلے اس پر پورے یقین کے ساتھ عمل کرنے کیلئے تیار ہوں اس سے بال برابر بھی اِدھر اُدھر نہ ہٹوں گا، تمہیں میں یہی بتانے اور اسی پر عمل کرنے کا طریقہ سکھانے آیا ہوں مجھے حکم ملا ہے کہ کہہ دوں میری عبادت، قربانی نذر و نیاز میرا جینا مرنا میرے تمام عمل سب کچھ اللہ تعالیٰ کیلئے ہیں جو تمام مخلوق کے پیدا کرنے والے اور پالنے والے ہیں اور اس کے برابر کا کوئی نہیں ہے نہ کوئی اس کی قوت اور حکومت میں شریک ہے، مجھے یہی کرنے کا حکم ملا ہے اور میں اس کے حکم پورا کرنے کیلئے سب سے پہلے حاضر ہوں۔

اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کی جڑ توحید ہے اور اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ بندگی، قربانی، منت، دعا، عاجزی کا اظہار، نماز، روزہ، خیر خیرات، غرض! ہر قسم کی عبادت اللہ تعالیٰ ہی کی کرنی چاہئے ان باتوں میں کسی کو اس کا شریک نہیں کرنا چاہئے، اس کے علاوہ زندگی کے سارے کام اسی کے حکم کے مطابق کرنے ہیں اس کے سوا کسی کی فرمانبرداری نہیں کرنی مگر جس کی فرمانبرداری کا وہ حکم دے اس کے کہنے کے مطابق چلنا جس کی وہ اجازت دے وہ

کرنا اور جس سے وہ روکے اس سے رک جانا یہی دین اسلام ہے۔

اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی کچھ دینے لینے والا نہیں

قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْ رَبًّا وَّ هُوَ رَبُّ كُلِّ شَيْءٍ ؕ وَ لَا تَكْسِبُ

آپ کہہ دیجئے کیا سوا اللہ کے ڈھونڈوں میں کوئی رب اور وہی رب ہے ہر چیز کا اور نہ کرے گا

كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا ۚ وَ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۚ ثُمَّ اِلٰى

کوئی جی مگر پر ہو گا اسی اور نہ اٹھائے گا کوئی اٹھانے والا بوجھ دوسرے کا پھر طرف

رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۶۴﴾

رب تمہارے کے ہے لوٹنا تمہارا پس خبر دے گا تم کو اس کی جو تھے تم میں اس اختلاف کرتے (۱۶۴)

با محاورہ ترجمہ:۔ کہہ دیں! کیا میں اب اللہ کے سوا کوئی اور رب تلاش کروں حالانکہ ہر چیز کا رب وہی ہے؟ اور جو کوئی گناہ کرتا ہے سو وہ اسی کے ذمہ ہے اور ایک شخص دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا، پھر تمہارے رب کے پاس ہی تم سب کو لوٹ کر جانا ہے، سو وہ بتلا دے گا جس بات میں تم جھگڑتے ہو۔ (۱۶۴)

لفظی تحقیق: لَا تَزِرُ: نہ اٹھائے گا۔ اس کا مصدر "وِزْرٌ" ہے، جس کے معنیٰ: بوجھ کے ہیں۔

تفسیر

جب ہم دنیا کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتے ہیں تو ایک عجیب وغریب انتظام نظر آتا ہے ہر چیز اپنی اپنی جگہ قاعدے اور قرینے سے رکھی ہوئی ہے اور ہر ایک کو اس کی ضرورت کی چیزیں باقاعدہ مل رہی ہیں اور ان کا پہچاننے والا سوا اللہ کے اور کوئی ہو نہیں سکتا؛ اس لئے سوا اس کے چارہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کو سب کا رب مانا جائے اس آیت میں یہی مضمون ہے ارشاد ہے کہ: اے رسول! کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا اس سارے جہاں کا پالنے والا، یعنی:

رب نظر نہیں آتا؛ اس لئے ضروری ہے کہ میں بھی اسی کو اپنا رب قرار دوں اور اپنی ضرورت کی ہر چیز اسی سے مانگوں، جو لوگ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر کسی اور کی طرف جھکتے ہیں وہ نادان ہیں دھوکا کھائے ہوئے ہیں ان کے بہکاوے میں آ کر اللہ تعالیٰ کو چھوڑنا نہ چاہئے، کوئی کسی کے کچھ کام نہ آئے گا ان پر اپنے ہی گناہوں کا بوجھ لدا ہوا ہے وہ دوسرے کا بوجھ کیا اٹھائیں گے مجھ سے صاف کہہ دیا گیا ہے کہ کوئی کسی کا ذمہ دار اور سفارشی بوجھ اٹھانے والا نہیں ہوسکتا ہر ایک اپنے اپنے عمل کا ذمہ دار ہے ہر ایک اپنے عملوں اور کرتوتوں کا بوجھ سر پر اٹھائے ایک دن اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہوگا اور اللہ تعالیٰ اسے بتادیں گے کہ کون ٹھیک تھا اور کون غلط، کون انعام کا مستحق ہے اور کون سزا کا، اس سے معلوم ہوا کہ کسی کے بہکانے سے کوئی برا کام ہرگز نہ کرنا چاہئے کیونکہ اس کا وبال کرنے والے کے سر پر پڑے گا اور بہکانے والا اپنی ہی مصیبت میں گرفتار ہوگا وہ کسی کو کیا بچائے گا، یاد رکھنا چاہئے کہ قیامت کے دن کوئی کسی کے کام نہ آئے گا وہاں کا اٹل قاعدہ یہ ہے کہ جو کرے گا وہ بھرے گا۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سلسلے میں انسانوں جانوروں حتیٰ کہ کیڑوں مکوڑوں تک کا ذکر کیا ہے، اگر کسی نے کسی دوسرے بھائی کی زمین غصب کی ہے تو وہ ٹکڑا بھی اس کے گلے کا طوق بن جائے گا جسے وہ گھسیٹتا ہوا میدان محشر میں لائے گا اسی طرح اگر کسی کا جانور چوری کیا ہے تو اسے بھی اپنی گردن پر اٹھائے ہوئے آئے گا اس کے ہر عمل کا حساب کتاب خود اسی کی ذات سے ہوگا اس معاملہ کی کسی دوسرے سے پوچھ گچھ نہیں ہوگی، "سورۂ نحل" میں ہے کہ اس دن ہر شخص کو خود ہی جواب دینا پڑے گا کوئی دوسرا اس کی طرف سے جواب دہ نہیں ہوگا ایسا ہرگز نہیں ہوگا کہ گناہ کوئی کرے اور اس کا بوجھ کسی دوسرے پر پڑ جائے، یہ اللہ تعالیٰ کے قانون کے خلاف ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی یہی اعلان کیا تھا جیسا کہ "سورہ نجم" میں ہے کہ "کیا انہیں ابراہیم کی یہ بات نہیں پہنچی کہ کوئی اٹھانے والا کسی دوسرے کے گناہوں کا بوجھ نہیں اٹھائے گا"، نیز: یہ کہ انسان کو وہی کچھ ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے، بہر حال اللہ تعالیٰ نے مشرکوں کی اس بات کا رد فرمایا جو وہ ایمان والوں سے کہتے تھے کہ ہمارا

دین قبول کرلو اگر کوئی گناہ ہوا تو ہم تمہارا بوجھ اٹھالیں گے۔

اس آیت میں یہ سمجھایا گیا ہے کہ قیامت کے معاملہ کو دنیا کے معاملہ کی طرح نہیں سمجھنا چاہئے کہ یہاں کوئی شخص جرم کرکے کسی دوسرے کے سر ڈال سکتا ہے، خصوصاً جبکہ دوسرا خود رضامند بھی ہو مگر اللہ تعالیٰ کے دربار میں اس کی کوئی گنجائش نہیں وہاں ایک کے گناہ میں دوسرا ہرگز نہیں پکڑا جاسکتا۔

انسان زمین پر اللہ تعالیٰ کا نائب ہے

وَ هُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓىِٕفَ الْاَرْضِ وَ رَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ

اور وہی ہے جس نے کیا تم کو نائب زمین میں اور بلند کیا بعض کو تم میں اوپر

بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّیَبْلُوَكُمْ فِیْ مَاۤ اٰتٰىكُمْ ؕ اِنَّ رَبَّكَ سَرِیْعُ

بعض کے درجوں میں تاکہ آزمائے تم کو میں اس جو دی تمہیں بیشک رب آپ کا جلد

الْعِقَابِ ۖؗ وَ اِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ۠ ﴿۱۶۵﴾ ع ۲۰ / ۱۱

سزا دینے والا ہے اور یقیناً وہ البتہ بخشنے والا مہربان ہے (۱۶۵)

بامحاورہ ترجمہ:۔ اور اسی نے تم کو زمین میں نائب مقرر کیا ہے اور تم میں سے بعض کے درجے بعض پر بلند کردیئے تاکہ تم کو اپنے دیئے ہوئے میں آزمائے، بیشک آپ کا رب جلد عذاب کرنے والا ہے اور وہی بخشنے والا مہربان۔ (۱۶۵)

لفظی تحقیق: خَلٰٓىِٕفَ: نائب۔ "خَلِیْفَةٌ" کی جمع ہے "خَلِیْفَةٌ" کے معنیٰ "سورہ بقرہ" کے چوتھے رکوع میں گزر چکے ہیں جہاں سے صاف سمجھ میں آتا ہے کہ انسان اس زمین میں اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہے اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو کچھ خاص اختیار اور قوتیں دے کر زمین پر بھیجا ہے تاکہ اس سے یہاں اپنا کام لے اور جو کوئی اس کام کو جہاں تک انجام دے اس کے مطابق اس کو جزا دے یہ سورۃ مکہ میں پہلے اتر چکی تھی، "سورۂ

بقرہ" بعد میں مدینہ میں اتری اس لئے "سورۂ بقرہ" کو اس کی تفسیر اور تشریح سمجھنا چاہئے۔

تفسیر

وَ هُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓىِٕفَ الْاَرْضِ: اللہ تعالیٰ کی ذات وہ ہے جس نے تمہیں زمین میں خلیفہ بنایا ہے، یہ خلافت عام بھی ہے اور خاص بھی، خلیفہ بنانے کا ایک مطلب یہ ہے کہ زمین میں بعض انسانوں کو بعض کا نائب بنایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں پہلے لوگوں کی جگہ پر کھڑا کیا ہے، پھر ان کو بھی لے جائے گا اور ان کی جگہ دوسروں کو لے آئے گا اس طرح بعض لوگ بعض دوسرے لوگوں کے نائب بنائے گئے ہیں، ایک نسل چلی جاتی ہے تو اس کی جگہ دوسری نسل آ جاتی ہے، کسی شخص یا قوم کو ہمیشگی حاصل نہیں یہ سب معاملے عارضی ہیں، لہٰذا انسان کو اپنی حیثیت سمجھنی چاہئے اور اس دنیا میں خلیفہ بن کر غرور و تکبر اختیار نہیں کرنا چاہئے۔

خلافت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو اپنا نائب مقرر کیا ہے، "سورۂ بقرہ" کی ابتداء میں آتا ہے کہ سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام کو خلافت حاصل ہوئی اور پھر آپ کے ذریعے سے یہ ذمہ داری حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد کو ملی، ظاہر ہے کہ خلیفہ اصل حاکم کا نائب اور قائم مقام ہوتا ہے اور اس کی طرف سے سپرد کئے ہوئے اختیارات کو کام میں لاتا ہے اور ان کے مطابق عمل کرتا ہے، اگر کوئی نائب اپنے حاکم اعلیٰ کے حکم کی خلاف ورزی کرتا ہے تو وہ باغی اور سرکش سمجھا جائے گا، اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنا خلیفہ مقرر کیا ہے تو اس کا فرض ہے کہ نائب ہونے کا حق ٹھیک طور پر ادا کرے ہر شخص اپنی صلاحیت کے مطابق خدا تعالیٰ کا خلیفہ ہے اللہ تعالیٰ نے اسے بعض اختیارات دے کر زمین میں بھیجا ہے اور حکم دیا ہے کہ میرے قانون پر خود بھی عمل کرو اور دوسروں سے بھی کراؤ، لہٰذا اب یہ انسان کا فرض ہے کہ وہ خلافت کی ذمہ داری پوری کرے۔

انسان کے حق میں اپنی خلافت کے ذکر کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ایک اور بات بیان فرمائی ہے تم میں بعض

کو درجے کے اعتبار سے بعض پر فوقیت بخشی ہے بعض کمزور ہیں اور بعض طاقتور، بعض لوگوں کو علم کے لحاظ سے دوسروں پر فوقیت حاصل ہے اور بعض مال و دولت میں فوقیت رکھتے ہیں، بعض خاندانی اعتبار سے اونچے شمار ہوتے ہیں اور بعض مرتبے کے لحاظ سے اعلیٰ ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کی صلاحیت علیحدہ علیحدہ رکھی ہے اور اس سے مقصود یہ ہے کہ ان چیزوں کے ذریعے تمہیں آزمائے جو اللہ تعالیٰ نے تمہیں عطا کی ہیں، مثال کے طور پر امیر اور غریب کی تفریق پیدا کی اور امیر کو مال دے کر ساتھ حکم بھی دیا کہ غریبوں کا خیال بھی رکھنا مگر اکثر امیر یہاں آکر آزمائش میں پورے نہیں اترتے مال و دولت کے گھمنڈ میں آکر غریب کی مدد کرنے کے بجائے اس پر ظلم و ستم ڈھاتے ہیں اور اس طرح امتحان میں ناکام ہوجاتے ہیں، اس طرح کسی شخص کو جسمانی قوت عطا کر کے کمزور آدمی کے ساتھ آزمائش میں مبتلا کیا ہے اگر وہ کمزور کی خدمت کرے گا تو کامیاب ہوگا اور اگر کمزور کو مزید دبانے کی کوشش کرے گا تو آزمائش میں ناکام ہوجائے گا، افسران بالا کیلئے ان کے ماتحت ملازمین آزمائش کا ذریعہ ہیں اگر کوئی اپنے ماتحتوں کے ساتھ اچھا رویہ اختیار نہیں کرتا ان کا حق پورا پورا ادا نہیں کرتا تو ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کی ہوئی خلافت و نیابت کا حق ادا نہیں کرسکا۔

اس آیت میں دونوں حالتوں کا انجام اس طرح بتلا دیا ہے کہ آپ کا رب نافرمانوں پر جلد عذاب بھیجنے والا ہے اور فرمانبرداروں کیلئے غفور و رحیم ہے۔

"سورۂ انعام" کا شروع حمد سے ہوا اور ختم مغفرت پر اللہ تعالیٰ ہم سب کو حمد کی توفیق دیں اور مغفرت سے نوازیں۔ آمین

حدیث میں ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: "سورۂ انعام" مکمل ایک ہی دفعہ میں اتری اور اس شان کے ساتھ کہ ستر ہزار فرشتے اس کے ساتھ تسبیح پڑھتے ہوئے آئے اس لئے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ "سورۂ انعام" قرآن کریم کی افضل و اعلیٰ سورتوں میں سے ہے، بعض روایتوں میں حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ سے منقول ہے کہ یہ سورۃ جس مریض پر پڑھی جائے اللہ تعالیٰ اس کو شفا (تندرستی) دیتے ہیں۔

..... تمت بالخیر .....

دفتر ریسرچ اینڈ رجسٹریشن آفیسر اوقاف

(حکومت سندھ)
جامع مسجد آرام باغ۔ کراچی

موبائل: 0300-3311811 فون نمبر: 021-9933 2012

مورخہ 28/9/2017 نشانِ مجاریہ:۔ آر۔آر۔او (اوقاف) A-64/2017

RESEARCH & REGISTRATION OFFICER
MUFTI MUNEER AHMED TARIQ
AUQAF DEPARTMENT GOVT. OF SINDH

تصدیق نامہ

میں نے مکتبہ ربانیہ کراچی کے مطبوعہ قرآن پاک مترجم بنام: آسان تفسیر القرآن مکمل (۱۰ جلدیں)، تالیف وترتیب حضرت مولانا مفتی اصغر علی ربانی صاحب مدظلہم کے عربی متن کو بغور پڑھا اور اسکے تمام حروف واعراب (زبر، زیر، پیش وغیرہ) کی پروف ریڈنگ اپنی زیر نگرانی کروائی ہے۔

الحمدللہ! بہت معیاری اور صحیح کتابت کرائی گئی ہے۔ تصدیق کی جاتی ہے کہ مذکورہ بالا قرآن پاک (اردو مترجم) آسان تفسیر القرآن (۱۰ جلدیں) تمام اغلاط سے پاک اور مبرا ہے۔ ان شاء اللہ

المصدق

مولانا مفتی منیر احمد طارق

ریسرچ ورجسٹریشن آفیسر اوقاف

حکومت سندھ
مفتی منیر احمد طارق
ریسرچ ورجسٹریشن آفیسر
محکمہ اوقاف سندھ کراچی

[illegible]

مکتبہ ربانیہ کراچی

ISLAMIC STUDIES PUBLISHERS